5
جلد پنجم

کلیات
خواجہ احمد عباس

تدوین وترتیب
ارتضیٰ کریم

کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد پنجم)

ناول

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	265/- روپے
قیمت سیٹ	:	1935/- روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1965

Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol.V)

Compiler: Prof.Irteza Karim

ISBN No :978-93-87510-28-9

Set ISBN: 978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسارامیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی ''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شونیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو/سرد لہر'' مایا نگری/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل/بھکارن، اسپرٹ/لُس، چمتکار/معجزہ۔ بعض کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل/بھکارن'' اپنے دو مختلف متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے اختلاف متن کا اندازہ ہو سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول جو 'ایک اور پریم کہانی'، 'ساحل اور سمندر'، 'ہیلو مس مالتی' جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں: مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش، ... خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے— مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہو سکی۔ ''لال گلاب کی واپسی''، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آ رہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائرکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جا سکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

○	پیش لفظ	iii
○	اعتذار	ix
-1	انقلاب	1
-2	دو بوند پانی	431

اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

> ''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں ''آخری صفحہ'' (Last Page) اور ''آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص:66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ، گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو ''فلم'' کا سہارا لیا۔غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی ۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے ''اظہار کے مختلف پیرائے'' کا سہارا لیا۔خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔تادم تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی— لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویۂ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

''1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا.. اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کر کے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کر سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جا سکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دورانِ تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> Let me record here that three months period in the
> 'National Call' really made me into a journalist
> (I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کر لیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک

نقطے' پر مکمل کیا۔ اگر چہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔۔ بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جا سکتا ہے۔۔ 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم 'آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم و بیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے بہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من وعن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہو سکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر۔۔ بلٹز کے لیے 'آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے
کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔''

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار ص 230)

یہاں مجھے صرف ایک اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا— خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جواب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔''

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

''رقصِ حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔''

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جا سکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مر سکتی ہے؟''

(بلٹز 10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق''

(بلٹز 24 مئی 1980)

''حیدرآباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری 1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جا سکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، میری
سلمہ، سوہنی، جولیٹ، پدمنی
لیلیٰ، لیلا، للی
موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...
دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔
دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیٹری بنانے والیاں، بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پر بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا— ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے—

''مہنگائی کا خاتمہ کرو!
کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو
چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ،
کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ—
شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دوررس تھی؟ وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات اور اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

افسانہ

خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ ''ابابیل'' تھا، (اس افسانے کی سنہ اشاعت کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اسی لیے رسالہ جامعہ کے مشمولات کا عکسی صفحہ پہلی جلد میں شامل کر دیا ہے تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔) گویا یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ تادم تحریر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً سوا سو کہانیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے۔ بقیہ افسانوی مجموعے انہیں دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے، جنہیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرّر کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ میں کہانیوں کے علاوہ خاکے، مضامین اور دیگر نوعیت کی تحریریں بھی شریک کر دی گئی ہیں۔ اس سے ہمارے ناقدین کو مغالطہ بھی ہوا ہے کہ وہ ان کے بعض مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کر لیتے ہیں۔ رام لعل نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے'' میں '' آئینہ خانہ میں'' کو افسانے کے زمرے میں شامل کر دیا ہے۔ یہی سہو پروفیسر صغریٰ مہدی کی مرتبہ کتاب ''اگر مجھ سے ملنا ہے'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے) میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ نہیں بلکہ مضمون ہے۔ ' آئینہ خانہ میں' ادبی تحریر کا ایسا سلسلہ ہے۔ جس کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں کرشن چندر، بیدی، اور دوسرے قلم کاروں نے اپنی شخصیت اور فکر و فن پر خود روشنی ڈالی تھی۔ خواجہ احمد عباس کا یہ سوانحی مضمون افکار (دسمبر 1963ء) میں شائع ہوا تھا۔

ان کے بعض افسانوں کو عنوانات بدل بدل کر بھی شائع کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ 1956 / الف لیلیٰ 1980، الف لیلیٰ 1952، مسوری 1952 / مسوری 1953، پنجرہ / پنچھی، پنجرہ اور اڑان، آج کے

لیلیٰ مجنوں ربیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، اجنتا راجنتا کی اُور، کیپٹن سلمیٰ ربھوپال کی کیپٹن سلمیٰ، ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام ربچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام، رفیق رمیجر رفیق مارا گیا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایسے کچھ افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے بلکہ اردو رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

اردو کی طرح ہندی والوں نے بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جس پبلشر نے جیسے مناسب سمجھا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کو شائع کیا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنیاد پر عوام میں خوب مقبول ہیں اور تھیں۔ اردو کی کہانیوں کا اگر سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو خواجہ احمد عباس کی کہانیاں ان میں جگہ بنالیں گی۔ ان کے افسانوں کے انفراد پر آئندہ سطور میں گفتگو ہوگی۔ سردست ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تفصیل حاضر ہے۔

پہلا افسانہ **'ابابیل'** رسالہ: جامعہ، جلد 26، شمارہ 6 جون 1936

ایک: پہلا افسانوی مجموعہ: **ایک لڑکی** (1942)

مشمولات: (1) فیصلہ (2) ایک لڑکی (3) سرکشی (4) ناگن (5) پہلا پتھر (6) ابابیل (7) تین عورتیں (8) داروغا اور لڑکی (9) معمار (10) رادھا۔

دو: **پاؤں میں پھول** (1948)

مشمولات: (1) پاؤں میں پھول (2) چڑھاؤ اتار (3) بارہ گھنٹے (4) ایک پائلی چاول (5) ماں (6) آزادی کا دن (7) میں اور وہ (8) موت کی شکست۔

نوٹ: تعارف کے طور پر کرشن چندر کی تحریر شامل ہے۔

تین: **زعفران کے پھول**: (مارچ۔1948) کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی

مشمولات: (1) زعفران کے پھول (2) اجنتا (3) اندھیرا اور اجالا۔

چار: **میں کون ہوں**، (1949)، نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی۔

مشمولات: (1) چڑیا چڑے کی کہانی (2) دھوئیں کی زنجیر (3) جاگتے رہو (4) رفیق

(5) میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی (6) میرے بچے (7) میری موت (8) ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام (9) انتقام (10) شاعر کی آواز (11) میں کون ہوں؟

نوٹ: کہانی کی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔

پانچ: کہتے ہیں جس کو عشق، (1953)، پروین بک ڈپو، الہ آباد۔

مشمولات: (1) کہتے ہیں جس کو عشق (2) شکر اللہ کا (3) مسوری 1952

چھ: گیہوں اور گلاب، (1955)، ایشیا پبلشرز، دلی۔

مشمولات: (1) گیہوں اور گلاب (2) میرا بیٹا میرا دشمن (3) آسمانی تلوار (4) لال پیلا (5) نئی برسات (6) معجزہ (7) مونتاژ۔

سات: دیا جلے ساری رات، (1959)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی۔

مشمولات: (1) دیا جلے ساری رات (2) روپے آنے پائی (3) چراغ تلے اندھیرا (4) بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام (5) کچی کچی (6) تین تصویریں (7) ڈیڈ لیٹر (8) الف لیلیٰ 1956۔

نوٹ: اس مجموعے میں کرشن چندر کی یہ تحریر بھی شامل ہے: کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا مقدمہ۔

آٹھ: نئی دھرتی نئے انسان، (1977)، مکتبہ جامعہ، دہلی۔

مشمولات: (1) نیا شوالہ (2) ہنومان جی کا ہاتھ (3) سبز موٹر کار (4) ٹڈی (5) بھولی (6) نئی جنگ (7) تین بھنگی (8) پانی کی پھانسی (9) تیسرا دریا (10) سونے کی چار چوڑیاں (11) یہ بھی تاج محل (12) ٹیری لین کی پتلون (13) چٹان اور سپنا (14) خزانہ (15) دو ہاتھ (16) ایک لڑکی۔ سات دیوانے۔

نوٹ: اس مجموعے میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر شامل ہے۔

نو: نیلی ساڑی، دسمبر (1982)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

مشمولات: (1) ایک کہانی کا سوال ہے (2) تین مائیں ایک بچہ (3) سردی گرمی (4) بھوک (5) فین (6) نیا انتقام (7) نیلی ساری۔

دس: سونے چاندی کے بت، (1986)، کلاسیک انٹرنیشنل، بمبئی۔

اس کتاب میں فلمی شخصیات پر دس خاکے اور چھ ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فلمی دنیا سے ہے ان کے علاوہ درج ذیل نو کہانیاں شریک کتاب ہیں۔

(1) ماں کا دل (2) فلمی تکون (3) پرنیتا کماری کے پان (4) دو پرچھائیاں (5) کایا کلپ (6) اچھن کا عاشق (7) رین مشین (8) ایک لڑکی تین چہرے (9) ایکٹریس۔

ان کے علاوہ جو افسانوی مجموعے ہیں انہیں مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا BY PRODUCT کہا جانا چاہئے۔ الّا یہ کہ کسی نے کسی رسالے میں شائع شدہ کوئی افسانہ شریک کر دیا ہو۔ چند مجموعے جو درج ذیل عنوانات سے شائع ہوئے ہیں:

(1) پیرس کی ایک شام (2) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (3) چراغ تلے (4) اداس دیواریں (5) پھول اور دوسری کہانیاں (6) اندھیرا اجالا (7) اگر مجھ سے ملنا ہے (مرتبہ: صغریٰ مہدی) (8) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (مرتبہ: رام لال)

خواجہ احمد عباس کو میں ''اسکرین پلے فکشن نگار'' تصور کرتا ہوں۔ اپنے خیال کو تقویت بخشنے اور آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کی ہی تحریر حاضر ہے۔

> امر، جو کنسٹرکٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کر رہا تھا۔ پھر گوپال کے اوور ٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'
>
> ''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُوور ٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

اس سلسلے میں ایک دو مثالیں اور بھی ان کے ہی ناول/افسانے سے پیش کی جا سکتی ہیں:

''.....آؤ میں تمہاری قمیض کو سی دوں گی۔ روزی ناچ گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے.....''

یہاں کہانی جس اسلوب میں بڑھائی جارہی ہے وہ واضح طور پر ''اسکرین پلے'' سے قربت رکھتا ہے۔

ناول

(1) چار دل چار راہیں (2) شیشے کی دیواریں (3) بمبئی رات کی بانہوں میں (4) اندھیرا اجالا (5) انقلاب (6) دو بوند پانی (7) فاصلہ (8) تین پیسے (9) ساحل اور سمندر (10) چار یار۔

تاریخی ترتیب سے ''چار دل چار راہیں'' جسے کتابستان الہ آباد نے 1959 میں شائع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ناول ''انقلاب'' جو بوجوہ نیا سنسار بمبئی سے 1975 میں شائع ہوا۔ ناول کے سلسلے سے اسے پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنے کئی مضامین میں اردو میں اس کے تاخیر سے چھپنے کی وجہ بتائی ہے۔ آجکل اپریل 1985 کے شمارے میں ''من کہ.....'' کے تحت انہوں نے لکھا ہے:

''سب سے مشہور ناول اردو میں ''انقلاب'' تھا، جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا رُوسی ایڈیشن 'سن آف انڈیا'' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ ''اچھا یا برا اس کے بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔''

میں خواجہ احمد عباس کی تحریروں کی تلاش کر رہا تھا کہ اس درمیان ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ایک مضمون ''**جوالا مکھی**'': **خواجہ احمد عباس کا گم شدہ ناول**'' ''ایوان اردو'' دہلی کے فروری 2015 کے شمارے میں منظر عام پر آیا۔ جس سے ایک نئی حقیقت سامنے آئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی اگر 1936 میں شائع ہوئی تو ان کی ناول نگاری کا سفر بھی اسی سال شروع ہوتا ہے۔ میں یہاں مذکورہ مضمون کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں تاکہ صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوا جا سکے۔ یحییٰ نشیط لکھتے ہیں:

> ''ہمارے پیش نظر اس وقت ''طبی دنیا'' دہلی کا ستمبر 1963ء کا ایک شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 11 سے 61 تک خواجہ احمد عباس کے ناول کی پہلی قسط طبی دنیا کے مدیر نے اپنی رائے کے ساتھ شائع کی ہے۔ مدیر کی رائے حسب ذیل ہے۔
>
> ''ایک پر اسرار ناول جو ''طبی دنیا'' میں ہر ماہ قسط وار شائع ہوگا۔
>
> ''ہم اپنے نوجوان عزیز خواجہ احمد عباس کے شکر گزار اور دعا گو ہیں کہ ''طبی دنیا'' میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنا یہ پہلا شاہکار بھیجا۔ عزیز موصوف ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مغربی علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملازمت کی پابندیوں کے حوالے نہیں کیا، جس میں ان کے لیے زندگی کی کامیابیوں کا ایسا میدان تھا، جو ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے شاید کسی ایک ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کے خداداد ادبی ذوق اور شوقِ مطالعہ اور قابل قدر جذبۂ ایثار نے ان کے سامنے جو راہِ خدمت پیش کی، انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔ آسمانِ صحافت پر یہ ایک نئی صبح کا ظہور ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو لوگ دیکھیں گے کہ مولانا حالیؔ کے مطلع خاندان سے ان کے بعد ایک اور روشن تارہ نکلا ہے!''
>
> اس اداریے کے بعد مدیر نے ''جوالا مکھی'' کا پہلا باب شائع کیا ہے۔ عنوانِ باب کی جلی سرخیوں کے ساتھ جزوی سرخیوں کو بھی مدیر نے قدرے روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، جتنی بھی فلمیں بنائی ہیں، جتنے اسکرپٹ اور جتنے ناول لکھے ہیں، ان تمام سے مختلف یہ تخلیق ہے۔ پتہ نہیں کیوں، پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ''طبّی دنیا'' ایک غیرادبی جریدہ ہے۔ محققین بھلا ادب کا میدان چھوڑ کر طبی جریدے کی ورق گردانی کیوں کرنے لگیں۔ اسی سرد لوحی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی اولین کوشش سے آج ہم بے خبر ہیں۔

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کر لی ہے کہ اس رسالے کے باقی ماندہ شماروں کو بھی حاصل کروں، اس دوران مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو ماہ ٹھہرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا اور میں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی مگر طبی دنیا کے وہ قدیم شمارے مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔''

اس کے بعد انہوں نے اس جاسوسی ناول کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور پہلی قسط بھی۔ جو اس کلیات میں ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ ناول خواجہ احمد عباس کی ابتدائی کاوش ہے اس لیے اس میں وہ پختگی اور فن کی کہنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں ان کا مبتدیانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ان کی اس اولین تخلیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع ہی سے ترقی پسند افکار پنپنے لگے تھے۔ ان کے اس ناول کی تخلیق اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے قیام سے قبل 1932 میں چند نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کر دیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے انہی افسانوں سے متاثر ہو کر یہ ناول لکھا ہو اور ''انگارے'' کی مناسبت سے اپنے ناول کا نام ''جوالا مکھی'' رکھا۔ اس ناول کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے خیالات اور جذبات میں اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ مالداروں اور غریبوں کے درمیان دولت کی خلیج کی وجہ سے بڑھتے ہوئے فاصلوں کا ادراک خواجہ

احمد عباس کو شروع ہی سے تھا۔ اس افتراق کو ختم کرنے کا وہ انقلابی نعرہ ابھی ہندوستان میں لگایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے انقلاب کی زیریں لہریں ہی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی، مگر ''جوالا مکھی'' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول ''جوالا مکھی'' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

راقم نے بھی اس ناول کے حوالے سے تحقیق کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ چونکہ طبی دنیا کے شمارے کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ''طبی دنیا'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو۔ ممکن ہے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شروعات کی ہو لیکن وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ایسا ان کی کئی کتابوں کے ساتھ ہوا ہے کہ اعلانات تو کیے گئے مگر اس عنوان سے ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً ''یہ امرت ہے''، ''پرچم'' یا ''چار دانوں کی کہانی''۔ آخری الذکر کی آخری قسط بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔

خواجہ احمد کے ناولوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اندھیرا اجالا، شیشے کی دیواریں،

دو بوند پانی ، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، سات ہندوستانی، ایک پرانا ٹب اور دنیا بھر کا کچرا، فاصلہ وغیرہ۔ یہاں حتمی طور پر ان ناولوں کی سنہ اشاعت نہیں دی جاسکتی۔ چونکہ زیادہ تر ناولوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصلاً یہ ناول فلم کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ ادبی شان نہیں ملتی، جو ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان ناولوں پر ہماری تنقید مہر بہ لب نظر آتی ہے۔ آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے؟ اس پر بات تو ہونی ہی چاہئے تھی تاکہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے انقلاب کا ذکر مندرجہ بالا سطر میں دانستہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ ناول ان ناولوں سے مختلف ہے اور یہاں فنی اعتبار سے خواجہ احمد عباس زیادہ بامراد بھی رہے ہیں۔ اگرچہ انقلاب کے حوالے سے بھی ہمارے ناقدین نے بخل سے کام لیا ہے۔

ڈرامے

خواجہ احمد عباس کا تعلق IPTA سے بہت گہرا رہا ہے اور انہوں نے اس کے لئے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کیے۔ مثلاً: (1) زبیدہ (2) اناس اور ایٹم بم (3) یہ امرت ہے (دستیاب نہیں ہوسکا) (4) بارہ بج کر پانچ منٹ (5) لال گلاب کی واپسی (6) پرچم۔ (دستیاب نہیں ہوسکا)

ان ڈراموں کے موضوعات مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی۔ لیکن ایک عام روح جو ان تمام ڈراموں میں جاری ہے، وہ انسان دوستی، رواداری اور عصری منظرنامے کی ہے۔ ڈراما ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کا موضوع بالکل آج کا موضوع ہے، یعنی صحافت جو سیاست، سماج اور ملک کا مقدر بدل سکتی تھی اس نے بھی تجارت کی شکل لے لی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان ڈراموں کو کامیاب کوشش کہا جائے گا۔

صحافتی تحریریں

اوپر ذکر آچکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ صحافتی مضامین لکھے بلکہ درج ذیل صحافتی نوعیت کی

کتابیں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں: (1) مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش (2) مولانا محمد علی (3) خروش چیف کیا چاہتا ہے؟ (4) فلمیں کیسے بنتی ہیں؟

فلم اسکرپٹ اور کہانیاں

(1) میرا نام جوکر (2) سات ہندوستانی (3) دھرتی کا لال (4) بابی (5) شہر اور سپنا (6) آسمان محل (7) ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی (8) راہی (9) آوارہ (10) شری 420 (11) خون کا رشتہ۔

سفر نامہ: (1) مسافر کی ڈائری (2) سرخ زمین اور پانچ ستارے

تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی اُردو میں مندرجہ بالا کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی تقریباً باون (52) تصانیف ہیں (ان میں بعض کتابیں اُردو کہانیوں کا ترجمہ ہیں)۔ اس تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں کم ہو جائیں لیکن کم و بیش خواجہ احمد عباس اسی کتابوں کے مصنف کہے جاسکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہندی میں براہِ راست نہیں لکھتے تھے، ان کی جو کتابیں ہندی میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر اُردو یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے ملتی ہے جسے نیلابھ پرکاشن، الہ آباد نے 1953 میں ناول کے نام سے شائع کیا ہے جب کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ ''مسوری 1952'' ہے جو ان کے طویل افسانوں پر مشتمل مجموعے ''کہتے ہیں جس کو عشق'' میں شریک اشاعت ہے لیکن نام مختلف ہونے کی بنا پر لوگ اسے بھی الگ کتاب شمار کرتے ہیں۔ میں نے خواجہ احمد عباس کے حوالے سے تحقیق و تلاش کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ان کی زیادہ تر تخلیقات کو یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی تمام تحریروں کو پالیا ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کوئی اور تحریر سامنے آجائے لیکن سرِ دست میری تحقیق کا حاصل یہی ہے۔

امید ہے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری یہ کوشش پسند آئے۔ اتنا بڑا کام جو آپ کے سامنے ہے ظاہری بات ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں

ہوسکتا تھا جب تک ہمیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری اور ادارۂ ادبیات حیدرآباد سے مدد نہ ملی ہوتی۔ جو افراد اور احباب اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا فرداً فرداً نام لینا مشکل تو ہے مگر ضروری بھی۔ اس میں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کچھ ناموں کا ذکر نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی فوری طور پر جناب ابوذر ہاشمی کلکتہ، جناب یحییٰ نشیط، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر زاہد الحق، محترمہ زویا زیدی، جناب مہر ندیم الٰہی، جناب عطا خورشید، محترمہ نوشین عثمانی، پاکستان کے ہمارے دوست جناب رفاقت علی شاہد وغیرہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

میں خصوصی طور پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا سراپا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت کے حقوق راقم کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کیے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا تعلق خواجہ احمد عباس کے خانوادے سے ہے انہوں نے خواجہ احمد عباس میموریل ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ادب کی بہت اچھی پارکھ رہی ہیں۔ نیز آپ سماجی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہ صرف بہت فعال ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جلسوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کا بھی انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی بہت فعال ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونی ورسٹی حیدرآباد کی چانسلر بھی رہ چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اتنا اہم کام شائع نہیں ہوسکتا تھا۔

مجھے یقین ہے اس کام میں کمیاں ہوں گی مگر یہ بھی توقع ہے کہ اس کام کو دوسرے لوگ بہتر طریقے سے کرسکیں گے۔

مجھ سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب میں نے قدم رکھا یہ خاک داں ویراں تھا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

انقلاب

یہ ناول اردو میں پہلی بار نومبر 1975 میں نیا سنسار پبلشرس، بمبئی۔54 سے شائع ہوا

اپنی بیوی، دوست اور ساتھی

مجتبائی خاتون مرحومہ

کے نام...

''وہ جو کہ پاس ہو کر دُور ہو گئی...
وہ جو کہ دُور ہو کر پاس آ گئی''

انقلاب کی کہانی

میرا عقیدہ یہ ہے کہ اصل ادیب اور شاعر صرف ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔

امریکہ میں جہاں کتابوں کا ایڈیشن لاکھوں کا ہوتا ہے، کامیاب کتابوں پر ادیبوں کو لاکھوں ڈالر رائلٹی ملتی ہے۔ شاعروں کو فی سطر ایک ڈالر سے پانچ ڈالر ملتے ہیں۔ سویت یونین اشترا کی ملک ہے لیکن وہاں اتنی کتابیں بکتی اور پڑھی جاتی ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کو لاکھوں روبل رائلٹی میں ملتے ہیں۔ میں نے روس کے ایک مشہور ناول نگار سے پوچھا کہ اتنی رائلٹی کا آپ کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ شروع شروع جوانی میں سُوٹ خریدنے کا شوق ہوتا ہے۔ پھر وہ سوٹ پہننے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ ہمارے مُلک میں سادہ لباس ہی مقبول ہے۔ دوستوں کی دعوتیں کرتے ہیں۔ شراب لُنڈھاتے ہیں۔ پھر خوب صورت چیزیں خریدتے ہیں۔ اُن سے جب گھر بھر جاتا ہے تو مضافات میں ایک 'ڈاچا' خرید لیتے ہیں۔ جس کی اجازت ہے۔ اُس کی سجاوٹ اور آرائش پر پیسہ بے تحاشا خرچ کرتے ہیں۔ پھر بھی رائلٹی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اخیر میں تنگ آ کر گورنمنٹ سے درخواست کرنی پڑتی ہے کہ وہ رائلٹی 'بحق سرکار ضبط' کر لے۔

ہندوستان میں بدشوقی، غُربت اور پندرہ سولہ زبانیں ہونے کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت (سوائے ملیالم اور بنگالی کے)، اردو ہزار کے ایڈیشن میں ہوتی ہے۔ ہندی کی پاکٹ بکس البتہ

بیس پچیس ہزار بک جاتی ہیں مگر اُن کے لیے خاص طور سے سوسوا سو صفحے کے ناول لکھنا پڑتے ہیں، وہ بھی کچھ جاسوسی، کچھ رومانی اور مار دھاڑ سے لبریز، فلمی ٹائپ کے۔ سنجیدہ کتابوں اور ٹھوس نفسیاتی ناولوں کے لیے تو یہی بہت ہے کہ چھپ جاتے ہیں۔

تب ہی تو ہندوستان میں افسانہ کے فن نے زیادہ ترقی کی ہے۔ کیونکہ افسانہ ایک اتوار کو یا 'ویک اینڈ' میں لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں سوموار سے لے کر سنیچر تک ادیب کو کچھ اور کرنا پڑتا ہے۔ اسپتال میں ڈاکٹر، ڈاک خانے یا ریلوے میں ملازمت۔ ریڈیو میں کام، وکالت، پروفیسری یا پھر فلم میں ڈائیلاگ لکھنے پڑتے ہیں۔ اتوار کو ادبی کام کرنے کی چھٹی ملتی ہے۔ پھر بھی ہر سال اتنے (اور اتنے اچھے) افسانے لکھے جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ تقریباً سب 'فن برائے فن' کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل ادیب اور مصنف صرف ہندوستان میں ملتے ہیں۔

ٹیگور اور ٹالسٹائے کیسے، باوجود اپنے ملک کے افلاس اور بدشوقی کے معرکتہ الآرا ناول لکھ پائے؟ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں گیہوں روپے کا بیس سیر بکتا تھا۔ کاغذ روپے کا ایک ریم ملتا تھا۔ اور یہ دونوں عالمگیر شہرت کے مالک کسی قسم کے اقتصادی مشکلوں میں نہیں پڑے تھے۔ گھر کی جائیداد کافی تھی۔ زمینداری سسٹم کی فارغ البالی تھی جس نے اِن دو ترقی پسندوں کو اطمینان اور شانتی سے اپنی کتابیں لکھنے کا موقع دیا، جن کو پڑھ کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوانوں کو انقلاب کی تحریک ہوئی۔ ورنہ پریم چند جو اپنے زمانے کے بہترین افسانہ نگار اور ناولسٹ تھے آخیر وقت تک بہت تنگی سے بسر کرتے رہے۔

'انقلاب' جیسا ناول لکھنے کے لیے (جس کا پس منظر ملک کی سیاست بلکہ انقلاب ہو) فرصت چاہیے جو مجھے نہیں تھی۔ فارغ البالی چاہیے جو مجھے حاصل نہیں تھی۔ ایک اچھا خاصا اسٹاف چاہیے، ریسرچ کرنے کے لیے جو میرے پاس نہیں تھا۔ پبلشر سے بہت معقول ایڈوانس چاہیے۔ جو مجھے ہندوستان میں نہیں مل سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے اگست 1942 کو یہ ناول لکھنا شروع کر دیا۔ ہڑتالوں اور اسٹرائیکوں کے دنوں میں میں نے اپنے ہیرو کے بچپن کے باب لکھے۔ جب چھٹی ملی (اتوار کی یا کوئی اور) تب ناول کو آگے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1949 تک یعنی سات برس

میں صرف تیرہ باب لکھ پایا۔ وہ بھی انگریزی میں...... پھر ایک مہینہ کی چھٹی لے کر میں اپنی (مرحومہ) بیوی سمیت راس کماری گیا۔ پورا صندوق بھر کر کتابوں، اخباروں اور تراشوں کو ساتھ لے گیا اور وہاں ایک کمرے میں جس کی کھڑکیوں میں سے تین طرف سمندر نظر آتا تھا رات دن ایک کر کے یہ ناول مکمل کیا۔

اِس کے بعد اس کی اشاعت کی اصل جدّ و جہد شروع ہوئی۔ چھ سو صفحے کا ناول کوئی چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ اس کو ڈیڑھ سے دو سو صفحے کا کردو تو پاکٹ بک میں چھاپ دیں گے۔ چار برس اس طرح گذر گئے۔ پھر مغربی جرمنی کے ایک ایجنٹ کا خط آیا۔ اُس کو ناول کا مسوّدہ بھیجا۔ اُس نے پبلشر سے بات کی۔ انھوں نے ناول کا جرمن ترجمہ چھاپنا منظور کیا۔ 1954 کے اخیر میں جب میں پہلی بار روس گیا تو مسودے کی ایک نقل ساتھ لیتا گیا۔ وہاں جا کر یونین آف رائٹرز کو ناول دیا۔ انھوں نے پبلشر کو دکھایا۔ انھوں نے پڑھا، پڑھوایا، پسند کیا اور کنٹراکٹ کر لیا۔ شرط مگر یہ لگائی کہ ہم 'انقلاب' نام نہ رکھیں گے کیونکہ اس نام کی کم سے کم سینکڑوں کتابیں اُن کے ہاں ہیں۔ انھوں نے نام رکھا 'سین اندی' یعنی 'ہندوستان کا بیٹا' اور یہی نام باقی سب سوویت زبانوں میں رکھا گیا۔ اگلے سال یعنی 1955 میں جرمن اور روسی ترجمہ شائع ہوا۔ (روسی زبان میں نوّے ہزار کا ایڈیشن شائع ہوا) تب جا کر بمبئی کے ایک پبلشر نے کہا کہ سو صفحے کم کردو تو ہم بڑی پاکٹ بک میں چھاپ دیتے ہیں۔ بادل ناخواستہ پچاس ساٹھ صفحے کم کیے۔ تب جا کر 1956 میں یہ ناول انگریزی میں ہندوستان میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن پانچ ہزار جلدوں کا تھا جو چند ماہ میں بک گیا۔ اس پر رائلٹی ملی ساڑھے سات سو روپے۔ چلیے ناول کو ٹائپ کرانے کا خرچہ تو نکل آیا۔ بعد کے سالوں میں اس کے پانچ پانچ ہزار کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ (کُل ملا کر دو ہزار دو سو پچاس روپے ملے) مگر کم سے کم پندرہ ہزار نوجوانوں نے اسے پڑھا۔ (ممکن ہے ایک ایک کاپی ایک سے زیادہ لوگوں نے پڑھی ہو) اور اُن کے خطوں سے معلوم ہوا کہ اُن میں سے اکثر نے اوّلین قومی تحریک کے بارے میں (اور اس کا اثر نوجوانوں کے کردار پر) صرف اِس ناول کے ذریعے جانا۔ یہ ایک کتاب کے لیے اور اس کے لکھنے والے کے لیے — بہت بڑا انعام ہے۔

1958 میں یہ ناول سوویت یونین کی یوکرنین زبان میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن پندرہ ہزار کا چھپا۔ دوسرا ایڈیشن جو پچھلے سال چھپا ہے پچاس ہزار کا ہے۔

1958 ہی میں یہ ناول سوویت یونین ہی کی آذربائی جانین زبان میں شائع ہوا۔ جو مختصر سے علاقے کی زبان ہے۔ (تعداد اشاعت پندرہ ہزار)

1959 میں چیکوسلوواکیہ کی سلوواکین زبان میں شائع ہوا۔ (تعداد اشاعت تین ہزار)

1960 میں سوویت قزاقستان کے ایک ادیب ساتھی ہندوستان تشریف لائے اور ایک کاپی قزاق ترجمے کے ساتھ لیتے آئے جو 1959 میں وہاں شائع ہوا تھا۔ قذاق ایک نئی زبان ہے جو بہت کم لوگ بولتے ہیں۔ (تعداد اشاعت چھ ہزار)

1961 میں ہندی زبان میں میرے دوست اور بہنوئی منیش نرائن سکسینہ نے جو ہندی کے مستند ادیب اور مترجم ہیں، اُس کا ترجمہ کیا اور راجپال اینڈ سنز نے شائع کیا۔ (تعداد اشاعت دو ہزار)

جب سے کوشش کرتا رہا کہ اُردو کا کوئی پبلشر اس ناول کو چھاپنے کو راضی ہو جائے لیکن لوگ اس کی ضخامت دیکھتے ہی 'نہیں' کہہ دیتے تھے۔ پڑھنے کی تکلیف کسی نے نہ کی۔ جب کوئی تیار نہ ہوا تو اپنے اکسٹھویں سال میں میں نے اس کی خود کتابت کرائی، خود چھپوایا، اپنے خرچ سے خود شائع کیا۔ (تعداد اشاعت: ایک ہزار!!!) دیکھیں کتنے برس میں یہ بکے گا۔

اپنے سکریٹری عبد الرحمٰن اور اسسٹنٹ وحید انور صاحب کا میں ممنون ہوں جنھوں نے مہینوں اس کا مسودہ تیار کرنے اور صاف کرنے میں میری مدد کی اور خوشنویس محمد عبد الرحمٰن صاحب کا جنھوں نے بہت کم وقت میں اس کی کتابت کر دی اور دھاریہ اینڈ کمپنی کا جنھوں نے کاغذ اُدھار دے دیا۔ اور اپنے دوست سردار جعفری صاحب کا شکریہ جن کی مہربانی اور مدد سے یونیورسل لیتھو پریس بمبئی میں چھپ کر یہ ناول آخر کار میری اپنی زبان میں سب سے اخیر میں شائع ہو رہا ہے......

خواجہ احمد عباس

فہرست

کتاب پہلی: بادل گھر کر آتے ہیں

1- حوریں اور کبوتر

2- سڑکِ اعظم

3- موت سے ملاقات

4- ساری دنیا سے اوپر!

5- دیا جلے ساری رات

کتاب دوسری: طوفان کی آمد آمد

6- سسرال

7- سمندر میں ایک قطرہ

8- کاہے کو بیاہی بدیس؟'

9- اور خدا سوتا رہا......

10- قیدِ غم

کتاب تیسری: بادل کی گرج، بجلی کی کڑک

-11 ہلال اور تاج

-12 دردِ بے دوا

-13 سنہری ناگن

-14 پیار کا پھندا

-155 انقلاب زندہ باد

کتاب چوتھی: طوفان اور طوفان کے بعد

-16 کھلی سازش

-17 انوکھا سفر

-18 جب شیر بھوکا ہوتا ہے

-19 دُنیا کا خاتمہ؟

-20 کہاں ہے منزل تیری؟

کتاب پہلی

بادل گھِر کر آتے ہیں

حوریں اور کبوتر

(1)

مولوی صاحب کی رُعب دار داڑھی پر جب بھی انور کی نظر پڑتی وہ حیرت سے اُسے دیکھتا رہ جاتا۔ اُس سفید اور لمبی داڑھی پر جب جمنا کے کنارے کی صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگتے تو وہ عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتی۔ کبھی ابابیل کی دُم کی طرح نوکیلی ہو جاتی اور کبھی اُڑتے ہوئے کبوتر کے پروں کی طرح پھیل جاتی۔ کبھی تو اتنی خاموش رہتی جیسے کوئی بلّی سو رہی ہو اور کبھی سڑک کے اُس آوارہ کُتے کی طرح بپھر جاتی جس سے پاس پڑوس کے سارے بچّے ڈرتے تھے۔ جب ہوا کے تیز جھونکے سے اُن کی داڑھی پنکھے کی طرح پھیل جاتی، اُس وقت اسے سنبھالنے میں بوڑھے مولوی صاحب کی جو حالت ہوتی اُسے دیکھ کر بہت مزا آتا کیونکہ اُس وقت وہ بچّوں کو قرآن ٹھیک سے یاد نہ کرنے کے لیے ڈانٹنا بھول جاتے تھے۔

انور جھوم جھوم کر قرآن کی آیتیں پڑھتا رہتا تھا اور بار بار انھیں دُہراتا رہتا تھا۔ کیونکہ قرآن رٹ لینا بہت ثواب کا کام تھا چاہے عربی کا ایک لفظ بھی سمجھے بِنا اُسے طوطے کی طرح ہی کیوں نہ رٹ لیا جائے۔ مولوی صاحب بچّوں کو یہ بتانا کبھی نہ بھولتے تھے کہ یہ جنّت میں پہنچنے کا سب سے سچّا راستہ ہے اور جو بچّے شریر ہوتے تھے اور دھیان دے کر قرآن نہیں پڑھتے تھے، یا

مولوی صاحب کا ادب نہیں کرتے تھے اُن کو صاف بتا دیا جاتا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں گے جہاں بے حد گرمی پڑتی ہے، دلّی کی مئی جون کی گرمی سے بھی زیادہ۔ انور کو گرمی سے سخت نفرت تھی کیونکہ اس موسم میں ہر وقت پسینہ ٹپکتا رہتا تھا اور دوپہر میں باہر نکلنے سے لُو لگ کر مر جانے کا ڈر رہتا تھا۔ پر اِس گرمی کی کچھ اچھائیاں بھی تھیں گرمی میں ٹھنڈا شربت پینے کو ملتا تھا۔ برف میں لگی ٹھنڈی میٹھی ملائی کی قُلفیاں کھانے کو ملتی تھیں لیکن جب بھی انور برف کی قُلفی کھاتا تھا اُس کا گلا دُکھنے لگتا تھا اور اسے کھانسی زکام ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اس کے باپ نے اُسے نہ صرف قُلفی کھانے سے بلکہ برف کا ٹھنڈا پانی تک پینے سے منع کر رکھا تھا اور اِن چیزوں کا شوق چوری چھپے نہیں پورا کیا جا سکتا تھا۔ انور اپنے من میں سوچتا کہ کُل ملا کر دیکھا جائے تو جنّت میں جانا ہی اچھا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت موسم ٹھنڈا رہتا ہے، دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، حوریں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں اور پیڑوں پر چڑیاں گاتی رہتی ہیں۔

آخر یہ حوریں کون ہوتی ہیں؟ انور کے من میں یہ سوال کئی بار اُٹھا تھا، پر آٹھ برس کے اُس بچّے کا دماغ اس سوال کا کوئی جواب نہ ڈھونڈ سکا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کس طرح کی عورتیں ہوتی ہیں؟ کیا وہ پھوپھی اماں کی طرح ہوتی ہیں؟ انور کی پھوپھی بیوہ تھیں اور اُن کے کوئی بچّہ نہیں تھا اور بچپن میں ہی جب انور کی ماں مر گئی تھیں تو پھوپھی اماں نے ہی انور کو پالا پوسا تھا۔ اُن کے سفید بال بہت خوب صورت تھے۔ وہ ہر وقت سفید کپڑے پہنتی تھیں اور بہت کم بولتی تھیں، یا یہ حوریں گلابو کی طرح ہوتی ہیں، اُس موٹلی کالی نوکرانی کی طرح جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی لیکن جو کھانا اتنا اچھا پکاتی تھی کہ اس کا نام یاد آتے ہی انور کے منہ میں پانی بھر آتا تھا؟ انور نے اپنی زندگی میں اِن ہی دو عورتوں کو اچھی طرح جانا تھا اور وہ ان میں سے کسی کو بھی اٹھکھیلیاں کرنے والی حوریں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یا وہ اُن دوسری عورتوں، جیسی ہوتی ہیں جن کی انور نے بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔

انور گا گا کر قرآن پڑھتا رہا اور جھومتا رہا لیکن اُن دوسری عورتوں کی بات سوچتے ہی اس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دن وہ لال کنویں کی کسی دُکان سے اپنے ابا کے ساتھ دریا گنج میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اُس کے باپ کا قد بہت لمبا تھا اور اُسی حساب

سے اُن کی ٹانگیں بھی لمبی تھیں۔ انور کو اُن کے ساتھ چلنے کے لیے بیچ بیچ میں بھاگنا پڑتا تھا۔ لال کنویں سے وہ حوض قاضی پہنچے اور وہاں سے بائیں ہاتھ چاوڑی بازار میں مُڑ گئے۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ لوگ دُکانیں بند کر کے گھر جا چکے تھے لیکن بازار میں کافی چہل پہل تھی۔ جگہ جگہ پھول بار والے' لے لو پھول چنبیلی کے' کی آوازیں لگا کر چنبیلی کے گجرے بیچ رہے تھے۔ انور اور اُس کے ابا کو چھوڑ کر بازار میں کسی کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ سب لوگ نہایت اطمینان سے چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مار کر کچھ اشارے کر رہے تھے۔ دکانوں کے اوپر والے چھجوں پر کوئی ایسی چیز تھی جس میں سب کو دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ انور کی آنکھیں بھی اپنے آپ اوپر اٹھ گئیں اور وہاں اس نے ہر چھجے پر ایک عورت کھڑی دیکھی۔ یہ عورتیں نہ تو پھوپھی اماں جیسی تھیں نہ گلابو جیسی۔ وہ رنگ برنگے کپڑے پہنے تھیں۔ لال، ہرے اور نیلے جنھیں دیکھ کر انور کا جی بہت خوش ہوا۔ اُن کے گال گلابی تھے، ہونٹوں پر بھرپور لالی تھی اور کالے بال تیل سے چکنے اور بہت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ ہر عورت کے پاس لٹکی ہوئی لالٹین اُس کے روپ کو چار چاند لگا رہی تھی اُن کی ایک جھلک دیکھ کر ہی انور کو ایسا لگا کہ وہ جتنے لوگوں کو جانتا ہے اُن سب سے یہ الگ قسم کی ہیں اور اُنھیں زندگی کا کوئی راز، کوئی ایسا انوکھا بھید معلوم ہے جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا پر اُسے ایسا لگا کہ بازار میں رنگیلوں اور بےفکروں کی اس بھیڑ کا ہر آدمی اس بھید کو جانتا ہے۔ وہ اپنے ابا سے ان عورتوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا پر اس کی ہمت نہیں پڑی، کیونکہ اس کے ابا یوں تو اُس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتے تھے اور اس کی کسی بھی بات پر جھنجھلاتے نہیں تھے پر انھوں نے اپنے بیٹے کو اوپر کی طرف نظریں ڈالتے دیکھ کر بڑی رُکھائی کے ساتھ اُس سے کہا تھا کہ بازار میں چلتے وقت کوٹھوں کی طرف دیکھنا شریفوں کا کام نہیں ہے۔ اس کے بعد باقی راستہ دونوں نے چُپ چاپ طے کیا اور انور کی پھر اُوپر نظر اُٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انور کے ابا نے اُس دن کے بعد سے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ جب بھی اُن کا بیٹا ساتھ ہوتا تو وہ بلّی ماران اور چاندنی چوک کا چکّر لگاتے ہوئے زیادہ لمبے راستے سے گھر لوٹتے تھے۔

(2)

کوو۔ووو! کوو۔ووو! ہا آ! ہا آ!

کبوتر بازوں کی اس جانی پہچانی آواز میں، انور اور اس کی بہن انجم کی ایک بندھی ہوئی دُھن سے قرآن رٹنے کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ انجم انور سے دو برس بڑی تھی اور اُس کے پاس ہی بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ کبوتر بازوں کی آواز سن کر انور کا دھیان ٹوٹ گیا۔ وہ کبوتروں کے اُڑتے ہوئے جھنڈ کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں اُن دوسری عورتوں کے بارے میں جو تھوڑی بہت دلچسپی تھی اسے بھی بھول جاتا تھا۔ انور کے ابا کو کبوتر بازی سے بھی سخت نفرت تھی۔ اُن کی رائے میں یہ دلّی کے اُن رئیس زادوں کا شوق تھا جن کے دن اب پورے ہو چکے تھے اور اُن کی رئیسی ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو کتنی ہی بار بتایا تھا کہ اس طرح کی چیزوں کی وجہ سے مغلوں کی سلطنت مِٹ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا پتنگ بازی یا کبوتر بازی جیسے فضول شوقوں میں وقت خراب کرنے کی بجائے کُشتی اور کبڈّی میں اور ڈنڈ بیٹھک کی قسم کی کسرت میں دلچسپی لے جو مردوں کے کھیل ہیں اور جن سے تندرستی بنتی ہے۔ انور کو اپنے ابا کی بات پر پورا یقین تھا، پر اس کی تندرستی کبھی بھی اتنی اچھی نہیں رہی کہ وہ ان کھیلوں میں حصہ لے سکے جو اس کے ابا بتاتے تھے۔ کیونکہ اُن سب میں بہت دَم دار آدمی کی ضرورت ہوتی تھی اور پھوپی اماں اس بات کے لیے کبھی بھی تیار نہ ہوتی تھیں کہ اُن کا لاڈلا بھتیجا اکھاڑے میں جمع ہونے والے آس پاس کے سنڈوں سے اپنی ہڈّیاں تڑوائے۔ جہاں تک کبوتر بازی اور پتنگ بازی کا سوال تھا انور کو یہ دونوں ہی چیزیں بہت پسند تھیں لیکن وہ اس بات کو اپنے ابا سے چھپاتا تھا کیونکہ وہ بہت ہی سخت آدمی تھے اور ان سب بری لتوں سے اپنے بیٹے کو کوسوں دور رکھنا چاہتے تھے۔ رنگ برنگی پتنگیں کتنی بھلی لگتی تھیں اور آسمان پر پہنچ کر وہ کس ادا سے کبھی اونچی چڑھ جاتی تھیں اور کبھی نیچے آجاتی تھیں لیکن کبوتروں سے تو انور کو اور بھی زیادہ لگاؤ تھا۔ پتنگ تو صرف اتنی ہی اونچی جا سکتی تھی جتنی لمبی ڈور ہو اور انگلی کے ایک اشارے سے اُس کا رخ موڑا جا سکتا تھا یا اُونچا نیچا کیا جا سکتا تھا اور جب بھی پتنگ باز کا دل چاہے اُسے نیچے اُتار سکتا تھا لیکن کبوتر اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتے تھے۔ وہ اپنے اڈّے پر سے ایک بادل کی طرح اُڑتے تھے اور ان

کا سایہ ایک چھت سے دوسری چھت پر ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہتا تھا اور پھر وہ آسمان پر بہت اونچے اڑ جاتے تھے جہاں تک کہ دور اُفق پر صرف ایک دھبّہ جیسا دکھائی پڑتا تھا۔ وہ کہاں جاتے تھے؟ وہ بہت دور جن انجانے ملکوں میں جاتے تھے وہاں وہ کیا دیکھتے تھے؟ وہ کیا تجربے اور یادیں لے کر واپس لوٹتے تھے؟ انور جب بھی کبوتروں کو اُڑتا ہوا دیکھتا وہ دل ہی دل میں ان سوالوں پر غور کرتا رہتا۔ گلابو سوتے وقت اُسے وہ کہانیاں سناتی تھی۔ اُن میں کی اگر کوئی پری اس سے کبھی یہ پوچھتی کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے تو انور یہی کہتا۔ 'کبوتر۔'

لیکن فوراً ہی کبوتر بازوں کی اس 'کود۔ ووو۔ ہا آ۔ کود۔ ووو۔ ہا آ' کے پیچھے سے ایک نئی آواز سنائی دی۔ شہد کی مکھیوں کی گُنجن جیسی ایک ہلکی سی منمناہٹ۔ بہت دور پورب کی طرف جمنا کے اُس پار ایک اکیلا کبوتر آسمان پر اُڑ رہا تھا، شاید اپنے جھنڈ سے بچھڑ کر پیچھے رہ گیا تھا لیکن جیسے جیسے وہ اُڑ کر پاس آتا گیا اس کی آواز تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ شہد کی مکھی کی تیز سے تیز آواز سے بھی زیادہ تیز ہوگئی۔ یہ کبوتر دوسرے کبوتروں سے بالکل الگ تھا کیونکہ وہ اپنے پَر نہیں پھڑ پھڑاتا تھا۔ وہ سیدھا اڑتا چلا آ رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے وہ بڑے سے بڑے کبوتر سے بھی بڑا ہو گیا۔ وہ تو باز سے بھی بڑا ہو گیا اور جب وہ انور کے سَر پر سے ہو کر گذرا تو اسے ایسا لگا کہ وہ الف لیلہ کی سند باد جہازی والی کہانی کے اُس عقاب سے بھی بڑا تھا جس کے بارے میں گلابو نے اسے بتایا تھا۔

اس انوکھے کبوتر کو دیکھ کر انور اور انجم کو اتنی دلچسپی ہوئی کہ وہ قرآن کی رٹائی چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی اور تعجب سے تالیاں بجانے لگے۔ مولوی صاحب جو بچّوں کی قرآن پڑھنے کی سدھی ہوئی دُھن کی لوریاں سنتے سنتے اونگھ گئے تھے، یکا یک چونک کر جاگ گئے۔

'یہ کیا ہو رہا ہے؟' انھوں نے بناوٹی غصّے کے ساتھ ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اتنے موٹے اور نرم دل کے بوڑھے آدمی کے لیے غصے میں اپنی طاقت خرچ کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ 'میری آنکھ ذرا سی جھپکی نہیں کہ تم دونوں کا دھیان اپنے سبق کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔'

وہ بڑا سا کبوتر اڑتا ہوا قطب مینار کی طرف چلا گیا تھا اور اب وہ دور آسمان پر ایک دھبّے جیسا دکھائی دے رہا تھا حالانکہ انور جو کچھ پڑھتا تھا اس کا مطلب وہ بالکل ہی نہیں سمجھتا تھا اور

اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ دنیا کی ایک بہت پُرانی اور خوب صورت زبان کی اعلیٰ درجے کی شاعری پڑھ رہا ہے۔ پھر بھی انور کو ان لفظوں کا تلفظ بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ جب ان لفظوں کا تلفظ مولوی صاحب کے بتائے ہوئے طریقے سے کیا جاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ زبان سے الفاظ نہیں بلکہ گاڑھا شہد ٹپک رہا ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو صحیح ڈھنگ سے پڑھ سکنا سچ مچ ایک بہت بڑا کمال تھا اور جب بھی انور ان کا تلفظ صحیح صحیح کر لیتا تھا تو اسے بے حد خوشی ہوتی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس نے کوئی طاقت حاصل کر لی ہے۔ لفظوں پر انسان کی زبان کی انوکھی اور رُعب دار طاقت۔

(3)

جس وقت انور کمرے میں آیا وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور کئی آدمی ایک ساتھ بول رہے تھے۔ انور اپنے ابا سے بڑے سے کبوتر کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ جو اس نے آسمان پر اُڑتا ہوا دیکھا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور گھبرا کر سوچنے لگا کہ کسی نے اسے دیکھا نہ ہو۔ جب بھی وہ اپنے ابا کے اتنے بہت سے دوستوں کو ایک ساتھ دیکھتا تھا تو نہ جانے کیوں گھبرا سا جاتا تھا۔ وہ اُن سب کو جانتا تھا اور الگ الگ وہ سب اسے بہت اچھے لگتے تھے پر جب وہ ایک ساتھ ہوتے تھے تو اُسے اُن سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ اسے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب مل کر ایک ایسی بھیانک طاقت بن گئے ہیں جو ایک شرمیلے اور دبو لڑکے کی سنجیدگی اور شرماہٹ کی دیواروں کو ڈھا دینے پر تُلی ہوئی ہو۔

باہر برآمدے میں بانس کی گہرے ہرے رنگ کی چلمنیں پڑی تھیں تا کہ سورج کی تیز روشنی اندر نہ آسکے۔ گرمیوں میں بھی دوپہر کے وقت کمرہ اندر سے بہت ٹھنڈا اندھیرا اور آرام دہ رہتا تھا۔ چونکہ انور سیدھا چھت پر سے آیا تھا جہاں بیٹھ کر مولوی صاحب ہمیشہ قرآن پڑھاتے تھے۔ اس لیے کمرے میں گھستے ہی پہلے تو اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ دھیرے دھیرے اسے اندھیرے میں کچھ شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ فرش پر بچھی ہوئی سفید چاندنی، دیوار کے سہارے لگے ہوئے سفید گاؤ تکیے ایسے لگ رہے تھے جیسے بنا سر اور بنا ٹانگوں کے موٹے موٹے بچھڑے دیوار سے لگے بیٹھے ہوں اور ان کا سہارا لیے ہوئے اسے اپنے ابا اور ان کے دوستوں کے سفید پوش جسم دکھائی دیے۔

انور اپنے ابّا کو بے حد پیار کرتا تھا بلکہ من ہی من میں اُن کی پرستش کرتا تھا۔ انور کے ابّا اکبر علی کا قد لمبا تھا اور وہ اس طرح تن کر کھڑے ہوتے تھے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ پچاس برس کے ہیں۔ اُن کا رنگ گورا اور چہرے پر کچھ گلابی پن تھا۔ چھوٹی سی کالی داڑھی سے اُن کے چہرے کا رُعب دُگنا ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بُراق کپڑے پہنتے تھے اور صفائی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ نہ صرف جسمانی صفائی بلکہ ذہنی بھی۔ اُن کے دوست اور کاروبار میں اُن کے ساتھی اُن سے محبت کرتے تھے اور ان پر پورا اعتبار رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے نے دیکھا تھا کہ ایک بار ایک بیوپاری اُن کے پاس بیس ہزار روپے امانت رکھ گیا تھا اور لاکھ کہنے پر بھی اس نے رسید نہیں لی۔ 'کمال کرتے ہو اکبر علی' رسید کیا تمھاری زبان سے بڑھ کر ہے۔ اُس بیوپاری نے کہا تھا اور یہ دیکھ کر بیٹا' جس کے سامنے یہ سودا ہوا تھا' فخر سے پھولا نہیں سمایا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی تھی۔ 'یا خدا، مجھے بھی میرے ابّا جیسا بنانا۔'

اکبر علی کے پاس ہی لالہ رامیشور دیال بیٹھے تھے جو بیوپار میں اُن کے ساجھے دار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بیوپار میں ساجھے دار ہونے سے بھی بڑھ کر بہت کچھ تھے۔ وہ اکبر علی کے سب سے پُرانے دوست تھے۔ دونوں اسکول میں ساتھ پڑھے تھے اور انور نے اکثر دیکھا تھا کہ دونوں اُس زمانے کی شرارتیں یاد کر کر کے کتنا خوش ہو کر ہنستے تھے۔ رامیشور دیال کا قد چھوٹا اور اُن کے چہرے کا رنگ پیلا تھا۔ بہت ہی نیک طبیعت کے آدمی تھے۔ اور خاص طور پر انور پر تو بہت مہربان تھے۔ ان کی عادت تھی کہ باتیں کرتے کرتے اپنی آستینیں چڑھا لیتے تھے اور فرش پر پالتی مار کر بیٹھے بیٹھے اپنے بائیں تلوے کو تھپکتے رہتے تھے۔ اُن کے کُرتے کے سونے کے بٹن اُس اندھیرے کمرے میں چمک رہے تھے۔ سونے کے اُن بٹنوں کو دیکھ کر انور کا جی بہت للچاتا تھا اور ایک بار رامیشور دیال نے جنھیں انور کا کا کہتا تھا' کہا تھا کہ وہ اسے سونے کے بٹن بنوا دیں گے لیکن اکبر علی نے بڑی سختی کے ساتھ یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ سونے کے بٹن بیکار کی چیز ہیں اور ابھی سے انور کو اگر ان کا شوق پیدا ہو گیا تو وہ بگڑ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ سونے کے بٹنوں کا شوق رکھنے والا نکمّا رئیس بنے۔

کمرے میں دو آدمی اور تھے۔ ایک تھے حکیم عبدالرشید جن کا پیشہ تو حکیمی کرنا تھا پر طبیعت

میں شاعری بسی ہوئی تھی اور وہ 'بیدل' تخلص سے غزلیں کہتے تھے۔ وہ بہت ہی نازک طبیعت کے آدمی تھے۔ ہر وقت کپڑوں سے عطر کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ لگا تار پان چباتے رہتے تھے اور بات بات میں غالب، میر اور ذوق کے شعر دہراتے رہتے تھے۔ دوسرے تھے چودھری محمد عمر جن کی طبیعت حکیم بیدل سے بالکل اُلٹی تھی۔ وہ بہت لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ مزاج میں شاعری چھو بھی نہیں گئی تھی لیکن کاروبار کے معاملے میں بہت تیز تھے۔ کئی برس پہلے پنجاب سے آئے تھے اور بہت چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کر کے انھوں نے چینی اور ایلومونیم کے برتنوں کا بہت بڑا کاروبار کھڑا کر لیا تھا۔ وہ بہت پڑھے لکھے نہیں تھے اور اکثر حکیم بیدل کی باتوں کی باریکی اور اُن کے شعر چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ لیکن اکبر علی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور وہ اکثر انور سے کہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو محمد عمر کی طرح تجارت کا رستہ اپنانا چاہیے کیونکہ تجارت کے ذریعے ہی آدمی اور قومیں دنیا میں ترقی کر سکتی ہیں۔ وہ کہا کرتے 'انگریزوں کو دیکھو صرف تجارت کے بل پر وہ دنیا کے مالک بن بیٹھے ہیں۔'

(4)

انور کونے میں بیٹھا ان بڑے لوگوں کی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج کی بات چیت میں ہمیشہ سے زیادہ گرمی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ کس چیز کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ اُس کے کان میں بار بار کچھ ایسے لفظ پڑ رہے تھے جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ جیسے 'رولٹ بل' 'مارشل لا' 'ہڑتال' 'کانگریس' 'مسلم لیگ' وغیرہ۔ ایک نام جو بار بار لیا جا رہا تھا وہ گاندھی جی کا نام تھا اور ہر شخص 'ستیہ گرہ' نام کی کسی چیز کے بارے میں جوش دکھا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے جب اس کی آنکھیں کمرے کے اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو اس نے وہاں پر جمع ہوئے لوگوں کو پہچاننا شروع کیا۔ اس کے کان بھی بات چیت کے رُخ کا ساتھ دینے لگے اور اس کا دماغ بحث کی کچھ بنیادی باتوں کو سمجھنے لگا۔ جیسے جیسے اس بات چیت میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی، انور اس عجیب چڑیا کو بالکل بھول گیا جس کے بارے میں وہ اپنے باپ سے پوچھنے آیا تھا۔ اب اس کے دماغ پر اس سے بھی عجیب عجیب اور اہم باتیں چھائی ہوئی تھیں۔

انور کو ایسا لگا کہ انگریز سرکار کا رویہ بہت خراب تھا۔ یوروپ میں 'چار سال کی بڑی لڑائی' ہوئی تھی اور ہندوستانیوں نے اس لڑائی کو جیتنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کے بدلے میں انھیں حکومت کے کام میں زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ لیکن اب لڑائی ختم ہو جانے کے بعد انگریز ان وعدوں کو بھول گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ لوگوں میں اس بات پر غصہ تھا اور کچھ لوگ اس کے بارے میں شور مچانا چاہتے تھے اور کچھ لوگ انگریزوں کو گولی سے اُڑا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا۔ اُدھر انگریزوں نے ایک نیا قانون بنایا تھا۔ جس کا نام 'رولٹ بل' تھا اور اس قانون میں سرکار کے خلاف کوئی بات کہنے یا کوئی کام کرنے کے لیے بہت سخت سزا رکھی گئی تھی۔ گاندھی نام کا کوئی آدمی جو ابھی تک بہت دور جنوبی افریقہ میں بیرسٹری کرتا تھا، لوٹ کر ہندوستان آیا تھا۔ اپنے ملک کے باشندوں کو 'ستیہ گرہ' کے ہتھیار کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے سرکار کے خلاف کامیابی کے ساتھ لڑا جا سکتا ہے۔ اکبر علی اور اُن کے دوستوں کو بھی 'ستیہ گرہ' کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ رامیشور دیال نے گاندھی کا لکھا ہوا کوئی مضمون پڑھا تھا اور انھیں تھوڑا بہت معلوم تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ شاید مضمون لکھنے والے کا مطلب یہ تھا کہ اگر سب لوگ بے انصافی کے قانونوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو سرکار اُن قانونوں کو واپس لینے پر مجبور ہو جائے گی اور پھر انگریزوں کو گولی سے اُڑانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی۔ دراصل ایسا لگتا تھا کہ یہ آدمی گاندھی کسی کو جان سے مارنے کے بالکل خلاف تھا۔ یہاں تک کہ بے انصاف اور ظالم انگریز افسروں کو بھی نہیں۔ انور اِن باتوں کا پورا مطلب تو نہیں سمجھ پایا۔ پر دو باتیں خود بخود اسے بہت اچھی لگیں ایک تو سرکار کے نا انصافی کے قانونوں کو نہ ماننا اور دوسرے کسی کو بھی جان سے نہ مارنا۔ انور کے ابا نے اسے سکھایا تھا کہ سچے مسلمان کے لیے بے انصافی کے سامنے سر جھکانا گناہ ہے۔ اپنے خاندان میں ہی اس کے دادا کی مثال تھی جو دلّی کے آخری بادشاہ کے دربار میں شاعر تھے۔ لیکن ایک بار اپنی کسی نظم میں انھوں نے بادشاہ اور ان کے درباریوں کی عیاشی کی زندگی کو بُرا بھلا کہنے کی گستاخی کی تھی اور اس کے لیے معافی مانگنے سے انکار کیا تھا جس کی سزا میں انھیں دربار سے الگ کر دیا تھا۔ اکبر علی اپنے باپ کے اس قصے کو بڑے فخر سے بیان کرتے کبھی

نہ تھکتے تھے اور انور کے دل میں بھی اپنے دادا مرحوم کے لیے بہت عزت ہوگئی تھی۔ کسی بھی جاندار چیز کو مارنے کے خیال سے ہی اُسے گھن آتی تھی۔ ایک بار اس نے گلابو کو باورچی خانے میں چوہا مارتے دیکھ لیا تھا تو اُس سے دو دن تک کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ کسی آدمی کو مارنا تو اس سے بھی خوفناک بات تھی۔ انور نے فیصلہ کیا کہ وہ معلوم کرے گا کہ آخر یہ آدمی گاندھی کون ہے؟

بحث ابھی چل ہی رہی تھی اور انور ابھی تک یہ پتہ لگا نہیں پایا تھا کہ اُس کے ابا گاندھی کے ان نئے خیالات سے متفق ہیں کہ اتنے میں گھر کا پُرانا نوکر فقیرا کمرے میں آیا اور اس نے اکبر علی کے ہاتھ میں ایک تار دیا۔ اپنے ابا کو تار کی رسید پر دستخط کرتے اور خاکی لفافہ پھاڑتے دیکھ کر انور کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ تار آنے پر اس کے دل میں ہمیشہ کھلبلی مچ جاتی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ خط اتنی جلدی کیسے آ جاتا ہے۔ کلکتے تک سے وہ چند گھنٹوں میں دلّی پہنچ جاتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ کیا یہ خط کبوتر لاتے ہیں۔ جس طرح گلابو کی پرانے بادشاہ والی کہانیوں میں لاتے تھے یا ان خطوں کو بڑا سا کبوتر لاتا تھا جسے اس نے صبح آسمان پر اُڑتے دیکھا تھا؟

تار آنے کا مطلب ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ ایک بار تار سے دس ہزار کمبلوں کا آرڈر آیا تھا۔ ایک بار اور تار سے اونی کپڑے کی ایک فیکٹری میں جہاں سے اکبر علی اور رامیشور دیال کا مال آتا تھا، آگ لگنے کی خبر آئی تھی۔ اکثر تار کا مطلب ہوتا تھا کوئی لمبا سفر — کانپور یا امرتسر یا کلکتے تک کا سفر۔ انور کا دل کتنا چاہتا تھا کہ وہ بھی اپنے ابا کے ساتھ ان جگہوں کے سفر پر جا سکے۔ وہ تمام انوکھی جگہوں کے سپنے دیکھا کرتا تھا جہاں اس کے ابا جایا کرتے تھے۔ پر یہ جگہیں بہت دور تھیں اور کسی لمبے سفر پر جانے کی اس کی خواہش ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

اکبر علی نے تار اپنے ساجھے دار کے ہاتھ میں دے دیا۔ رامیشور دیال نے اپنی عادت کے مطابق اسے بڑے دھیان سے دھیرے دھیرے پڑھا۔

'اِس کا مطلب ہے کہ آپ کو امرتسر جانا پڑے گا۔ رامیشور دیال نے تار اکبر علی کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اکبر علی نے تار کو موڑ کر لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

تو یہ بات تھی، ابا امرتسر جا رہے ہیں۔ انور کے دل کو بڑی تسلّی ہوئی اور اس کے دل میں جو ایک عجیب سی تشویش تھی وہ دور ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوتا تھا انور نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اللہ میاں سے دعا مانگی۔ 'یا اللہ میاں، کچھ ایسا کیجیے کہ ابا مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ اللہ میاں بس میری یہ مراد پوری کر دیجیے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کبھی کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ میں ابا کا اور پھوپی اماں کا اور مولوی صاحب کا کہنا مانوں گا۔

لیکن اکبر علی، یہ وقت تمھارے لیے اس سفر پر جانے کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔ انور نے چودھری محمد عمر کو کہتے سنا اور اس نے آنکھیں کھول کر اللہ میاں کی طرف سے دھیان ہٹا کر وہاں پر جمع ہوئے لوگوں کی طرف دھیان دیا۔ پنجاب میں مارشل لا لگا ہوا ہے اور وہاں ہر آدمی کے لیے جان کا خطرہ ہے۔

'جی ہاں،' حکیم بیدل نے ہمیشہ کی طرح بہت دھیرے سے اپنی آواز کھینچ کر کہا۔ آسمان پر نحوست کے بادل گھر رہے ہیں اور زمانہ بہت خراب ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔

'جانے بھی دیجیے کہ غالب نے کیا کہا ہے۔ اکبر علی نے اُن کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔ میں گھر پر عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھ سکتا اور بہر حال میں تو اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ میں وہاں کوئی سیاسی تحریک چلانے تو جا نہیں رہا ہوں پھر مجھے کچھ کیوں ہونے لگا؟'

'پھر بھی بھائی صاحب،' رامیشور دیال نے ہمّت کر کے کہا۔ رامیشور دیال یوں تو عمر میں اکبر علی کے برابر ہی تھے، پر وہ ہمیشہ انھیں اپنا بڑا بھائی مان کر صاحب کہتے تھے۔ اگر ذرا بھی خطرہ ہے تو میں تو یہی کہوں گا کہ آپ وہاں نہ جائیں۔'

رامیشور، نادانی کی باتیں نہ کرو۔ جب تک میں امرتسر جا کر ملوں کے ساتھ مال کا بندوبست نہیں کروں گا تب تک ہم اپنا یہ ٹھیکہ پورا نہیں کر سکتے۔ میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔

انور کو ابا کا اس طرح دوٹوک اپنا پکا ارادہ ظاہر کر دینا بہت پسند تھا۔ وہ کسی بات سے گھبرانے یا ڈرنے والے نہیں تھے۔ اگر کوئی کام کرنا ہوتا تھا تو وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے تھے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ انور کا دل ایک بار فخر سے بھر اُٹھا اور پھر اس کا فخر سے بھرا ہوا دل

زور سے دھڑکا۔ اُس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں اور خوشی کے مارے اس کے سارے بدن میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔

'انور' اس کے ابا نے اس کی طرف دیکھ کر پکار کر کہا۔

'جی ابا'

'میرے ساتھ امرتسر چلو گے؟' اور یہ کہہ کر وہ مسکرا دیے۔

یہ سوال اِس طرح اچانک اُس پر ٹوٹ پڑا کہ انور ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑا۔ وہ یہ سننے کے لیے بھی وہاں نہ رُکا کہ اکبر علی اپنے دوستوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ وہ اپنے آٹھ برس کے بیٹے کو اپنے ساتھ اس لیے لے جا رہے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ اسے دنیا کی خبر ہو، سفر کر کے اس کا نظریہ وسیع ہو اور وہ سور ما اور نِڈر بنے۔ انور بھاگ کر زنان خانے میں پہنچ چکا تھا اور اپنی بہن کے گلے سے لپٹ کر بے حد خوش ہو کر کہہ رہا تھا 'باجی انجم۔ میں امرتسر جا رہا ہوں۔'

(5)

گرمی کے دن تھے۔ رات کے وقت آسمان بالکل صاف تھا اور اُس پر لاکھوں ستارے اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح باجی انجم کا وہ گہرا نیلا کامدانی کا دوپٹہ جس پر سینکڑوں ستارے لگے ہوئے تھے اور جو انھوں نے عید کے دن پہنا تھا۔ انور گھر کے اندر والے آنگن میں پھوپھی اماں، انجم اور گلابو کے پاس سوتا تھا۔ وہ بستر پر آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ اس کی بوڑھی پھوپھی اماں دن بھر گھر کا کام کاج کرنے کے بعد تھک کر سو گئی تھیں۔ انجم بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ گلابو ہمیشہ کی طرح رات کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے پڑوس میں گپیں لڑانے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ صرف انور ستاروں کا ساتھ دے رہا تھا۔ آنے والے سفر کے خیال سے اس کے دل میں اتنی کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

رات کے سنّاٹے میں پُرانے بھاری پھاٹک کے قبضوں کے چوں چوں کی آواز سنائی دی اور انور نے گلابو کو اندر آتے دیکھا۔ گلابو نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہ کم سے کم آواز ہو دروازہ

بند کیا اور کنڈی چڑھادی۔ پھر وہ دبے پاؤں آکر اپنی چارپائی کی طرف بڑھی۔

'بوا گلابو' حالانکہ وہ نوکرانی تھی لیکن انور کو سکھایا گیا تھا کہ وہ اسے ہمیشہ عزّت کے ساتھ 'بوا' کہا کرے۔

'ہاں بیٹا، کیا بات ہے؟'

'مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔'

'تو تمھارا مطلب ہے کہ میں تمھیں کوئی کہانی سناؤں؟'

'ہاں بوا' میری اچھی بوا۔'

ایسا لگتا تھا کہ سارے ستاروں کی چمک اور بھی بڑھ گئی ہے جیسے وہ گلابو کی کہانی سننے کے لیے اور پاس آگئے ہوں۔ انور کو پکا یقین تھا کہ گلابو جیسی مزیدار کہانیاں سناتی تھی ویسی ستاروں نے کبھی نہ سنی ہوں گی۔

جیسے ہی گلابو اپنے بھاری ڈیل ڈول کے ساتھ انور کی چارپائی پر بیٹھی، چارپائی چرمرا اٹھی۔ شاید اسے گلابو کا وہاں بیٹھنا اچھا نہ لگا۔ گلابو نے منہ کا پان تھوک دیا اور کہانی کہنا شروع کیا۔ گلابو کی ہر کہانی ایک ہی طرح سے شروع ہوتی تھی اور انور کہانی کے شروع کے اِن لفاظ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

'سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا، نبی بادشاہ۔ ایک تھا بادشاہ......'

گلابو اسے جو بھی کہانی سناتی تھی وہ اسی طرح شروع ہوتی تھی۔ اس میں ہمیشہ ایک بادشاہ ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ اس کی اولادیں کتنی ہیں۔ کبھی اس کے سات بیٹیاں ہوتی تھیں۔ کبھی اس کے سات بیٹے ہوتے تھے۔ ایک کہانی میں اس کے تین بیٹیاں تھیں۔ اس کہانی میں اس کے صرف ایک بیٹا تھا۔

'بادشاہ اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتا تھا۔' گلابو اپنی نرم اور میٹھی آواز میں کہانی کہتی رہی۔ گلابو کا جسم جتنا بھاری بھرکم اور بدصورت تھا، اتنی ہی اس کی آواز میٹھی اور خوب صورت تھی۔ 'تو جب شاہزادہ اٹھارہ برس کا ہوا تو ایک دن بادشاہ نے اُسے بُلا کر ایک گھوڑا اور ایک تلوار دی اور

سمت معلوم کرنے کے لیے قطب نما دی۔'

'بیٹا جاؤ، جا کر دنیا کی سیر کرو۔' بادشاہ نے اس سے کہا 'اور خود دنیا کو دیکھو۔' اُس نے شہزادے کو ایک بات کے لیے منع بھی کیا۔ 'بیٹا مشرق جانا، شمال جانا، جنوب جانا مگر دیکھو مغرب کبھی نہ جانا کیونکہ اُدھر بہت بُرائی اور بہت خطرہ ہے۔' خدا حافظ کہہ کر بادشاہ نے اپنے بیٹے کو رخصت کیا۔

'سو شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر سفر پر نکل پڑا۔ پہلے وہ شمال کی طرف گیا۔ وہ گدڑیوں اور سیدھے سادے پہاڑی لوگوں کے ساتھ رہا اور اس نے دیکھا کہ انھیں اپنا پیٹ پالنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ آندھی طوفان اور برف کا کتنی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ پھر وہ جنوب کی طرف چلا۔

شمال کے برفیلے علاقوں کے بعد جنوب کا علاقہ اسے بہت ہرا بھرا دکھائی دیا اور وہاں کا موسم بھی اچھا تھا۔ خوب صورت گھاٹیوں میں ہو کر ندیاں بہہ رہی تھیں۔ کھیتوں میں چاول اور گیہوں کی فصل لہرا رہی تھی۔ پیڑ پھلوں سے لدے تھے اور زمین پر سے ناریل، آم اور امرود اٹھا کر ہی آدمی اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ وہاں جن لوگوں سے وہ ملا وہ بات بڑی نرمی سے کرتے اور گھر آئے مہمان کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ بہت کاہل اور سست بھی تھے۔ وہ اپنا کافی وقت ناچنے گانے میں اور اپنے جسموں کو قوس قزح کے ساتوں رنگوں میں رنگنے میں صَرف کرتے تھے۔

'اُس کے بعد شہزادہ مشرق کی طرف مڑا اور بہت بڑے بڑے شہروں میں جا پہنچا۔ وہاں کے بازار طرح طرح کی انوکھی چیزوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہاں کے مندروں پر سونے کے کلس تھے اور وہاں کے رئیس چاندی کی پالکیوں میں چڑھ کر جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ بڑے تہذیب والے تھے اور جن لوگوں سے وہ ملا اُن میں بڑے بڑے وِدوان اور ہزاروں برس پُرانا علم جاننے والے لوگ تھے۔'

'مشرق کا سفر پورا کر کے شہزادہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب صرف مغرب کی طرف جانا رہ گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے اُدھر جانے سے بالکل منع کر رکھا تھا لیکن اتنا گھومنے پھرنے کے بعد وہ

مغرب کی طرف جانے کو اتنا بے چین ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے باپ کی نصیحت نہ مان کر مغرب کا راز بھی معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور سوشہزادے نے اپنا تھکا ماندہ گھوڑا مغرب کی طرف موڑا۔ نہ جانے کتنی پہاڑیوں اور دُور تک پھیلے تپتے ہوئے ریگستانوں کے پار اُسے سفر کرنا پڑا۔ آخر میں شہزادہ آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرتا ہوا ایک خوفناک شہر میں پہنچا۔ یہاں اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ سچ مچ بہت بھیانک تھا۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے زنجیروں سے ایک بہت بڑی چکّی سے بندھے ہوئے تھے جسے وہ گھمار ہے تھے۔ اُن کے بیچ میں ایک بہت لمبا چوڑا دیو کھڑا ہوا تھا جس کا سر بادلوں کو چھورہا تھا اور جس کے پاؤں زمین میں بہت دھنسے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا اور جو کوئی بھی کام میں ڈھیل کرتا تھا اس کی پیٹھ پر وہ بڑی بے رحمی سے کوڑا مار دیتا تھا۔ اس چکّی کے پاٹوں سے، جو پہاڑ جتنے بڑے تھے، بہت بھیانک آواز نکل رہی تھی۔ شہزادے نے جب پاس جا کر چکّی کے پاٹوں کو دھیان سے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے، کیونکہ اس چکّی میں انسان پیسے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ دیو کچھ لوگوں کو اٹھا کر اس چکّی میں جھونک رہا تھا اور اس چکّی کو چلانے والے غلام سر جھکائے کولھو کے بیل کی طرح چکّر لگاتے جارہے تھے۔ ان کی بیڑیوں کی جھنکار چاروں طرف گونج رہی تھی، وہ خود اپنی تباہی کی چکّی کو روک نہیں سکتے تھے۔

'ان بے چارے بدنصیب لوگوں کو دیکھ کر شہزادے کا دل دہل گیا اور اس نے ترس کھا کر ایک آدمی کی زنجیریں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس آدمی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ بھائی، تم بیکار پریشان نہ ہو۔ ہم لوگ اس چکّی سے اُس وقت تک بندھے رہیں گے، جب تک آسمان پر ایک خاص لال ستارہ نہیں دکھائی دے گا۔ اُس ستارے کے دکھائی دینے کے بعد ہی ہم آزاد ہوں گے۔ تم جاؤ اور جا کر ہری آنکھ والے اژدہے کا پتہ لگاؤ اور اسے مار ڈالو کیونکہ وہ ہمارے بہت سے بھائیوں کو کھا گیا ہے۔

اور سوشہزادہ ہری آنکھ والے اژدہے کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں پریوں کا دل کو لبھانے والا باغ پڑا۔ ہوا میں سنگیت تھا۔ شراب کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ پیڑوں میں ڈالیاں سنہرے پھلوں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھیں اور چاروں طرف سے خوب صورت پریاں پکار

پکار کر اُس سے کہہ رہی تھیں، پردیسی تھوڑی دیر کے لیے ہمارے پاس اِس خوب صورت جگہ پر ٹھہر جاؤ۔ ایسی جلدی کیا ہے۔' لیکن شہزادہ جانتا تھا کہ یہ سب لالچ اُسے اِس لیے دیئے جا رہے ہیں کہ وہ جس کام کو پورا کرنے نکلا ہے اسے پورا نہ کر سکے۔ اس چکّی سے بندھے ہوئے غلاموں کی خوفناک تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اس لیے اس نے پریوں کو ایک طرف دھکیل دیا اور تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پریوں کے باغ کو پار کر گیا۔

لیکن اس کے بعد اُس کا راستہ خوف کی وادی سے ہو کر گزرتا تھا۔ جس پر جہالت کی کالی چھاؤں پڑ رہی تھی۔ جب وہ وہاں سے گزرا تو بھوتوں نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور چٹانوں سے بھیانک آوازیں نکل کر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اِن آوازوں نے چلّا کر کہا' واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے چنگل سے بچ کر آگے نہیں جا سکتے۔ ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔' ڈراؤنے راکشسوں نے آگ کے بھالوں سے اس پر حملہ کر دیا اور زور زور سے چلّا کر اس سے کہنے لگے' واپس لوٹ جاؤ، آج تک کوئی بھی اِس خوف کی وادی کو زندہ پار نہیں کر سکا۔ ہم تمھیں مار ڈالیں گے' لیکن شہزادے کو اُس کے باپ نے سکھایا تھا کہ خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا اور اس لیے شہزادے کو اُن سے ڈر نہیں لگا۔ اس نے تلوار کھینچ لی اور کلمہ پڑھ کر سب سے چلّا کر کہا' ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں انسان ہوں۔ انسان کی اولاد ہوں۔ میں ساری دنیا کا مالک ہوں۔' اور اس کا اتنا کہنا تھا کہ بھوت غائب ہو گئے اور ڈرانے والی خوفناک آوازیں سُنائی دینا بند ہو گئیں۔

چلتے چلتے شہزادے کو ہری آنکھ والا اژدہا ملا۔ اس کے پکھراج کی ہری ہری چمک دار آنکھیں اور سونے کی دُم تھی اور اس کا منہ بہت بڑا تھا۔ ہر بار جب وہ منہ کھول کر سانس لیتا تھا تو نہ جانے کتنے مرد، عورتیں اور بچے کھنچ کر اس کے منہ میں چلے جاتے تھے اور انھیں وہ زندہ نگل لیتا تھا۔ شہزادے نے تلوار کھینچی اور اژدہے پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا لیکن اس پر تلوار کا وار کرنے سے پہلے وہ کچھ سوچ کر رُک گیا۔ اژدہا اپنے شکار کے پیچھے ایک گول دائرے میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنی ہی سنہری دُم پکڑ لی اور خود اپنے آپ کو نگلنے لگا۔

شہزادے نے اُوپر نظر اُٹھا کر دیکھا تو آسمان پر ایک نیا ستارہ چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں

اسے بجلی کڑکنے کی آواز اور طوفان کا شور سنائی دیا لیکن بعد میں اسے پتہ چلا کہ یہ چکّی سے بندھے ہوئے اُن غلاموں کا ہی شور وغُل تھا جو اب آزاد ہو کر خوشی کے مارے چلاّ رہے تھے.....'

لیکن انور تو کب کا سو چکا تھا۔ اُس نے کہانی آخر تک سُنی ہی نہیں!

(6)

اُس رات انور نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سپنا دیکھ رہا ہے پھر بھی اس کے من میں ایک گہرا احساس یہ تھا کہ یہ خواب نہیں بلکہ یہ سچّائی ہے۔ پہلے تو اس نے آسمان پر ایک بہت بڑا کبوتر اڑتے دیکھا جو ایک چمکدار لال ستارے کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ کبوتر نہیں ہے بلکہ وہ خود اُس بہت بڑے کبوتر کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے جسے اُس نے اُس دن صبح آسمان پر اڑتے دیکھا تھا۔ اس کے دونوں طرف پنکھوں کی طرح مولوی صاحب کی سفید داڑھی لگی ہوئی تھی جو ہوا میں عجیب طرف سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اُس کے ابا کہیں سے اسے آواز دے رہے تھے، پر جب اس نے مُڑ کر دیکھا تو وہ اس کے ابا نہیں بلکہ کا کا رامیشور دیال تھے۔ وہ آسمان کی طرف اُڑتا چلا جا رہا تھا جس کا رنگ نیلا تھا اور جس پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے، پر جب اس نے اسے پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کی تو وہ باجی انجم کا دھانی دار دوپٹہ نکلا۔ ایک چڑیا اڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔ لیکن نہیں، وہ چڑیا نہیں تھی بلکہ امرتسر سے آیا ہوا تار تھا جو ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور اتنے میں وہ بڑا کبوتر ایک سفید گھوڑا بن گیا تھا اور چڑیا کی طرح اڑا چلا جا رہا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ زمین پر اتر آیا اور ایک گھاٹی میں سے ہو کر دُلکی چال سے چلنے لگا۔ ایک حور یا پری ہوا میں اُڑتی ہوئی آئی اور بولی۔ 'پردیسی، تھوڑی دیر کو رُک جاؤ نا۔' لیکن وہ حُور نہیں تھی بلکہ چاوڑی بازار کی اُن 'دوسری عورتوں' میں سے ایک تھی اور اس لیے انور نے جواب دیا۔ 'میں انسان ہوں، انسان کی اولاد ہوں میں ساری دنیا کا مالک ہوں۔' اور اُس نے جواب دیا۔ 'میں عورت ہوں، عورت کی بیٹی ہوں اور تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔' اور اتنا کہہ کر وہ اپنی بانہیں پھیلا کر انور سے لپٹ گئی لیکن وہ وہاں نہیں تھا اور نہ ہی وہ تھی۔ اب وہ خوف کی وادی میں پہنچ گیا تھا اور ہری آنکھوں والا اژدہا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ وہیں سہم کر کھڑا ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا

کہ وہ اژدہا اسے مار ڈالے گا۔ اتنے میں ایک اجنبی دُبلا پتلا چھوٹا سا آدمی آکر اس کے اور اژدہے کے بیچ میں کھڑا ہوگیا اور بولا 'میں گاندھی ہوں اور میں افریقہ سے آیا ہوں۔ اے اژدہے اِس معصوم بچّے کو نہ مارنا۔ نہیں تو میں تمھارے بے انصافی کے قانونوں کو نہیں مانوں گا۔ مارنا تو تمھیں کسی کو بھی نہیں چاہیے چوہے تک کو نہیں۔' اژدہے نے اپنے نتھنے پھنکار کر زور سے سانس لی اور وہ اجنبی اور انور دونوں اس اژدہے کے پیٹ میں پہنچ گئے...... لیکن اصل میں وہ اژدہے کا پیٹ نہیں بلکہ اس کے ابا کی اندھیری بیٹھک تھی اور وہاں حکیم بیدل بیٹھے غالب کے شعر سُنا رہے تھے۔' آسمان پر منحوس گھٹائیں گھر رہی ہیں۔' حکیم بیدل نے کہا اور سچ مچ آسمان پر گہرے کالے بادل گھر آئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں پانی برسنے لگا۔ کمرے کے اندر بھی برسنے لگا......

لیکن پانی کا چھینٹا تو انجم نے ہمیشہ کی طرح انور کو جگانے کے لیے اس کے منہ پر مارا تھا۔ انور نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی بہن شرارت بھرے انداز سے مُسکرا رہی تھی۔ 'اُٹھ، کاہل کہیں کا۔ اگر امرتسر جانا ہے تو فوراً اٹھ جا نہیں تو ابا تجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'

○

سڑکِ اعظم

(1)

ریلوے اسٹیشن انور کے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ کبھی سپنے میں بھی اُس نے ایسی جگہ نہیں دیکھی تھی۔ بھیانک کالے دیو جیسے بڑے بڑے اِنجن دھواں اُڑاتے ہوئے ریل کی چمکتی ہوئی پٹریوں پر اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ گاڑیاں آتی تھیں اور بہت دور بمبئی، کلکتے اور پشاور تک چلی جاتی تھیں۔ اسٹیشن میں آتے ہوئے اور اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے مسافروں کی بھیڑ ایک عجیب پنچ میل کھچڑی تھی— ہر رنگ کی پگڑیاں، ہر شکل کی ٹوپیاں، شلواریں پہنے ہوئے پٹھان اور دھوتیاں باندھے ہوئے بنگالی، ڈھیلے ڈھالے بُرقعوں میں ملبوس مسلمان عورتیں اور منہ پر چھوٹا سا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے کھاتے پیتے گھرانوں کی ہندو عورتیں اور اُن کے ساتھ ہی کچھ گوری چمڑی والی عورتیں ایسی بھی تھیں جو بہت ہی باریک کپڑے پہنے تھیں جن میں سے اُن کا سارا جسم دکھائی دیتا تھا۔ شاید یہی چاوڑی بازار والی دوسری عورتیں تھیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ انور کے ابا نے اُسے بتایا کہ یہ اُن صاحب لوگوں کی، انگریز افسروں کی بیویاں یا بیٹیاں تھیں جو پلیٹ فارم پر ریل کے اِنجن کی طرح سگریٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے۔

بعد میں اُس کے ابا نے اُسے بتایا کہ وہ سیدھے امرتسر نہ جا کر ایک دن کے لیے پانی پت

میں رُکیں گے جو وہاں سے صرف پچاس میل دُور تھا۔

'ابّا، ہم لوگ رات تک وہاں پہنچ جائیں گے؟' اُس نے پوچھا۔

'رات تک؟ ارے ابھی تین گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔'

اتنے میں وہ اس پلیٹ فارم پر پہنچ گئے جہاں اُن کی گاڑی کھڑی تھی۔ چاروں طرف ایک عجیب چہل پہل تھی اور عجیب شور وغُل ہو رہا تھا۔ مسافر اور انھیں چھوڑنے کے لیے آئے ہوئے اُن کے دوست 'قُلی'، پھل اور شربت بیچنے والے، کتابیں اور اخبار بیچنے والے سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور چلّا چلّا کر اپنا مال بیچنے کی کوشش کر رہے تھے اور اِن تمام آوازوں کے شور وغُل میں اُسے دو آوازیں بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔ 'ہندو پانی۔' 'مسلم پانی۔'

مسلم پانی والے کے داڑھی تھی اور وہ اپنے کندھے پر مشک لٹکائے ہوئے تھا۔ اُس کا جوڑی دار ہندو پانی والا دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بالٹی لیے ہوئے تھا۔ انور سوچنے لگا کیا اِن دونوں کے پانی میں سچ مچ کوئی فرق ہے۔ لیکن اتنے میں وہ دیکھتا کیا ہے کہ دونوں پانی والوں نے پلیٹ فارم کے بیچ میں جا کر ایک ہی نل سے پانی بھرا۔

انور نے دیکھا کہ گاڑی میں بھی کئی طرح کے ڈبّے ہیں۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبّوں کے باہر سونے کی طرح چمکتے ہوئے پیتل کے ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ اُن میں چمڑے کی گدّیاں تھیں، آئینے لگے تھے اور بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ اِن میں سے زیادہ تر ڈبّوں میں انگریز مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ کچھ امیر ہندوستانی بھی اِن ڈبّوں میں سفر کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے انھیں گوروں کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا جاتا تھا۔ انور نے دیکھا کہ ایک باعزّت ہندوستانی صاحب ایک ایسے ہی ڈبّے میں گھُسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں بیٹھے ہوئے دو انگریز انھیں ڈانٹ رہے تھے۔ 'گیٹ آؤٹ تم کالا آدمی کو ہم اِدھر نہیں بیٹھنے مانگتا۔' ہندوستانی صاحب نے اپنا ٹکٹ نکال کر انھیں دکھایا کہ انھیں سیکنڈ کلاس کے ڈبّے میں بیٹھنے کا حق ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک ہندوستانی ٹکٹ بابو سے بھی فریاد کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انھیں مجبور ہو کر سیکنڈ کلاس کے ایک دوسرے ڈبّے میں بیٹھنا پڑا جو صرف ہندوستانی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ انور کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کیونکہ اس نے سُن رکھا تھا کہ انگریزوں کے راج میں سب

برابر ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ ہندوستانی صاحب انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی ڈبّے میں سفر کیوں نہیں کر سکتے؟ اُس کے لیے یہ ایک اور پہیلی تھی۔ بالکل اُس پہیلی جیسی کہ ایک ہی نل کے پانی کے دو مذہب کیسے ہو جاتے ہیں اور وہ ہندو پانی، مسلم پانی کہہ کر کیوں بیچا جاتا ہے؟

وہ انٹر کلاس کے ایک ڈبّے میں گھُسے ہی تھے کہ انجن نے زور سے سیٹی دی اور گاڑی اتنے زور کے جھٹکے کے ساتھ چلی کہ انور اپنے ابا کی گود میں جا گرا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پلیٹ فارم اور اس پر کھڑے ہوئے سب لوگ دور بھاگے جا رہے ہیں۔ انور کے لیے تو یہ بہت ہی تعجب کی بات تھی۔

'ابا، ابا، اسٹیشن بھاگا جا رہا ہے۔' انور نے گھبرا کر چلّاتے ہوئے کہا اور ڈبّے میں بیٹھے ہوئے سارے مسافر ہنس پڑے۔

اکبر علی نے مسکرا کر دھیرے سے اپنے بیٹے کی بانہہ کو تھپک دیا اور بولے 'بیٹا اسٹیشن نہیں، ہماری گاڑی بھاگی جا رہی ہے۔ وہ دیکھو سبزی منڈی کے باغ ہیں کیوں کہ ہم اُن سے دُور ہٹتے جا رہے ہیں اس لیے تمھیں ایسا لگتا ہے کہ وہ دوسری طرف ہم سے دور بھاگتے جا رہے ہیں۔'

انور اپنی اِس بے وقوفی کی بات پر بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دی کہ یہ میرا پہلا ہی ریل کا سفر ہے اور یہ سوچ کر اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ جوتے اُتار کر وہ آرام سے سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھنے لگا۔ لیکن اب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ صرف ایسا لگتا ہے کہ وہ غائب ہو جاتے ہیں۔

(2)

گاڑی تیزی سے پانی پت کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔ انور کھڑکی کے پاس سے تیزی سے گزرتے ہوئے نظاروں کو دیکھنے میں محو تھا۔ کھیت اور پھلوں کے باغ، ریل کی لیول کراسنگ پر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں، کہیں دور کسی مقبرے کا سفید گنبد، گاؤں کے پاس سے دھڑ دھڑاتی ہوئی گاڑی کو گزرتے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور شور مچاتے ہوئے بچے۔ انور جانتا تھا کہ اُس کے دل میں جو کھلبلی مچی ہوئی تھی، اُس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ کسی خاص جگہ، پانی پت یا امرتسر جا رہا

تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریل سے جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کے خون میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی کہ وہ بہت تیز چلنے والی ریل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ خوب زور زور سے چلّائے، اُچھلے کودے اور جی بھر کر ناچے۔ لیکن اُس کی پرورش اور تربیت اچھے ڈھنگ سے ہوئی تھی اور وہ اس بات کو جانتا تھا کہ اس طرح کی حرکتیں سب کے سامنے نہیں کی جانی چاہییں۔ اس کے ابا اِس چیز کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی اپنی خوشی یا غم کا ڈھنڈورا پیٹے۔ انور کو سکھایا گیا تھا کہ اگر کہیں گرنے سے بہت سخت چوٹ بھی لگ جائے تو بھی زور سے نہ روئے۔ حکیم بیدل کے اچھے سے اچھے مذاق پر بھی کبھی زور زور سے نہ ہنسے اور جب درزی اس کے لیے عید کی کمخواب کی شیروانی سی کر لائے تب بھی وہ خوشی سے ناچنے نہ لگے۔ اور اس لیے وہ کھڑکی کے پاس چُپ چاپ بیٹھا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ خوشی کے مارے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس میں پہلے سے زیادہ جان آ گئی ہے جیسے وہ پہلے سے زیادہ طاقتور اور تندرست ہو گیا ہے اور گلابو کی کہانیوں والے شاہزادے کی طرح کوئی بھی کام کر سکتا ہے، کہیں بھی جا سکتا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے راکشش، پریاں، دیو، بھوت اور پریت دراصل کہیں ہوتے نہیں ہیں۔ اُس کے ابا نے اُسے یہ بات خاص طور پر بتائی تھی اور اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ گلابو کی کہانیوں کی ہر بات کو سچ نہ مان لیا کرے۔ نہیں تو وہ بڑا ہو کر پھوپھی اماں کی طرح ہو جائے گا جو اِن سب چیزوں پر یقین کرتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی انور کا جی چاہتا تھا کہ کاش سچ مچ ایسے راکشش ہوتے۔ اسے اِس کی کوئی فکر نہیں تھی کہ اُس کی آنکھیں کیسی ہوں، پر اس طرح کا ایک آدھ راکشش ہو ضرور، جس سے جا کر اُس کے جیسا بہادر لڑکا لڑ سکے اور اسے مار سکے اور پھر شہزادی سے بیاہ کر سکے جیسا کہ گلابو کی کئی کہانیوں میں ہوتا تھا۔

ریل گاڑی بہت لمبے چوڑے سپاٹ میدان کو پار کرتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے انور کو سانپ کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہوئی سفید سڑک دکھائی دے رہی تھی جو کبھی پیڑوں کے پیچھے چھپ جاتی تھی اور کبھی پھر اچانک باہر نکل آتی تھی۔ وہ کبھی ریل کی پٹری کے اتنے پاس آ جاتی تھی کہ انور اس پر جاتی ہوئی اونٹ گاڑیوں کو صاف دیکھ سکتا تھا

اور دوسرے ہی لمحے اتنی دور ہو جاتی تھی کہ اُفق کے کنارے پر صرف ایک لکیر جیسی دکھائی دیتی تھی۔ مسافروں کی بات چیت کچھ ٹھنڈی پڑ گئی تھی اور اس لیے اکبر علی کو اپنے بیٹے کو کچھ باتیں سمجھانے کا موقع ملا۔ انور کو اپنے ابا کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ انھیں ہر بات معلوم تھی اور وہ کبھی اس کے سوالوں کا جواب دینے سے اُکتاتے نہیں تھے۔ انھوں نے انور کو بتایا کہ اس سڑک کا نام گرینڈ ٹرنک روڈ یا سڑک اعظم ہے جو کلکتہ سے دلّی ہوتی ہوئی پشاور تک چلی گئی ہے اور ہندوستان کی مشرقی سمت سے شمال جنوب تک ایک ہزار پانچ سو میل لمبی ہے۔' یہ سڑک انگریزوں نے بنائی ہے؟' انور نے پوچھا۔ 'نہیں،' اس کے ابا نے جواب دیا۔ 'یہ سڑک ایک ہندوستانی بادشاہ نے بنوائی تھی اس کا نام شیر شاہ سوری تھا۔ اُس نے یہ سڑک اس لیے بنوائی تھی کہ اس لمبے چوڑے مُلک میں لوگوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرنا آسان ہو جائے۔'

'میرے ابا بھی کتنے عقل مند ہیں!' انور نے سوچا۔

گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ کھڑکی سے باہر اُس نے نظر دوڑا کر دیکھا تو اُسے اُس سپاٹ میدان کے سلسلے کو توڑتا ہوا، جس کا وہ اب تک عادی ہو چکا تھا، ٹیلے پر بسا ہوا ایک چھوٹا سا شہر دکھائی دیا۔ پکّی اینٹ کے مکانوں کی قطاریں ایک دوسرے کے اُوپر دُور تک چلی گئی تھیں اور اُن سب کے اُوپر مسجدوں کے مینار اور گنبد سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔

'تیار ہو جاؤ۔' اُس کے ابا نے کہا۔ 'پانی پت آ گیا۔'

(3)

پانی پت بہت ہی اُونگھا ہوا سا شہر نکلا۔ انور دلّی کی چہل پہل کا عادی تھا۔ اُسے یہاں کی ہر چیز اتنی سُست، اتنی بے رنگ اور اتنی بے جان معلوم ہوئی کہ وہ بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بازاروں میں لوگ نہایت اطمینان سے آ جا رہے تھے۔ ہر دُکان پر رُک کر تھوڑی دیر گپ لڑاتے یا تھوڑی دیر حُقّہ کا کش کھینچتے۔ کچرے سے لدے ہوئے گدھے ٹیڑھی اور اوبڑ کھابڑ سڑکوں کے بیچوں بیچ کھڑے اُونگھ رہے تھے جن کی وجہ سے اُن کے پھٹیچر تانگے کا آگے بڑھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس شہر کی ایک اور خاص چیز یہاں کی مکھیاں تھیں۔ لاکھوں کروڑوں مکھیاں۔ اور انور جیسے

آبنوس کی لکڑی پر بہت خوب صورت نقاشی کا کام سمجھ رہا تھا وہ پاس سے دیکھنے پر ایک حلوائی کی دُکان کے دروازے پر چپکی ہوئی مکھیاں نکلیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں بہت سے لوگ اُس کے ابا کو جانتے تھے اور اکبر علی نے اپنے بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ جب بھی کوئی السلام علیکم کہے تو وہ ادب سے سلام کا جواب دے۔ 'وعلیکم السلام'۔

بازار سے گزر کر وہ میر فیاض علی کے گھر پہنچے جو اکبر علی کے بہت پُرانے دوست تھے اور لڑائی کے دنوں میں چار برس تک کمبلوں کے بیوپار میں اُن کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ اکبر علی اور رامیشور دیال نے فوج کو ہزاروں کمبل سپلائی کیے تھے اور یہ کمبل زیادہ تر پانی پت سے بن کر آتے تھے۔ فیاض علی کا کہنا تھا کہ وہاں کے کمبل والے لڑائی کے ٹھیکوں کی بدولت بے حد پیسے والے ہو گئے تھے اور وہ اپنی نئی کمائی ہوئی دولت شادی بیاہوں پر، نئے گھر بنوانے پر اور اپنی عورتوں کے لیے گہنے بنوانے پر تباہ کر رہے تھے۔ 'ہم شریف لوگوں کے لیے نیچ جات کے اِن حرامیوں کو قابوں میں رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔' میر فیاض علی کی عادت تھی کہ وہ اپنی باتوں کے بیچ بیچ میں چُنی ہوئی گالیوں کا چٹخارہ دیتے رہتے تھے اور ہر بار جب وہ اکبر علی کے کم عمر نا سمجھ بیٹے کے سامنے 'حرامی' کے قسم کا کوئی لفظ کہتے تھے تو اُن کے جیسے شائستہ آدمی کے دل پر گہری چوٹ لگتی تھی۔ جب بات بات میں گالی بکنے والے شہر کے خاندانی رئیس میر فیاض علی اُٹھ کر زنان خانے میں گئے تو انور نے اپنے ابا سے پوچھا۔ 'ابا، میر صاحب کمبل بنانے والوں کو حرامی کہہ رہے تھے۔' یہ حرامی کون ہوتا ہے۔'

اکبر علی اپنے بیٹے کے کوئی سوال پوچھنے پر بہت خوش ہوتے تھے اور ہمیشہ بڑے صبر کے ساتھ خوشی خوشی اُس کے سوالوں کا جواب دیتے تھے۔ لیکن کچھ سوال ایسے بھی ہوتے تھے جن کا اُن سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا اور اس لفظ 'حرامی' کا مطلب بھی ایسے ہی سوالوں میں آتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی طرف سے اُسے اس کا مطلب سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

'یوں سمجھ لو بیٹا...... اس کا مطلب ہوتا ہے...... بُرا آدمی'۔

'تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ اگر میں کوئی بُری بات کروں۔ جیسے اگر میں آپ کا کہنا نہ مانوں یا اپنا سبق ٹھیک سے یاد نہ کروں تو مجھے بھی حرامی کہا جائے گا؟'

اکبر علی پر اس بات کا یکا یک اتنا گہرا اثر پڑا، اُن کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا اور وہ لاچاری میں اتنی بُری طرح ہکلانے لگے کہ انور سمجھ گیا کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر کوئی بہت بڑی غلطی کی تھی۔

'نہیں نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ ہر بُرے آدمی کو 'حرامی' نہیں کہتے۔ وہ تو بُرے آدمی سے بھی بدتر ہوتا ہے۔'

ظاہر تھا کہ اس لفظ 'حرامی' میں کوئی ایسا بھید تھا جو انور کے ابّا اپنے بیٹے کو نہیں بتانا چاہتے تھے۔ اتنے میں میر فیاض علی پانوں کی طشتری ہاتھ میں لیے ہوئے زنان خانے میں سے نکل آئے اور باپ بیٹے دونوں کو بات چیت کا رُخ بدل جانے پر بہت خوشی ہوئی۔

'اچھا میر صاحب یہ تو بتائیے۔' اکبر علی نے کہنا شروع کیا۔ 'ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں پانی پت کے لوگوں کا کیا خیال ہے؟'

'ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے! کیا ہو رہا ہے؟' پرانے خاندانی رئیس میر فیاض علی نے جن کی رئیسی اب نام ہی کو رہ گئی تھی، ایک پرانی آرام کرسی پر لیٹ کر اطمینان سے حُقّے کا کش کھینچتے ہوئے چونک کر کہا۔ پھر کچھ رُک کر وہ پان کی پیک تھوکتے ہوئے بولے: 'آپ کا مطلب اِس ستیہ گرہ سے ہے؟ کم سے کم پانی پت کے ہم شریف لوگ تو آٹا دال بیچنے والے اس ٹٹ پونجیے پنیے سے کوسوں دور رہیں گے۔'

(4)

شام کو میر فیاض علی اپنے مہمانوں کو بوعلی شاہ قلندر کا مقبرہ دکھانے لے گئے۔ بوعلی شاہ سینکڑوں برس پہلے کوئی فقیر گزرے تھے اور اُن کا نام قلندر اس لیے پڑ گیا تھا کہ وہ چیتھڑے پہن کر پاگلوں کی طرح رہتے تھے اور دنیا کی ہر بات کو بھلا کر خدا کے دھیان میں مگن رہتے تھے۔

یہ خوب صورت سفید مقبرہ پتھر کے فرش والے ایک لمبوترے آنگن کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ اپنے جوتوں سے کھٹ کھٹ کی آواز کرتے ہوئے وہ اندر پہنچے۔ اندر کے آنگن میں کافی بھیڑ جمع تھی اور اچانک انھیں گانے کی آواز سنائی دی۔ جوتے اُتار کر وہ سنگ مرمر کے چبوترے پر چڑھ گئے۔ وہاں انور نے ایک انوکھا نظارہ دیکھا۔

پتلے سے دروازے میں سے کوٹھری کے اندر پھولوں سے ڈھکی ہوئی قلندر صاحب کی قبر

دھندلی دھندلی دکھائی پڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک چوڑا سا برآمدہ تھا جس میں بیس پچیس آدمی گھیرا باندھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک آدمی پوری آواز کے ساتھ فارسی کے شعر گا رہا تھا اور باقی لوگ تالیاں بجا بجا کر تال دے رہے تھے۔ شعر کے آخری ٹکڑے پر پہنچ کر سب لوگ ساتھ مل کر گاتے تھے۔ سمندر کی چڑھتی ہوئی لہر کی طرح گانے کی لہر بھی لگاتار اونچی چڑھتی گئی، تالیاں اور زور سے بجنے لگیں اور طوفان کی طرح چڑھتی ہوئی دُھن۔ لوگ سر ہلا ہلا کر جھومنے لگے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرلیں اور ہر ایک رومی کی صوفیانہ شاعری کے جذبات کی اُمنڈی ہوئی لہروں میں کھو گیا۔ پھر انور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ بھیڑ کے بیچ میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور پاگلوں کی طرح کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ ایک لمحے تک یہ آدمی بالکل خاموش رہا۔ طوفان سے پہلے کی خاموشی کی طرح۔ چاروں طرف جذبات کا جو طوفان اُمنڈ رہا تھا اُس کے بیچ وہی ایک ایسا تھا جو بالکل چپ چاپ کھڑا تھا۔ پھر یکا یک اس پر جنون سوار ہوا۔ اُس کا سارا بدن کانپنے اور ہلنے جلنے لگا۔ گانا اب تک خوفناک حد تک تیز ہو چکا تھا اور لگاتار اُس کی دُھن تیز ہوتی جا رہی تھی اور گانے والوں کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس آدمی نے اپنے ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھا رکھے تھے جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی رسّی کو پکڑے ہوئے ہو۔ اچانک وہ اُوپر کی طرف اُچھلا اور پاگلوں کی طرح بالکل دیوانہ ہو کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے وہ اپنے کپڑے پھاڑتا جا رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ اپنے قابو سے بالکل باہر ہو چکا تھا۔ اُسے کسی بھی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اُس کے اندر کوئی ایسی پُر اسرار لہر اُٹھ رہی تھی جو اُس کے دیوانہ وار جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور اتنے میں یکا یک گانے والوں کے ہونٹوں پر گیت نے دم توڑ دیا۔ جذبات کی لہریں دب گئیں اور مجمع پر مرگھٹ جیسی خاموشی چھا گئی۔ اِس خاموشی میں بھیڑ کے بیچ میں کھڑے ہوئے اُس آدمی کی صورت مضحکہ خیز اور ڈراؤنی لگ رہی تھی، وہی صورت جو کچھ لمحے پہلے روحانی اور مقدس نظر آتی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ اس طرح کھڑا رہا جیسے اسے پھر حال آنے والا ہو، لیکن جذبات سے گیت کا سہارا چھن جانے کی وجہ سے اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس نظارے کا انور کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ کئی منٹ تک وہ بول ہی نہ سکا۔ اس کا سانس تیز چلنے لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا اور جب گانا یکایک رک گیا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر سے کوئی چیز نکل گئی ہے اور یہ خالی پن اندر ہی اندر اُسے کُریدنے لگا۔

تو یہ تھی قوّالی، ایرانی صوفیوں کی وجد آور رسم، اور میر فیاض علی کو اس پر بہت ناز تھا۔ اُنھوں نے کہا: 'پانی پت جیسی قوّالی تو کہیں ہوتی ہی نہیں۔' لیکن اکبر علی کچھ جھنجھلائے ہوئے کچھ شرمندہ سا محسوس کر رہے تھے۔ انھیں جذبات کا اس طرح کا اظہار اچھا نہیں لگا تھا اور انھوں نے یہ بات کہہ بھی دی۔ جس پر بوڑھے میر صاحب کے ساتھ اُن کی بحث چھڑ گئی۔ وہ ابھی بحث کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی اٹھا اور مزار کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر سجدہ کرنے لگا۔ اکبر علی نے بڑے فاتحانہ انداز سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا: 'یہ دیکھئے یہ ہے آپ کا اسلام، ایک قبر پر سجدہ۔ پھر آپ میں اور بُت پرست کافروں میں فرق کیا رہ گیا۔'

لیکن باہر والے آنگن میں ایک اور چھوٹی سی قبر تھی جس کے سامنے جا کر اکبر علی نے چپ چاپ اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور اپنے بیٹے کو بتایا کہ وہ اُردو کے مشہور شاعر حالی کی قبر تھی جنھوں نے اپنی لافانی مُسدّس میں اسلام کے عروج وزوال کو بیان کیا تھا۔

اکبر علی نے شاعر کی روح کے لیے دُعا مانگنے کے بعد ایک بار کنکھیوں سے میر فیاض علی کو دیکھا اور پھر وہاں جمع ہوئے لوگوں کو جو ایک دوسری قوّالی کی تیاریاں کر رہے تھے اور پھر بولے: 'انھوں نے ایک پوری قوم کو جگا دیا لیکن افسوس کہ خود اُن کا شہر ابھی تک غفلت کی نیند سو رہا ہے۔'

(5)

اب انور اور اُس کے ابا پانی پت سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر روانہ ہوئے تو وہ بڑی سڑک اب بھی ریل کی پٹری کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ جب پانی پت کا اونگھتا ہوا شہر پیچھے رہ گیا تو اکبر علی نے ایک لمبے چوڑے میدان کی طرف اشارہ کر کے کہا: 'یہی وہ میدان ہے جہاں پانی پت کی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئی تھیں اور اس سے بھی بہت پہلے مہابھارت کی لڑائی کا فیصلہ بھی اسی میدان میں ہوا تھا۔'

تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی تاریخی اہمیت والی مقدس سرزمین سے ہو کر گذر رہے تھے۔ انور نے اِس لمبے چوڑے میدان کو دیکھا اور فوراً ہی اس کے تصور نے وہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں لاکر کھڑی کر دیں۔ ہاتھی لاشوں کو اور دَم توڑتے ہوئے گھائل سپاہیوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رتھوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے چلے جا رہے تھے اور موت کا سندیسہ لانے والے کبوتروں کی طرح تیر ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے کتنے ہی ورق اسی وسیع میدان میں خون کی لکیروں سے لکھے گئے تھے۔ اس بڑی سڑک پر ہو کر حملہ آوروں، فاتحوں کی فوجیں، دیش بھگت اور ظالم حکمران اور لٹیرے سب ہی گزرتے تھے۔ لیکن وہ دَور کیا دکھائی دے رہا تھا؟

سڑک کوئی میل بھر تک بالکل ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی اور اُس سڑک پر گھوڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ چلا جا رہا تھا۔ گھوڑ سوار سپاہی، توپوں کی گاڑی جنھیں گھوڑے کھینچ رہے تھے اور کچھ موٹریں۔ انور نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے، پگڑیاں باندھے ہندوستانی سپاہیوں، خاکی ٹوپ لگائے ہوئے انگریز افسروں اور ٹٹوؤں پر بیٹھے ہوئے سائیسوں اور کوچوانوں کو پہچانا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے اس گھوڑ سوار دستے کو بڑے غور سے دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ سفید دُھول کے بادل اُڑاتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی بہت بڑی فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ امرتسر کی طرف جا رہا تھا۔

O

موت سے ملاقات

(1)

امرتسر!

گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اور سینکڑوں مسافروں کو پلیٹ فارم پر اُتار دیا گیا جن میں انور اور اس کے ابا بھی شامل تھے۔ لیکن وہاں پر ایک بھی قلی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ مسافر جو خود اپنا سامان لے جانا پسند نہیں کرتے تھے 'قلی! قلی!' چلّا رہے تھے پر قلی کوئی ہوتا تو آتا۔

جب وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو دُور دُور تک کوئی تانگہ دکھائی نہ دیا۔ کوئی مزدور بھی ایسا نہیں تھا جو اُن کا سامان ہوٹل تک پہنچا دیتا جہاں اکبر علی امرتسر میں ہمیشہ ٹھہرتے تھے۔ بڑی عجیب بات تھی۔

'ہوٹل بہت دور نہیں ہے۔ انور، کیا تم بستر اٹھا کر ہوٹل تک لے چل سکو گے؟' اکبر نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ بیٹا بھی اپنے ابا کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے بڑے فخر سے بولا۔

'جی ہاں ابا۔'

اور سو اپنا سامان سر پر لاد کر باپ بیٹے دونوں بہت سے دوسرے مسافروں کی طرح ہی دھول سے اٹی سڑک پر چل پڑے۔ سورج آسمان پر بہت اونچا چڑھ چکا تھا لیکن شہر میں ایک بھی

دُکان ابھی تک نہیں کھلی تھی۔ کپڑے کی دُکانیں، مٹھائی کی دُکانیں، دودھ کی دکانیں، کھانے پینے کی دُکانیں، شربت کی دُکانیں سب بند تھیں پھر بھی بازاروں میں سناٹا نہیں تھا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں دُکانوں کے پٹروں پر بیٹھے بہت جوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ سڑکوں کے نکّڑوں پر اس سے بھی بڑی بڑی بھیڑیں جمع تھیں اور بہت سے لوگوں کی بھرّائی ہوئی آوازیں ہوا میں گونج رہی تھیں۔ پولس والے لاٹھیاں لیے ہوئے بڑے رُعب کے ساتھ چپ چاپ گشت لگا رہے تھے۔

'ایسا لگتا ہے کہ آج شہر میں پوری ہڑتال ہے۔' اکبر علی نے دکانوں کی کئی قطاروں کے سامنے سے گزرنے کے بعد کہا اور تھوڑی ہی دیر میں وہیں کے ایک آدمی نے، جو اُن کے ساتھ چل رہا تھا، اُن کے اس خیال کی تائید کی۔ اُس نے بتایا کہ سرکار کو یہ بتانے کے لیے کہ رولٹ بل کے خلاف لوگوں میں کتنا غصہ ہے، چھ اپریل کو سارے ملک میں پوری ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔'

انور کے لیے یہ خیال بڑا ہیجان انگیز تھا۔ دلّی، امرتسر، بمبئی اور کلکتے، پشاور اور مدراس میں ہزاروں دُکانیں ایک ساتھ بند ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریز افسر سگریٹیں، گوشت، سبزی اور دودھ کچھ بھی نہیں خرید سکیں گے۔ اتنے زبردست مظاہرے کا اثر نہ پڑے یہ ناممکن ہے اور اپنی دکانیں بند کر دینے کا سیدھا سادہ طریقہ اپنا کر وہ سرکار کو اپنے بُرے قانونوں کو رد کر دینے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

'ابّا، کیا دلّی میں ہماری دکان بھی بند رہے گی؟' انور نے بھاری بستر کے بوجھ کے وجہ سے ہانپتے ہوئے کہا۔ ہڑتال کے خیال سے اس کے دل میں ولولے کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی تھی۔

'کیوں نہیں بیٹا۔ رامیشور نے ہماری دکان بھی ضرور بند کر دی ہوگی۔ جب سب لوگ ہڑتال کرنے کا فیصلہ کریں تو ہم سب کو اُس میں شامل ہونا ہی چاہیے لیکن' اور یہ کہتے کہتے اکبر علی اُداس ہو گئے۔' مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہڑتال پر ہی یہ قصہ ختم نہیں ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ گڑبڑ ہونا لازمی ہے۔'

جس وقت وہ ہوٹل میں گھس رہے تھے، انور نے سڑک پر پولیس والوں کا ایک دستہ قدم

ملا کر جاتے ہوئے دیکھا۔ اُن کے آگے آگے ایک انگریز افسر جا رہا تھا جس کی پیٹی سے ایک ریوالور لٹک رہا تھا۔

یکا یک انور کے دماغ میں گھوڑ سواروں کے اُس دستے کی تصویر گھوم گئی جسے اُس نے گرینڈ ٹرنک روڈ پر قطار باندھے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسی سڑک پر جسے پہلے بھی کئی فاتحوں نے اپنی فوجیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

(2)

رتن سے دوستی ہو جانے کی انور کو بہت خوشی تھی۔ رتن کا باپ جمعدار اجیت سنگھ پنشن یافتہ فوجی تھا جو رام پال اینڈ سنز کی اُون کی دُکان میں دربان کا کام کرتا تھا۔ اکبر علی کو حساب کتاب کے معاملے میں روز اس دُکان میں آنا پڑتا تھا اور انھوں نے خود ہی انور سے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر جمعدار اجیت سنگھ کے بیٹے کے ساتھ کھیل لیا کرے۔ رتن تھا تو انور کی ہی عمر کا، پر اُس سے زیادہ تگڑا اور لمبا تھا اور اس میں انور جیسا شرمیلا پن اور خود آگاہی نہیں تھی۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور چنچل لڑکا تھا اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے موتی جیسے دانت چمک اٹھتے تھے۔ اس نے انور کو بتایا کہ وہ تیرنا جانتا ہے، پیڑ پر چڑھ لیتا ہے اور اپنی عمر کے کسی بھی لڑکے کے ساتھ کشتی لڑ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دلّی کے ایک نازک لڑکے کے لیے یہ ساری باتیں بے حد بہادری کا ثبوت تھیں۔ سب ہی سکھوں کی طرح رتن بھی داہنی کلائی پر لوہے کا ایک کڑا پہنے تھا اور اس کے لمبے ریشمی بالوں پر ایک بسنتی رنگ کی پگڑی بندھی تھی، پر اس کے بالوں کی کچھ لٹیں پگڑی کے باہر نکل آئی تھیں جس کی وجہ سے اُس کے کانسے کی مورتی جیسے ٹھوس چہرے پر ایک خاص کشش پیدا ہو گئی تھی۔

انور کا بچپن بہت اکیلے پن میں بیتا تھا۔ جب وہ دودھ پیتا بچّہ تھا تب ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اُس کی بیوہ پھوپی اماں نے ہی اُسے پالا تھا۔ اُس کی پھوپھی اُس کے بہت لاڈ کرتی تھیں۔ اُس کی بڑی بہن انجم بھی اُس سے بے حد پیار کرتی تھی، پر اُسے اپنی گڑیوں سے کھیلنا پسند تھا جب کہ انور بھاگ دوڑ کے کھیل کھیلنے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اُسے باہر جا کر پاس پڑوس کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اُس کے ابا کو ڈر تھا کہ کہیں وہ بھی

اُن بچّوں کی طرح گالی بکنا نہ سیکھ لے اور اُس کی پھوپھی اماں تو یہاں تک ڈرتی تھیں کہ وہ کسی دن کہیں اپنی ہڈّی پسلی نہ تڑوا آئے اس لیے انور گھونگھے کی طرح اپنے خول میں سکڑتا گیا اور اُس نے تصور کے کھیل کھیلنا سیکھ لیا۔ زندگی میں رتن اُس کا پہلا دوست تھا اور جب دونوں ساتھ کھیلتے اور باتیں کرتے اور ہنستے تھے تو انور کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رتن کے بارے میں اُس کے وہی جذبات نہیں ہیں جو اپنے ابا یا اپنی پھوپھی یا اپنی بہن انجم کے بارے میں ہیں۔ رتن کے ساتھ اُس کے تعلقات میں ایک عجیب راز تھا، ایک انوکھا پن تھا جو دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس کے تعلقات میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس بات کا اس کے ابا یا پھوپھی پر کیا اثر ہوگا، پر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اُس کی کسی بات یا کسی حرکت کا رتن پر کیا اثر ہوگا۔ اور اِس وجہ سے اُن کے آپسی تعلقات کے بارے میں انور کے لیے ایک انوکھی دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ مثال کے لیے اُس نے شرماتے ہوئے اپنا بڑا سا پھول دار رومال نکال کر رتن کو دیا تھا اُس وقت اُسے یہ پتہ نہیں تھا کہ اُس کا یہ نیا دوست فوراً اُسے پگڑی پر باندھ لے گا اور بھاگا ہوا اپنے باپ کو دکھانے جائے گا اور واپس آکر انور کو ایک چھوٹی سی کالی کھلونے کی پستول دے گا۔

'بابا میرے لیے ولایت سے لائے تھے۔' رتن نے جلدی سے کہا تاکہ انور کو یہ تحفہ لینے سے انکار کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

'تمھارے بابا ولایت ہو آئے ہیں؟' انور نے پوچھا۔ اُسے اِس بات پر تعجب ہوا کہ وہ اس خوب صورت تحفے کے لیے اپنے دوست کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔

'ہاں۔' رتن نے جواب دیا۔ اپنے بابا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ 'میرے بابا لڑائی میں ولایتی فوج کے ساتھ لڑے تھے۔ پہلے وہ فرانس میں تھے پھر وہاں سے لندن گئے تھے۔ وہاں بادشاہ جارج پنجم نے اُن کی بہادری کی تعریف کی تھی بابا بہت بہادر ہیں۔ سرکار نے انھیں بہت سے تمغے دیے ہیں۔'

انور نے جمعدار اجیت سنگھ کی خاکی وردی پر اوپر والی جیب کے پاس چھوٹے چھوٹے رنگین فیتوں سے لٹکتے ہوئے یہ سونے اور چاندی کے تمغے دیکھے تھے۔ انھیں دیکھ کر اُس کے دل میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور اُن کے پیچھے بہادری کی بہت جوش دلانے والی کوئی کہانی چھپی

ہوئی ہے۔ پر وہ اتنا شرمیلا تھا کہ اُس وقت ڈراؤنی کالی داڑھی والے اُس بوڑھے سپاہی سے اپنی لڑائی کے کارنامے سُنانے کو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اب اُس نے محسوس کیا کہ رتن کے ساتھ اُس کی دوستی کی وجہ سے اب اُسے یہ فرمائش کرنے کا حق پیدا ہو گیا ہے۔

'کیا تمھارے بابا' اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا: 'مجھے بتائیں گے کہ انھوں نے ولایت میں کیا کیا دیکھا؟ آج تک میں نے کسی ایسے آدمی سے بات نہیں کی ہے جو ولایت ہو آیا ہو اور لڑائی میں لڑ چکا ہو'

'کیوں نہیں' ضرور بتائیں گے۔ بابا میرے' میرے کسی بھی دوست کے لیے کچھ بھی بڑی خوشی سے کریں گے۔'

'میرا دوست۔' رتن نے اُسے یہی تو کہا تھا۔ میرا دوست۔ دو سیدھے سادے لفظ لیکن انور کے کانوں کو وہ کتنے میٹھے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اُس کے دل میں رتن کے لیے نرمی اور پیار کا جو جذبہ اُمڈ رہا تھا اُسے وہ کسی طرح ظاہر کر دے۔ اب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اسی جذبے کو تو دوستی کہتے ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دوست کو گلے لگا لے جیسے عید کے دن لوگ گلے ملتے ہیں، اُسے پیار کر لے جیسے پھوپھی اماں اُسے پیار کرتی تھیں، کم سے کم اُسی تپاک سے اُس سے ہاتھ تو ملا ہی لے جس تپاک سے اُس کے ابا کا کارامیشور دیال سے ہاتھ ملاتے تھے۔ پر اُسے تو اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی بجائے چھپانا سکھایا گیا تھا اور اس لیے وہ بہت اُداس ہو گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس سے اُس کا سُکھ چھین لیا ہو اور اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں لیکن اپنے آنسوؤں کو پی کر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اور رتن زندگی بھر ویسے ہی گہرے دوست رہیں گے جیسے کہ اُس کے ابا اور کا کارامیشور دیال ہیں۔ اور نہ جانے کیوں یہ فیصلہ کرتے ہی اُس کی اُداسی دور ہو گئی اور اُسے ایسا لگا کہ اُس میں نئی طاقت آ گئی ہے۔ اُسے ایسا لگا کہ اب وہ اکیلا نہیں رہ گیا ہے۔

(3)

وہاں پر ایک نہیں، بلکہ دو سنہری مندر تھے۔ ایک تو چٹان کی طرح اٹل تھا، پر دوسرا ڈولا لرز رہا تھا۔ پہلے والے کے اُوپر سے جب سفید روئی جیسے بادل گزرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ آسمان

پر تیر رہا ہے اور دوسرا مقدس تالاب کے گہرے نیلے پانی کے اندر تیر رہا تھا۔ انور ٹکٹکی باندھے سنہری مندر کا عکس دیکھ رہا تھا اور اس لیے جمعدار اجیت سنگھ اُسے اُس کی تاریخ اور مذہبی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بتا رہے تھے اُس کی طرف سے بھی اس کا خیال ایک لمحہ کے لیے ہٹ گیا لیکن اتنا اُس نے ضرور سنا کہ مندر کے کلس پر سونے کا ورق چڑھا ہوا ہے جس کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے گئے ہیں۔ جمعدار اجیت سنگھ نے اُسے یہ بھی بتایا کہ یہ سکھوں کا سب سے مقدس مندر ہے اور ملک کے کونے کونے سے غریب اور امیر یاتری یہاں ماتھا ٹیکنے آتے ہیں اور اس سنہرے کلس کی دیکھ بھال کے لیے پیسہ دے جاتے ہیں۔

انور کی سنہری مندر میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ جمعدار کی وردی میں لگے تمغوں میں۔ غور سے دیکھنے پر انور کو پتہ لگا کہ اُن میں سے کچھ پر بادشاہ کی ویسی ہی تصویر بنی ہوئی ہے جیسی کہ روپے پر یا اکنّی دونّی پر بنی ہوتی ہے۔ کچھ پر ایک عورت کی شکل بنی ہوئی تھی جس کے ایک ہاتھ میں بھالا تھا اور دوسرے میں ایک گولا۔ ہر تمغے پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ جو انور پڑھ نہیں سکتا تھا۔ انور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی مگر اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا، اس لیے اُس نے عاجزانہ نظر سے رتن کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو 'وہ میں نے جس بات کے لیے کہا تھا اُس کا کیا ہوا؟' رتن سمجھ گیا۔

اُس نے سیدھے سیدھے کہا: 'بابا، انور آپ سے لڑائی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔'

'لڑائی!' بوڑھے سپاہی نے کہا اور کچھ اِس طرح کھسیانا ہو کر کھانسا جیسے اسے لڑائی میں اپنے کارنامے بیان کرتے ہوئے شرم آ رہی ہو۔ 'لڑائی کے بارے میں کوئی سپاہی تمھیں اس کے علاوہ کیا بتا سکتا ہے کہ جس طرح اُس سے لڑنے کو کہا گیا وہ لڑا اور واہِ گرو کی مہربانی سے دشمن کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ گیا۔'

لیکن رتن اپنے دوست کو اس طرح مایوس کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا: 'بابا انور کو فرانس کے بارے میں اور مورچے پر کی اُن خندقوں کے بارے میں اور جرمن کی اُن بڑی بڑی توپوں کے بارے میں کچھ بتایئے جو سو میل تک گولے پھینکتی ہیں۔'

انور کی آنکھیں تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ 'جمعدار صاحب، کیا سچ مچ ایسی توپیں ہوتی ہے؟'

'ہاں بیٹا ہوتی ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک چیزیں ہوتی ہے۔' اب وہ اپنے لڑائی کے تذکرے سنانے کو تیار ہو گیا تھا۔ 'لیکن اگر میں تمھیں بتاؤں گا تو شروع سے بتاؤں گا۔'

تینوں اُس مقدس تالاب کے کنارے آرام سے بیٹھ گئے۔ رتن تو ایک پل کے لیے بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُس نے ایک چھوٹی سی کنکری پانی میں پھینکی اور دوسرا سنہری مندر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

انور اب جس لڑائی کا ذکر سن رہا تھا وہ ایک نئی قسم کی لڑائی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب نو جوان شہزادہ سفید گھوڑے پر بیٹھ کر لڑنے نہیں جاتا تھا، اب تیر انداز تیر کمان کے کمال نہیں دکھلاتے تھے، اب دشمن پر دھاوا بولنے کے لیے ہاتھی اور رتھ استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔

رتن اپنے بابا کے ان بہادری کے کارناموں کی کہانی پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا اس لیے وہ بیچ میں بول اُٹھا: 'لیکن بابا بڑی بڑی توپوں اور ہوائی جہازوں کو تو آپ چھوڑ ہی گئے۔ اُن کے بارے میں بھی تو انور کو بتایئے۔'

'ہاں، تو دشمن کے پاس بہت سی بڑی بڑی توپیں ہوتی تھیں جو اُس نے کہیں مورچے کے پیچھے لگا رکھی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی گولا ہمارے سر کے اوپر سے سنسناتا ہوا گزرتا تھا اور زبردست دھماکے کے ساتھ ہماری خندقوں کے پاس آ کر پھٹ جاتا تھا۔ جس وقت جرمن پیرس سے ستر میل دور تھے اُس وقت انھوں نے ایک ایسی توپ لگا دی جو سب توپوں کی 'نانی' تھی۔ یہ توپ ستر میل دور پیرس کے سب سے اونچے گرجا گھر کی چوٹی پر گولا پھینک سکتی تھی اور یہ ہوائی جہاز تو ایک بہت بڑی منحوس چڑیا ہوتی ہے۔ سر کے اوپر سے اُڑتے وقت ایک انڈا چھوڑتی ہے اور یہ انڈا پھٹ کر ہزاروں کی جان لے لیتا ہے۔ ایسی چیزوں کے خلاف بہادر سے بہادر آدمی بھی کیسے لڑ سکتا ہے؟ یہ سب کچھ سائنس کا کرشمہ ہے اور سائنس جرمنوں کے گھر کی لونڈی ہے۔'

انور کے دماغ میں اُس بڑے سے کبوتر کی تصویر گھوم گئی جو اس نے اڑتا ہوا دیکھا تھا اور اُسے یاد آیا کہ اُس کے ابا نے بتایا تھا کہ وہ موت اور تباہی پھیلاتا ہے۔

'پھر جمعدار صاحب' آپ نے جرمن کو ہرایا کیسے؟' اُس نے ہمت کر کے پوچھا۔

وہ بوڑھا سپاہی جواب دینے سے پہلے کچھ دیر رُکا 'بیٹا ایسا نہیں تھا کہ ہمارے پاس کوئی ساز و سامان

تھا ہی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پاس دشمن کے مقابلے میں کم ہتھیار تھے لیکن جس وجہ سے جرمن کی ہار ہوئی وہ بالکل ہی دوسری چیز تھی۔'

'وہ کیا چیز تھی؟ کیا چیز تھی وہ؟' انور نے بے چین ہوکر پوچھا۔

جمعدار اجیت سنگھ کو اس سوال کا جواب دینے میں کچھ جھجک ہورہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے سوال کے بارے میں رائے دینے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ 'میں تو ایک اَن پڑھ سپاہی ہوں' میں سیاست دیاست کیا جانوں؟ لیکن صُلح ہونے سے کچھ دن پہلے میں نے خندق میں ایک گورے سے یہ بات سنی تھی۔ یہ گورا نامی فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے کسی کالج میں پڑھاتا تھا۔ اس لیے وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ ہاں، تو وہ کہتا تھا کہ جرمن لوگوں نے خاص طور پر کارخانوں کے مزدوروں نے، اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ لڑائی اور زیادہ نہیں چلانا چاہتے تھے کیونکہ یہ لڑائی قیصر اور اُس کے وزیروں نے اپنی سلطنت پھیلانے کے لیے چلائی تھی۔ انھوں نے قیصر کو گرفتار کرلیا اور اپنی سرکار بنالی۔ ہزاروں جرمن سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہمیں قیصر نے بے وقوف بنا کر انگریزوں اور فرانس والوں سے لڑوادیا۔ ہمارا اُن سے کیا جھگڑا ہے۔ اب قیصر نہیں رہا تو لڑائی بھی نہیں رہے گی۔ تو بیٹا لڑائی تو جرمن لوگوں نے ہمیں جتوائی ہے۔'

لیکن پورے بیان میں جمعدار اجیت سنگھ نے لڑائی میں اپنے کسی کارنامے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اُسے وہ سارے تمغے کیسے ملے تھے؟ لیکن اب انور کے دل میں اُس کی بڑی سی کالی داڑھی کا ڈر نہیں رہ گیا تھا۔ اِس لیے اُسے سیدھے سیدھے یہ سوال پوچھ لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

'ارے یہ میڈل؟' جمعدار اجیت سنگھ نے کہا: 'یہ تو ایسے ہی ہیں۔ مجھے اِس لیے انعام میں دیئے گئے تھے کہ میں سرکار کا وفادار تھا اور جو کچھ مجھے حکم دیا گیا اُسے میں نے پورا کیا۔'

'اور،' رتن نے بات جوڑتے ہوئے کہا: 'اِس لیے بھی کہ آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی۔'

'ہاں۔' جمعدار اجیت سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا: 'ایک بار رات کو ہم نے حملہ کیا جس

میں کرنل اسمتھ صاحب زخمی ہو گئے اور جب ہم لوگ پیچھے ہٹ رہے تھے تو وہ ہمارے اور دشمن کے مورچے کے بیچ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ وہ ہمارے افسر تھے اور ہمارے ساتھ اُن کا سلوک بہت اچھا رہا تھا۔ اُن کی جان بچانے کی کوشش کرنا ہمارا فرض تھا اس لیے میں رات کے اندھیرے میں اپنی خندق کے باہر رینگ کر گیا اور اُن کو اپنے ساتھ لے آیا۔'

'لیکن کیا جرمن والوں نے آپ پر گولی نہیں چلائی؟'

ہاں ہاں چلائی کیوں نہیں۔ کسی جرمن نشانہ باز کی گولی آ کر میری ٹانگ میں لگی۔' اور یہ کہہ کر جمعدار اجیت سنگھ نے بایاں پائنچہ اُٹھا کر اپنی پنڈلی پر روپے کے برابر گھاؤ کا نشان دکھایا۔ زخم بہت دن ہوئے بھر چکا تھا لیکن اس کے خیال سے ہی انور کو متلی سی ہونے لگی تھی۔

(4)

دن بہت ڈھل چکا تھا۔ مندر کے وسیع آنگن میں مندر کا سایہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اجیت سنگھ نے سوچا کہ اکبر علی اپنے بیٹے کا انتظار کر رہے ہوں گے، اس لیے تینوں ہوٹل کی طرف لوٹ چلے۔ انور نے تو آج چھٹی کا پورا مزہ لوٹا تھا۔ لوٹتے وقت اس بات کی طرف انور کا دھیان ہی نہیں گیا کہ لوگ جلدی جلدی اپنے گھروں کو جا رہے ہیں، اُس کے چاروں طرف لوگ دبی زبان میں کھسر پھسر کر رہے ہیں اور ہر نکڑ پر پولیس والے تعینات ہیں۔

اکبر علی بہت فکر مند ہو کر اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اُن کے لیے ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ بلا وجہ فکر مند یا پریشان نہیں ہوتے تھے لیکن شہر میں بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ چار دن پہلے جو ہڑتال ہوئی تھی اُس کے سلسلے میں جنتا کے دو لیڈر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال گرفتار کر لیے گئے تھے۔ یہ خبر پا کر احتجاجی لوگوں کے ایک مجمع نے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر جلوس لے جانے کی کوشش کی تھی مگر اُن لوگوں کو ہال گیٹ پُل کے پاس ہی روک دیا گیا تھا اور پولیس نے اُن پر گولی چلائی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور کچھ لوگ مارے گئے تھے۔

اجیت سنگھ اور رتن جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل دیے اور انور کچھ بوکھلایا ہوا سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اکبر علی اُس اندھیرے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ دور سے لوگوں کے چلّانے

کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی، اُس کے بعد بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر اُن کے پیچھے بھاگتے ہوئے پولیس والوں کے بھاری جوتوں کی آواز۔ لوگوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا کہ اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پھر یکایک سناٹا چھا گیا۔ پر یہ خاموشی انور کو اور بھی بھیانک لگ رہی تھی اور اُس کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ جب اُس کے ابا نے میز پر رکھا ہوا لیمپ جلانے کے لیے ماچس جلائی تو انور چونک کر چارپائی پر سے گرتے گرتے بچا۔

اتنے میں ہوٹل کا ایک نوکر ہانپتا ہوا اور گھبرایا ہوا کمرے میں آیا۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں گڑبڑ پھیلتی جا رہی تھی۔ ہال گیٹ پُل پر پولیس نے جو گولی چلائی تھی اُس پر خفا ہو کر لوگوں نے کئی عمارتوں میں آگ لگادی اور بہت سے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

جب نوکر وہاں سے چلا گیا تو اکبر علی نے پھر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ حالات نے جو شدّت اختیار کر لی تھی۔ اُس کا انور کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ وہ بالکل چپ بیٹھا رہا۔ سنہری مندر کے جس خوب صورت ماحول میں اس نے سارا دن بتایا تھا۔ تالاب کا وہ ٹھہرا ہوا پانی، رحم دل اجیت سنگھ کا پیار بھرا برتاؤ اور رتن کی دوستی۔ وہ دنیا دفعتاً چکنا چور ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی کئی بندوقیں ایک ساتھ چلنے کی آواز اور پھر رُک کر مشین گن چلنے کی تڑتڑاہٹ۔

(5)

13 اپریل 1919—انور اِس تاریخ کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

اُس دن آسمان اور دنوں سے زیادہ صاف اور سورج کی روشنی اور دنوں سے زیادہ تیز تھی۔ انور کو جو دو دن ہوٹل میں بند رہ کر بتانے پڑے تھے، وہ ماضی کا ایک بھولا بسرا واقعہ معلوم ہو رہا تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑیاں خوشی سے چہک رہی تھیں۔ اور ہاتھ منہ دھوتے وقت یا کپڑے بدلتے وقت انور برابر یہی امید کر رہا تھا کہ آج رتن سے اُس کی ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ اپنے دوست سے کئی دن سے نہیں ملا تھا اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس سے بچھڑے ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔

اکبر علی نے اخبار الگ رکھتے ہوئے بتایا کہ شہر کی حالت بہت سُدھر گئی تھی اور کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے اُٹھ کر اپنی شیروانی پہنی اور اُون کے بیوپاریوں سے حساب کتاب کرنے کے لیے بازار جانے کی تیاری کرنے لگے کیونکہ یہ کام دو دن سے ٹل رہا تھا۔ چلنے سے پہلے انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا: 'اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو ہم لوگ کل واپس لوٹ سکتے ہیں۔'

انور اکیلا رہ گیا تھا۔ اُس کا ساتھ دینے کو وہاں صرف اُس کے خیال تھے۔ اُس نے سڑک کے پتھروں پر یکایک بھاری جوتوں کی آواز سنی اور بھاگ کر چھجے پر دیکھنے پہنچ گیا۔ ایک فوجی دستہ شہر کی گشت پر جا رہا تھا۔ آگے آگے سِکھ گھوڑ اسوار تھے۔ اُن کے پیچھے ایک موٹر میں کچھ لال منہ والے انگریز افسر تھے۔ ان انگریز افسروں کے پاس پستول تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت چلا دیں گے۔ سب سے پیچھے گورکھوں کا ایک دستہ تھا جن کے سروں پر ایک طرف کو بے حد جھکے ہوئے ٹوپ لگے ہوئے تھے اور پیٹیوں سے کھکھریاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہوٹل کا نوکر بغل والے کمرے میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ اُس نے اچانک اِس فوجی دستے کو دیکھ کر جو اب دوسری سڑک پر مڑ رہا تھا، بڑی نفرت کے ساتھ زمین پر تھوکا اور بولا 'سور کے بچے ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں۔'

انور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرسی پر لیٹ گیا اور چڑیوں کی حرکتیں دیکھنے لگا۔ ماں اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہی تھی اور اُنھیں اڑنا سکھا رہی تھی۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور رتن اندر داخل ہوا۔ 'رتن! میرے یار'۔ انور مارے خوشی کے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شروع شروع میں تو دونوں کچھ ہچکچاہٹ میں پڑے رہے لیکن جلد ہی دونوں جی کھول کر باتیں کرنے لگے اور ہنسنے لگے اور دن بھر کے پروگرام بنانے لگے۔ رتن نے انور کو بتایا کہ آج بیساکھی کا تہوار ہے اور شہر میں بہت بڑا میلہ لگے گا۔ نئے سال کا تہوار بیساکھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ آس پاس سے آئے ہوئے کسانوں کی بھیڑ سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ انور نے سوچا اِس بھیڑ کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بڑا مزہ رہے گا۔ انور نے اپنے ابا سے شہر جانے کی اجازت نہیں لی تھی لیکن اُس کے ابا نے اُسے ہوٹل سے باہر نکلنے کے لیے منع بھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر وہ لوگ تو ابا کے واپس لوٹنے سے بہت پہلے ہی گھنٹے دو گھنٹے میں بازار گھوم کر لوٹ

آ ئیں گے۔ فضا میں ایک عجیب جوش تھا۔ اُس کے دل میں ایک انجانا تجربہ کرنے کا دُھندلا سا جذبہ تھا اور اُسے سب سے بڑا سہارا یہ تھا کہ رتن اس کے ساتھ تھا۔ انور اپنے دوست کے ساتھ نکل پڑا۔ اُس کا دل ہمیشہ سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

سڑکوں پر لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے کالے رنگ کے کسانوں کی بھیڑ تھی۔ اُن کے سر پر بڑی بڑی پگڑیاں، بدن پر کھدّر کے کپڑے اور پیروں میں نوکدار جوتے تھے جن پر گرد کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی۔ انور نے سوچا یہ اُسی بڑی سڑک کی گرد ہوگی۔ دونوں لڑکے بازاروں میں بے مقصد گھومتے رہے۔ کبھی کسی دکان کے آگے رُک کر اُس میں سجی ہوئی چیزیں دیکھنے لگتے اور پھر بھیڑ کے ساتھ آگے بڑھ جاتے۔ نہ تو اُن کو سمت کا خیال تھا اور نہ وقت کا احساس۔

ایک سڑک کے نکّڑ پر انور کی ہی عمر کے ایک لڑکے کے چاروں طرف ایک بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ وہ لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھا اور ایک دکان کے تختے پر کھڑا ہوکر ٹین کا پیپا بجا کر ڈُگی پیٹ رہا تھا۔ انور نے سوچا یہ تو سچ مچ کوئی مزیدار بات ہوگی۔

ڈُگی پیٹنے والے لڑکے نے کافی بڑی بھیڑ جمع کرنے کے بعد اُونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔ 'بھائیو! آج شام کو چار بجے جلیاں والہ باغ میں لالہ ہردیال کی صدارت میں ایک عام جلسہ ہوگا۔ آپ سب لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوکر جلسے کو کامیاب بنایئے۔' پھر اُس نے ٹین کو کئی بار لکڑی سے پیٹا اور دُکان کے پٹرے پر سے نیچے کود کر، دوسری جگہ ڈُگی پیٹنے چلا گیا۔

انور کبھی کسی عام جلسے میں نہیں گیا تھا اور اُسے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ آخر یہ عام جلسہ کیسا ہوتا ہے۔ رتن کو زیادہ آزادی ملی ہوئی تھی اس لیے وہ اس طرح کی کئی میٹنگیں دیکھ چکا تھا۔ اس نے انور کو بتایا کہ ان میٹنگوں میں بہت مزہ آتا ہے اور کسی بھی حالت میں اِن میں جانے سے نہیں چوکنا چاہیے۔

'تو پھر چلو اس میں چلیں گے۔' انور نے بڑے جوش سے کہا: 'اُس لڑکے نے کیا بتایا تھا کہ میٹنگ کہاں ہوگی؟ کس باغ میں؟'

'جلیاں والہ باغ میں۔' امرتسر کے باشندے رتن نے جواب دیا۔

(6)

جب وہ باغ میں گھسے تو انور کو کچھ نا اُمیدی ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ باغ بھی دلّی کے باغوں اور پارکوں کی طرح ہوگا۔ ہری ہری مخملی گھاس، سایہ دار درخت، پھولوں کی کیاریاں اور فوارے۔ لیکن یہ باغ تو دور تک پھیلا ہوا ایک بنجر علاقہ تھا جس کے بیچ میں ایک سفید مقبرے کے کھنڈر تھے۔ ایک کونے میں تین چار پیڑ تھے اور اُن کے پاس ہی ایک بالکل اکیلا تاڑ کا پیڑ کھڑا تھا جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جھک گئی تھی۔ سارا علاقہ چاروں طرف کے مکانوں سے بالکل گھرا ہوا تھا۔ بس اس میں گھسنے کے لیے ایک ہی پھاٹک تھا۔ لیکن عمارتوں کے بیچ میں جہاں کہیں جگہ چھوٹی ہوئی تھی، اُس میں سے ہوکر اکادُکا لوگ میدان میں آکر جمع ہونے لگے تھے۔

دونوں لڑکے اپریل کی تیز دھوپ سے بچاؤ کی کوئی جگہ ڈھونڈ رہے تھے، پر کوئی جگہ دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے میدان بھرنے لگا۔ پھاٹک کے پاس لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنایا گیا تھا جس پر کھڑے ہوکر لوگ تقریر کرنے والے تھے۔ رتن بھیڑ کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا پلیٹ فارم کے جتنا پاس ہوسکتا تھا پہنچ گیا۔ اُس نے کہا: 'اگر ہم پلیٹ فارم کے پاس نہیں بیٹھیں گے تو ہمیں کچھ بھی نہیں سنائی دے گا۔' سب کی طرح وہ بھی زمین پر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی قُربت کا مزہ لینے لگے۔ جلد ہی چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی اور اُن کی تعداد لگاتار بڑھتی ہی جارہی تھی۔

انور کے ابّا نے اُسے ایک گھڑی دی تھی۔ اُس نے گھڑی دیکھی کہ اب بھی اسے کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ گھڑی میں ساڑھے چار بجے تھے۔ رتن نے انور کو کُہنی سے ٹھیلتے ہوئے کہا: 'دیکھو دیکھو میٹنگ شروع ہورہی ہے۔'

پلیٹ فارم پر ایک مقرر کے آتے ہی بھیڑ میں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے باتیں کرنا بند کر دیا۔ مقرر نے کہا کہ 'عوام کے مقبول لیڈر ڈاکٹر کچلو صدارت کریں گے۔' اُس نے کہا 'ہاں، میں جانتا ہوں کہ سرکار نے اُن کو نظر بند کر رکھا ہے لیکن وہ ابھی تک ہمارے دلوں میں موجود ہیں۔' یہ کہہ کر اس نے کرسی پر ڈاکٹر کچلو کی ایک تصویر رکھ دی۔ ڈاکٹر کچلو بہت خوب صورت آدمی تھے اور اُن کے ایک چھوٹی سی کالی داڑھی تھی چاروں طرف سے کانوں کو بہرا کر دینے والی تالیوں کی

زوردار آوازوں کو چیرتا ہوا ایک زوردار نعرہ اِس طرح گونج اُٹھا جیسے سمندر میں جوار کی بڑی لہر اَن گنت چھوٹی چھوٹی لہروں کو روند کر آگے بڑھ جاتی ہے۔'انقلاب زندہ باد!'۔ انور 'انقلاب' کے لفظ کا پورا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بس موٹے موٹے طور پر یہ جانتا تھا کہ جب کوئی بنیادی اُتھل پتھل ہوتی ہے تو اسے انقلاب کہتے ہیں۔ پر نہ جانے کیوں اِس نعرے سے اُس کے سارے بدن میں جوش کی چنگاریاں سُلگ اُٹھیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کا ایک ایک رونگٹا نوچے لے رہا ہے۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا اور اُس کا سر اسی طرح چکرانے لگا جیسے ایک بار لُو لگ جانے پر ہوا تھا۔ اُس نے رتن کی طرف دیکھا اور اُسے ایسا لگا کہ اُس کے دوست کے جذبات پر بھی ایسا ہی اثر ہوا تھا۔ اُس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ دانت پیس رہا تھا اور اُس کی پیلی پگڑی میں سے پسینہ بہہ کر باہر آ رہا تھا۔ حقیقت میں سارے مجمع نے جوشیلی آواز میں اِس نعرے کو دہرایا۔ انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! بیس ہزار انسانوں کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی اور پھر وہ چاروں طرف کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ اُونچی ہوتی گئی اور پھر دفعتاً خاموش ہوگئی کیونکہ لوگ دم لینے کو رُک گئے تھے اور پھر ایک بار یہی سلسلہ جاری ہوگیا۔ انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! صرف اِن دو لفظوں کو بار بار دہرانے سے ایک جوش سا پیدا ہو جاتا تھا۔ انور کے لیے یہ بالکل ویسا ہی تجربہ تھا جیسے پانی پت کی قوّالی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ بالکل ہی دوسری قسم کی قوّالی تھی اور اس سے دل میں جذبات کا جو طوفان اُٹھتا تھا اُس میں درگاہ والا روحانی نشہ نہیں تھا بلکہ میدانِ جنگ کا جنون تھا جس کا ذکر رتن کے بابا نے کیا تھا۔

آخر میں جب نعرے بازی ختم ہوئی تو تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا اور لہر کے اس اُتار نے انور کو بہت ہی مایوس کر دیا۔ ان تقریروں میں ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کی گئی۔ دس تاریخ کو فائرنگ میں جو لوگ شہید ہوئے تھے اُن سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور سرکار سے لیڈروں کو رہا کر دینے اور رَولٹ بل کو رد کر دینے کی درخواست کی گئی۔ کسی نے بہت ہی ماتمی آواز میں ایک نظم پڑھی جس میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا کہ عوام کی فریاد پر غور نہیں کیا جا رہا تھا اور بیچ بیچ میں لوگ' ہندو مسلمان کی جے' کا نعرہ لگا دیتے تھے۔ لیکن اِن سب میں اُس 'انقلاب' کے

بارے میں ایک بھی لفظ نہیں تھا جس کے بارے میں وہ ابھی کچھ دیر پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاّ رہے تھے۔ انور کو یہ ساری باتیں غیر دلچسپ معلوم ہوئیں اور اُسے ایسا لگا کہ یہ لوگ بات کو بہت گھما پھرا کر کہہ رہے ہیں۔ وہ حالات کی باریکیوں کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کی سمجھ میں تو بس اتنا ہی آیا تھا کہ سرکار نے جنتا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا اور لوگوں میں اس بات پر بڑا غصہ اور دُکھ تھا۔ 'انقلاب زندہ باد' کے نعروں سے جو جوش پیدا ہوا تھا وہ اب ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا اور مجمع پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پارک کے ایک سرے پر کچھ لوگوں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے اور بیچ بیچ میں کہیں سے کسی بچے کے رونے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ انور گھر واپس جانا چاہتا تھا اور اُسے ایک دم جمعدار اجیت سنگھ کو آتا دیکھ کر بہت اُمید بندھ گئی۔ جمعدار صاحب کو رتن کو وہاں دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔

'ارے رتن، یہ تیرا کیا طریقہ ہے؟ تو مجھے بغیر بتائے گھر سے چلا آیا اور اکبر صاحب کے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اُس کے ابّا اس کے لیے بے حد پریشان ہو رہے ہیں، چلو دونوں اب چلو یہاں سے۔'

انور جمعدار صاحب کے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھا تو وہ یہ سوچ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ وہ اپنے ابّا کو کیا بتائے گا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا لیکن اتنے میں آسمان پر ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور سب لوگ سر اوپر اُٹھا کر ہوائی جہاز کو دیکھنے لگے۔ ایک شکاری چڑیا کی طرح ہوائی جہاز اُن کی طرف جھپٹتا چلا آ رہا تھا۔ وہ نیچے آتا چلا جا رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اُن کے بیچ میں ہی گر پڑے گا۔ مرد گھبرا کر اُسے دیکھ رہے تھے، عورتیں چلاّ رہی تھیں اور بچے ڈر کے مارے چیخ رہے تھے۔ لیکن اچانک ہوائی جہاز پھر اُونچا اُٹھنا شروع ہوا اور تھوڑی دیر میں وہ دُور صرف ایک دھبّے کی طرح دکھائی دینے لگا۔ مُقرر نے اپنی تقریر پھر شروع کی۔ جو لوگ گھبراہٹ کے مارے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، وہ پھر بیٹھ گئے اور انور اور رتن جمعدار صاحب کے پیچھے چل دیئے۔ جمعدار اجیت سنگھ اپنی فوجی وردی اور تمغوں کا رُعب ڈالتا ہوا بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھتا رہا پر ایک بار پھر انھیں رُک جانا پڑا۔ کسی نے خبردار کر دیا اور فوراً ہی یہ خبر سارے مجمع میں گونجنے لگی۔ 'وہ آ گئے۔ وہ آ گئے۔'

(7)

انور نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ پھر اُس نے پبلک کی طرف نظر دوڑائی اور جو کچھ اس نے دیکھا اُسے دیکھ کر اُس کا خون جم گیا۔

تیس یا چالیس انگریز اور گورکھا سپاہیوں کا ایک دستہ آکر باغ کے پھاٹک کے سامنے تعینات ہو گیا تھا۔ اُن سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ کچھ گورے افسروں کے پاس ریوالور بھی تھے۔ اُن میں وہ لال منہ والا افسر بھی تھا جسے انور نے اکثر موٹر پر فوجی سپاہیوں کے ساتھ گشت لگاتے دیکھا تھا۔

اس کے بعد پلک جھپکتے میں جو واقعات ہوئے وہ انور کی سمجھ سے باہر تھے۔ پر وہ اس کی یادداشت پر سالہا سال تک اپنا بھیانک عکس چھوڑ گئے۔ انور مورتی بنا ایک جگہ پر کھڑا تھا اور سارے واقعات ایک سپنے کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ اسے اتنا گہرا دماغی صدمہ پہنچا تھا کہ اُسے ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں پار ہا تھا کہ اُس کے چاروں طرف جو حادثے ہو رہے ہیں اُن کی اہمیت کیا ہے؟ لال منہ والے افسر نے گورکھوں سے چلّا کر کچھ کہا اور انھوں نے اپنی بندوقیں تان لیں اور بھیڑ کی طرف نشانہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ 'فائر' حکم ہوا اور گورکھوں نے تعمیل کی لیکن انور نے دیکھا کہ گولی چلانے سے پہلے انھوں نے اپنی بندوقوں کا منہ کچھ اوپر اُٹھا رکھا تھا۔ یکا یک گولیوں کی منحوس بوچھار نے خاموشی کو کانچ کی دیوار کی طرح چکنا چور کر دیا۔ پیڑوں پر سے کبوتروں اور کوؤں کا جھنڈ شور کرتا ہوا اُڑ گیا۔ چاروں طرف بھاگ دوڑ مچ گئی۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ عورتوں نے اپنے بچّوں کو اس طرح سینے سے لگا لیا۔ جیسے باز کے جھپٹنے پر مرغی اپنے بچّوں کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ پر کوئی گولی سے زخمی نہیں ہوا بلکہ بھیڑ میں سے کسی نے چلّا کر کہا بھی۔ 'ڈرو نہیں۔' وہ خالی کارتوس چلا رہے ہیں۔' کچھ لوگ بھاگتے بھاگتے رُک گئے اور کچھ پلٹ کر سپاہیوں کا سامنا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ لال منہ والا انگریز غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اپنا ریوالور ہلا ہلا کر گورکھوں سے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہہ رہا تھا۔ 'ٹم شالا سُوَر کا بچہ لوگ اتنا اونچا میں گولی کیوں چلاتا ہے، نیچا میں گولی چلاؤ نہیں تو ہم ٹم کو گولی مار دے گا۔' سارے گورے افسروں نے اپنے

اپنے ریوالور نکال لیے اور گورکھوں کی طرف نشانہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ لال منہ والے افسر نے حکم دیا 'فائر!'۔ اور گورکھوں نے گولی چلا دی۔ اِس بار اُن کی رائفلوں کی نلیاں سیدھی بھیڑ کی طرف تھیں۔ 'لیٹ جاؤ' جمعدار اجیت سنگھ نے بالکل فوجی طریقے سے حکم دیا اور دونوں لڑکے فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ بچ نہ سکتے۔ کیونکہ وہ زمین پر لیٹے ہی تھے کہ اُن کے اُوپر سے گولیاں سنسناتی ہوئی گذر گئیں۔

انور زمین پر اوندھا لیٹا لیٹا یہ ناٹک دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لیے یہ بے حد بھیانک تجربہ تھا۔ رائفلیں کتّوں کی طرح بھونک رہی تھیں، گولیوں کی بوچھار ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رُکی تھی۔ مرد عورتیں اور بچے چاروں طرف گولیوں کا شکار ہو کر گر رہے تھے۔ ہر طرف لوگوں کی چیخ پکار اور کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ باغ سے باہر نکلنے کے تنگ راستوں کی طرف بھاگتے ہوئے لوگوں کو اپنے جوتوں اور پگڑیوں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا، کچھ لوگوں کی تو دھوتیاں تک پیچھے رہ گئی تھیں۔ جو لوگ زمین پر لیٹے ہوئے تھے انھیں اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے بھاگنے والے آگے بڑھے جا رہے تھے۔ ایک بار تو انور کی ٹانگ پر بھی کسی کا بھاری سا بوٹ پڑا اور اس کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ جو لوگ باہر نکلنے کے راستوں تک پہنچ بھی گئے۔ اُن کی بھی خیریت نہیں تھی۔ اس لال منہ والے افسر نے رائفلوں کے منہ اُن کی طرف کروا دیے اور باہر نکلنے سے پہلے ہی انھیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔

اُن کے چاروں طرف مرے ہوئے دم توڑتے ہوئے اور زخمی لوگ پڑے تھے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بیچ ان کی خوفناک چیخیں اور 'یا اللہ' اور 'ہے بھگوان' اور 'ارے میری ماں' کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ اُن کے پاس ہی کوئی آدمی بہت زور سے کراہ رہا تھا۔ انور نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ہوٹل کا نوکر نندو نکلا۔ اُسے دیکھنے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ گولی اُس کے پیٹ میں لگی ہے کیونکہ جب بھی درد کی لہر اُٹھتی تھی وہ اپنا پیٹ پکڑ لیتا تھا۔ ایک بار اُس نے بڑی کوشش کر کے اپنا سر ذرا سا گھمایا اور دونوں ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر زور سے تھوکا— خون!

نندو کے منہ سے گاڑھا گاڑھا کتھئی رنگ کا خون نکلتے دیکھ کر انور کو متلی ہونے لگی۔ نندو نڈھال ہو کر پھر پہلے کی طرح لیٹ گیا تھا اور خون کی ایک پتلی سی دھار اُس کے منہ کے ایک

کو نے سے دھیرے دھیرے ۔ ۔رہی تھی۔ یوں تو ہر طرف لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے، لیکن یہ تو ایک ایسا آدمی تھا جسے وہ جانتا تھا، جس کے ساتھ وہ باتیں کر چکا تھا اور ہنس چکا تھا۔ نندو ایک نوجوان آدمی تھا اور ابھی کل ہی تو اُس نے انور کو بتایا تھا کہ حال ہی میں اُس کی شادی ہوئی ہے۔ ایک پل کے لیے سارے مجمع کا درد نندو کی اِس تکلیف میں سمٹ آیا۔

انور کے لیے اپنے آپ کو اور زیادہ قابو میں رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ انجانے ہی میں وہ کہنی کے بل کچھ اوپر کی طرف اُٹھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر تڑپتے ہوئے نندو کی طرف اشارہ کر کے اُونچی آواز میں بولا۔ ’جمعدار صاحب، جمعدار صاحب، اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے کیا؟‘

’سر نیچے کرو۔‘ جمعدار اجیت سنگھ نے کڑک کر حکم دیا، انور نے کھٹ سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ وہ بال بال بچ گیا کیونکہ اُسی وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی اُس کے پاس سے نکل گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ موت کے منہ سے کس طرح بال بال بچ گیا تھا، انور کے سارے بدن سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔

اجیت سنگھ نندو کو دیکھ رہا تھا۔ ’زیادہ کچھ تو ہم کر نہیں سکتے لیکن کم سے کم اُسے پیٹ کے بل اوندھا تو لٹا ہی دینا چاہیے تاکہ خون بہہ جائے اور وہ اطمینان سے مر سکے۔‘ یہ کہہ کر وہ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا نندو کے پاس پہنچ گیا۔ انور اور رتن دَم سادھے بڑی فکر کے ساتھ اُسے دیکھتے رہے۔ نندو خون کا بہاؤ روکنے کی کوشش میں اپنا پیٹ دونوں ہاتھ سے دبائے تھا۔ جمعدار اجیت سنگھ نے آہستہ سے اُسے پلٹ دیا اور فوراً ہی اس کی تکلیف کم ہو گئی۔ انور اپنا منہ زمین سے لگا کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ لیکن اُن کے اوپر گولیاں اب بھی اپنا خوفناک موت کا سنگیت سنا رہی تھیں۔ جب اجیت سنگھ پھر رینگ کر اپنی جگہ پر واپس لوٹا تو اس کے چہرے پر غُصّے کا ایک نیا وحشیانہ رنگ اُبھر آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

’کیا سرکار پاگل ہو گئی ہے؟ کیا سرکار پاگل ہو گئی ہے؟‘ اس نے کئی بار دُہرایا اور پھر اس سے پہلے کہ رتن اور انور اسے روک سکتے، اجیت سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سیدھا اُن سپاہیوں کی طرف بڑھا جن کی بندوقیں موت اُگل رہی تھیں۔

’او ئے جرنیل صاحب۔‘ اُس نے کسی بھی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زور سے کہا۔ ہر

طرف چلتی ہوئی گولیوں کی منحوس سنسناہٹ کو چیرتی ہوئی، اُس کی کڑک دار آواز گونج اُٹھی۔

چاروں طرف سنسناتی ہوئی گولیوں کے بیچ اُس نے ایک بار پھر چلّا کر کہا۔ 'اوئے جرنیل صاحب۔ میں لڑائی میں آپ کی طرف سے لڑ چکا ہوں۔ میں نے ایک انگریز افسر کی جان بھی بچائی تھی۔ اگر میری بات پر یقین نہیں ہے تو ان تمغوں کو دیکھ لو! لیکن یہ تو لڑائی نہیں ہے— آپ نہتے لوگوں پر گولی نہیں چلا سکتے۔ اگر اسی طرح آپ گولی چلاتے رہے تب تو آپ بیس ہزار لوگوں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ ہم نے تو کبھی نہتے جرمنوں پر بھی گولی نہیں چلائی۔'

جمعدار اجیت سنگھ کو اِس طرح آگے بڑھتا دیکھ کر کچھ ڈر بھی لگتا تھا۔ پر ساتھ ہی ساتھ فخر کا احساس بھی ہوتا تھا۔ انور دنگ ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اُس کی جان خطرے میں ہے۔ سارا مجمع حیرت سے بُت بنا اُسی طرف دیکھ رہا تھا اور ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس بوڑھے نے بندوق والے سپاہیوں پر جادو کر دیا ہو، ایک لمحے کے لیے اُن کی اُنگلیاں بندوق کی لبلبیوں پر جمی رہ گئیں۔

جمعدار اجیت سنگھ اُس لال منہ والے افسر سے کچھ ہی گز کی دوری پر رہ گیا تھا۔ وہ لال منہ والا افسر چبوترے پر ہاتھ میں ریوالور لیے نشانہ تانے کھڑا تھا۔ 'بولو صاحب بولو۔ اپنے سپاہیوں کو گولی چلانا بند کرنے کا حکم دو۔' اجیت سنگھ کی آواز میں اب بھی چیلنج تھا، پر اس کی کڑک دار آواز کچھ لڑکھڑانے لگی تھی۔ 'جرنیل صاحب ہم سب لوگ سرکار کے وفادار ہیں، ہم میں سے کوئی بھی باغی یا غدار نہیں ہے۔ آپ ہم لوگوں پر کیوں اِس طرح گولی چلا رہے ہیں؟ سرکار! ہمارے اُوپر رحم کرو۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں.....' اُس کی آواز میں چیلنج کی جو کڑک تھی وہ غائب ہو کر خوشامد کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بدل گئی۔ یہ کہہ چکنے کے بعد اجیت سنگھ کا تیس برس کی عادت سے سَدھا ہوا ہاتھ مشین کی طرح اُوپر اُٹھا اور اُس نے ایڑیاں کھڑا کر کے اُس گورے افسر کو فوجی سلام جھاڑا۔

اُسی وقت ایک گولی دغنے کی آواز گونج اٹھی اور جمعدار اجیت سنگھ کا جسم ایک لمحے کے لیے کھڑا رہ گیا۔ اُس کا ہاتھ ابھی تک ماتھے سے لگا ہوا تھا جیسے کہ وہ یوں ہی دائمی سلام کرتا کھڑا رہے گا۔

وہ اِس طرح کھڑا تھا جیسے اب آگے قدم بڑھانے والا ہو لیکن ایک پل میں وہیں اچانک

زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ گولی چلنا بند ہوگئی۔ لال منہ والے افسر نے اپنے سپاہیوں کو کچھ حکم دیا اور سارے افسر اور سپاہی قدم ملائے ہوئے پھاٹک سے باہر چلے گئے۔ جلیان والہ باغ پر موت کا سناٹا چھا گیا جو گولیوں کی آواز سے بھی بھیانک تھا۔ انور اور رتن پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جمعدار اجیت سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔ گولی ایک تمغے کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی تھی۔ اجیت سنگھ مر چکا تھا۔

انور سے جمعدار اجیت سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ اُس کے چاروں طرف زمین پر لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے جیسے گیہوں کی فصل کاٹ دی گئی ہو۔ ایک بچّہ اپنی ماں کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ماں ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔ انور کی ہی عمر کا ایک اور لڑکا بے جان پڑا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون دکھائی دیتا تھا۔ انور کا سر چکرانے لگا۔ اسے متلی ہو رہی تھی۔ لاکھ چاہنے پر بھی وہ اُلٹی نہ کر سکا۔ اُس نے اپنا سر زمین پر ٹکا دیا اور اُسے ایسا لگا کہ آسمان گھوم رہا ہے، ستارے ناچ رہے ہیں، موت کا ناچ ناچ رہے ہیں اور کھجور کا وہ ٹیڑھا پیڑ بھی تو ناچ رہا تھا۔ لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے انور نے رتن کے چہرے کی جھلک دیکھی۔ رتن کے چہرے پر رنج یا دُکھ نہیں تھا بلکہ وہ دور خلاؤں میں تک رہا تھا۔ وہ سسکیوں کو روکنے کے لیے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بدلے کی آگ دہک رہی تھی۔

○

ساری دنیا سے اوپر

(1)

وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے اور بچپن میں تو بدن کے ہی نہیں، دل کے گھاؤ بھی بہت جلدی بھر جاتے ہیں لیکن انور کے لیے امرتسر کے اُس دلخراش حادثے کو بھول جانا آسان نہیں تھا۔ اُس پورے قتل عام سے بھی بڑھ کر جمعدار اجیت سنگھ اور ننددو کی موت سے اُس کے دل پر بہت گہرا زخم لگا تھا۔ اُس حادثے کے آٹھ مہینے بعد بھی اُن دونوں کی صورتیں انور کو سپنے میں دکھائی دیتی تھیں۔ جب بھی وہ اپنے دوست رتن کے بارے میں سوچتا اُسے اُس کی آنکھوں میں وہی انتقام کی آگ دہکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وہ اُس دلخراش اور ذلت آمیز حادثے کو بھی نہیں بھولا تھا جس کا ذکر اُس نے آج تک کسی سے نہیں کیا تھا۔

امرتسر سے چلنے سے ایک دن پہلے جب کہ اُس کے ابّا بازار گئے ہوئے تھے، انور چپکے سے ہوٹل سے نکل کر شہر کے اُس علاقے میں گیا تھا جہاں رتن اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس تنگ گلی کے نکڑ پر کچھ گورے سپاہی بندوقوں پر سنگینیں لگائے کھڑے تھے۔ ایک بار تو انور کے جی میں آیا کہ وہ اُلٹے پیر واپس آجائے لیکن وہ اُس دن کے قتل عام کے بعد سے اپنے دوست سے ملا نہیں تھا۔ اور دوسرے دن وہ دلّی واپس جا رہا تھا۔ کون جانے پھر کب ملنا ہو؟ انور

ڈرتا ڈرتا سڑک کے کنارے کنارے سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ لیکن اُس نے گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اُس کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیا اور اُسے گلی کی اوبڑ کھابڑ اور گندی زمین پر رینگ کر چلنے پر مجبور کیا۔ بالکل چوہے کی طرح رینگ کر۔ بیچ میں وہ ایک بار اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کرنے کے لیے رُک کر ذرا سا اُوپر اُٹھا ہی تھا کہ کسی نے بھاری فوجی بوٹ سے اُسے ٹھوکر ماری۔ غصّے اور لاچاری سے انور کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ انور کو اپنی زندگی میں اتنی بڑی ذلت نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔ اتنی لاچاری بھی اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اتنا بوکھلا گیا کہ اُس نے اپنے ابّا سے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔

(2)

وقت ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے اور بچپن میں ان گنت ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں جو ماضی کی دُکھ بھری یادوں کو بھلائے رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انور کو دن بھر میں فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی مولوی صاحب سے قرآن پڑھتا تھا اور اُس کے بعد جلدی سے اُلٹا سیدھا کچھ کھا کر اسکول بھاگتا تھا۔ گرمیاں بہت دن ہوئے بیت چکی تھیں اور پھر برسات آ گئی تھی۔ اور اب تو برسات بھی ختم ہو کر سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ انور کو سردیوں کا موسم سب سے اچھا لگتا تھا۔ یہ لحاف کا موسم ہوتا تھا جو رات کے وقت اپنی گرم آغوش میں چھپا لیتا تھا۔ یہ گرم گرم کھچڑی کے اُوپر جمے ہوئے گھی کا ڈلہ رکھ کر کھانے کا موسم تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے ہمالیہ پہاڑ کے اُوپر برفیلی چوٹی ہو۔ جس کی تصویر اُس نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں دیکھی تھی۔ یہ رس دار گنّے چوسنے کا موسم تھا۔ اور یہی بیر کھانے کا موسم بھی تھا جو کھانے کے کام بھی آتی تھیں اور اُن کی گٹھلیاں اسکول کی کھانے کی چھٹّی کے دوران کھیلنے کے کام بھی آتی تھیں۔

اپنی عمر کے بچّوں کے درمیان انور کو اسکول کی زندگی میں بہت مزا آتا تھا، حالانکہ شرمیلی فطرت ہونے کی وجہ سے اُس کے دوست بہت نہیں تھے۔ آج کل اُسے اپنے ابّا کے کمرے میں بیٹھ کر وہاں کی بات چیت سننے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سرکار نے اُس لال منہ والے افسر کو سزا دینے سے انکار کر دیا تھا اور ملک میں سیاسی ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اسکول میں

ماسٹر صاحب نے لڑکوں کو یہ بتایا تھا کہ انگریز سرکار بہت انصاف پرست اور فیاض سرکار ہے اور بچّوں کو اسکول میں 'برٹش راج کی دین' کی ایک لمبی فہرست یاد کرائی جاتی تھی۔ ریلیں، سڑکیں، اسکول، ڈاک تار وغیرہ۔ انور کے دماغ میں جلیان والہ باغ کا منظر، ان ساری چیزوں پر ایک بھیانک سوالیہ نشان کا سایہ ڈالتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگتا تھا کہ ماسٹر جی (جو ہر وقت بیت پھٹکارتے رہتے تھے اور اکثر لڑکوں کو سزا دینے کے لیے اُسے استعمال بھی کرتے تھے)، وہ نہ اُس کی بات سمجھیں گے، نہ اُس کے ساتھ ہمدردی جتائیں گے۔

(3)

انور کے چاروں طرف کی دنیا میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کے اور اُس کی بہن کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے حالانکہ وہ اب بھی ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ دونوں اسکول جانے لگے تھے لیکن اب انجم کو مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھوپھی اماں نے اُس کی قرآن کی پڑھائی چھڑانے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ انجم اب گیارہ برس کی ہونے کو آئی، اب اُسے پردہ کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انجم کبھی کبھار کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی اور وہ بھی پھوپھی اماں کی طرح سر سے پیر تک بُرقع اوڑھے بغیر باہر نہیں جا سکتی تھی۔ بُرقع کے خیال سے ہی انور کا دَم گھٹنے لگتا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک پوری چھولداری اوڑھ کر عورتیں سانس کیسے لے پاتی ہوں گی۔

ایک دن جب گلابو بیٹھی انجم کا بُرقع سی رہی تھی اور انجم اپنے پہلے بُرقعے کی خوشی میں اِترا رہی تھی، انور نے اپنی پھوپھی سے پوچھا: 'پھوپھی اماں، جب عورتیں باہر نکلتی ہیں تو انھیں بُرقع کیوں پہننا پڑتا ہے؟'

پہلے تو پھوپھی اماں انور کے اس دوٹوک سوال کو سُن کر بہت چکرائیں، پھر انھوں نے کسی طرح یہ جواب دیا۔ 'بیٹا، عورتوں کو پردہ اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے مذہب اسلام میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔'

انور کو بھلا اس جواب سے کہاں تسلّی ہوتی۔ اُس نے دوسرا سوال کیا۔ 'لیکن ہمارے مذہب میں صرف عورتوں کے لیے ہی پردہ کیوں بتایا گیا ہے، مردوں کے لیے کیوں نہیں؟'

'اس لیے...... اس لیے کہ......' پھوپھی اماں نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ 'سڑک پر چلنے

والے لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں اور وہ عورتوں کو بُری نیت سے گھورتے ہیں۔'

'بُری نیت؟' یہ انور کے لیے ایک نئی پہیلی تھی، یہ زندگی کا کوئی ایسا راز تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چاوڑی بازار میں مردوں کو گھورتے دیکھا تھا۔ کیا وہ بری نیت سے اُنھیں گھورتے ہیں؟ اُن کی بُری نیت کیا ہوتی ہے؟ شاید کسی عورت کے گہنے چھین لینے کو بُری نیت کہتے ہوں۔

اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا 'پھوپی اماں، اگر آپ بغیر بُرقع اوڑھے باہر نکلیں تو کیا لوگ آپ کو بھی بُری نیت سے دیکھیں گے؟' اور وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا یہ سوال سنتے ہی پھوپھی اماں کے جھری دار چہرے پر لالی کیوں دوڑ گئی اور ان کی آواز بھرّا کیوں گئی۔

لیکن انجم شاید پردے میں رہنے کے خیال سے خوش تھی۔ اپنے بُرقعے کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو اُٹھتی تھی اور یہ محسوس کرنے لگتی تھی کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے اور اُس کی بھی کچھ اہمیت ہو گئی ہے۔ یہ بات انور کی سمجھ کے باہر تھی اور اُسے ایسا لگتا تھا کہ شاید انجم پھوپی اماں کو دکھانے کے لیے ہی سب کرتی ہے لیکن انجم میں ایک دوسری تبدیلی بھی آ رہی تھی۔

وہ اپنا بہت سارا وقت پھوپی اماں اور گلابو سے کھانا پکانا اور سینا پرونا سیکھنے میں صرف کرنے لگی تھی۔ اور انور کے لیے سب سے بڑی پہیلی تو یہ تھی کہ انجم اب پہلے کی طرح اپنے بھائی سے لڑتی نہیں تھی بلکہ بہت خاموش رہتی تھی اور اُس میں ایک خاص بُزرگی آ گئی تھی جو اُس کی عمر کی لڑکی کے لیے عجیب بات تھی۔

(4)

اسکول میں انور کا ایک دوست تھا۔ گوپال، گوپال ایک ٹھیکے دار کا بیٹا تھا۔ اُس کے باپ نے لڑائی کے زمانے میں بہت پیسہ بنایا تھا اور اجمیری گیٹ کے باہر بہت سی بنجر زمین خرید لی تھی۔ سنا جاتا تھا کہ وہاں لاٹ صاحب کے لیے بہت بڑی بستی بسائی جانے والی تھی۔ انور کو گوپال پر رشک آتا تھا۔ وہ انگریزی ڈھنگ کے کپڑے پہنتا تھا۔ صاحب لوگوں کی طرح بال بڑھاتا تھا۔ اُس کے پاس ایک فاؤنٹن پین اور سنہری گھڑی بھی تھی۔ لیکن ہر چیز سے بڑھ کر انور کو گوپال کی سائیکل دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔

وہ کافی چمک دار سائیکل، چاندی کی طرح چمکتا ہوا اُس کا ہینڈل اور مست دُھن میں ٹن ٹن کرتی ہوئی اس کی گھنٹی۔ گوپال روز اِسی سائیکل پر چڑھ کر اسکول جاتا تھا اور شام کو جب اسکول کی چھٹی ہوتی تھی تو نہ جانے کتنے لڑکے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھنے کے لیے گوپال کی خوشامد کرتے تھے۔ انور اپنی طرف سے کبھی بھی کیریئر پر بیٹھنے کے لیے گوپال سے نہ کہتا لیکن ایک دن گوپال نے جو پڑھائی میں ہمیشہ پیچھے رہتا تھا، گھر پر کرنے کے لیے دیئے گئے کچھ سوال حل کرنے میں انور کی مدد لی تو اس کے بدلے میں اُسے سائیکل پر بیٹھ کر گھر چلنے کی دعوت دی۔

'پہلے کہاں چلیں؟' گوپال نے گھنٹی کی دُھن پر ہینڈل مارتے ہوئے پوچھا۔ انور اپنا پورا زور لگا کر کیریئر سے چپکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی گر پڑے گا۔ سائیکل کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی۔

'چلو اسٹیشن چلیں۔' انور نے تجویز پیش کی۔ اُسے یاد تھا کہ امرتسر جاتے ہوئے اُس نے اسٹیشن پر کیسی کیسی انوکھی اور شاندار چیزیں دیکھی تھیں۔

اسٹیشن کے پھاٹک پر بے حد بھیڑ تھی، اس لیے انھیں سائیکل سے اُتر جانا پڑا۔ دونوں سیر سپاٹے کے لیے نکلے تھے اس لیے سائیکل میں تالا لگا کر حفاظت سے رکھ دینے کے بعد گوپال نے دو پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے اور بھیڑ کے ریلے کے ساتھ وہ بھی اسٹیشن کے اندر پہنچ گئے۔ سب لوگ تِلک نام کے کسی شخص کے بارے میں باتیں کر رہے تھے، جو بمبئی سے امرتسر جاتے ہوئے دلّی سے گذرنے والا تھا۔ گوپال کو شربت والے کی دُکان پر رکھی ہوئی ہری، لال پیلی بوتلوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ لیکن انور تِلک نام کے اِس شخص کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ امرتسر کا نام سن کر اُس کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اُس نے ایک بوڑھے شریف آدمی سے جا کر تلک کے بارے میں پوچھا۔ بوڑھے نے اس متجسس لڑکے کے سوال کا جواب دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی اُس نے انور کو بتایا کہ تلک ہندوستان کے بہت بڑے قومی لیڈر ہیں اور اپنے ملک کے لوگوں کے حقوق کے لیے لڑنے کی وجہ سے انھوں نے کئی سال جیل میں بتائے تھے۔ وہ ویسے تو مراٹھا تھے، پر انھوں نے ملک کی جو خدمت کی تھی، اس کی وجہ سے سارے ملک کے لوگوں کے دلوں پر اُن کا سکّہ جم گیا تھا۔ اب وہ کانگریس کے جلسے میں حصّہ لینے امرتسر جا رہے ہیں۔ اور سب لوگ اُن

کے لیے اپنی عقیدت پیش کرنے کے لیے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ اتنے میں گاڑی آ گئی۔ پورے پلیٹ فارم پر اور گاڑی کے چاروں طرف لوگوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ کہیں تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر آدمی اس عظیم لیڈر کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ ہزاروں آدمی اسٹیشن کے باہر والے برآمدے میں جمع تھے۔ ریلوے کے افسران بھیڑ کو باہر ہی رکھنے کی کوششوں میں صرف اُن ہی لوگوں کو اندر جانے دیتے تھے جن کے پاس پلیٹ فارم کا ٹکٹ ہوتا تھا۔ لیکن آخر کار لاچار ہو کر انھوں نے پھاٹک کھول دیئے اور لوگ اس طرح اندر گھس پڑے جیسے دریا کا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ اس دھینگا مُشتی میں ایک پھل والے کا ٹھیلہ اُلٹ گیا۔ نہ جانے کتنوں کے پیر کُچل گئے۔ انور کی تُرکی ٹوپی گُم ہو گئی اور بھیڑ کے دھکّوں سے وہ دونوں ایک دیوار سے جا لگے۔ بھیڑ نعرے لگا رہی تھی۔ 'لوکمانیہ تِلک کی جے!' 'مہاتما گاندھی کی جَے!' 'ہندو مسلم بھائی بھائی!'

اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے انور نے کہا: 'کیسے کمال کی بات ہے کہ اتنے بہت سے لوگ یہاں تِلک کا استقبال کرنے کو جمع ہوئے ہیں، جو یہاں سے بہت دور بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ سچ مچ کوئی بہت بڑے آدمی ہوں گے۔'

'ہاں یہ بھی کوئی کانگریسی ہیں'، گوپال نے کہا۔ انور کی سمجھ میں نہ آیا کہ گوپال نے یہ لفظ اتنی نفرت سے کیوں کہے تھے۔ 'میرے پتا جی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ سرکار کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں اور اگر سرکار ہی نہ ہو گی تو پھر میرے پتا جی کو یہ ٹھیکے کون دے گا؟ آؤ چلیں، ہمیں اس طرح کے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔'

لیکن انور یہ محسوس کرتا تھا کہ اُسے اس طرح کے لوگوں سے بہت سروکار رکھنا ہو گا۔ وہ نہ جانے کون سی طاقت تھی جو بیساختہ اُسے ان لوگوں کی طرف کھینچتی تھی لیکن وہ گوپال کے ساتھ بحث کر کے اِس نئی دوستی کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

(5)

جب انور گھر پہنچا تو اُسے رتن کا خط ملا۔ اُس نے بڑی بے صبری سے خط کھول کر اُسے کئی بار پڑھا۔ رتن کے سب ہی خطوں کی طرح یہ خط بھی بہت چھوٹا سا تھا اور اُس کی اسی جانی پہچانی کھُلی کھُلی لکھائی میں لکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے صفحہ پر صرف چھ سات لائنوں سے زیادہ نہیں آتی

تھیں۔ رتن بھی انور کی طرح ہی اسکول جاتا تھا اور اپنا سارا وقت پڑھائی میں لگاتا تھا۔ اُس نے وظیفہ پانے کی ٹھان لی تھی کیونکہ اس کے بنا اس کی ماں اُسے ہائی اسکول میں پڑھنے نہیں بھیج سکتی تھی۔ رتن نے لکھا تھا۔ 'کئی مہینے تک اسکول کے سب لڑکوں کو زبردستی چلا کر چھ میل دور چھاؤنی لے جایا جاتا تھا اور وہاں ہم سے انگریزوں کے جھنڈے کو سلامی دلوائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ گورے ٹامی بھی رہتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا ڈھیل ڈھال کرتا تھا تو اُن میں سے کوئی ٹامی اسے ٹھوکر سے مارتا تھا۔ اب یہ سلسلہ بند ہو گیا ہے لیکن یقین جانو میں اسے بھولوں گا نہیں۔ اور نہ ہی میں اپنے بابا کے قتل کو بھولا ہوں۔' خط کے نیچے لکھا تھا۔ 'تمھارا دوست رتن۔' اور اُس کے بعد پھر لکھا تھا۔ 'کانگریس کا سالانہ جلسہ یہاں ہونے جارہا ہے۔ لوکمانیہ تلک، گاندھی جی، مولانا محمد علی اور شوکت علی سب ہی لوگ آرہے ہیں۔ یہ لیڈر جتنے دن یہاں رہیں گے اِن کی خدمت کرنے کے لیے میں بھی والینٹیروں میں بھرتی ہو گیا ہوں۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اُن کو اتنے نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اپنے اگلے خط میں میں تمھیں اُن کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں لکھوں گا۔'

انور سوچ رہا تھا کہ رتن زیادہ سنجیدہ ہو گیا ہے اور بڑے بڑے جلسوں میں حصّہ لے رہا ہے جب کہ میں بچّوں کی طرح گوپال کی چمک دار سائیکل دیکھ کر دل ہی دل میں للچاتا رہتا ہوں۔ پر وہ زیادہ دیر اپنے ان خیالوں میں ڈوبا نہ رہ سکا۔ اُس کے ابّا نے، جو پھوپی اماں سے باتیں کر رہے تھے، انور کو بلا کر بتایا کہ اُس کے تایا ابّا امجد علی، اکبر علی کے بڑے بھائی۔ کچھ دن کے لیے دلّی آرہے ہیں۔ انور کو یہ جان کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے رؤف کو بھی لا رہے ہیں۔ انور جانتا تھا کہ اُس کے تایا ابا بڑے رعب داب والے آدمی تھے جن سے سب کی روح فنا ہوتی تھی۔ وہ بچّوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے اور نوکروں کو ہر دم ڈانٹتے پھٹکارتے رہتے تھے وہ گُڑگاؤں ضلع میں تحصیل دار تھے اور برسوں سے سرکاری نوکری کرتے کرتے اُن میں ایک اکڑ آ گئی تھی لیکن انور رؤف سے کبھی نہیں ملا تھا۔ رؤف انور سے کچھ ہی سال بڑا تھا۔ 'بھائی صاحب رؤف کو دلّی کی سیر کرانے لا رہے ہیں۔' اکبر علی نے کہا۔ لیکن انور کو اصلی خوشی تو اُن کی اِس بات سے ہوئی کہ 'تم دونوں سب جگہیں ایک ساتھ دیکھ کر آنا۔ بھائی صاحب اپنی موٹر میں آئیں گے، اس لیے گھومنے پھرنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔'

(6)

اونچی سی موٹر کھڑ کھڑ کرتی، ہارن بجاتی ہوئی دتی دروازے سے شہر سے باہر نکلی۔ دونوں لڑکے سامنے والی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے۔ امجد علی اور اکبر علی پیچھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اُن کی بات چیت کا کچھ حصّہ انور کے کانوں میں بھی پڑ جاتا تھا۔ اُس کے تایا ابا کہہ رہے تھے۔ 'یہ باغی اور انتشار پسند لوگ۔ امرتسر میں جنرل ڈائر نے ان لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ لوگ اسی لائق ہیں۔ اگر میری تحصیل میں اِس قسم کا کوئی آدمی میرے ہاتھ لگا تو میں اُسے مزا چکھا دوں گا۔' انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر 'انتشار پسند' کون ہوتے ہیں، وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جمعدار اجیت سنگھ اور نندو اور وہ سارے لوگ جو گولی سے مارے گئے تھے، انتشار پسند تھے؟ لیکن جلد ہی اُس کا دھیان سڑک کی بائیں طرف پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت کے شاندار کھنڈروں کی طرف چلا گیا۔ یہ پرانا قلعہ تھا۔ اُس کے چاروں طرف ایک اونچی سی دیوار اور کھائی تھی۔

اکبر علی کو دتی کی تاریخ اور اس کی یادگاروں کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ اور جب بھی انھیں موقع ملتا تھا وہ اپنے بیٹے کو ان چیزوں کے بارے میں بتاتے تھے کہ رؤف پہلی بار دتی آیا تھا اس لیے اسے اس کی تاریخ کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ اپنے بڑے بھائی پر اپنی معلومات کا رُعب جھاڑ کر انور بہت خوش ہو رہا تھا اُس نے رؤف کو بتایا کہ دتی ہزاروں برسوں سے ہندوستان کی راجدھانی رہی ہے کتنے ہی شاہی خاندان یہاں حکومت کر چکے ہیں، سینکڑوں بادشاہ یہاں کے تخت پر بیٹھ چکے ہیں۔ اِس کا نام ہمیشہ سے دتی نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس کا نام تھا اندر پرستھا یعنی اندر کا شہر۔ جب مغل بادشاہ شاہجہاں، جس نے آگرہ کا تاج محل بنوایا تھا، اپنی راجدھانی آگرہ سے یہاں لایا تو اُس نے اُس کا نام شاہجہان آباد رکھ دیا۔ سات بار دتی اُجڑی اور ہر بار پُرانے کھنڈروں سے ایک نیا شہر بسایا گیا۔ اسی لیے ہر طرف ان پُرانی دِلّیوں کے کھنڈر آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ محل، مقبرے، رصدگاہ اور سرائیں۔ انور نے یہ بھی بتایا کہ داہنی طرف دور تک جو خالی جگہ پڑی ہے وہاں کچھ دن میں ایک نئی دتی بسائی جائے گی۔ آٹھویں دتی، انگریزوں کی دتی۔ انور جانتا تھا کہ اس میں سے کچھ زمین گوپال کے پتاجی کی

تھی۔ وہ وہاں اُن انگریز افسروں کے لیے بنگلے بنوانے والے تھے جو بڑے لاٹ صاحب کا شہر بن جانے کے بعد وہاں آ کر رہنے لگیں گے۔

ہمایوں کے مقبرے، حضرت نظام الدین کی درگاہ اور صوفی شاعر، موسیقار اور فلسفی امیر خسرو کے چھوٹے سے مزار سے ہوتے ہوئے وہ مہرولی گاؤں پہنچے۔ اور وہاں پہنچ کر موٹر رُک گئی۔ انور اور رؤف آسمان کو چھوتی ہوئی شاندار قطب مینار کی چوٹی دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ قطب مینار اُن کے اُوپر جھکی آ رہی ہے۔ وہ جھکتی چلی آ رہی تھی، یہاں تک کہ انھیں ایسا لگا کہ وہ کسی بھی لمحے اُن کے سر پر آ گرے گی۔ رؤف ڈر کے مارے سفید پڑ گیا۔ لیکن انور نے ایک تجربہ کار آدمی کی طرح اُسے سمجھایا کہ وہ حقیقت میں گر نہیں رہی ہے بلکہ آسمان پر چلتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے ایسا نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔

لڑکے قطب مینار کے اُوپر چڑھنے کی ضد کرنے لگے اور سب لوگوں نے اندھیری بدبودار، چکّر دار سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ اوپر جیسے جیسے مینار کا گھیرا کم ہوتا گیا ویسے ویسے سیڑھیاں بھی چھوٹی ہوتی گئیں۔ اندھیرے میں چمگادڑ اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ رؤف کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور وہ واپس جانے کی بات کر رہا تھا۔ لیکن انور جانتا تھا کہ اوپر پہنچ کر کتنا مزا آئے گا۔ اس لیے وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا کہ منزل کے اتنے پاس پہنچ کر اُسے ہمّت نہیں ہارنا چاہیے۔

ساری دنیا سے اُوپر۔ مینار کی چوٹی پر پہنچ کر چاروں طرف نظر دوڑانے سے انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ اُن کی آنکھوں کے آگے ساتوں دِلّیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس سڑک سے ہو کر وہ آئے تھے وہ ایک پتلی سی پٹّی کی طرح پیڑوں کے بیچ سے چکّر کاٹتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ اور اِن تمام دلّیوں سے پرے جمنا بہہ رہی تھی، جو اب جاڑے میں گھٹ کر ایک پتلی سی دھارا رہ گئی تھی۔ تیسرے پہر کی ہوا میں کچھ خنکی تھی جو بہت اچھی لگتی تھی۔ انور نے اپنی ٹوپی اُتار دی اور ہوا کے سرد جھونکے اس کی منڈی ہوئی چاند کو گدگدانے لگے۔ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ نیچے زمین پر چلتے ہوئے مرد اور عورتیں چیونٹیوں جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ موٹر بالکل کھلونے کی موٹر معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت اونچائی پر کھڑے تھے لیکن کچھ چیزیں

اُن سے بھی اُونچی تھیں۔ نیچے سے دیکھنے پر جو بادل مینار کی چوٹی کے چاروں طرف گھیرا بنائے ہوئے دکھائی دیتے تھے، وہ اب بھی بہت دور اور بہت اونچائی پر تھے۔ مغربی اُفق پر جیسے جیسے سورج کہرے کے ایک گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا، ویسے ویسے ہوا اور ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈک کی ایک لہر سی اُس کی گردن سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے تک دوڑ گئی۔ انور کو چھینک آئی۔

'اب گھر چلیں، بہت دیر ہوگئی ہے۔' اکبر علی نے کہا اور سب لوگ اُن اندھیری سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ اُوپر کی ٹھنڈی ہوا میں کھڑے رہنے کے بعد سیڑھیوں کی بدبو اور گھٹن کچھ زیادہ ہی معلوم ہونے لگی تھی۔

○

دیا جلے ساری رات......

دیکھنے میں بہت ڈراؤنی تھیں وہ مونچھیں۔ بے حد گھنی کچھ بال سفید ہو چکے تھے اور موم لگا کر اُن کے سرے اینٹھ کر نوکیلے کر دیے گئے تھے۔ داڑھی بہت صاف بنی ہوئی تھی مگر بھوؤں کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے آنکھوں کے اُوپر ایک چھپّر پڑا ہو۔ ہاتھوں پر، اُنگلیوں پر یہاں تک کہ کانوں پر بھی گھونگریالے بالوں کے گچھے تھے۔ لیکن بنا فریم والی عینک کے صاف ستھرے شیشوں کے پیچھے سے جو آنکھیں چمک رہی تھیں اُن میں رحم دلی تھی اور انور کو مشفقانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

انور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دواخانے میں تھا۔ اکبر علی نے اُسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر انصاری دِلّی کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ انھوں نے ولایت کی سب سے بڑی یونی ورسٹیوں میں ڈاکٹری پڑھی تھی اور ولایت کے کئی اسپتالوں میں کام بھی کر چکے تھے۔

پندرہ دن تک انور حکیم بیدل کا یونانی علاج کر چکا تھا لیکن قطب مینار کی چوٹی پر ایک چھینک سے جوڑ کام شروع ہوا تھا وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ حقیقت میں اُس نے بڑھتے بڑھتے برونکائٹس کی شکل اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے اُسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور دن بھر وہ نڈھال رہتا تھا۔ اب وہ اپنے تایا ابا اور اپنے بھائی رؤف کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پھوپھی امّاں اُس کے کمرے کی ہر کھڑکی اور ہر دروازہ بند رکھتی تھیں اور حکیم بیدل اُسے ڈھیروں جوشاندہ اور دوسری دوائیں پلاتے تھے۔ پر ان تمام علاجوں کے باوجود اُس کی حالت بگڑتی گئی۔ آخر کار اکبر علی

نے اُسے ڈاکٹر انصاری کو دکھانے کا فیصلہ کیا جو پاس ہی دریا گنج کے سرے پر رہتے تھے۔ اُن کے بنگلے کے ایک طرف پُرانی دلّی کی فصیل تھی اور دوسری طرف دریائے جمنا۔ انور نے جس وقت سے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں قدم رکھا تھا تب ہی سے اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ڈاکٹر لوگ کیسے کیسے خوفناک آپریشن کر ڈالتے ہیں، اور پیٹ چیر دینا یا ہاتھ پیر کاٹ کر الگ کر دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ پھوپی اماں نے اُس کے دل میں ڈاکٹروں کا اور بھی ڈر بٹھا دیا تھا اور اس لیے انور نے اپنے دل میں یہ تصویر بنائی تھی کہ جن ڈاکٹر صاحب کے یہاں اُسے لے جایا جا رہا ہے وہ جلاّد قصائی قسم کی کوئی چیز ہوں گے اور وہ خوفناک مونچھیں سچ مچ کسی جلاّد کی ہی لگتی تھیں۔ لیکن انور کو اُن خوفناک مونچھوں کا، اُن کی مہربان آنکھوں اور نرم میٹھی آواز سے کوئی تعلق نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ولایتی ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے پر بول خالص ہندوستانی رہے تھے۔

'کیوں بیٹا، کیا حال ہے؟'

انھوں نے صرف اتنا ہی کہا لیکن اُن کی اس ایک بات سے انور کا سارا ڈر دُور ہو گیا اور وہ اُنھیں اپنے اسکول کی پڑھائی اور اپنی امرتسر کی سیر کے بارے میں ساری باتیں بتانے لگا۔ اُس نے انھیں جلیاں والہ باغ کے بارے میں بھی بتایا۔ جلیاں والہ باغ کی فائرنگ کی بات سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے، ان کی آنکھیں کچھ دھندلی پڑ گئیں۔ اُن میں آنسو چھلک آئے اور اُنھوں نے کاغذ کاٹنے کا چاقو گلابی بلاٹنگ پیپر میں گڑا دیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اِس موضوع پر زیادہ دیر انور کو باتیں نہیں کرنے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بڑی ہوشیاری سے بات چیت کا رُخ بدل دیا۔ اب وہ کبوتروں، پتنگوں اور ہوائی جہازوں کی بات کر رہے تھے اور جب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ 'انور جانتے ہو جب تم بڑے ہو گے اُس وقت ہوائی جہاز اتنے ہی عام ہو چکے ہوں گے جتنی کہ آج کل ریل گاڑیاں۔' تو انور کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

(2)

ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے ہوئے انور کو نہ جھجک ہو رہی تھی، نہ ڈر ہی لگ رہا تھا۔ اچانک اُسے یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ اُس کی بیماری بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اُس کا گلا اب

نہیں دُکھ رہا تھا۔ اُسے بخار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اور حالانکہ چاروں طرف کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ جب سے وہ کمرے میں آیا تھا اُسے نہ چھینک آئی تھی نہ کھانسی۔ یہ ڈاکٹر صاحب تو سچ مچ جادوگر تھے۔ وہ انور سے اِس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ بیمار ہے ہی نہیں اور حقیقت میں وہ بیمار تھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر انصاری انور سے ریل گاڑیوں، موٹروں اور دوسری ایسی چیزوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جن میں بچّوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اِس بات چیت کے دوران ہی انھوں نے انور سے ایک کوچ پر لیٹ جانے کو کہا۔ اور ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح بڑے غور سے اُس کی جانچ کی۔ اُس کی نبض دیکھی، آلہ لگا کر اُس کا سینہ دیکھا اور انگلیوں سے اُس کا پیٹ ٹھونک پیٹ کر دیکھا۔ اُن کی لمبی لمبی پتلی اُنگلیاں اتنی نرم اور نازک تھیں کہ انور کو یقین ہو گیا کہ ان انگلیوں سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ اس بات پر تعجب کرنے لگا کہ ڈاکٹر انصاری وہ خوفناک آپریشن کیسے کرتے ہوں گے جن کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا۔

ڈاکٹر انصاری نے انور کو اُٹھا کر کھڑا کر دیا اور اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولے 'بیٹا، تمھیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ لیکن میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تمھارے جیسے سمجھدار لڑکے اسکول میں اپنا وقت خراب کریں۔ تمھاری تو ابھی کھلے میدانوں اور باغوں میں دوڑنے بھاگنے کی عمر ہے۔ تمھیں تو دیہات کی کھلی ہوا میں سیر کرنا چاہیے۔' انور کو اُن کے یہ الفاظ ایسے لگے جیسے کوئی بڑی ممتا سے اپنے ملائم ہاتھوں سے اُسے تھپک رہا ہو۔ پھر ڈاکٹر صاحب انور کے ابّا سے مخاطب ہو کر بولے۔ 'اکبر صاحب، کیا آپ اپنے بیٹے کو کچھ دن کے لیے شہر کے شور و غل سے دور کسی گاؤں میں نہیں بھیج سکتے؟'

اکبر علی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یقین دلایا کہ اس میں کوئی دِقّت نہیں ہو گی۔ انور کچھ دن کے لیے جا کر اپنے تایا ابّا کے ساتھ رہ سکتا ہے جو اُس وقت گڑگاؤں میں تحصیلدار تھے اور اُن کے ساتھ ہی اُن کی تحصیل کے گاؤں کے دورے پر جا سکتا ہے۔

وہ لوگ اُٹھ کر جانے ہی والے تھے کہ انور نے دو لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے داڑھی والے بزرگوں کو اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دونوں عرب لوگوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے لبادے پہنے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اُن دونوں سے کمرہ بالکل بھر گیا تھا۔ انور اُن کی عجیب چال ڈھال کو دیکھ کر اور اُن کی گونجتی ہوئی آوازوں کو سُن کر کچھ ڈر سا گیا۔ ڈیل ڈول تو

دونوں ہی بزرگوں کا لمبا چوڑا تھا پر اُن میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تگڑے تھے اور جب بولتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ بادل گرج رہے ہیں۔ ایک بولے: 'انصاری، ابھی تو ہم لوگ باہر جا رہے ہیں۔ تیسرے پہر تم سے ملاقات ہوگی۔' دوسرے بزرگ نے جن کے ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے، ایک کاغذ میز پر رکھتے ہوئے کہا: 'تم اسے ذرا دیکھ لینا اور شام کو اس کے بارے میں اپنی رائے بتانا۔' پھر دونوں اسی طرح اچانک باہر چلے گئے جیسے وہ اندر آئے تھے اور چق میں سے انور کو صرف دو ڈھیلے ڈھالے کالے لبادے ہوا میں اُڑتے دکھائی دیے۔

'جانتے ہو کون تھے؟' ڈاکٹر انصاری نے جاتی ہوئی اُن دونوں ہستیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور انور کو اُن سے ناواقف دیکھ کر بتایا کہ وہ محمد علی اور شوکت علی تھے۔ انور کو یکایک یاد آیا کہ اپنے ابا کی بیٹھک میں ایک بار کسی بحث کے دوران اُس نے اُن کا نام سنا تھا۔ یہ دونوں بھائی تحریک خلافت کے لیڈر تھے اور ابھی حال ہی میں جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ انور کو یقین تھا کہ ایسے رُعب دار آدمیوں سے تو سرکار بھی ڈرتی ہوگی۔

'انور پھر آنا لیکن کھانسی یا زکام کی شکایت لے کر نہ آنا۔' ڈاکٹر انصاری نے انور اور اُس کے ابا کو الوداع کرتے ہوئے کہا۔

(3)

ایسا لگتا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کے بنگلے میں عجیب عجیب لوگ رہتے تھے۔ جس وقت انور اپنے ابا کے ساتھ لان پار کر کے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا اُس نے دیکھا کہ کئی لوگ لان پر دُھوپ میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو دیکھ رہے ہیں۔ انور نے یہ بھی دیکھا کہ پتلی پتلی ٹانگوں والا ایک آدمی موٹے کھدر کی دھوتی اور کُرتا پہنے بیٹھا چرخہ کات رہا ہے۔ اُس نے اپنے سر پر ایک سفید انگوچھا بھی ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے انور کو یہ دھوکا ہوا کہ شاید کوئی عورت ہے۔ جب دونوں اُس آدمی کے پاس سے ہو کر گذرے تو چرخہ ایک لمحے کے لیے رُک گیا اور انگوچھے میں سے بڑے بڑے گول شیشوں والی عینک پہنے ہوئے ایک چہرہ دکھائی دیا اور انور کو دیکھ کر دو آنکھیں عینک کے پیچھے مشفقانہ انداز میں مسکرا دیں۔ انور ٹپٹا گیا اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اِس استقبال کا جواب کیسے دے۔ اس لیے وہ بھی جواب میں مسکرا دیا۔ وہ چھوٹا سا گنجا سر پھر انگوچھے میں چھپ گیا اور چرخا پھر اپنی لے کے ساتھ چلنے لگا۔

جب وہ لوگ وہاں سے کافی آگے بڑھ گئے تو اکبرعلی نے بتایا۔'یہ مہاتما گاندھی تھے۔ گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری سب سوراج کے لیے مل کر کام کر رہے ہیں۔'

'سوراج کیا ہوتا ہے ابا؟' انور نے پوچھا۔

'سوراج کا مطلب ہوتا ہے اپنی حکومت۔ ہندوستانیوں کی حکومت بیٹا۔'

انور کو کئی مہینے پہلے کی وہ بات یاد آئی جب اُس کے ابا اور کاکا رامیشور دیال گاندھی کے بارے میں اور انگریزوں کو مارے بنا اُنھیں یہاں سے نکال دینے کی باتیں کر رہے تھے۔ تو یہ تھا بڑا آدمی جو سپنے میں اُسے اژدہے سے بچانے آیا تھا۔

اُس نے سوچا یہ آدمی دیکھنے میں تو اتنا چھوٹا ہے پر اُسے اژدھے سے ڈر نہیں لگتا۔

'ابا!'

'ہاں، بیٹا!'

'مہاتما گاندھی بوڑھیوں کی طرح، ہماری گلابو بُوا کی طرح، چرخہ کیوں چلا رہے ہیں؟'

یوں تو اکبرعلی ہمیشہ ہی انور کو کوئی بات سمجھا کر بہت خوش ہوتے تھے مگر انور کے اِس سوال کا جواب دے کر اُنھیں ہمیشہ سے زیادہ خوشی ہوئی۔'اُن کا کہنا ہے کہ ہم ولایتی کپڑا خرید کر کروڑوں روپیہ اپنے ملک سے باہر بھیج دیتے ہیں اِس لیے ہم اپنے دیش کا بنا ہوا کھدر پہنیں تو وہ روپیہ ہندوستان میں ہی رہے گا اس کے علاوہ ہمارے دیش میں کروڑوں لوگ بے روزگار ہیں اور کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو اپنی کمائی سے اپنی ساری ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے۔ غریب کسانوں کو دو فصلوں کے بیچ کئی مہینے خالی بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم سب لوگ کھدر پہننے لگیں تو اُن کو بھی کچھ اور آمدنی ہو سکتی ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ چرخہ کاتنے سے ہمارے اندر سادگی اور ایمانداری پیدا ہوتی ہے۔'

'ابا۔'

'ہاں بیٹا۔'

'آپ کو مہاتما گاندھی اچھے لگتے ہیں؟'

'ہاں انور، وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'

'ابا۔'

'ہاں بیٹا۔'

'مجھے بھی مہاتما گاندھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'

(4)

گڑگاؤں کی خشک اور ٹھنڈی آب و ہوا میں رہ کر انور کی کھانسی بالکل جاتی رہی۔ وہاں وہ کھلی ہوا میں تندرست زندگی بِتا تا تھا۔ اُس کے تایا ابا بہت سخت آدمی تھے اور اِس بات پر زور دیتے تھے کہ تینوں بچے — انور، رؤف اور رؤف کی نو سال کی بہن بلقیس، بہت صبح اُٹھا کریں۔ اتنی صبح گرم گرم بستروں سے نکلنا بہت بُرا لگتا تھا لیکن ایک بار وہ کھلے میدانوں میں نکل جاتے اور انھیں ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملتا تو انھیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے۔ رؤف سب سے آگے نکل جاتا کیونکہ وہ سب سے بڑا تھا اور سب سے لمبا بھی اور بلقیس سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے پیچھے رہ جاتی تھی اور جب انور اُس سے بہت آگے نکل جاتا تو وہ بہت روتی چلاتی۔ اُسے روتا دیکھ کر انور رُک جاتا اور جب تک وہ اُس کے برابر نہیں پہنچ جاتی تھی تب تک وہ آگے نہیں بڑھتا تھا اور اگر وہ بہت تھکی ہوتی تھی تو دونوں کھیتوں کے بیچ سے ہو کر آہستہ بہتے ہوئے چشمے کے کنارے بیٹھ جاتے تھے۔

بلقیس انور کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ چھوٹی اور نازک تھی لیکن اُس میں زندگی بھرپور تھی۔ اُس کے بال گہرے بھورے رنگ کے تھے جنھیں گوندھ کر ایک چھوٹی سی چوٹی باندھ دی جاتی تھی اور جب وہ دوڑتی تھی تو یہ چوٹی بہت ہی مضحکہ خیز انداز سے اُوپر نیچے اُچھلتی رہتی تھی۔ انور کو رؤف بھی بہت اچھا سا لگتا تھا لیکن چونکہ اُس کی پرورش بالکل ہی دوسرے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے رؤف کی کچھ عادتوں پر انور کو بہت تعجب ہوتا تھا۔ اکبر علی اپنے بیٹے کو کبھی نوکروں سے بدتمیزی سے بات بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ ایک بار اُس نے جب 'بُوا گلابو' کی بجائے صرف 'گلابو' کہہ دیا تھا تو اُس کے ابا نے سزا کے طور پر اُسے دن بھر کھانا نہیں دیا تھا لیکن رؤف نہ صرف اپنے نوکروں پر چلاتا تھا بلکہ اُنھیں ایسی ایسی گالیاں بھی دیتا تھا کہ انور تو سُن کر ہی شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔

تحصیلدار امجد علی کے گھر میں نوکروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اُن کے ذاتی نوکروں کے علاوہ

آدھے درجن سرکاری چپراسی ہر وقت رؤف کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے کے لیے موجود رہتے تھے اور وہ بھی اُن پر رُعب جھاڑ کر بہت خوش ہوتا تھا۔

جب وہ صبح ٹہل کر لوٹتے تھے تو انھیں بہت بھوک لگی ہوتی۔ رؤف کی ماں، جنھیں انور، بڑی اماں، کہتا تھا، ناشتہ رکھتی تھیں اور تینوں اُٹھ کر ناشتہ کرتے تھے۔ بڑی اماں انور پر بہت مہربان رہتی تھیں۔ وہ حد درجے کی کاہل تھیں۔ دن بھر میں کم سے کم سو پان چباجاتی ہوں گی کیونکہ گھر کا سارا کام نوکر کرتے تھے اس لیے انور نے اپنی بڑی اماں کو کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھوپھی اماں کی طرح نہیں تھیں جو دن بھر برتن مانجھنے، کھانا پکانے، سلائی کرنے وغیرہ میں پھنسی رہتی تھیں اور انجم کو بھی گھر کا کام کاج کرنے میں گاؤ بوکا ہاتھ بٹانے پر مجبور کرتی تھیں لیکن انور کے تایا ابا ٹھہرے سرکاری افسر۔ اُن کے گھر میں بچّوں کا سارا کام نوکر کرتے تھے اور انور کو یہ بات بڑی عجیب لگتی۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ کوئی دوسرا اُس کا بستر لگائے یا اُس کے جوتوں پر پالش کرے۔

(5)

ناشتہ کر کے رؤف اسکول چلا جاتا، امجد علی کچہری چلے جاتے، بڑی اماں دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے ایک نیند سو لینے کے لیے جاتیں اور بلقیس اپنی گڑیا نکال کر بیٹھ جاتی تھی۔ انور بھی اپنی کوٹھری میں جا کر اپنے صندوق میں سے اپنا خفیہ خزانہ نکالتا تھا۔ یہ خزانہ وہ کتابیں تھیں جو اُس کے ابا نے چلتے وقت اُسے دی تھیں اور کہا تھا 'اگر تم اِن سب کو پڑھ لو گے تو تمھاری اسکول کی پڑھائی کا جو نقصان ہوگا وہ پورا ہی نہیں ہو جائے گا بلکہ تمھیں اس سے بھی زیادہ فائدہ پہنچے گا۔'

اکبر علی نے سب کتابوں پر ایک جیسی جلد بنوادی تھی۔ انور کو یہ موٹی پتلی کتابیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اُسے اُن پر چڑھی ہوئی لال چمڑے کی جلد اور اُن پر سُنہرے حرفوں میں لکھا ہوا کتاب اور مصنف کا نام بہت ہی پسند تھا۔ اُسے اُن کی صاف ستھری خوشبو بھی بے حد پسند تھی۔ تازے کاغذ کی خوشبو، چھاپے خانے کی سیاہی، لئی اور چمڑے کی خوشبو اور وہ ایک نامعلوم خوشبو جو سب ہی کتابوں میں سے آتی ہے۔ اُسے انھیں پڑھنے میں بھی بہت مزا آتا کیونکہ اُنھیں پڑھ کر اُسے ایسا لگتا جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے انوکھی اور دلچسپ دنیا کے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ انور جب بھی کوئی کتاب

کھولتا تو اُسے ایسا لگتا کہ وہ کتاب نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ وسیع اَن جانے برِّ اعظموں کا سفر کر رہا ہے۔

اُس نے اُن میں سے کئی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور اُن کو پڑھ کر اُس کے تصورات میں ہلچل پیدا ہو اُٹھتی تھی۔ جب اُس نے 'چار درویش' پڑھی تو اُسے ایسا لگا کہ ایران کے اُن چار درویشوں کے ساتھ وہ بھی اُن عجیب اور انوکھے تجربوں سے گزر رہا ہے۔ سیدھی سادی زبان میں لکھی ہوئی 'حکایاتِ لقمان' سے اُس نے وہ بہت سی عملی معلومات حاصل کی تھیں جو لقمان نے انسانوں اور جانوروں کے بارے میں اپنے اِن قصّوں میں بھر دی تھیں۔ شرر کی 'بہشت بریں' پڑھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ وہ پھر اساسیوں کے اُس ظالم لیڈر کے زمانے میں پہنچ گیا ہے جس نے بھولے بھالے لوگوں کو بہکا کر اپنا پیرو بنانے کے لیے اُس زمین پر ایک نقلی جنّت بنائی تھی جہاں حوریں بھی تھیں اور دودھ اور شہد کی ندیاں بھی تھیں اور چہچہاتی ہوئی چڑیاں بھی۔ لیکن اُس پر سب سے گہرا اثر 'مسدسِ حالی' کا ہوا تھا۔ جس جوشیلے رزمیہ میں اسلام کے عروج و زوال کا ذکر پانی پت کے اُسی شاعر نے کیا تھا جس کی قبر پر انور اور اُس کے ابّا نے عقیدت کے پھول چڑھائے تھے۔ نو برس کا انور شاعری کی باریکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اس میں جن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ تھا اُن سے بھی وہ بالکل ناواقف تھا، پر حالی کی اِس لافانی نظم کے الفاظ میں ایسی دُھن اور ایسی روانی تھی کہ اُن کو پڑھ کر اس کے جذبات میں ایک لہر سی پیدا ہو جاتی تھی اِن بندوں کو پڑھ کر اُسے ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی قرآن کی آیتوں کو پڑھتے وقت ہوا کرتی تھی اور اِن بندوں میں زور بھی ویسا ہی تھا۔

ہر بار انور جب اُسے پڑھتا تو اُسے ایسا لگتا کہ شاعر کا مقصد ہی یہ تھا کہ پڑھنے والوں میں کبھی جوش پیدا ہو، کبھی وہ فخر محسوس کریں، کبھی وہ نا اُمید ہوں اور کبھی شرمندہ۔ لیکن اِن سب چیزوں کے ملنے سے دل میں یہ جذبہ ضرور پیدا ہو جاتا تھا کہ کوئی تبدیلی فوراً ہونا چاہیے۔ اِن بندوں کو پڑھ کر علم کی شمع سے جہالت کے اندھیرے کو دُور کرنے کا ارادہ ہوتا تھا اور بے شک شاعری کا یہی مقصد تھا۔

(6)

قدرت کے اصولوں کے مطابق موسم بدلتے رہے۔ تحصیلدار صاحب کے بنگلے میں جو ٹھنڈی ہوا چلتی تھی اُس میں اب وہ برفیلی چُبھن نہیں رہ گئی تھی۔ آس پاس کے کھیتوں پر جو

گُھرے کے بادل چھائے رہتے تھے وہ دھوپ میں غائب ہوگئے۔ کچھ دن بعد مکئی کے کھیت کٹ گئے اور گیہوں بونے کے لیے کھیت تیار کیے جانے لگے۔ پھر جون میں سورج تپنے لگا اور پسینہ پھوٹنے لگا۔ لولگ جانے کے ڈر سے بچّوں کو دوپہر سے شام تک گھر سے باہر نکلنے کے لیے بالکل منع کر دیا گیا۔ اس لُو میں تو خس کے پردے بھی اتنی جلدی سوکھ جاتے تھے کہ تحصیلدار امجد علی کے تین نوکروں کو لگاتار اُن پر پانی چھڑکتے رہنا پڑتا۔

انور سارا وقت اپنے بھائی بہن کے ساتھ کھیلنے، اپنے ابا کی بھیجی ہوئی کتابیں پڑھنے اور کبھی کبھی رتن کو خط لکھنے میں صَرف کرتا۔ امرتسر سے اُس کا دوست بھی لگ بھگ ہر ہفتے خط لکھتا اور اس کے خط تحصیلدار صاحب کے ٹھنڈے اور محفوظ ماحول میں حقیقت کے تیز جھونکوں کی طرح آتے تھے۔ اُس کے خطوں سے پتہ لگتا تھا کہ امرتسر میں کانگریس کے جلسے کے موقع پر رتن نے لیڈروں کے کیمپ میں والنٹیئر کی حیثیت سے کام کیا تھا اور ایک بار تو گاندھی جی کے لیے پانی بھی لے گیا تھا۔ رتن سنگھ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اِن جلسوں اور اُن میں شرکت کرنے والے لیڈروں کے بارے میں لکھا تھا۔ تِلک کے بارے میں، علی برادران کے بارے میں اور انور کے ڈاکٹر انصاری کے بارے میں اور ان سب باتوں کو پڑھ کر انور کو رتن کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔

مگر رتن کے دن بہت مصیبت میں کٹ رہے تھے جس کی وجہ سے انور کو اپنی عیش و آرام کی زندگی پر شرم آنے لگی۔ جمعدار اجیت سنگھ کے مرتے ہی اُس کی پنشن بھی بند ہوگئی تھی اور رتن کی بیوہ ماں کو اپنے سارے گہنے گروی رکھ دینے پڑے تھے تاکہ اُس کا بیٹا اسکول میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکے۔ یہ پیسہ بھی خرچ ہوگیا تھا اور اب وہ دن بھر چرخہ چلا کر اور سوت بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ رتن نے لکھا تھا ’مہاتما جی نے اگر ہمیں یہ چرخہ نہ دیا ہوتا تو ہم بھوکوں مرنے لگتے اور مجھے شاید پڑھائی چھوڑ کر اسٹیشن پر بوجھ ڈھونا پڑتا۔‘ بڑی مصیبت میں اُن کے دن کٹتے تھے۔ ایک بار مہینے بھر تک رتن کا کوئی خط نہیں آیا۔ بعد میں اُس کے خط سے پتہ چلا کہ اُس کے پاس پوسٹ کارڈ خریدنے کو بھی پیسے نہیں تھے۔ اُس وقت انور کے صندوق میں دس روپے تھے۔ اُس کے ابا ہر مہینے اسے دو روپے بھیجتے تھے اُسی کو بچا بچا کر اُس نے یہ دس روپے جوڑے تھے۔ وہ چپ چاپ ڈاک خانہ گیا اور دس روپے کے ٹکٹ خرید کر ایک لفافے میں رتن کو بھیج دیے۔ لیکن

ایسا لگتا ہے کہ جس کے پاس جتنا ہی کم پیسہ ہوتا ہے اُسے اس طرح کے تحفے قبول کرنے میں اتنی ہی زیادہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ رتن نے اپنے اگلے خط کے ساتھ سارے ٹکٹ واپس کر دیئے اور اپنے دوست کا خط پڑھ کر انور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے خط میں لکھا تھا: 'اب کبھی مجھے اس طرح کی کوئی چیز نہ بھیجنا۔ میں جانتا ہوں تم نے دوستی کا حق نبھانے کے لیے ہی ایسا کیا ہوگا۔ پھر بھی مجھے اس سے ٹھیس پہنچی۔ ماں کہتی ہیں کہ 'خیرات لینے سے اچھا ہے کہ آدمی بھوکوں مر جائے۔'

(7)

آسمان پر کالے بادل چھانے لگے اور پہلا چھینٹا پڑتے ہی زمین کی گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک آنے لگی۔ سوکھی ہوئی مٹی نے اسپنج کی طرح سارا پانی جذب کر لیا اور جلد ہی ہر طرف نئی زندگی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ گڑگاؤں کا چھوٹا سا گندا قصبہ نہا دھو کر نکھر آیا۔ سڑکوں پہ گرد اُڑنا بند ہوگئی اور تحصیلدار صاحب کے بنگلے میں جہاں بھی خالی جگہ تھی وہاں گھاس اور ہریالی اُگ آئی تھی۔ بڑی اماں نے نیم کے سایہ دار پیڑ کی سب سے اونچی ڈالی پر سوت کی رسّی کا جھولا ڈلوا دیا اور تینوں بچّے لمبے لمبے پینگ لے کر اُس پر جھولنے لگے۔

اِسی موسم میں، جب نہ بہت گرمی پڑتی تھی نہ بہت سردی، تحصیلدار صاحب اپنی تحصیل کے دورے پر جاتے تھے۔ دورے پر جانے کی تیاریاں زوروں پر جاری تھیں اور بچّے گاؤں کی سیر کے خیال سے بہت خوش تھے۔ رؤف پہلے بھی اپنے ابا کے ساتھ دورے پر جا چکا تھا۔ اُس نے انور اور بلقیس کو بتایا کہ دورے پر کتنا مزا آتا ہے۔ اُس نے انھیں بتایا کہ 'گاؤں میں ابا کی حیثیت بالکل بادشاہ جیسی ہوتی ہے اور میری شہزادہ جیسی۔ سب لوگ جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں۔' انور پر اس بات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ لیکن اُس نے یہ بات رؤف سے کہی نہیں۔ نوکروں سے کس طرح بات کی جانی چاہیے، اِس سوال کو لے کر اُس کا اور رؤف کا جھگڑا ہو چکا تھا اور اپنے تایا کے یہاں اتنے دن ہنسی خوشی گذار دینے کے بعد اب چلتے وقت وہ اور زیادہ کڑواہٹ نہیں پیدا ہونے دینا چاہتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد اُسے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ رؤف نے جو بات کہی تھی اُس کا کیا مطلب

تھا۔ امجد علی تحصیلدار دورے پر جاتے تھے تو ایک پورا قافلہ اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ سب سے آگے وہ خود گھوڑے پر چلتے تھے۔ اُس کے پیچھے ایک تانگے میں بچے اور سب سے پیچھے ایک بیل گاڑی پر خیمے، بستر، چارپائیاں، کرسیاں اور برتن لدے ہوتے۔ اس شاہی ٹھاٹ سے وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا دورہ کرتے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی گاؤں والے طاقتور سرکار کے اس نمائندے کو عقیدت پیش کرنے کے لیے لپکتے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اُن کا استقبال کرتے تھے اور پھر گاؤں میں سب سے اچھی جگہ پر خیمہ لگانے، خدمت گاری کرنے، لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے میں تحصیلدار صاحب کے عملے کی مدد کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ خیمہ لگتے ہی تحصیلدار صاحب اپنا حُقّہ لے کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے تھے اور چیتھڑے پہنے ہوئے میلے کچیلے کسانوں کا تانتا لگ جاتا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی فریاد لے کر اُن کی نظرِ کرم کی بھیک مانگتا ہوا آتا تھا 'حضور اِس سال فصل بہت خراب ہوئی'، اور 'حضور ہمارے پاس لگان دینے کو پیسہ ہے ہی نہیں'، اور 'حضور مائی باپ ہیں'۔ یہی اُن سب کی فریاد ہوتی تھی۔ رؤف کہتا تھا کہ جب کوئی 'مائی باپ' کہتا تھا تو اُسے بہت ہنسی آتی تھی۔ اس سے یہی پتہ چلتا تھا کہ یہ کسان کتنے بے وقوف ہیں۔

(8)

نور پور بہت ہی چھوٹا گاؤں تھا۔ اُس میں ایک کچے راستے کے دونوں طرف لگ بھگ پچاس جھونپڑیاں پڑی تھیں۔ جب پانی بہت برستا تھا تو یہ راستہ بالکل نالہ بن جاتا تھا۔ چاروں طرف گندا پانی کھڑا رہتا تھا جس پر ہری ہری کائی کی ایک موٹی تہہ جمی رہتی تھی جس میں مچھر پلتے تھے۔ امجد علی نے سب بچوں سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ نور پور میں رہیں تب تک بِنا اُبالا ہوا پانی نہ پیئیں۔

تحصیلدار صاحب نے گاؤں کے باہر ایک آم کے باغ میں اپنا خیمہ لگایا تھا اور خیمہ لگتے ہی باغ کا مالک ایک ٹوکری میں پکے ہوئے رس دار آم لے کر حاضر ہو گیا تھا۔ باورچی خانے کی چھولداری سے مسالے دار کھانوں کی خوشبو آ رہی تھی جو آموں کی تیز میٹھی خوشبو سے بھی زیادہ تھی۔ انور نے اپنے آپ اُس باغ میں ایک سایہ دار جگہ ڈھونڈ لی اور اپنی کتاب لے کر وہاں جا بیٹھا۔ وہ اُردو میں 'رابن سن کروسو' کا قصہ تھا اور کتاب پڑھتے پڑھتے وہ اپنے تصور میں ایک

ویران ٹاپو پر پہنچ گیا اور وہاں ریت پر آدمی کے پیروں کے نشان دیکھ کر اُس نے 'فرائی ڈے' کو کھوج لیا تھا۔ اُسے اس طرح کے قصے بہت پسند تھے۔ انھیں پڑھ کر بہت جوش آتا تھا لیکن اس نے مشکل سے کچھ ہی صفحے پڑھے ہوں گے کہ اُسے کچھ شور سنائی دیا۔ باورچی کسی پر چلاّ رہا تھا اور اُسے گالیاں دے رہا تھا اور وہ آدمی بھی اُس سے جھگڑ رہا تھا۔ اب انور بھاگ کر باورچی خانے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے تایا کا پہلوان جیسا باورچی یعقوب جس کی بہت بھیانک کالی داڑھی تھی، انور کی ہی عمر کے ایک چھوٹے سے پتلی پتلی ٹانگوں والے لڑکے کو پیٹ رہا ہے۔

'یعقوب' یعقوب' کیا کر رہے ہو؟ خبردار جواب مارا' انور نے چلاّ کر کہا۔ باورچی اپنے مالک کے بھتیجے کا حکم تو نہیں ٹال سکتا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ جب وہ ساری بات انور کو بتائے گا تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ اُس لڑکے کو بلا وجہ سزا نہیں دی جا رہی ہے۔

یعقوب نے سرکاری افسروں کے سبھی نوکروں کی طرح بہت ہی خوشامد بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ 'انور میاں' آپ اِس بدمعاش کو نہیں جانتے۔ مجھے تحصیل دار صاحب کے لیے آملیٹ بنانا ہے اور سارے گاؤں میں مجھے اسی کے گھر میں انڈے ملتے ہیں لیکن یہ کسی طرح انڈے دیتا ہی نہیں، نہ جانے انھیں رکھ کر کیا کرے گا، انھیں سینک کر کیا بچے نکالے گا؟'

انور نے اُس بھوکے ننگے لڑکے کو دیکھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اُن انڈوں کو بیچ کر کچھ پیسے کیوں نہیں بنا لیتا جب کہ ظاہر تھا کہ اُسے پیسوں کی سخت ضرورت ہوگی۔ 'کیوں جی، تم اپنے انڈے بیچ کیوں نہیں دیتے؟'

یعقوب نے کھیسیں نکال دیں لیکن انور کو اُس کا مطلب اُس وقت سمجھ میں آیا جب اُس لڑکے نے جواب دیا۔ 'حضور، میں تو بیچنا چاہتا ہوں لیکن یہ ہمیں پیسہ نہیں دیتا۔ یہ راموکی بگیا سے سبزی اور بنیے کی دُکان سے گھی بھی مفت لایا ہے۔ میرے اور میری ماں کے پاس صرف چھ مُرغیاں ہیں اور ہم اُن کے انڈے بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ حضور تو آپ ہمیں چھ انڈوں کے تین آنے دلا دیں تو میں چلا جاؤں۔'

اب سارا معاملہ انور کی سمجھ میں آیا۔ یعقوب زور زبردستی سے سارا سامان مفت لاتا اور اپنے مالک سے پورے پیسے وصول کرتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ ایک بار اس کی شکایت جہاں اپنے تایا سے کر دی تو یہ ساری دھاندلی ختم ہو جائے گی۔

وہ لڑکا آنسو پونچھ کر اب اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انور نے اُس سے کہا۔ 'تم میرے ساتھ آؤ اور تم بھی آؤ یعقوب، میں تایا ابّا سے تمھاری شکایت کروں گا۔' باورچی نے خانساماں کو آنکھ مار کر کچھ اشارہ کیا اور انور کے ساتھ ہولیا۔

تحصیلدار امجد علی کے پاس ہی ایک کرسی پر سفید گل مونچھوں والا ایک بوڑھا آدمی بیٹھا اُن سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔

وہ بوڑھا اُن سے کہہ رہا تھا۔ 'تحصیلدار صاحب اب میں آپ کو کیا بتاؤں یہ سُوَر کے بچے کسان، اِن کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ اِن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو نہ ہماری بات سنتے ہیں، نہ سرکاری افسروں کی۔ یہ ہر کام کے لیے مزدوری مانگتے ہیں جیسے اِن کے باپ دادا کو زمیندار کا کام کرنے کی مزدوری ہی تو ملتی تھی۔ اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب اُس بنیے کی اولاد گاندھی کا کیا دھرا ہے، اُس نے ہی جنتا کے حقوق کی باتیں کر کر کے اِن کے دماغ بگاڑ دیے ہیں۔'

تحصیلدار صاحب نے دھیمے گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔ 'لیکن آپ فکر نہ کریں، ٹھاکر صاحب، سرکار ایسے لوگوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتی ہے۔ پانی میں رہ کر کوئی مگر مچھ سے بیر نہیں رکھ سکتا۔'

'تایا ابا' انور نے اُن کی بات چیت کے بیچ میں اُونچی آواز میں کہا: 'یعقوب اِس لڑکے کو انڈوں کے پیسے نہیں دیتا اور اوپر سے اِسے گالیاں دے رہا ہے اور پیٹ رہا ہے۔'

لیکن امجد علی کو اپنے بھتیجے کی شکایت بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بولے: 'کیوں یعقوب کیا ہوا؟ جب وہ انڈے دینے کو تیار ہے تو تم اس لڑکے کو پیٹ کیوں رہے ہو؟'

'لیکن، سرکار، یہ حرامی تو انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیسے لیے بِنا تو وہ لاٹ صاحب کو بھی انڈے نہیں دے گا۔ سرکار اصل میں اِس نے آپ کی بڑی توہین کی ہے۔'

یہ سُن کر اُس گاؤں کے خاندانی زمیندار ٹھاکر چتن سنگھ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ تحصیلدار صاحب پر اپنی دھاک جمانے کا اچھا موقع تھا اور بوڑھے زمیندار صاحب یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

'کیوں بے لونڈے، کیا نام ہے تیرا؟'

'میرا نام بھولا ہے ٹھاکر صاحب۔'

'تیرے باپ کا کیا نام ہے؟'

'میرا باپ تو مر چکا ہے، ٹھاکر صاحب۔ پچھلے سال جب ہیضے کی بیماری پھیلی تھی اُسی میں مر گیا تھا۔ اس کا نام رامو تھا۔'

'تم جانتے ہو، یہ کون صاحب ہیں؟' انھوں نے امجد علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ بھولا چپ رہا۔ صرف اُس نے اپنا سر ہلا دیا۔

'تو انہیں جانتا ہے پھر بھی تو اِن کے ناشتے کے لیے چند انڈے دینے سے انکار کرتا ہے؟ جانتا ہے یہ تجھے اُس پیڑ سے باندھ کر تیری کھال کھنچوا سکتے ہیں؟ خیریت جانو کہ تحصیلدار صاحب بہت رحم دل آدمی ہیں، نہیں تو سرکار کا حکم نہ ماننے کے جرم میں تجھے گرفتار کروا کر جیل میں بند کروا دیتے۔ سمجھا؟' بھولا ڈر کے مارے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ 'اچھا اس بار تو میں تجھے معاف کرائے دیتا ہوں۔ سلام کر تحصیلدار صاحب کو اور بھاگ جا یہاں سے۔'

'سلام تحصیلدار صاحب، سلام ٹھاکر صاحب۔' اور بھولا کھال کھنچوانے کے ڈر سے کانپتا ہوا اپنی پھر تیلی ٹانگوں سے وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ بوڑھے ٹھاکر صاحب نے فخر کے ساتھ امجد علی کی طرف دیکھا اور یعقوب بھی وہاں سے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے انور کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' میں تو پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہی ہوگا' انور بہت ذلت محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے بھولا کی طرفداری کر کے بہت بڑی بیوقوفی کی ہے۔ اب ہر آدمی اُس کا مذاق اُڑائے گا۔ رؤف اور بلقیس بھی اُس پر ہنسیں گے۔ لیکن اُس کا دل کہتا تھا کہ اُس نے ٹھیک کیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس خیال سے کہ کہیں کوئی اُسے روتا دیکھ نہ لے اور اُسے شرمندہ نہ ہونا پڑے، وہ بھاگ کر آموں کے باغ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت اُسے بالکل بھوک نہیں لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اب زندگی میں کبھی بھی وہ آملیٹ شوق سے نہیں کھا پائے گا۔

(9)

انور گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اُسے دو کسان جولائی کی تپتی ہوئی دھوپ میں کھیت جوتتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن کی کالی ننگی پیٹھیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ خیمے

میں سب لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہے تھے لیکن انور کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ بھولا کا خوفزدہ چہرہ اُس کا پیچھا کر رہا تھا، اُس سے فریاد کر رہا تھا اور اُس پر الزام بھی لگا رہا تھا۔ اب وہ اُسی بھوت کو ٹھنڈا کرنے جا رہا تھا۔ اُس کی جیب میں لگ بھگ دو روپے کی ریزگاری کھنک رہی تھی جو وہ بھولا کو دینے جا رہا تھا۔ اِس طرح وہ اُن تین آنوں کا بدلہ چکا دینا چاہتا تھا جو یعقوب نے اُسے نہیں دیئے تھے۔ لیکن اُس بے چارے جاہل باورچی کا کیا قصور؟ انور نے سوچا۔ اس شرمناک حرکت کی اصل ذمہ داری اُس کے تایا ابا امجد علی پر تھی۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے دل میں اپنے تایا ابا کے لیے سخت نفرت پیدا ہوئی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ جلدی سے جلدی گھر واپس چلا جائے گا۔

گاؤں میں گھستے ہی انور نے ایک بہت ہی درد بھرا گیت سنا۔ ایک جھونپڑی میں کچھ لڑکیاں مل کر ڈھولک پر ایک دُھن گا رہی تھیں جس کی وجہ سے اُس دُھن میں اور درد پیدا ہو گیا تھا۔ انور کو دلّی کے رئیس زادوں کی شائستہ زبان سننے کی عادت رہی تھی اِس لیے وہ پنجابی کے اِس لوک گیت کے بول تو نہیں سمجھ پایا، پر گانے کی ٹیپ کچھ اس طرح کی تھی: 'دِیوا بلے ساری رات، بیر یا ظالما، دِیوا بلے ساری۔' دیا ساری رات کیوں جلتا ہے؟ عورت کس کا انتظار کر رہی ہے؟ اگر انور پنجاب کے اس مشہور لوک گیت سے واقف ہوتا تو اُسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ عورت صدیوں سے اپنے عاشق کا انتظار کرتی رہی ہے اور وہ ابھی تک نہیں آیا۔

لیکن انور کے دماغ پر تو بھولا کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اپنے عاشق کا انتظار کرنے والی بیراگن کا درد بھرا گیت دور سے آتی ہوئی ایک دُھن کی طرح لگا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اِس گیت کی دُھن اور بول دونوں ہی بھولا کی حالت پر پورے اُترتے تھے۔ آخر عاشق کہاں چلا گیا تھا؟ کیا زمیندار نے بیگار لینے کے لیے اُسے پکڑ لیا تھا؟ یا تحصیلدار صاحب نے اسے پیڑ سے باندھ دیا تھا اور اُس کی کھال کھنچوا رہے تھے؟

گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھوں کو ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آرام کرتے دیکھ کر اُس نے اُن سے پوچھا: 'رامو کے بیٹے بھولا کا گھر کون سا ہے؟' ان میں سے ایک داڑھی والے بوڑھے نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ جھونپڑی باقی سب جھونپڑیوں سے نیچی اور زیادہ ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیتی تھی۔

اپنی منزل پر پہنچ کر انور کو اندر جاتے شرم آ رہی تھی لیکن جس مقصد کو لے کر وہ نکلا تھا جب تک اُسے پورا نہ کر لے تب تک اُس کے دل کو سکون نہیں ملے گا۔

'بھولا! بھولا!' اُس نے زور سے آواز دی۔ سفید بالوں والی ایک دُبلی پتلی عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ بھولا کی ماں تھی اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک لڑکا اُس کے دروازے پر کھڑا ہے لیکن بھولا نے، جو ایک کونے میں بیٹھا روکھی روٹی کھا رہا تھا، انور کو پہچان لیا اور اُسے سلام کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

'ماں۔' اس نے کہا: 'یہ تحصیلدار صاحب کے بھتیجے ہیں۔ انھوں نے.....' لیکن انور نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے پیسوں کی تھیلی نکالی اور اُسے بھولا کی حیران ماں کی ہاتھوں میں رکھ کر بولا۔ 'اسے آپ لے لیجیے۔ بھولا کو اسکول بھیج دیجیے گا۔' اور اتنا کہہ کر وہ وہاں سے بھاگ آیا۔

گاؤں کے وہی بوڑھے جنھیں انور نے آتے وقت دیکھا تھا، بیٹھے اِس بات پر غور کر رہے تھے کہ تحصیلدار صاحب کے بھتیجے کے گاؤں میں آنے کے پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے۔ کچھ ہی منٹ بعد انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہی لڑکا تیزی سے بھاگا چلا جا رہا ہے جیسے کوئی بھوت اُس کا پیچھا کر رہا ہو۔ شہر کے اِن امیروں کے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں۔

انور نے گاؤں کے باہر ہی نکل کر دم لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھولا یا اُس کی ماں پیسے واپس کرنے اُس کے پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ کھیتوں کے کنارے پہنچ کر وہ دم لینے کے لیے رُکا اور اطمینان کا سانس لیا۔ پیچھے سے ایک دُھن کے ساتھ ڈھولک کی آواز سنائی دے رہی تھی اور لڑکیاں مل کر ابھی تک وہی گیت گا رہی تھیں۔ 'دیوا جلے ساری رات۔'

اُس کے سامنے جُتے ہوئے کھیت پھیلے تھے۔ کچھ کھیتوں کو کسان ابھی تک جوت رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ اپنے بیلوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے اُن کی پیٹھ پر ایک چابک جڑ دیتے تھے اور کھیتوں کے اُوپر تھوڑی ہی اونچائی پر کالے کالے بادل تیر رہے تھے۔ یہ آنے والے طوفان کی صاف نشانی تھی۔

○

کتاب دوسری

طوفان کی آمد آمد

سسُرال!

(1)

جن دنوں انور اپنے تایا ابا کے ہاں تھا اُن ہی دنوں ایک سیاسی طوفان کی گرج سُنائی دے رہی تھی۔ سارے ملک میں نافرمانی کا ایک عجیب سا جذبہ پھیل گیا تھا۔ ہر طرف بغاوت پھیلی ہوئی تھی اور اس بغاوت کا اظہار اُن حلقوں سے ہو رہا تھا جہاں سے اُس کی کوئی اُمّید نہیں تھی۔ جن لوگوں کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، جو نرم دل اور امن پسند تھے، جو مطلبی اور دبُّو تھے، جنھوں نے زندگی بھر سرکاری افسروں کے تلوے چاٹے تھے اور اُن کی خوشامد کی تھی۔ یہ سب لوگ بھی سیاسی تحریک میں کھنچ کر آ گئے تھے۔ دلّی لوٹنے کے کچھ دن بعد انور نے ایک دن اپنے ابّا کی بیٹھک میں سُنا کہ سرکار کی نافرمانی کے جُرم میں سارے ملک میں جو پہلے دو آدمی گرفتار کیے گئے تھے وہ پانی پت کے دو مسلمان تھے۔ پانی پت کے اُسی سوئے ہوئے قصبے کے، جہاں وہ پچھلے سال گیا تھا۔ اکبر علی میر صاحب کے یہ الفاظ یاد آ گئے کہ 'کم سے کم پانی پت کے ہم شریف لوگ تو آٹا دال بیچنے والے اس ٹٹ پونجیے بنیے سے کوسوں دور رہیں گے۔' اور ان الفاظ کو یاد کر کے وہ مسکرا دیئے۔ جب پانی پت میں اتنی زبردست لہر آئی تھی تو باقی ملک میں کیا ہوگا؟

اِس طوفان کے پیچھے جس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، تاریخی مذہبی،

سیاسی اور معاشی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ انور کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا تھا کہ یہ سارا جھگڑا کن مسائل کو لے کر ہو رہا تھا، پر اُسے اتنا احساس ضرور تھا کہ سرکار ظلم کر رہی تھی اور لوگ پریشان ہو کر سرکار کے اس ظلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ اُس کے دل میں یہ تصویر جلیاں والہ باغ کے حادثے کی شکل میں چھائی ہوئی تھی جس کو اُس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کے دل سے یہ بھیانک تصویر کبھی نہیں مٹ سکتی۔ اس سیاسی تحریک کی جڑ میں گہری معاشی بے چینی بھی چھپی ہوئی تھی۔ غربت زدہ کسانوں میں اپنے حقوق کے لیے بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اِس بات کو سمجھتے جا رہے تھے کہ وہ زندگی بھر دوسروں کی غلامی کرنے اور بھوکوں مرنے کے لیے ہی نہیں پیدا ہوئے ہیں، اُن کا مستقبل زیادہ روشن ہو سکتا ہے۔ انور نے گڑگاؤں کے آس پاس کے گاؤں میں کسانوں کی حالت دیکھی تھی، اور وہ اُس کسان کے چھوٹے سے لڑکے بھولا کو نہیں بھلا سکتا تھا جس نے تحصیلدار صاحب کے ظالم باورچی کو تین انڈے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سارے ملک میں نافرمانی کا جو جذبہ پھیلتا جا رہا تھا، بھولا کا انکار اُسی کی ایک علامت تھی۔

(2)

انور پھر اسکول جانے لگا لیکن ایسی ہلچل کے زمانے میں پڑھائی میں دل لگانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر طرف جلوسوں، عام جلسوں، حُبّ الوطنی کے نغموں اور نعروں کا دَور دَورہ تھا۔ چاروں طرف ایک نیا لفظ سنائی دیتا تھا 'بائیکاٹ'۔ ہر چیز کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں کا، عدالتوں کا، اسکولوں اور کالجوں کا اور ولائتی کپڑے کا۔ روز سر بازار ولایتی ہیٹوں اور سوٹوں کے ڈھیر جلائے جاتے تھے اور بڑے بڑے فیشن والے لوگ بھی فخر کے ساتھ کھدّر کے کپڑے پہننے لگے تھے۔ ایک دن جب انور نے ڈاکٹر انصاری کو دریا گنج میں اپنی موٹر پر جاتے دیکھا تو وہ انھیں آسانی سے پہچان بھی نہ سکا۔ اُن کا ٹھاٹ دار ولایتی سوٹ اب اُن کے جسم پر نہیں تھا۔ اُس کی بجائے وہ کھدّر کا لمبا سا کُرتہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے، اُن کی مونچھیں اب بھی ڈراؤنی لگتی تھیں لیکن اُن کی مسکراہٹ میں پہلے کی طرح ہی مٹھاس تھی۔ انور کو اِس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب اُسے بھولے نہیں تھے۔ اُسے دیکھتے ہی انھوں نے موٹر روکی

اور اُس کی صحت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

بہت ہی جوشیلے اور نہ بھولنے والے دن تھے۔ اِس سے پہلے شاید ہی کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اتنے کھلے طور پر اور اتنے جوش کے ساتھ آپس میں بھائی چارہ دکھایا ہوگا۔ جلوسوں میں ہندو اور مسلمان مل کر 'اللہ اکبر' اور 'وندے ماترم' کے نعرے لگاتے تھے۔ اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے پانی پیتے تھے اور ہندو لیڈروں کو جمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں کے سامنے تقریر کرنے کے لیے جامع مسجد میں بلایا جاتا تھا۔

روز سڑکوں پر نئے نئے گیت سنائی دیتے تھے۔ جوشیلے گیت جن سے ملک کے نوجوانوں میں سیاسی بیداری جاگ اُٹھی تھی۔ کراچی میں علی برادران گرفتار کر لیے گئے تھے اور اُن کی بوڑھی ماں مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک میں شامل ہوگئی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، درجنوں نئے گیت فضا میں گونجتے گئے۔ انور نے بھی بلا کسی مشکل کے اُن میں سے کچھ گیت سیکھ لیے تھے۔

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
بولی امّاں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کچھ گیت ایسے بھی تھے جن میں انگریزوں کا مذاق اُڑایا گیا تھا جیسے:

بول گئی مائی لارڈ ککڑو کوں

جب کبھی کوئی انگریز اکیلا جاتا ہوا دکھائی دے جاتا تو لڑکے مُرغے کی بولی کی نقل کرتے اور ہوا میں ککڑوکوں کی آواز گونج اُٹھتی جس کی وجہ سے اپنی اکڑ میں پھولے ہوئے صاحب بہادر کو بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔ انور فطرتاً ڈرپوک تھا اس لیے وہ کھلے عام اپنی نفرت کا اظہار کرنے میں ہچکچاتا تھا لیکن عدول حکمی کا جو جذبہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اُس کا اثر اُس پر بھی ہوا تھا اور ایک دن اسکول سے لوٹتے وقت اُسے چاندنی چوک میں ایک انگریز سپاہی اکیلا جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس سے نہ رہا گیا اور اُس نے چلّا کر کہا: 'بول گئی مائی لارڈ ککڑوکوں۔' سپاہی نے مُڑ کر دیکھا کہ اُس کو یہ گالی کس نے دی تھی۔ انور نے جب اُس کا غُصّے سے لال چہرہ دیکھا تو اس سے پہلے

کہ انگریز حکمرانوں کا غصّے میں بھرا ہوا نمائندہ اُس کا پیچھا کرتا، وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن انور کے دل میں اُس انگریز کا ڈر سا گیا تھا۔ اس لیے وہ پوری تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں جلیاں والہ باغ کا وہ خوفناک نظارہ گھوم رہا تھا۔ لال منہ والے سپاہی اُس کی طرف بندوقیں تانے قطار باندھے چلے آ رہے تھے اور اُس رات کو اُن سپاہیوں نے خواب میں بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

(3)

انور ایک ایسے دَور سے گزر رہا تھا جب ہر طرف اُتھل پُتھل ہو رہی تھی لیکن ابھی تک یہ اُس کے لیے صرف ایک دلچسپ اور جوشیلا ڈرامہ ہی تھا۔ اُس کی ذاتی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ کنارے پر کھڑا ہوا طوفانی لہروں سے جدّ و جہد کرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

امرتسر سے خط آیا تھا۔ رتن کی ماں نے لکھا تھا کہ رتن گرفتار کر لیا گیا ہے اور ایک غیر قانونی جلوس میں شامل ہونے کے جُرم میں اُسے سال بھر کی قید کی سزا دی گئی ہے۔ انور روز سارے ملک میں گرفتاریوں کی خبریں پڑھتا اور سُنتا آیا تھا۔ اُن میں بڑے بڑے لیڈر بھی تھے۔ پر یہ خبر پاکر کہ اُس کا دوست جیل میں ہے، اُسے صدمہ سا پہنچا۔ درمیانہ طبقے کے رواجوں میں جکڑے ہوئے ماحول میں پلنے کی وجہ سے انور جیل خانے کو ایک بُری جگہ سمجھتا تھا۔ جہاں چور ڈاکو اور بدمعاش لوگ رکھے جاتے تھے لیکن اب حالت بدل گئی تھی اور جیل میں سزا کاٹنا بڑی عزّت کی بات سمجھی جانے لگی تھی۔ دیش بھر میں ہزاروں لوگ جیل جا رہے تھے۔ اخباروں میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اُن سب کا صرف نام بھی چھاپ سکیں۔ کچھ دن بعد اُس کے پاس امرتسر ڈسٹرکٹ جیل سے رتن کا خط آیا۔

'میرے پیارے دوست انور تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں یہاں آج کل اپنی سسرال میں ہوں......'

سسرال! رتن نے جیل کو سسرال کہا تھا اور پھر جیل کی زندگی کا ذکر کیا تھا۔ وہاں وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ساتھ کانگریس اور خلافت کے بہت سے رضا کار وہاں تھے۔ رتن نے بڑے فخر سے لکھا تھا۔ میں یہاں سب سے چھوٹا ہوں اور سب لوگ میرا بے حد خیال رکھتے

ہیں۔ میرے سال بھر کی اسکول کی پڑھائی کا تو ہرج ہوگا پر یہاں بہت سے عالم لوگ ہیں جو مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ سکھانے کو تیار رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں اسکول کے مقابلے میں زیادہ کام کی باتیں سیکھوں گا۔' ظاہر ہے کہ رتن ذہنی طور پر انور سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ انور کا دماغ تو ابھی تک بچوں جیسا ہی تھا۔

سسرال؟ جیل ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کے لیے سسرال بن گیا تھا۔ جب بھی کوئی گرفتار کیا جاتا تھا تو اُس کے دوست اور ساتھی اُسے ہار پہناتے تھے، اُس پر پھولوں کی بارش کرتے تھے، اُسے بدھائیاں دیتے تھے، اُس سے دیر تک ہاتھ ملاتے تھے اور گلے مل کر ہنس ہنس کر اُسے اس طرح وداع کرتے تھے جیسے وہ سچ مچ اپنی دُلہن کو لینے جارہا ہو۔

ایک دن وہ بھی آیا جب اکبر علی نے کاکا رامیشور دیال اور اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ بات چیت کے دوران بالکل ہی اس ڈھنگ سے کہا جیسے وہ بیوپار کے کام سے امرتسر یا کانپور جانے کی بات کہتے تھے۔ 'کل میں بھی سسرال جارہا ہوں۔'

کونے میں بیٹھے ہوئے انور کا دل دھک سے رہ گیا اور اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے دل میں چھرا اُتار دیا ہو۔ اِس خیال سے کہ اُس کے ابا سال بھر کے لیے یا شاید دو سال کے لیے چلے جائیں گے، انور کو بہت دُکھ ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی یہ اس کے لیے بڑے فخر کی بھی بات تھی۔ انور جانتا تھا کہ اب وہ اپنا سر اونچا کر کے چل سکے گا اور اپنے دوستوں سے کہہ سکے گا۔ 'میرے ابا بھی سسرال گئے ہوئے ہیں' اور سب لوگ اُس کی اسی طرح عزت کریں گے جیسے کسی بہادر کے بیٹے کی عزت کی جاتی ہے۔

(4)

دوسرے دن اکبر علی گرفتار کر لیے گئے اور رسمی عدالتی کارروائی کے بعد انھیں پندرہ مہینے کی سزا ہوگئی۔

انور کو اِس عظیم واقعہ کی ایک ایک بات یاد تھی۔ اُس کے ابا روز کے مقابلے میں جلدی اُٹھے تھے اور نہا دھو کر انھوں نے دھلے ہوئے کپڑے پہنے تھے اور پھر اپنی داڑھی پر کنگھا کیا تھا۔ ہر جمعہ کو اُن کا یہی دستور تھا۔ پر آج انھوں نے ہر بات کی طرف کچھ زیادہ ہی دھیان دیا تھا۔

انھوں نے نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے میں کچھ زیادہ ہی وقت لگایا تھا۔ جب وہ تیار ہو گئے تو انھوں نے پھوپھی امّاں کو نوٹوں کی ایک گڈّی دے کر کہا: 'لو یہ رکھو، شاید میں کافی دن تک واپس نہ لوٹ سکوں۔' پھر انھوں نے انجم کو گلے لگا کر اُسے پیار کیا اور انور کی بانہہ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ زنان خانے سے باہر لے گئے۔

دوپہر کے وقت انور اپنے ابّا کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا، جامع مسجد کے لال پتھر سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ مسجد میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور مؤذن کے اشارے پر ایک کے بعد ایک لوگوں کی نہ جانے کتنی قطاریں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ انور اس نظارے سے ہمیشہ بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ اُسے مذہب کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے ابّا سچائی اور نیک اخلاق پر زور دیتے تھے اور مولوی صاحب جنّت اور جہنم کی جو باتیں کرتے تھے، اُس سے زیادہ انور کو مذہب کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ ہزاروں لوگوں کو ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور ایک ساتھ سجدے کرتے دیکھ کر وہ دنگ رہ جاتا تھا۔ اُس کے ابّا نے اکثر اُسے بتایا تھا کہ اسلام میں جماعت باندھ کر نماز پڑھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کی ایک جمہوری بنیاد ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی انور نے چاروں طرف نظر ڈالی تو اُس نے دیکھا کہ سب ہی طبقوں کے لوگ کندھے سے کندھا ملا کر وہاں نماز پڑھ رہے ہیں۔ کلف دار ململ کے کُرتے پہنے ہوئے گورے چٹے رئیس، کڑھی ہوئی گول ٹوپیاں پہنے ہوئے چھوٹے موٹے دکاندار، کارخانے والے اور موٹے گاڑھے کے کپڑے پہنے ہوئے کسان یا نوکر، سب ہی وہاں موجود تھے۔ جب سارے نمازی ایک ساتھ سجدے میں گرتے تھے اور قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے تو انور کے دل میں مذہبی جوش کے مقابلے میں بھائی چارے اور برادری کا ایک عجیب جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

(5)

نماز کے بعد جمع ہوئے لوگوں نے وہاں ایک عام جلسہ کیا اور کئی کھدر پوش ہندو مسجد میں آئے اور اُنھیں نمازیوں کے مجمع کے سامنے لال پتھر پر بیٹھنے کی جگہ دی گئی۔ لوگوں نے تقریریں کیں۔ سب سے آخر میں اکبر علی کی تقریر ہوئی اور وہ سب سے اچھی تقریر تھی۔ انور نے بڑے فخر

کے ساتھ اپنے ابا کو اُٹھ کر منبر پر جاتے دیکھا۔ گھنی کالی داڑھی میں اُن کے چہرے پر ایک عجیب جوش نمایاں تھا۔ اُن کے منبر پر آتے ہی چاروں طرف سے اللہ اکبر کے نعرے لگنے لگے۔ اتنے میں ایک کونے سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی 'انقلاب زندہ باد' کی آواز سنائی دی اور فوراً بھیڑ نے نعرہ اُٹھالیا۔ بار بار لوگوں نے ایک آواز سے اِس نعرے کو دُہرایا اور اس گونجتی ہوئی آواز کی لہریں منبر کی طرف بڑھتی رہیں۔ لوگوں کے جوش کے اس اظہار کے بعد اکبرعلی نے اپنی تقریر شروع کی۔ انور اُس آواز سے اچھی طرح واقف تھا۔ اکبرعلی کی آواز ضرورت کے مطابق بہت سخت بھی ہو جاتی تھی اور بہت نرم بھی۔ اپنی اس آواز میں بتایا کہ بدیسی حکومت میں کتنے ظلم اور کتنی بے انصافیاں سہنی پڑتی تھیں۔ کس طرح لوگوں کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تاریخ میں کتنی ہی بار یورپ کی طاقتوں نے ترکی کے ٹکڑے کر دینے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے جلیاں والہ باغ کے قتلِ عام کا ذکر اتنے جوشیلے الفاظ میں کیا کہ کئی سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

انھوں نے ہزاروں گرفتاریوں کا ذکر کیا جس میں محمد علی اور شوکت علی بھی شامل تھے اور یہ اعلان کیا کہ اور بھی بہت سے لوگ گرفتار کیے جائیں گے۔ شاید اِس مسجد میں میٹنگ کے بعد کچھ لوگ گرفتار کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ لوگ خاموش رہیں اور اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ انھوں نے کہا: 'مہاتما گاندھی نے قسم لی ہے کہ ہماری آزادی کی لڑائی عدم تشدد کی بُنیاد پر لڑی جائے گی اور ہم اُنھیں مایوس نہیں کریں گے۔' جب انھوں نے اپنی تقریر ختم کی تو لوگوں نے پھر اللہ اکبر اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اکبرعلی کی تقریر کے دوران انور نے اُن کے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سنا بھلے ہی اُس کی سمجھ میں ہر بات نہ آئی ہو۔ وہ خوشی اور فخر کے مارے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ 'میرے ابا سچ مچ کتنے شاندار اور ہوشیار آدمی ہیں۔'

میٹنگ ختم ہوئی اور لوگ مسجد کے تین پھاٹکوں سے باہر نکلنے لگے۔ گھبراہٹ میں انور اپنے ابا کی اچکن کا دامن پکڑے ہوئے اُن کے ساتھ چپکا رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس بھیڑ میں اپنے ابا سے الگ نہ ہو جائے۔ بھیڑ کے ساتھ وہ بھی مسجد کے مشرقی دروازے سے باہر نکلے۔ اتنے میں پولس کے ایک داروغا صاحب چھ سات سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ پہنچے اور اکبرعلی کے پاس آ کر بڑی شرافت سے بولے: 'اکبرعلی صاحب آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ کوتوالی چلیے۔'

ہر آدمی جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ انور کو بھی کوتوالی کے اس بلاوے کے بارے میں کسی طرح کا شبہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے ابا وہاں گرفتار کر لیے جائیں گے۔ نہ جانے کیوں وہ اس بات کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں کتنی گڑ بڑ پیدا ہوگی بلکہ اُسے اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ اُس کے ابا کو گرفتار کرنے کے لیے جو پولس کا افسر آیا تھا وہ بھی ہندوستانی تھا۔ بڑے تعجب کے ساتھ وہ داروغا صاحب کی خاکی پگڑی کے کلف دار طرّے کو گھورتا رہا۔ پھر اُس کی نظریں نیچے اُتریں اور اُن کی کالی چمکدار پیٹی اور اتنے ہی چمکدار کالے چمڑے کے کیس میں رکھے ہوئے ریوالور پر جم گئیں۔

'اچھا، تو سسرال سے بُلاوا آ ہی گیا۔' اکبر علی نے ہنستے ہوئے کہا: 'چلیے میں تو تیار ہوں۔'

لیکن جو لوگ وہاں جمع تھے اُن کا رویہ دوسرا ہی تھا۔ انھوں نے چلاّ کر کہا 'نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ اِس داروغا کو شرم نہیں آتی؟ غدار کہیں کا! اِس طرح کے ہندوستانی تو انگریزوں سے بھی بدتر ہیں، اُتار لو اس کی پگڑی۔' انور نے دیکھا کہ داروغا صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُن کی اینٹھی ہوئی مونچھیں کانپنے لگیں۔ اُن کی رگیں تن گئیں اور اُن کا ہاتھ ریوالور پر پہنچ گیا۔ انور سمجھ گیا کہ کوئی گڑ بڑ ہونے والی ہے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے اور پولس والے تھے کُل چھ سات اور لوگوں کی آواز میں غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ٹوڈی بچّہ۔ غدار۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کہیں کا وائسرائے ہے؟ ہے۔ ہے۔ ہے۔ اور اب وائسرائے کو بھی کون پوچھتا ہے۔'

اتنے میں کسی ہمت والے نے زور کا ایک ہاتھ مارا اور داروغا صاحب کی پگڑی دھول چاٹنے لگی۔ لوگوں نے بہت غصے میں آگے بڑھ کر داروغا صاحب کو گھیر لیا تھا اور وہ بھیڑ میں اس طرح گھر گئے تھے کہ اپنا ریوالور بھی نہیں نکال سکتے تھے۔ داروغا صاحب کی آنکھوں میں خوف تھا۔ انور یہ سوچ کر گھبرا اُٹھا کہ یہ لوگ اُسے مار ڈالیں گے۔' لیکن اتنی بھیڑ کی غصے سے بھری ہوئی آوازوں کے اوپر اکبر علی کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔' بھائیو، یہ مت بھولیے کہ ہم نے عدم تشدد کی قسم کھائی ہے۔' انھوں نے یہ الفاظ بہت نرمی سے لیکن بہت ہی قطعیت کے ساتھ کہے تھے اور کسی کو اُن کی بات ٹالنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھیڑ پیچھے ہٹنے لگی۔ جو لوگ داروغا صاحب کے پاس کھڑے تھے وہ پیچھے ہٹنے لگے اور داروغا صاحب نے اپنی پگڑی پھر اپنے سر پر رکھ لی۔ اُس کا

طرح ٹیڑھا ہو گیا تھا اور دُھول سے بھر گیا تھا۔

'انور، اب میں جا رہا ہوں۔' اُس کے ابا نے کہا: 'میرے پیچھے ٹھیک سے رہنا۔ پھوپھی امّاں کا کہنا ماننا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو رامیشور کاکا کے پاس چلے جانا۔ اچھا خدا حافظ۔' بس اتنا کہہ کر وہ داروغا صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ نہ انھوں نے پیار کا کوئی لفظ کہا، نہ اپنے بیٹے کو گلے لگایا، نہ چلتے وقت پیار ہی کیا، نہ پیٹھ تھپتھپایا۔ انور اپنے ابا کو اچھی جانتا تھا اس لیے اُسے اس بات کی اُمید ہی نہیں تھی کہ وہ کھلے عام اپنے جذبات کا اظہار کریں گے، پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کا دل اپنے باپ سے پیار کا کوئی لفظ سننے کے لیے، اُن کے پیار کا کوئی اظہار دیکھنے کے لیے تڑپ اُٹھا تاکہ وداعی کے اِس لمحے کا درد کچھ کم ہو سکے۔ اکبر علی داروغا صاحب کے ساتھ چل دیئے اور بھیڑ بھی اُن کے ساتھ ہو لی۔ انور لال پتھر کی اُن سیڑھیوں کے اُوپر اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اُن سیڑھیوں کا ہر زینہ پچھلے زینے سے زیادہ چوڑا تھا اور سب سے نیچے سڑک سے ملا ہوا جو زینہ تھا وہ سب سے چوڑا تھا۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے وہیں سیڑھی پر بیٹھ گیا، اُسے پتھر کی گرمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ بڑی دیر تک وہ وہاں دھوپ میں بیٹھا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ ابا کے بِنا اُس کی زندگی کیسے گذرے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ابا کے بِنا رہ بھی پائے گا کہ نہیں۔ پھر اُس کا دھیان پھوپھی امّاں اور انجم کی طرف گیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ ابا کی گرفتاری کی خبر سُن کر اُن پر کیا اثر ہوگا۔ پھر اُسے اپنے ابا کی یہ بات یاد آئی کہ 'اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو رامیشور کاکا کے پاس چلے جانا۔' ہاں وہ کاکا کے پاس دُکان پر جا کر کاکا سے ملے گا۔ جب وہ چلنے کے لیے اُٹھا تو اُسے سامنے لال قلعہ دکھائی دیا جس کے صدر پھاٹک پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ 'یہ جھنڈا یہاں کتنے دن تک ابھی اور لہرائے گا؟' انور سیڑھیاں اُترتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

○

سمندر میں ایک قطرہ

(1)

لالہ رامیشور دیال اُصول کے بڑے پابند تھے۔ اُن کا جسم بہت دُبلا پتلا تھا اور آئے دن کوئی نہ بیماری انھیں لگی رہتی تھی۔ اس لیے ڈاکٹروں نے اُنھیں رائے دی تھی کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں کھانے پینے کے معاملے میں بہت پرہیز کرنا ہوگا۔ کام کرنے، آرام کرنے اور سونے کا وقت مقرر کرنا ہوگا۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جوش و خروش والی باتوں سے دور رہیں اور اسی لیے اُن کی بیوی اُنھیں میٹنگوں میں جانے نہیں دیتی تھی۔ لاجونتی کا جسم جتنا بھاری تھا اُتنی ہی بھاری اُن کی آواز بھی تھی۔ اُس نے ساری گرہستی کو اور اپنے شوہر کو بھی جذبات کے بندھن میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ اُس کے کوئی بچہ نہیں ہوا تھا اور اس لیے وہ اپنی ساری ممتا اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرنے اور اُن کا حد سے زیادہ خیال رکھنے میں دکھاتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ جو وہ کہے وہی کیا جائے جیسے وہ اُن کی بیوی نہیں بلکہ اُن کی ماں ہو۔ وقت پر وہ لالہ جی کو گولیاں کھلاتی، دوا پلاتی، اُن کے گرتے ہوئے بالوں میں تیل ملتی، انھیں کھانا کھلاتی اور آرام کرنے یا دُکان جانے کی اجازت دیتی۔ اور اگر وہ ٹھیک وقت سے واپس نہ لوٹتے تو اُن کی خیریت نہیں تھی۔ تیسرے پہر تین بجے سے پانچ بجے تک اُن کا آرام کرنے کا وقت تھا۔ اور اگر

اِس درمیان دُکان سے کوئی ضروری سندیسہ بھی آتا تو وہ اُن تک نہ پہنچاتی۔ اس وقت میں وہ کسی بھی طرح کی دخل اندازی یا خلل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اپنے شوہر کو پلنگ پر لیٹ جانے کا حکم تو دے سکتی تھی لیکن اُن کی آنکھوں میں نیند لے آنا اُن کے بس میں نہیں تھا اور عام طور پر رامیشور دیال یہ دو گھنٹے کا وقت عجیب عجیب باتیں سوچنے میں صَرف کرتے تھے جن کے بارے میں وہ اپنی بیوی کو کچھ بھی بتانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پڑے پڑے اپنے بچپن کے بارے میں، اپنے اسکول کے دنوں کے بارے میں اور اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ وہ سوچتے رہتے تھے کہ جوانی میں اُن کے دل میں کیسی کیسی تمنّائیں تھیں، کہاں کہاں کی سیر کرنے کے منصوبے اُن کے دل میں تھے اور زندگی میں کن رنگینیوں کے پروگرام انھوں نے بنائے تھے لیکن جسم کے کمزور ہونے کی وجہ سے اور ارادہ اُس سے بھی کمزور ہونے کی وجہ سے وہ گھر بار سے بندھ کر رہ گئے تھے اور شادی ہو جانے کے بعد تو اُن کے لیے فرار کا آخری راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ اب زندگی کی ساری رنگینیاں اُن کے دماغ ہی میں رہ گئی تھیں اور اپنی بیوی کے نادر شاہی غصّے سے بچنے کا اُن کے پاس صرف یہ راستہ رہ گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے کے لیے سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے تھے۔

آج وہ خاص طور پر اکبر علی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اُن کے دوست اور ساجھے دار کو جیل گئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے جس کی وجہ سے رامیشور دیال پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ انھیں اس کا کوئی دُکھ نہیں تھا کیونکہ اکبر علی سے اُن کو بہت لگاؤ تھا اور قوم کی خاطر جیل جانے کے لیے اُن کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کاش وہ بھی اکبر علی کے ساتھ جیل میں ہوتے اور اُن کے ساتھ اُن دلچسپ بحثوں میں حصّہ لیتے جن میں اُنھیں بہت مزا آتا تھا جو اُن کے دوست کی گرفتاری کے بعد ختم ہو گئی تھیں۔

وہ جیل میں اکبر علی سے جا کر ملنے کی بھی سوچ رہے تھے۔ پر ساتھ ہی انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ اُن کی بیوی کو اس کا پتہ نہ چلنے پائے کیونکہ اُن کی بیوی اکبر علی کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اور ہمیشہ بڑی نفرت سے اُنھیں 'وہ تمھارے مسلمان دوست' کہتی تھیں اور یہ بات اُن کے گلے سے نیچے نہیں اترتی تھی کہ اُن کے شوہر کی ایک دوسرے مذہب کے آدمی کے ساتھ اتنی گہری

دوستی ہو۔لیکن وہ جانتی تھیں کہ اب اتنی پُرانی دوستی کو توڑ نا ناممکن تھا اور اس لیے انھوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔

(2)

پاس والے کمرے میں کچھ آوازیں سن کر رامیشور دیال کا دھیان ٹوٹ گیا۔ لاجونتی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ یکا یک دوسری آواز کو پہچان کر اُن کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔

'میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ لالہ جی سو رہے ہیں اور میں اُن کو جگا نہیں سکتی۔' لالہ جی نے اپنی بیوی کو کہتے سنا: 'اگر تمھیں ملنا ہی ہے تو کل دُکان پر مل لینا۔'

'لیکن کاکی میں اکبر علی صاحب کا بیٹا انور ہوں۔ میرے ابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی ضرورت پڑے تو کاکا سے مل لینا۔ صبح مجھے اسکول جانا ہوتا ہے اس لیے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کاکا کے اُٹھنے تک میں یہاں انتظار کر لوں گا۔' انور کی آواز میں بڑی انکساری اور نرمی تھی۔ لیکن للائن پر اُس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''نہیں نہیں، تم کسی اور وقت اُن سے مل لینا۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں اُٹھیں گے۔'

'اچھی بات ہے کاکی۔ کاکا سے اتنا کہہ دیجیے گا کہ انور آیا تھا۔' انور کی آواز میں بڑی نا اُمیدی تھی۔ وہ مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔

'انور، انور! اندر آجاؤ! میں جاگ رہا ہوں۔' انھوں نے چلاّ کر کہا اور انور بھاگ کر کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ لاجونتی بھی جھنجھلائی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے آئیں اور انھوں نے تیسرے پہر کا آرام کرنے کا اصول توڑنے کے لیے اپنے شوہر کو گھور کر دیکھا اور پھر جھلا کر پیر پٹکتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

'کہو بیٹا کیسے ہو؟' رامیشور کاکا نے بڑے پیار سے انور کو گلے لگا کر کہا۔ وہ انور کو ہمیشہ 'بیٹا' کہتے تھے اور حالانکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ باپ کے دوست باپ جیسا ہی سلوک کریں، پر انور کو اس سے ہمیشہ اُلجھن ہوتی تھی۔ اُس کے ابا اپنی محبت کو اتنا کم ظاہر کرتے تھے کہ اس طرح کے لاڈ پیار سے انور کو کچھ شرم بھی آتی تھی اور وہ کچھ جھنجھلا بھی جاتا تھا۔

'تو بیٹا بتاؤ کس کام سے آنا ہوا؟' انجم اور پھوپھی امّاں اور خود انور کی صحت اور اس کی

اسکول کی پڑھائی کے بارے میں ساری پوچھ تاچھ کرنے کے بعد انھوں نے پوچھا۔

'کاکا، جیل سے خط آیا ہے۔' انور نے بڑے جوش سے کہا۔ 'انھوں نے لکھا ہے کہ میں آپ کے ساتھ اُن سے ملنے آسکتا ہوں اور یہ کہ ہم دونوں کو سرکار سے اُن سے ملنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ کاکا آپ ڈپٹی کمشنر کو خط لکھ دیجیے اور ہم لوگ جلد اُن سے ملنے چلیں۔ تین مہینے سے میں نے ابا کو نہیں دیکھا ہے۔ کیا ہم لوگ کل چل سکتے ہیں؟'

رامیشور دیال لڑکے کی بے صبری پر بڑے پیار سے مسکرا دیے۔ 'ہاں ہاں انور، تمھارے ابا سے ملنے ضرور چلیں گے لیکن ملاقات کی اجازت لینے میں ایک دن سے زیادہ کا وقت لگ جائے گا لیکن تم فکر نہ کرو جب سب کچھ طے ہو جائے گا تو میں تمھیں خبر کر دوں گا۔'

انور کو یہ جان کر بہت تسلی ہوئی کہ رامیشور کاکا ابا سے ملاقات کا انتظام کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ چلنے کے لیے اُٹھا پر اُس کے کاکا نے اُسے روک لیا۔

'ذرا رُکو انور، یہ لو' اور اتنا کہہ کر انھوں نے تکیے کے نیچے سے ایک روپیہ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ انور کے ابا اُسے خرچ کرنے کے لیے روز صرف ایک آنہ دیتے تھے۔ چاندی کا چمکتا ہوا روپیہ دیکھ کر انور بہت خوش ہوا لیکن اُس کی پرورش بہت سختی کے ماحول میں ہوئی تھی اور اُسے اس طرح کے انعام لینے سے منع کیا گیا تھا۔

'ایک روپیہ کاکا!' اُس نے تعجب سے کہا۔ 'میں اس کا کیا کروں گا؟'

'لے لو بیٹا' اور یہ کہہ کر رامیشور دیال نے روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ کر جلدی سے اُسے کمرے کے باہر کر دیا۔

(3)

جیل کی اونچی اونچی دیواریں کسی قلعے کی دیواریں لگتی تھیں۔ لوہے کے بڑے سے پھاٹک میں موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ لیکن انور اور رامیشور دیال کے اندر آنے کے لیے پھاٹک کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول دی گئی۔ ایک سنتری کندھے پر سنگین لگی بندوق رکھے اُس برآمدے کے آگے پہرہ دے رہا تھا جس میں جیل کے دفتر کے دروازے کھلتے تھے جس وقت انھیں سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں لے جایا جا رہا تھا، اُس وقت انور بہت ڈر رہا تھا۔ کہانیوں میں اُس نے

سنا اور پڑھا تھا کہ لوگوں کو کس طرح تہہ خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور انھیں کیسی کیسی تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ اُس وقت اُس کے تصور میں وہی تصویریں آرہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی ویسا ہی شیطان ہوگا لیکن وہ تو بہت ہی شریف آدمی نکلا وہ کچھ تھکا ہوا ضرور معلوم پڑتا تھا لیکن اُس نے انور کو دیکھتے ہی مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ رامیشور کا کا نے اُسے ملاقات کی اجازت دکھائی اور سپرنٹنڈنٹ انھیں بغل والے کمرے میں لے گئے جہاں کچھ سیاسی قیدی بیٹھے اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے باتیں کررہے تھے۔ ایک وارڈر کونے میں اسٹول پر بیٹھا چپ چاپ انھیں دیکھ رہا تھا۔

'تمھارے ابا ابھی ایک منٹ میں یہاں آتے ہیں۔' سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے وہ جس دروازے سے نکل کر آئے تھے اُسی کی بغل میں ایک دوسرا دروازہ تھا۔ شاید یہی جیل کے اندر جانے کا دروازہ تھا۔ اُس کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سے چاروں طرف سے گھرے ہوئے آنگن میں کچھ قیدی جیل کے موٹے کپڑے پہنے ہوئے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سَروں پر ٹوکریاں رکھے اینٹیں اور گارا اور سیمنٹ ڈھو کر کہیں لے جارہے تھے۔ شاید جیل کے اندر کوئی عمارت بن رہی تھی۔ انور کو یہ دیکھ کر بڑا ترس آیا کہ اُن میں سے کچھ کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ رامیشور کا کا نے بتایا کہ یہ بہت خطرناک قیدی ہیں، جنھیں قتل یا ڈاکے کے جُرم میں لمبی لمبی سزائیں دی گئی ہیں۔ انور پر پہلا اثر یہ ہوا کہ اُسے اِس بات پر بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ اُس کے ابا کو جو سب سے زیادہ شریف آدمی تھے، ایسے غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ رکھا جائے۔ اُسے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر لوگ دوسرے لوگوں کو لوٹتے کیوں ہیں یا اُن کا خُون کیوں کرڈالتے ہیں۔

وہ اسی مسئلے پر سوچ رہا تھا، جس پر بہت پہلے سے اُس سے بڑے بڑے مُفکر اپنا سر کھپاتے آئے تھے۔ اتنے میں جیل کے اندر جانے والا دروازہ کھلا اور اُس کے ابا کمرے میں داخل ہوئے۔

'ابا!' انور خوشی کے مارے چلّایا اور اپنے ابا کے گلے سے لپٹ جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اکبر علی نے ہمیشہ کی طرح بڑے خاموش ڈھنگ سے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپتھپائی اور اپنی

محبت کا اِس سے زیادہ کوئی اظہار کیے بنا انھوں نے بڑے تپاک سے رامیشور دیال سے ہاتھ ملایا۔ پھر انھوں نے دونوں سے اشارے سے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی ایک کرسی لے کر اُن کے پاس بیٹھ گئے۔

دونوں دوست باتیں کر رہے تھے اور انور اپنے ابا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ دُبلے ہو گئے تھے اور اُن کا چہرہ کچھ پیلا پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ہی ہنس مکھ تھے اور باری باری سے کبھی وہ اپنے ساجھے دار سے بیوپار کی باتیں کرتے اور کبھی اپنے بیٹے سے گھر کا حال چال پوچھتے۔ لیکن انور جیل میں ابا کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اکبر علی اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی مصیبتوں کا دُکھڑا روتے اور خاص طور پر اپنے بیٹے کے سامنے۔ انھوں نے انور کو بتایا کہ جیل میں انھیں کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ انھوں نے کہا: 'میں آج کل بہت سی کتابیں پڑھ رہا ہوں جو کاروبار میں پھنسے رہنے کی وجہ سے باہر نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ اور میرے ساتھ یہاں بہت اچھے لوگ ہیں۔ اُسی جیل میں سیاسی قیدیوں میں وکیل اور بیرسٹر، بڑے بڑے عالم، پروفیسر، مولوی اور پنڈت تھے اور اُن کے بیچ فلسفیانہ، سیاسی، مذہبی اور سماجی مسائل کے بارے میں لمبی چوڑی بحثیں چلتی رہتی تھیں۔ انور کے دل میں اس بات سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی اور اُس نے اپنے ابا سے پوچھا: 'کیا یہاں لڑکے بھی ہیں میرا مطلب ہے میری عمر کے لڑکے؟' اور جب اُس کے ابا نے جواب میں 'ہاں' کہا تو اُس نے اپنے دل میں فوراً فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی وہیں آئے گا جہاں اُس کے ابا تھے۔

جب ملاقات کا وقت پورا ہو گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے ایک بار پھر بڑی نرمی کے ساتھ آ کر انھیں اس بات کی اطلاع دی اور انھوں نے ایک دوسرے سے رُخصت لی۔ انور نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ہاتھ ملایا اور رامیشور دیال نے، جو خود نرم دل تھے، سپرنٹنڈنٹ صاحب کا اُن کی مہربانی کے لیے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا لیکن جب وہ برآمدے سے نکل کر اُسی چھوٹی سی کھڑکی کے راستے باہر کی روشنی میں نکلے تو انور کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ جلد ہی وہ پھر جیل آئے گا لیکن اُس بار کسی سے ملنے نہیں بلکہ قیدی بن کر۔

(4)

وہی ہندوستانی جو ابھی کچھ دن پہلے تک قانون کے پابند اور امن پسند تھے انھیں اچانک نہ جانے کیوں جیل جانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ بیوپاریوں نے اپنی دُکانیں چھوڑ دیں، طالب علموں نے اسکولوں اور کالجوں میں اپنی پڑھائی چھوڑ دی، مُلّاؤں اور پروہتوں نے اپنے اپنے مسجد مندر چھوڑ دیے۔ عورتیں زنان خانے کی اُونچی اُونچی دیواروں سے باہر نکل آئیں، وکیلوں کو جس قانون کی حفاظت کرنا سکھایا گیا تھا اُسی قانون کو وہ خود توڑنے لگے، بڑے بڑے رائے بہادروں اور خان بہادروں نے اپنے خطاب واپس کر دیے۔ سرکاری نوکر راج کے دشمنوں سے جا ملے۔ اور یہ سب لوگ جا کر جیلوں میں بھر گئے۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنے بہت سے لوگ اپنی مرضی سے جیل نہیں گئے تھے۔

جب سے انور جیل میں اپنے ابّا سے مل کر آیا تھا، اُس وقت سے اُس پر جیل جانے کا بھوت سوار تھا۔ وہ موٹے کھدّر کے کپڑے پہننے لگا تھا اور گاندھی ٹوپی لگانے لگا تھا جسے اب بغاوت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا اور گھر کے باقی لوگ سو جاتے تو وہ چپ چاپ اپنا بستر چارپائی پر سے اُتار کر نیچے زمین پر بچھا لیتا تاکہ اُسے فرش پر سونے کی عادت ہو جائے۔ اُس سے کسی نے کہا تھا کہ جیل میں بہت کھردرے کمبل اوڑھنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ بھی ابّا کی دُکان سے اپنے لیے ایسا ہی ایک کمبل لے آیا تھا۔ وہ کالا کمبل تھا اور اُس کے روئیں بہت سخت تھے اور اُس میں سے ایک عجیب سی بو آتی تھی۔ لیکن انور نے اُس کی عادت ڈال لینے کی ٹھان لی تھی۔ روز رات کو وہ نرم ریشمی لحاف چھوڑ کر اُسی کمبل کو اوڑھ کر سو جاتا تھا، حالانکہ شروع شروع میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے نیند بالکل نہیں آتی تھی۔ دھیرے دھیرے اُسے اس کی عادت پڑ گئی اور اپنی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش بھی ہوا۔ لیکن بہت سویرے ہی اور لوگوں کے جاگنے سے پہلے وہ اُٹھ جاتا تھا اور بستر پھر چارپائی پر لگا کر کمبل گدّے کے نیچے چھپا دیتا تھا۔ اگر کوئی اُسے یہ تپسیا کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ شرم سے مر جاتا۔

وہ روز اسکول جاتا تھا مگر پڑھائی میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اُسے جلوسوں اور گرفتاریوں کی خبروں میں اور کسی نہ کسی لیڈر کی گرفتاری پر آئے دن ہونے والی ہڑتالوں میں زیادہ دلچسپی

تھی۔ چوراہوں پر ولایتی کپڑے کی جو ہولی جلائی جاتی تھی وہ اس کے لیے ایک نئی دلچسپی کا سامان تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ولایتی کپڑوں کی بہت بڑی بڑی ہولیاں جلائی جاتی تھیں اور بے حد قیمتی سوٹ اور شیروانیاں، عورتوں کی جارجٹ کی ساڑیاں اور زری کے بیاہ کے جوڑے آگ کی اِن لپٹوں میں جھونک دیے جاتے تھے۔ لڑکوں کے لیے یہ بھی ایک کھیل تھا اور کچھ لڑکے تو اپنے گھر سے کپڑے چُرا کر لے آتے تھے اور اس ہولی میں جلا دیتے تھے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ کوئی لڑکا آگے آگے کوئی ریشمی کوٹ یا شیروانی لیے بھاگا چلا آ رہا ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے غصّے میں لال پیلا ہوتا ہوا اُس کا باپ اُسے کوستا اور گالیاں دیتا چلا آ رہا ہے اور اس سے پہلے کہ باپ لڑکے کو روک سکے، وہ کپڑا آگ کی نذر ہو چکتا تھا اور لڑکا بڑی ڈھٹائی سے اپنے باپ کی طرف اس طرح دیکھتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب جو سزا آپ چاہیں دے لیں لیکن قوم پرستی کا جذبہ اتنا زوردار تھا کہ باپ کو سب کے سامنے اپنے بیٹے کو ڈانٹنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی، اُسے ڈر رہتا تھا کہ کہیں لوگ اُسے غدار نہ ٹھہرا دیں۔

انور نے بھی پھوپھی اماں کے ڈر کے مارے کچھ ولایتی کپڑے الگ چھپا کر رکھ چھوڑے تھے اور انھیں وہ ایک ایک کر کے لا کر آگ میں جھونک دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پھوپھی اماں اس بات کے بالکل خلاف تھیں کہ اچھے اچھے نئے کپڑے اِس طرح جلا دیے جائیں۔ انور نے ایک چمکدار ریشمی شیروانی، جو پچھلی عید پر اُس کے لیے بنوائی گئی تھی، بچا کر رکھ چھوڑی تھی۔ لیکن جب تحریک نے زور پکڑا اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لیڈر پکڑ کر جیل میں بند کیے جانے لگے اور ڈھیروں ولایتی کپڑا روز جلایا جانے لگا تو انور بھی زیادہ دیر تک اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس شیروانی کو جلتے دیکھ کر اُسے بڑا دُکھ ہوگا لیکن وطن پرستی کے لیے تو اپنی پیاری سے پیاری چیز کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ اپنا جی کڑا کر کے اپنی شیروانی بھی نہیں جلا سکتا تو پھر وہ جیل کیسے جائے گا۔

ایک دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور شیروانی نکال کر اُس نے بڑی حسرت بھری نگاہ سے اُسے آخری بار دیکھا اور پھر اُسے ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔

اپنی اسکول کی کتابوں کے نیچے ایک بنڈل چھپائے ہوئے وہ چپکے سے گھر سے کھسک رہا تھا کہ اتنے میں اُس نے گلی میں ایک تانگہ آ کر رُکنے کی آواز سنی اور باہر نکلتے ہی وہ اپنے تایا ابّا امجد علی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ ابھی ابھی تانگے سے اُترے تھے اور اُن کا چپراسی اُن کا

صندوق لیے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

'سلام تایا ابا' انور اتنا کہہ کر جلدی سے آگے بڑھا۔

'جیتے رہو بیٹا' تایا ابا نے اپنی عادت کے مطابق ناک کے سُر میں بڑی بے پروائی اور رُکھائی سے کہا 'اتنی جلدی کہاں چل دیے؟'

'اسکول جا رہا ہوں تایا ابا' انور کسی صورت سے اپنی جان چھڑا کر وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔

امجد علی کچہری میں برسوں تک مُجرموں کو دیکھتے دیکھتے ہر چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انور کسی چیز کو اپنی کتابوں کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

'یہ کیا ہے؟' انھوں نے پوچھا۔

انور جانتا تھا کہ اُس کے تایا ابا اُسے کبھی بھی یہ شیروانی ولایتی کپڑوں کی ہولی میں جلانے نہیں دیں گے۔ پھوپھی امّاں نے اُسے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے اس لیے خفا تھے کہ وہ 'اُن باغی کانگریسیوں کے ساتھ اپنی اوقات خراب کر رہا ہے اور جیل جا کر اُس نے خاندان کے نام پر دھبّہ لگا دیا ہے' انور جانتا تھا کہ اگر انھوں نے دیکھ لیا کہ اِس بنڈل میں کیا ہے، تو اُس کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

'کچھ نہیں تایا ابا، کچھ بھی تو نہیں' اُس نے گھبراہٹ میں اٹک اٹک کر جواب دیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے تایا ابا چلاّ چلاّ کر اُسے روک رہے تھے، پر اُس نے اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔

(5)

اُس دن جب انور رات کو گھر لوٹا تو تایا ابا اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب تناؤ اور خاموشی تھی۔ پھوپھی امّاں اور آپا انجم کے چہروں پر اُس نے گہری فکر کے آثار دیکھے۔

'انور' امجد علی کی آواز میں وہ کڑک تھی جس کے آگے پُرانے سے پُرانے مُجرم بھی اُن کی کچہری میں پیش کیے جانے پر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

'جی تایا ابا۔' انور نے دبی زبان میں جواب دیا۔

'سارے دن کہاں رہے؟ بولو، بتاؤ۔' اور جب بے حد غصّے میں پوچھے گئے اِس سوال کے جواب میں انور چُپ چاپ کھڑا رہا جیسے وہ گونگا ہوگیا ہو، تو امجد علی نے خود اپنے سوال کا جواب دیا۔ 'اگر تم نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے تو میں بتاتا ہوں کہ تم کہاں تھے؟ تم کانگریس اور خلافت کے اُن بدمعاشوں کے ساتھ دن بھر واہی تباہی گھومتے رہتے ہو، غیر قانونی جلوسوں میں حِصّہ لیتے ہو اور ولایتی کپڑا جلاتے ہو۔ صبح تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اسکول جا رہے ہو لیکن تم وہاں گئے ہی نہیں۔ میں تمھارے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا تھا، وہ تمھاری حرکتوں سے بہت ناراض ہیں۔'

سارے ملک میں ہر طرف جو شاندار، جوش دلانے والے اور دل میں ایک ولولہ پیدا کر دینے والے حادثے ہو رہے تھے، وہ ایک پل میں خاک میں ملا دیئے گئے۔ تحصیلدار صاحب کی سرکاری نظروں میں یہ سارے حادثے اُن غنڈوں اور شہدوں کی شرمناک حرکتیں تھیں جو گولی سے اُڑا دیئے جانے کے لائق تھے۔ انور بوکھلا گیا۔ اُس نے سوچا۔ شاید تایا ابا ٹھیک ہی کہتے ہوں، لیکن......'

'لیکن تایا ابا، پھر ابا کیوں اِس چکّر میں پڑے؟ اگر جیل جانا اچھا کام نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔'

'یا خدا' امجد علی کا غصّہ یہ سنتے ہی بھڑک اُٹھا۔ 'تو نے بھی مجھے کیسا بھائی دیا ہے اور کیسا بھتیجا؟ سرکار نے تو اِن غیر قانونی حرکتوں کو کُچلنے میں میری خدمتوں سے خوش ہو کر مجھے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا ہے اور ہمارے خاندان والے سرکار کا شکریہ کس طرح ادا کر رہے ہیں؟ اِن سُور کے بچّوں کا۔ گاندھی اور محمد علی اور شوکت علی کا۔ ساتھ دے کر۔'

وہ اسی طرح بھکتے رہے اور آخر میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے بولے۔ 'اُس احمق اکبر نے جو کچھ کیا ہے اُسے میں مٹا نہیں سکتا لیکن میں اِس بات کو قطعی برداشت نہیں کر سکتا کہ اب اُن کا لڑکا خاندان کو سرکار کی نظروں میں اور گرا دے۔ انور، کل صبح تمھیں میرے ساتھ گڑگاؤں چلنا ہوگا، یہاں تمھاری پھوپھی امّاں تمھاری دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ تمھارے ابا جب تک جیل سے

لوٹ کر نہیں آ جاتے تب تک میں تمھیں اپنی نگرانی میں رکھوں گا۔'

اُس رات انور نے نہ کھانا کھایا، نہ اُسے نیند آئی۔ اُس کے تایا ابا نے آج جس طرح اُس سے بات کی تھی ویسے کوئی آج تک اُس سے نہیں بولا تھا اور اُس کے ابا کے اُس طرح بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی یہ بے انصافی اُس کے دل کو کھرچتی رہی۔ اُسے سب سے بُری تو وہ بات لگی تھی جو اُنھوں نے اُس کے ابا کے بارے میں کہی تھی حالانکہ جس وقت انھوں نے اُس کے ابا کے بارے میں وہ باتیں کہی تھیں تو غصّے کے مارے اس کی زبان بند رہ گئی تھی لیکن بعد میں اس کا جی چاہ رہا تھا وہ جا کر اُن سے کہہ دے کہ وہ تحصیلدار ہوں یا اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، پر وہ اُس کے ابا کی جوتیوں کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جا کر اُن سے کہہ دے کہ اُن کے جیسے لوگوں کو عام لوگ غدّار، ٹوڈی اور خوشامدی ٹٹو سمجھتے ہیں۔ لیکن اُس کے اندر کوئی چیز ایسی تھی جو اُسے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ شاید اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے بچپن سے بڑوں کی عزّت کرنا سکھایا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے جھگڑے فساد سے فطرتاً نفرت تھی یا شاید اس وجہ سے کہ اس کا جسم بہت کمزور تھا۔

رات کے سنّاٹے میں وہ اپنے بستر پر پڑا جاگ رہا تھا۔ اُس کا تکیہ گرم آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ بار بار وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ 'مجھے اپنے تایا ابا سے نفرت ہے۔ مجھے اپنے تایا ابا سے نفرت ہے۔ میں اُن کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں اُن کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔'

پڑوس کے مسجد میں مولوی صاحب لوگوں کو صبح کی نماز کے واسطے بلانے کے لیے اذان دے رہے تھے۔ اسی وقت انور اُٹھا اور اپنی گرم شیروانی پہن کر اُس نے گلے میں ایک مفلر لپیٹ لیا تاکہ اُس کے کانوں میں سردی نہ لگے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آنگن میں ابھی اندھیرا تھا۔ اُس کا پیر سوتی ہوئی بلّی پر پڑتے پڑتے بچا اور بلّی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ایک طرف کو بھاگ گئی۔ ایک پل کے لیے وہ خاموش کھڑا رہا کہ شاید کوئی جاگ جائے۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا وہ پھاٹک پر پہنچا لیکن اُس کی کُنڈی اتنی اُونچی تھی کہ وہاں تک اُس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا اس لیے وہ ایک اسٹول لے آیا اور گھبراہٹ میں کانپتے ہوئے اسٹول پر چڑھ گیا۔ کُنڈی تو کھل گئی پر اُس ڈگمگاتے ہوئے اسٹول پر وہ اپنا بیلنس قائم نہ رکھ سکا اور ایک دھماکے

کے ساتھ اسٹول سمیت زمین پر آ گرا اور اُس کا سر پتھر کی چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ اُس وقت اُسے چوٹ کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے تو بس فکر تھی کہ شور سن کر کہیں سب لوگ جاگ نہ جائیں اور جاگ کر وہاں نہ آ جائیں۔ بنا سوچ بچار کے اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر سر پر پاؤں رکھ کر سنسان گلی میں بھاگ کھڑا ہوا اور بڑی سڑک پر ہی پہنچ کر دَم لیا۔ پو پھٹ رہی تھی اور دریا کے اُس پار مشرق کی طرف افق دھیرے دھیرے گلابی اور سنہرا ہوتا جا رہا تھا لیکن اُوپر آسمان پر ابھی تک کچھ تارے چمک رہے تھے۔

انور پہلے کبھی اتنے سویرے نہیں اُٹھا تھا اور اب وہ ایک عجیب جوش محسوس کرنے لگا۔ ہوا تیر کی طرح چبھ رہی تھی اور جب وہ مفلر اپنے منہ پر لپیٹنے لگا تو اُسے بائیں آنکھ کے اُوپر ماتھے پر کوئی چیز چپچپی سی لگی۔ خون! یہیں پر اُسے پتھر کی چوکھٹ سے چوٹ لگی تھی۔ اُسے فتح کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔ لوگ ہمیشہ اُس کے چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی پھوپھی اماں ہمیشہ اس طرح حفاظت سے رکھتی تھیں جیسے وہ کوئی ٹوٹنے والا کھلونا ہو لیکن اُس نے پتھر سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا اور سچ مچ اُس کے خون نکل رہا تھا پھر بھی اُس نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی تھی اور جب اُسے چوٹ کا پتہ لگا تب بھی وہ گھبرایا نہیں تھا۔ وہ رویا بھی نہیں تھا۔ اُس نے مَردوں کی طرح اُس چوٹ کو برداشت کر لیا تھا۔ اُس کے ابا اُس سے اسی بات کی اُمید رکھتے تھے۔

اُس کے ابا! جلد ہی کچھ ہی گھنٹوں میں وہ اُن کے پاس پہنچ جائے گا جیل میں۔ انور نے طے کر لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

(6)

انور نے سوچا تھا کہ جیل جانا بہت آسان بات ہے، بس ایک بار ارادہ کرنے کی ضرورت ہے، پھر کوئی بھی قانون توڑ دو اور پولیس پکڑ کر کٹہرے دار کالی لاری میں بٹھا کر لے جائے گی۔ انور نے سیاسی قیدیوں کو پہلے بھی ایسی ہی لاریوں میں بیٹھ کر جیل جاتے دیکھا تھا۔

لیکن سرکار دوسرے ڈھنگ سے سوچ رہی تھی۔ اُس نے جیل عام مجرموں کے لیے چور اُچکوں، جیب کتروں اور قاتلوں کے لیے بنوائے تھے۔ لیکن اب اُن کے سامنے ایک عجیب کیفیت آ گئی تھی۔ ایسی کیفیت جس کا سامنا دنیا کی کسی بھی سرکار نے اس سے پہلے کبھی اتنے

بڑے پیمانے پر نہیں کیا تھا۔ ہزاروں ایسے شریف لوگوں کو جواب تک قانون کے پابند تھے اور خدا سے، بھگوان سے ڈرتے تھے، اچانک نہ جانے کیوں جیل جانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ دس ہزار، بیس ہزار، تیس ہزار، پھر بھی یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ جیل خانے ٹھسا ٹھس بھر گئے تھے۔ جیل کے افسروں، پولیس والوں اور اہل کاروں پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ جیل خانے والے تیرتھ یاتریوں کے اس حیرت انگیز جلوس سے تنگ آ گئے تھے۔ سول نافرمانی کے بوجھ کے نیچے سرکار کی پوری مشینری چرمرانے لگی تھی۔

اس لیے ہوا یہ کہ جس وقت انور نے جیل جانے کا فیصلہ کیا اُسی وقت سرکار نے جیلوں میں بہت زیادہ لوگ نہ ٹھونسنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ بڑے بڑے باغیوں کے لیے تو کسی طرح جیل میں جگہ نکل بھی سکتی تھی پر چھوٹے چھوٹے لوگوں سے نمٹنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اپنانا ضروری تھا۔

گھر سے نکلتے وقت انور نے کوئی خاص پروگرام نہیں بنایا تھا۔ اس لیے وہ بنا مقصد اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے اپنے اسکول کے دوستوں کی ایک ٹولی دکھائی دی جو کانگریس کا بڑا سا جھنڈا لیے ہوئے جا رہی تھی۔ یہ لوگ کسی جلوس میں شامل ہونے جا رہے تھے اُن میں سے ایک لڑکے نے بڑے رُعب کے ساتھ انور کو بتایا۔ 'آج بہت سی گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔' گرفتاریاں؟ اسی کی تو انور کو تلاش تھی۔

جلوس بہت لمبا تھا، اُس کا ایک سِرا فتح پوری مسجد پر تھا اور دوسرا پتھر والے کنویں پر۔ انور اور اُس کے سب ہی دوستوں کے دل میں اِس جنگ میں کود پڑنے کی دُھن سمائی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اپنی اِسی دُھن میں جلوس کے آگے پہنچ گئے۔ ایک داڑھی والے مولوی صاحب اور گیروے کپڑے پہنے ہوئے ایک سوامی جی جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے، نعرے لگ رہے تھے۔ وہی نعرے جو اُس نے امرتسر میں سُنے تھے۔ انور نے بھی اپنی پتلی آواز بھیڑ کی گونجتی ہوئی آواز میں ملا دی۔ اللہ اکبر! وندے ماترم! اور پہلی بار انور اِن جادو بھرے لفظوں کے جوش سے واقف ہوا۔ انقلاب زندہ باد۔ اِن الفاظ کو سن کر مجمع کے دل میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ بھیڑ میں انور انسانیت کے سمندر میں ایک بُوند کی مانند ہو گیا تھا۔ اُس کی شخصیت مجمع میں مل کر ایک ہو گئی تھی۔ مجمع کے جذبات سے متاثر ہو کر انور میں ایک عجیب سی

تبدیلی آ گئی۔ اب وہ شرمیلا انور نہیں رہ گیا تھا، اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب اُس میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی، نئی اُمنگ اور نئی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس وقت وہ موت کا بھی سامنا کر سکتا تھا۔

سڑک پر راستہ روک کر کھڑی پولیس کی شکل میں موت سے اُس کا واسطہ پڑا۔ وہ اپنے کندھوں پر بندوقیں اُٹھائے کھڑے تھے۔ بندوقوں کا مُنہ سیدھا بھیڑ کی طرف تھا۔ جلوس ٹھہر گیا۔ پولیس کی ناکہ بندی کی خبر دیکھتے دیکھتے جلوس کے پیچھے تک پہنچ گئی اور پورے جلوس میں ایسا گُنجن پیدا ہوا جیسے لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ایک لمحہ پہلے جو جوش دکھائی پڑ رہا تھا وہ غائب ہو گیا فضا میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ انور کے اسکول کا ایک ساتھی کشن، جو اوروں سے چھوٹا تھا، اچانک رونے لگا۔ اس سنجیدہ ماحول میں یہ ایک مضحکہ انگیز واقعہ تھا اور اس سے مجمع کی یکسانیت کا جذبہ ٹوٹ گیا۔ وہ سب الگ الگ لوگ بن گئے جن کی اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں اور فکریں تھیں۔ اُس چھوٹے سے بچّے کی طرح جو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

پولیس کے ایک افسر نے آگے بڑھ کر دونوں لیڈروں کو گرفتاری کا وارنٹ دکھایا اور وہ اس طرح مسکرا دیئے جیسے وہ اپنی گرفتاری کی راہ ہی دیکھ رہے تھے۔ 'تو سسرال کا بلاوا آ گیا، چلیے میں تیار ہوں' داڑھی والے مولوی صاحب نے داروغا کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ گیروے کپڑوں والے سوامی جی نے مُڑ کر بھیڑ کو مخاطب کر کے تقریر شروع کر دی' بھائیو! ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہے اور ہم جا رہے ہیں، آپ لوگ خاموش رہئے گا اور یاد رکھیے گا کہ ہم نے اہنسا کی قسم کھائی ہے۔ ہم خود مر جائیں گے لیکن دشمن کو نہیں ماریں گے۔ سچّائی ہی ہمارا ہتھیار ہے۔' انور نے پولس والوں کی رائفلوں کو دیکھا جو بھیانک نظروں سے بھیڑ کو تاک رہی تھیں اور اُس کے دل میں ایک دُھندلا سا شک پیدا ہوا کہ کیا سچّائی سے اِن رائفلوں کو ہرایا جا سکتا ہے۔ امرتسر کی یاد اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اِس طرح کی رائفلیں کیا کر سکتی ہیں۔

دونوں لیڈروں کو وہاں پر کھڑی ہوئی پولیس کی بہت سی لاریوں کی طرف لے جایا گیا۔ اور جب وہ اُن ہی میں سے کسی ایک میں غائب ہو گئے تو انور کو یکا یک یاد آ گیا کہ وہ کیا کرنے نکلا تھا۔ اُسے جو کرنا ہے وہ جلدی کرنا چاہیے نہیں تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ پولیس کی لاریوں کی طرف بھاگا۔ باقی لڑکے بھی یہ سوچ کر کہ کہیں وہ انور سے پیچھے نہ رہ جائیں، اُس کے ساتھ ہو لیے۔

'کدھر جا رہے ہو؟' ایک پولیس والے نے اُن کا راستہ روک کر پوچھا۔
'مجھے بھی گرفتار کرو۔' انور نے جواب دیا۔ 'میں بھی سرکار کے خلاف ہوں۔'
اُسے یقین تھا کہ اِس دلیل کے آگے پولیس والے لاچار ہو جائیں گے۔
'ہاں ہاں۔' باقی لڑکوں نے بھی ایک ساتھ چلا کر کہا۔ 'ہم بھی سرکار کے خلاف ہیں، ہم سب کو بھی گرفتار کر کے جیل لے چلو۔'
یہ سُن کر ڈراؤنی صورت والے داروغا کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ 'اچھا، چلو بیٹا۔' اُس نے کہا اور اپنے کسی ماتحت کو آنکھ مار کر اشارہ کیا۔ 'سب لڑکوں کو گاڑی میں چڑھا دو۔'
سب لڑکے پولیس کی لاری کی طرف اِس طرح بھاگے جیسے کہیں پکنک پر جا رہے ہوں۔ کوئی بیس لڑکے رہے ہوں گے اور سب بے حد جوش میں تھے۔ بس ایک کشن کو چھوڑ کر جس کے چہرے پر بالکل مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ جب لاری چلنے کو ہوئی تو اُس نے انور سے پوچھا۔ 'اچھا، ایک بات تو بتاؤ، جیل میں ہمیں مار تو نہیں پڑے گی؟'
'نہیں نہیں۔' انور نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے وقت وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہا تھا اور اُس سے اِس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔ 'نہیں، جیل میں مار نہیں پڑے گی، بس کوٹھریوں میں بند کر دیا جائے گا۔'
'تمھیں کیسے معلوم؟' ایک دوسرے لڑکے نے پوچھا۔ یہ انور کے لیے کامیابی کا لمحہ تھا۔ اُس نے فوراً جواب دیا۔ 'میں اس لیے جانتا ہوں کہ میرے ابا وہاں ہیں۔'
'لیکن ہم لوگ جا کہاں رہے ہیں؟' جب بس پرانے قلعے والی سڑک پر بائیں ہاتھ کو مُڑی تو ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔ 'یہ تو جیل کا راستہ نہیں ہے۔'

(7)

رات بہت کافی بیت چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اندھیرا اور سروی سڑک کے دونوں طرف پیڑوں کے نیچے کچھ عجیب عجیب شکلیں چلتی پھرتی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ کہیں دور سے اُلو کے ہُو ہُو کرنے کی آواز آ رہی تھی اور چمگادڑ اپنے پر پھیلا کر رات کے گہرے اندھیرے میں اُڑ رہے تھے۔

انور کو ڈر لگ رہا تھا لیکن بے چارے کشن کی حالت تو اُس سے بھی بُری تھی۔ وہ تو بالکل نا امید ہو کر انور کی بانہہ زور سے پکڑے ہوئے تھا۔ سردی کے مارے اُس کے دانت کٹکٹا رہے تھے اور تھکن کے مارے اُس کے پاؤں نہیں اُٹھ رہے تھے اپنے دوست کو اتنی بُری حالت میں دیکھ کر انور کو اپنے ڈر پر قابو پانے میں کچھ مدد ملی۔ وہ اپنے کو عمر میں بہت بڑا اور طاقتور سمجھنے لگا اور کشن کے لیے اس کے دل میں بے پناہ پیار اُمنڈنے لگا۔ اُس چھوٹے سے روتے ہوئے بچّے کو دیکھ کر اُس کے دل میں اُس کی حفاظت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ ایسی مصیبت کے وقت میں اپنے ساتھی کی حفاظت کرنا اُس کا فرض ہے۔ وہ کشن کو ڈھارس بندھانے کے لیے اُس سے کہنے لگا کہ اب دلّی بس تھوڑی ہی دور ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے ابھی پورے دس میل چلنا ہے۔ وہ کشن کو یقین دلا رہا تھا کہ دیہات کے اس حصے میں کوئی جنگلی جانور نہیں ہے، وہ اپنا دل مضبوط رکھنے کے لیے مذاق کر رہا تھا ہنس رہا تھا اور وطن پرستی کے گیت گا رہا تھا اور اُس کی یہ ترکیب کامیاب بھی ہو رہی تھی۔ صرف اس کے لیے نہیں بلکہ کشن کے لیے بھی۔ اب اُنھیں چلنے میں اتنی تھکن نہیں محسوس ہو رہی تھی اور کچھ دیر بعد جب آسمان پر پتلا سا چاند نکل آیا تب تو اندھیرے کے بھوت بھی بھاگ گئے اور کشن کی بھی اتنی ہمّت بندھ گئی کہ اُس نے انور کی بانہہ ڈھیلی چھوڑ دی۔

پولیس والوں نے اسکیم یہ بنائی تھی کہ لاری کو بہت دور دیہات کی طرف لے جایا جائے اور دو دو تین تین کر کے بچّوں کو تھوڑی دور پر راستے میں اُتار دیا جائے اور اُنھیں اس سرد اندھیری رات میں پیدل سِسکتے ہوئے گھر جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ پولیس والوں کو پورا یقین تھا کہ پکڑے ہوئے کم عمر لڑکوں کے لیے یہ سزا قید کے مقابلے میں کہیں زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ اس طرح جیل میں بھیڑ بڑھنے کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا کیونکہ جیل یوں بھی ٹھسا ٹھس بھر چکے تھے۔ دونوں لڑکے رات کے اندھیرے میں لگا تار چلتے چلے جا رہے تھے لیکن کچھ میل چلنے کے بعد کشن اتنا تھک گیا کہ اُسے تھوڑی دیر سُستا لینے کا موقع دینے کے لیے اُنھیں ہر تھوڑی دُور پر رُک جانا پڑتا تھا حالانکہ انور اپنے ننھے ساتھی کے سامنے اس بات کو کبھی تسلیم نہ کرتا لیکن میلوں تک اس طرح چلتے رہنے کے بعد وہ خود بھی تھک گیا تھا۔ صبح کا وہ جوش، وہ جلوس، وہ

گیت، وہ نعرے جیل میں اپنے ابا کے پاس پہنچ جانے کا پکّا ارادہ۔ یہ سب چیزیں دُھندلے ماضی کے حادثے معلوم ہونے لگے تھے۔ دن بھر کے جوش وخروش کے بعد اب اُس کا جذبہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ انور کشن کی ہمت بڑھانے کے لیے جو گیت گا رہا تھا وہ دھیرے دھیرے بند ہو گئے۔ اب تو بات کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ چُپ چاپ سنجیدہ منہ بنائے وہ سڑک پر چلے جا رہے تھے اور اُن کے پیچھے گرد کا ایک ہلکا سا بادل اُڑ رہا تھا۔

یکا یک انور کو خیال آیا کہ اُسے بھوک لگی ہے۔ اُس نے نہ صبح ناشتہ کیا تھا نہ دوپہر کو کھانا کھایا تھا، نہ رات کو۔ اُسے یاد آیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اُسے نیند آ رہی ہے۔ پچھلی رات وہ سویا بھی نہیں تھا۔ اُسے اُس چوٹ کی یاد آئی جو صبح اُس کو لگی تھی اور حالانکہ خون بہنا جلد ہی بند ہو گیا تھا پر اب پھر اُس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اسے سردی لگ رہی ہے اور برف جیسی ٹھنڈی ہوا کے تیر اُس کی گرم شیروانی کو چھید کر اُس کے جسم کی ہڈیوں تک چُبھ رہے ہیں۔ وہ اپنے گرم اور گدگدے بستر کے لیے تڑپ اُٹھا۔ وہ اُس گرم گرم سالن اور تازی چپاتیوں کے لیے بے چین ہو گیا جو بُوا گلابو نے اُس کے لیے بنائی ہوں گی۔

تھوڑی دُور آگے انھیں ایک بیل گاڑی کے پہیے کی چرخ چوں سنائی دی اور دونوں لڑکوں کو ڈھارس بندھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ کچھ دور کے لیے انھیں گاڑی میں بیٹھ کر جانے کا موقع ملے گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کہ کسی آدمی کا ساتھ رہے گا۔ انھوں نے جلدی جلدی اپنے قدم بڑھائے اور جلد ہی بند گوبھی، گاجر اور مولیوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔

گاڑی والے کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دو لڑکے جو اپنے پہناوے سے شہر کے کسی کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے معلوم ہو رہے تھے۔ اتنی رات گئے سڑک پر کہاں چلے جا رہے ہیں۔ لیکن جب انور نے سارا قصہ بتایا تو وہ جھٹ سے بولا 'بیٹا آجاؤ یہاں گاڑی پر میرے پاس آجاؤ۔ بہت تھک گئے ہو گے تم تو۔ رات میں چھوٹے چھوٹے بچّوں کو بیس بیس میل اکیلے چلانا۔ یہ پولیس والے بھی بہت حرامی ہوتے ہیں۔' حرامی! پھر وہی گالی کا لفظ لیکن اُس کسان نے اِس کے ساتھ ہی کچھ ایسی چُنی چُنی گالیاں بھی دیں جو انور نے پہلے کبھی سنی بھی نہیں تھیں اور جن کا مطلب تو اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھا۔

اتنی دور پیدل چلنے کے بعد وہ بیل گاڑی سب سے آرام دہ سواری معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن گاڑی کے جھٹکوں سے اُن کا خالی پیٹ اور بھی خالی معلوم ہونے لگا اور تازی سبزیوں کی خوشبو اُن کی ناک میں گھس رہی تھی۔ انور بھوکا ضرور تھا لیکن ایک شریف گھر میں پلا ہونے کی وجہ سے وہ کسی اجنبی سے کھانے کو کیسے مانگ سکتا تھا؟

'کیا گاجریں لے جا رہے ہو؟' اُس نے کسان سے پوچھا۔

'ہاں بیٹا' گاجریں ہیں، مولیاں ہیں اور گوبھی کے پھول بھی ہیں۔ میں انھیں سبزی منڈی لے جا رہا ہوں۔'

'مجھے گاجریں بہت اچھی لگتی ہیں۔' کشن نے بنا پوچھے ہی کہا۔ کتنی میٹھی ہوتی ہیں۔'

'ہاں، اچھی تو مجھے بھی لگتی ہیں۔' انور نے کہا: 'جاڑے میں ہم لوگ بہت گاجر کھاتے ہیں اور میری پھوپھی اُن کا بہت اچھا حلوہ بناتی ہیں۔ کیا تمھاری گاجریں اچھی اور میٹھی ہیں؟'

'کھا کر دیکھو۔' یہ کہہ کر اُس نے دونوں کو کچھ گاجریں اُٹھا کر دے دیں۔

شکریہ ادا کیے بنا ہی دونوں لڑکے بھوکے بھیڑیوں کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے اور گاجریں چبانے لگے۔ انھیں اس طرح گاجریں کھاتا دیکھ کر کسان نے سوچا۔ 'میں بھی کتنا بے وقوف ہوں، مجھے پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ بھوکے ہوں گے۔'

پیٹ بھرتے ہی کشن تو انور کے کندھے پر سر رکھ کر فوراً سو گیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اور سامنے بہت دُور دلّی سے بھی آگے انور کو آسمان دھیرے دھیرے گلابی ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اُن کے چاروں طرف سنّاٹا تھا، ہر چیز سو رہی تھی۔ کھیت سو رہے تھے۔ اپنی جھونپڑیوں میں کسان سو رہے تھے اور چھپروں کے نیچے مویشی سو رہے تھے۔ گاڑی چرخ چوں کرتی ہوئی اپنی مستانی چال سے چلی جا رہی تھی اور بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں سُریلی آواز سے بج رہی تھیں۔ گاڑی والا بھی اُونگھ کر کچھ گنگنا رہا تھا۔

انور کو بھی نیند آ رہی تھی لیکن چاروں طرف کے حیرت انگیز ماحول نے اُس کو چونکا دیا تھا۔ صبح کا سہانا منظر، دیہات کا پُرسکون ماحول، مٹی اور پیڑوں کی خوشبو، چرچراتی ہوئی گاڑی کا مدُھر سنگیت، کسان کا گیت اور بیلوں کی گھنٹیاں۔ اس کے دل میں کشن کے لیے بے پناہ پیار اُمڈ آیا جو

اُس کے کندھے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اُس کا دل کسان کے لیے شکرگذار تھا جس نے انھیں گاڑی پر بٹھالیا تھا اور گاجریں کھانے کو دی تھیں۔ دنیا کتنی خوب صورت، اچھی اور انوکھی ہے۔ اس نے سبزیوں کے ڈھیر پر سر ٹکاتے ہوئے سوچا اور دھیرے دھیرے وہ بھی سو گیا۔

(8)

ڈرتے ڈرتے انور نے گھر میں قدم رکھا۔ انور کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ اُسے اپنے تایا ابا کے سامنے اس بات کا جواب دینا ہوگا کہ وہ لگ بھگ تیس گھنٹے تک کہاں غائب رہا۔ یا شاید تایا امجد علی کو پہلے ہی یہ پتہ چل گیا ہو کہ کل والے جلوس میں اُس نے حصہ لیا تھا اور بعد میں پولیس نے کیا رکیا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو شدید ہنگامہ ہو جائے گا۔ لیکن انور کل تجربے سے اتنا خوش تھا کہ اُسے اپنے تایا ابا کی ڈانٹ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ ہونا ہو وہ جلدی ہو جائے۔

گھر میں اُسے جو پہلا آدمی دکھائی دیا وہ ابا تھے۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے، لیکن نہیں، وہ اکبر علی ہی تھے۔ وہ تکیوں کا سہارا لگائے بیٹھے تھے اور اُن کے پاس حکیم بیدل بیٹھے اُن کی نبض دیکھ رہے تھے۔

یکا یک انور کی سمجھ میں آیا کہ اُس کے ابا بیمار تھے اور اُس خیال کے آگے وہ اور سب باتیں بھول گیا۔ وہ بھاگ کر اُن کے پاس گیا اور بولا 'ابا' آپ واپس آ گئے!'

'ہاں انور، لیکن تم اب تک کہاں تھے؟ میں نے سنا ہے کہ تم کل صبح سے گھر نہیں آئے۔ اُن کی آواز میں کمزوری تھی، یہ اکبر علی کی پرانی کڑک دار آواز نہیں تھی۔

انور نے مختصراً سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ دیکھ کر اُسے تسلی ہوئی کہ اُس کی بات سن کر اُس کے ابا بڑے پیار سے مسکرا دیے۔ اتنے میں امجد علی پیالے میں کھولتی ہوئی کوئی چیز لے کر وہاں آئے لیکن اب انور کو اُن سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ جب وہ اپنے ابا کے پاس ہوتا تھا تو اُسے کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

'انور، یہ بھی اچھا مذاق رہتا کہ ادھر میں چھوٹ کر آتا اور اُدھر تم جیل میں بند کر دیے گئے ہوتے، رہتا نا؟'

اس پر حکیم بیدل بولے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کو رہا کرنے میں انھوں نے کوئی جلدی نہیں کی ہے، اگر آپ کو مہینے بھر بھی جیل میں اور رکھا جاتا تو آپ کی صحت بالکل تباہ ہو جاتی۔ یہ ساری گڑ بڑ جیل کے کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

'لیکن مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ میں اپنی رہائی سے بالکل خوش نہیں ہوں۔' اکبر علی بولے۔ 'میں یہاں زخمی سپاہی کی طرح پڑا ہوں اور دوسرے لوگ لڑ رہے ہیں، جیسے ہی میری طبیعت کچھ ٹھیک ہوگی، میں افسروں کو اطلاع دے دوں گا کہ وہ مجھے پھر گرفتار کر سکتے ہیں۔'

اتنے میں کاکا رامیشور ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے آئے۔ انور کی پیٹھ تھپک کر اور ہمیشہ کی طرح اطمینان سے ایک طرف بیٹھ کر انھوں نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، 'ارے اکبر، تم فکر کیوں کر رہے ہو؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی ہے۔'

'کیا مطلب تمھارا؟' اکبر علی کی آواز میں پھر وہی پہلے والا جوش پیدا ہو گیا تھا۔

'ہاں ہاں، میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، یہ دیکھو اخبار میں لکھا ہے۔'

'لیکن کیوں؟ آخر کس وجہ سے؟'

'یو پی کی چوری چورا نام کی کسی جگہ پر کچھ پولیس والے مار ڈالے گئے تھے، اس لیے گاندھی جی کہتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ابھی تک ہنسا ہے اور اس لیے سِوِل نافرمانی کی تحریک واپس لی جاتی ہے۔'

'یہ صحیح ہے کہ کچھ پولیس والے مار ڈالے گئے لیکن اس سے کیا ہوا؟ ہر آدمی تو مہاتما، یا سنت نہیں ہو سکتا۔ کیا اُن لوگوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو نہیں مارا ہے؟' اکبر علی کی آواز میں ایک ایسی کڑواہٹ تھی جو انور نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ دیر رُک کر وہ پھر دھیمی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہنے لگے، یہ کیا کیا؟ آخر یہ کیا کیا؟ جب ہم منزل کے اتنا قریب پہنچ گئے تھے تب ہمیں روک لیا۔'

لیکن انور کو سیاست کی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ دُعا مانگ رہا تھا 'یا خدا کسی طرح میرے ابّا کو صحت یاب کر دے۔'

○

’کاہے کو بیاہی بدیس؟‘

(1)

حکیم عبدالرشید بیدل کے علاج اور پھوپھی امّاں کی تیمارداری کی بدولت اکبر علی جلد ہی اچھے ہوگئے۔ پر موت کا سایہ اُن کے سر پر منڈلا رہا تھا اور اُن میں ایک صاف تبدیلی جھلک رہی تھی۔ وہ اپنا کاروبار اب بھی دیکھتے تھے اور بیٹھک میں اب بھی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ وہ اب بھی اخبار پڑھتے تھے اور سیاسی واقعات پر بحث کرتے تھے۔ لیکن اُن میں وہ پہلے والا جوش باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اُن کی داڑھی سفید ہونے لگی تھی اور بیماری کی وجہ سے اُن کے چہرے کا رنگ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا تھا اور اُن کی آواز میں پھر کبھی وہ پہلے والی گونج پیدا نہ ہوسکی۔ وہ کافی کمزور ہوگئے تھے اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ اکثر وہ بڑی دیر تک بالکل خاموش بیٹھے بہت اُداس ہوکر کچھ سوچتے رہتے تھے اور جب کوئی اُن سے کچھ کہتا تو یکا یک چونک پڑتے تھے۔

انور بھی بڑے غور سے اپنے ابّا کو دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ اب وہ نماز میں زیادہ وقت لگاتے تھے۔ پہلے بھی وہ دن میں پانچ بار پابندی سے نماز پڑھتے تھے لیکن وہ نماز اتنی پھرتی سے پوری کر لیتے تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی منجھا ہوا سپاہی فوجی قواعد کر رہا ہو۔ لیکن اب وہ گھنٹوں جا نماز پر بیٹھے کچھ سوچتے رہتے تھے یا تسبیح پھیرتے رہتے تھے۔ اکثر نماز پڑھتے وقت اُن کی

آنکھوں سے آنسو بہہ کر اُن کی داڑھی میں جذب ہو جاتے تھے۔ اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں دُعا مانگتے تھے 'اے خدا تو بڑا رحیم ہے' تو بڑا کریم ہے، میرے بچّوں پر رحم کر، ہمیں ایمان کے راستے پر لے چل اور بُرائیوں سے بچا۔' اور جب انور یہ سنتا تو اُس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا جس کے سامنے اُس کے ابّا بھی اتنے لاچار تھے۔

کچھ اور تبدیلیاں بھی ہوئی تھیں۔ اب اکبر علی اپنا زیادہ وقت چودھری محمد عمر کے ساتھ بتاتے تھے اور اکثر صدر بازار میں اُن کی چینی کے برتنوں کی دُکان پر بھی جاتے تھے۔ یہ پنجابی بیوپاری ہمیشہ سے اِس بات کے خلاف تھے کہ اکبر علی سیاست میں اپنا وقت خراب کریں۔ وہ اکثر اُن سے کہتے تھے۔ 'اکبر صاحب آپ سیاست کے جھگڑے اُن لیڈروں پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے اور اپنے کاروبار کو زیادہ وقت کیوں نہیں دیتے؟' نہ جانے کیوں انور کو چودھری محمد عمر اچھے نہیں لگتے تھے۔ اُسے اُن سے کوئی خاص شکایت نہیں تھی لیکن اُن کا اکھڑ پن اُن کی سخت آواز اور بڑی بے تکلفی سے اُس کی پیٹھ پر دھپ مارنا۔ انور جیسے شائستہ لڑکے کو بالکل پسند نہیں تھا۔

ایک دن جب انور بیٹھک میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے ابّا چودھری محمد عمر کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، اُن کے سامنے کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے اور وہ کچھ راز کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اُن کی باتوں میں خلل نہ پڑے، انور پیچھے لوٹا ہی تھا کہ محمد عمر صاحب نے اُسے پکارا۔ 'آؤ انور، تم سے کیا چوری ہے۔' اور جب وہ بیٹھ گیا تو اکبر علی نے کہا۔ 'دیکھو انور، میں نے ابھی چودھری صاحب کے ساتھ ساجھے کے ایک دستاویز پر دستخط کیے ہیں۔ میں اب اِن کی چینی کے برتنوں کی دُکان میں ساجھے دار ہو گیا۔' اور پھر اپنی ہمیشہ جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولے 'اب اگر تمھیں کبھی پلیٹوں یا گلاسوں کی ضرورت ہو تو ہمیشہ ہماری دُکان سے مُفت لا سکتے ہو۔'

ہماری دُکان! انور کو نہ جانے کیوں یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ 'لیکن ابّا، آپ کا رامیشور دیال کاکا کے ساتھ بھی تو ساجھا ہے!'

'سو تو ہے انور، لیکن کیا میں دو دُکانوں میں ساجھے دار نہیں ہو سکتا؟ اور پھر تم جانتے ہو کہ جب سے لڑائی ختم ہوئی ہے تب سے کمبلوں کا کاروبار برابر مندا پڑتا جا رہا ہے۔ تمھیں اِن سب باتوں کا پتہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ میرے مرنے کے بعد تمھیں ہی سارا کاروبار دیکھنا ہوگا۔'

'ہاں بیٹا،' محمد عمر صاحب نے انور کی پیٹھ پر ایک دھپ مارتے ہوئے اپنی گرجدار آواز میں کہا: 'میں چاہتا ہوں کہ تم اور شفیع بھی آپس میں ویسے ہی پکّے دوست ہوں جیسے ہم اور تمھارے ابّا ہیں۔'

انور نے محمد عمر صاحب کے بیٹے کو دیکھا تھا۔ بہت بڑے ڈیل ڈول کا اکھڑ قسم کا لڑکا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ابّا کے ساتھ صدر بازار والی دُکان پر جاتا تھا تو شفیع ہمیشہ کاروبار کے بارے میں اپنی گہری معلومات کا اُس پر رُعب جھاڑتا تھا۔ اُس نے پرائمری تک اپنی پڑھائی کر کے اسکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس کے ابّا کو کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لیے کسی کی ضرورت تھی۔ شفیع کا دوست اور ساجھے دار بننے کی بات انور کو بالکل پسند نہیں آئی لیکن اپنے ابّا کا لحاظ کر کے اُس نے کچھ کہا نہیں اور چودھری صاحب کی اِس بے تکلفی کو چپ چاپ ٹال گیا۔

(2)

انور نے بیٹھک میں بڑے لوگوں کی باتیں سن کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ اسکول سے آ کر وہ چُپ چاپ بیٹھک میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور اپنے ابّا اور اُن کے دوستوں کی باتیں سنتا رہتا۔

روز کسی نہ کسی نئی بات پر بحث ہوتی تھی اور روزانہ انور کچھ نئے لفظ سیکھتا تھا۔ گاندھی جی نے نافرمانی کی تحریک واپس لے لی تھی۔ پھر بھی سرکار نے انھیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تھا۔ حکیم بیدل اخبار سے اُن کے مقدمے کا حال پڑھ کر سنا رہے تھے۔ انور نے سُنا کہ جس وقت قیدی کو عدالت میں لایا گیا تو سب لوگ ادب سے اُٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ خود جج صاحب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ انور کو اب سے کئی برس پہلے کا وہ دن یاد آ گیا جب اُس نے ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لان پر پتلی پتلی ٹانگوں والے ایک دُبلے پتلے آدمی کو چرخا چلاتے دیکھا تھا۔ اُسے بڑے بڑے گول شیشوں والی عینک اور اُس بوڑھے کی دوستانہ مسکراہٹ یاد آ گئی۔ اور اب اُسی کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ اپنے دشمنوں کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چوہے تک کو مارنا نہیں چاہتا تھا؟ یہ دنیا اب تک انور کے لیے ایک بہت بڑی پہیلی بنی ہوئی تھی۔

لیکن ایک بات وہ جانتا تھا کہ اُس کے ابّا نے ابھی تک گاندھی جی کو تحریک واپس لینے کے لیے معاف نہیں کیا تھا اور اکثر اُن کے بارے میں بہت طنز بھری باتیں کیا کرتے تھے اور جب

رامیشور دیال وہاں پر موجود نہ ہوتے تھے تو چودھری محمد عمر صاحب کہا کرتے تھے، 'بنیا بہر حال بنیا ہوتا ہے، آٹا دال بیچنے والا۔'

ایک دن اچانک بغیر کسی اطلاع کے رتن انور کے گھر آیا۔ شروع میں تو اُسے پہچاننا ہی مشکل تھا کیونکہ اُس کی عمر کو دیکھتے ہوئے وہ سکھ لڑکا کافی لمبا تگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سر پر کالی پگڑی باندھنے لگا تھا اور جب انور نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے پیلی پگڑی باندھنا کیوں چھوڑ دیا تھا تو رتن نے جواب دیا تھا۔ 'تم نہیں جانتے میں اکالی بن گیا ہوں؟'

'اکالی! اکالی کیا ہوتا ہے؟' انور کو اپنے دوست کے سامنے اپنی جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے بہت شرم آئی۔

'تم نہیں جانتے؟' نوجوانی کے جوش کے ساتھ اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے رتن نے اُسے سمجھایا کہ اکالی تحریک کس طرح شروع ہوئی تھی، کس طرح یہ تحریک سکھوں کے گرودواروں کو سرکار اور اُس کے گرگوں کے ہاتھوں سے واپس لے لے گی اور یہ بھی بتایا کہ پولیس نے سکھوں کو کیسی کیسی تکلیفیں دی تھیں، کس طرح انھیں پیٹا تھا اور کچھ سکھوں کو تو جان سے بھی مار ڈالا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اکالی ایک بڑھتی ہوئی انقلابی طاقت ہے۔ رتن اپنے الفاظ کے بہاؤ میں ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے اِس بات کی فکر بھی نہیں تھی کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب اُس کے دوست کی سمجھ میں آیا بھی تھا کہ نہیں 'تم دیکھ لینا ایک دن یہی اکالی ہندوستان کو آزاد کرائیں گے!'

'لیکن رتن، یہ تو بتاؤ دلّی کیسے آنا ہوا؟'

'تم نہیں جانتے؟' اور اُس کا یہ سوال سُن کر انور کو ایک بار پھر اپنی جہالت کا احساس ہوا۔ رتن نے اُسے بتایا، یہاں کانگریس کا جلسہ ہونے والا ہے، اس لیے اکالی والنٹیروں کا ایک جتھا لاہور سے یہاں اِس لیے بھیجا گیا ہے کہ اپنی تحریک کے بارے میں کانگریس والوں کو بتائے۔ یہ تو تُم جانتے ہی ہو گے کہ ہم کانگریس کے ساتھ ہیں۔'

'کیا میں بھی کانگریس کے اجلاس میں آ سکتا ہوں؟' انور نے پوچھا اور رتن نے اپنے آپ کو اپنے دوست سے بہت بڑا محسوس کرتے ہوئے اُس سے کہا کہ وہ اُس کے لیے بھی ایک ٹکٹ کا انتظام کر رکھے گا۔

'اچھا اب میں چلتا ہوں۔' رتن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

'اس طرح بنا کھائے پیے کیسے جا سکتے ہو' ذرا ٹھہرو! میں جا کر پھوپھی امّاں سے ہم لوگوں کے لیے کچھ تیار کر دینے کو کہتا ہوں۔ پھر ہم ساتھ کھائیں گے، بس ہم دونوں۔'

پھوپھی امّاں نے انور سے کہا کہ وہ اُس کے دوست کو اندر نہیں آنے دے سکتیں 'تمھاری سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اب تمھاری بہن بڑی ہوگئی ہے، اُسے پردہ کرنا چاہیے۔ تم ایک اجنبی آدمی کو گھر کے اندر نہیں لا سکتے' لیکن انھوں نے اُن دونوں کے لیے باہر کھانا بھجوا دیا اور کیونکہ اکبر علی گھر پر نہیں تھے اِس لیے دونوں بیٹھک میں فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ فقیرا سالن اور چاول اور ذائقے دار سبزیاں لا کر دیتا جا رہا تھا۔

رتن انور سے اگلے دن کانگریس کے پنڈال پر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ 'تم بڑے گیٹ پر آ جانا۔ میں وہیں ملوں گا۔'

جب انور اندر گیا تو اُس نے پھوپھی امّاں سے کہتے سنا۔ 'اُس سکھ لڑکے نے جن برتنوں میں کھانا کھایا ہے انھیں الگ رکھنا اور راکھ سے مانجھ کر تین بار پاک کر لینا۔'

انور نے محسوس کیا کہ یہ اُس کے دوست کی بے عزّتی ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اُسے اِسی طرح کا ایک واقعہ یاد آیا جب اُس نے کاکا رامیشور دیال کے گھر پر کھانا کھایا تھا اور اُن کی بیوی نے بھی وہ تھالی اور پیتل کی کٹوریاں الگ رکھوا دی تھیں جن میں اُسے کھانا دیا گیا تھا۔ اُس وقت اِس بات کی اہمیت انور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ جس طرح وہ کاکا کی بیوی کی نظروں میں اَپوِتر تھا اُسی طرح رتن پھوپھی اماں کی نظر میں ناپاک تھا۔ لیکن کیوں؟ آخر کیوں؟ کس وجہ سے؟

(3)

ستمبر 1923 میں دلّی میں کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا، اُس میں انور جا نہیں سکا اور رتن پنڈال کے بڑے پھاٹک پر بڑی دیر تک کھڑا اُس کی راہ دیکھتا رہا۔

انور نے رتن سے ملنے کا جو وعدہ کیا تھا اُسے بھی پورا نہیں کر سکا اور اُس اجلاس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر بھی نہیں سن سکا۔ یہ ایک تاریخی اجلاس تھا، کیونکہ اس میں کانگریس

کے لیڈروں نے فیصلہ کیا تھا کہ سرکار کے ساتھ مکمل عدم تعاون کی تحریک کو لیجس لیٹیو کونسل میں دستوری مخالفت کی سمت میں موڑ دیا جائے۔

اِس عرصے میں اکبر علی نے اپنی بیٹی انجم کی شادی اپنے بھتیجے رؤف کے ساتھ کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور ایک تیرہ برس کے لڑکے کے لیے بڑی سے بڑی سیاسی اُتھل پتھل کے مقابلے میں بیاہ کی چہل پہل میں دلچسپی لینا فطری تھا۔ اُس دن صبح جب انور سو کر اُٹھا اور رتن سے ملنے کے لیے کانگریس کے پنڈال جانے کی تیاری کرنے لگا تو اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بیٹھک میں اُس کے ابّا تایا امجد علی سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ تایا ابّا رات ہی کو آئے تھے اور دونوں بھائی بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ بیٹھک سے گذرتے وقت انور نے تایا امجد علی کو کہتے سُنا۔ 'تو اکبر یہ طے رہا۔ اگلے چاند کی بارہویں کو مبارک دن ہے، میں نے مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے۔' اور اِس پر چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ 'میں بالکل راضی ہوں بھائی صاحب۔ اِس بیماری نے مجھے بالکل کمزور کر دیا ہے، کون جانے اللہ نے مجھے کتنی عمر دی ہے؟ آنکھیں بند ہونے سے پہلے چاہتا ہوں کہ میں انجم کا بیاہ کر جاؤں۔' اس پر امجد علی نے جواب دیا۔ 'ماشاء اللہ رؤف اب بالغ ہوا ہے، بہتر یہی ہے کہ اس وقت اس کی شادی کر دی جائے، دیر سے شادی کرنے میں جوان لڑکوں میں دنیا بھر کے عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔'

تو باجی انجم کا رؤف بھیا کے ساتھ بیاہ ہونے والا ہے! ایک لمحے کے لیے انور کے دل میں یہ خیال اُٹھا کہ رؤف کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اچھا تھا کیونکہ رؤف اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ رئیسانہ مزاج کا اور ضدّی تھا۔ لیکن بیاہ کی خبر سنتے ہی وہ اتنا خوش ہوا تھا کہ اس کے لیے کسی اچھائی یا برائی پر غور کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ انور اپنے خاندان میں ہی کئی شادیاں دیکھ چکا تھا اور اُن کی چہل پہل میں اُسے بہت مزا آتا تھا۔ رنگ برنگے کپڑے، گہنے اور دعوتیں لیکن جب اپنے ہی گھر میں شادی ہو اُس میں تو بے حد مزا آئے گا!

'انور، ذرا اِدھر آنا۔' اُس کے ابّا نے آواز دی اور انور نے جا کر تایا ابّا کو سلام کیا۔ پھر اکبر علی اُس سے بولے۔ 'اگلے مہینے تمھاری بہن کی شادی تمھارے رؤف بھیا سے ہونے والی ہے، دریبہ جا کر ذرا بنارسی لال جوہری کو بُلا لاؤ۔'

اور جب وہ بھاگ کر دریبے کی طرف گیا جہاں جوہریوں اور سناروں کی دُکانیں تھیں، تو وہ رتن اور کانگریس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ حالانکہ ابھی کل ہی وہ وہاں جانے کے لیے اتنا بے چین تھا۔

(4)

'باجی انجم، باجی انجم، اس گھر میں کسی کی شادی ہونے والی ہے، بھلا بتاؤ تو کس کی؟'

'چل یہاں سے شریر کہیں کا، تیری ہی شادی ہونے والی ہوگی کسی کانی چڑیل سے۔'

اپنی بہن کو ایک کونے میں بیٹھ کر ریشمی کُرتے پر گوٹا ٹانکتے دیکھ کر انور کو اُسے چھیڑنے کا اچھا موقع مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ کون کون سے زیور بنوائے گئے ہیں اور باہر بیٹھک میں ریشم، جامہ دار اور مشرو کے کیسے تھان رکھے ہوئے ہیں۔ اُس نے باجی انجم سے پوچھا کہ وہ اپنے تایا ابا امجد علی سے اچانک پردہ کیوں کرنے لگی ہے اور بات چیت کے دوران کوئی نہ کوئی موقع نکال کر وہ رؤف کا بھی ذکر کر دیتا جسے سُنتے ہی انجم کے گورے گالوں پر لالی دوڑ جاتی۔ آخر کار پھوپی اماں نے آکر اُس بے چاری لڑکی کی جان چھڑائی اور انور کو ڈانٹا کہ وہ اپنی بہن کو تنگ کرنے کی بجائے باہر جا کر بیوپاریوں اور پھیری والوں سے نمٹنے میں ابا کی مدد کیوں نہیں کرتا۔ بیاہ کی بھنک پا کر جوہریوں اور سناروں کے ساتھ بہت سے بیوپاری اور پھیری والے بھی اُس گھر کے چکّر لگانے لگے تھے۔ انور نے باہر دیکھا تو بیٹھک میں ہر رنگ کے کپڑے، چاندی، پیتل اور چینی کے برتنوں، میز کرسیوں، قالینوں، جوتوں اور یہاں تک کہ لحاف گدّوں اور تکیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

ساری خریداری کی ذمہ داری چودھری محمد عمر صاحب پر تھی اور وہ ہر بیوپاری سے بڑے رُعب کے ساتھ بات کرتے تھے، جیسے کوئی بڑا بیوپاری چھوٹے بیوپاری سے کرتا ہے۔ بیچ بیچ میں کسی چیز کو پسند کر کے وہ کہہ دیتے تھے۔ 'اچھا! اسے بھی رکھ لیں۔' اور اکبر علی کو تسلی دینے کے لیے جنھیں اِن سب چیزوں کے پیسے دینے تھے، یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ 'اکبر علی میں یقین دلاتا ہوں کہ برسوں میں کسی نے اپنے بیٹی کو ایسا جہیز نہیں دیا ہوگا۔'

انور کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بیاہ کی اِن ساری تیاریوں میں کسی چیز کی کمی ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ محمد عمر صاحب کی باتیں سنتے سنتے ایک دن اچانک اُس کی سمجھ میں آ گیا

کہ کس چیز کی کمی تھی۔ کمی تھی کاکا رامیشور دیال کی۔ وہ کئی دن سے بیٹھک میں دکھائی نہیں دیئے تھے۔

'ابا ابا' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ اتنے دن سے کاکا کیوں نہیں آئے ہمارے یہاں؟'

'اپنی دُکان کے کام میں پھنسے ہوں گے۔' اکبر علی نے چھوٹا سا جواب دیا اور انور کو ایسا لگا کہ کسی وجہ سے اُس کے ابا اِس کے اِس سوال سے خوش نہیں ہوئے تھے اور 'اپنی دکان' سے اُن کا کیا مطلب تھا کیونکہ پہلے تو وہ ہمیشہ 'ہماری دکان' کہتے تھے۔ اِس درمیان کیا ہو گیا تھا۔

(5)

اِس درمیان (میں) جو کچھ ہوا تھا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ اکبر علی اور رامیشور دیال کی پُرانی ساجھے داری ختم ہو گئی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساجھے داری بھی خلافت اور سوراج کی ملی جلی تحریک کے دوران مضبوط ہونے والا اُن کا اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔

اتحاد اور دیش بھگتی کی لہر اُترنے لگی تھی۔ سِوِل نافرمانی کی تحریک کے واپس لے لیے جانے کی وجہ سے ملک کی سیاسی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا جسے بھرنے کے لیے ایک دوسرے کی مخالف تحریکیں چل پڑی تھیں۔ ایک مذہبی ہندو کانگریسی کو سزا کی میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ سنا جاتا تھا کہ انھیں اِس لیے رہا کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ سیاسی معاملوں میں حصہ نہ لے کر مذہبی کاموں میں ہی اپنا سارا وقت لگائیں گے۔ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ کچھ بڑے بڑے سرکاری افسروں نے ہی انھیں یہ قدم اُٹھانے کے لیے اُکسایا تھا۔ کچھ بھی رہا ہو، پر انھوں نے جیل سے باہر آ کر 'شُدھی' کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اُن سب لوگوں کو جو ہندو نہیں تھے، پھر ہندو بنا لیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک اور تحریک بھی شروع کی گئی جس کا مقصد تھا 'سنگھٹن' یعنی ہندو ہونے کی حیثیت سے ہندوؤں کی ایک لڑاکو تنظیم بنائی جائے اور اس کی مخالفت میں فوراً 'تبلیغ' یعنی اللہ کا پیغام پھیلانے کی تحریک شروع کی گئی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی 'تنظیم' شروع کی گئی۔ ہندو تحریک کی طرح ہی 'تبلیغ' اور 'تنظیم' کے جتھوں کی رہنمائی بھی ایک پُرانے کانگریسی رہنما کے ہاتھ میں تھی جو کسی زمانے میں اتحاد کے گُن گاتے تھے۔

اپنے ابا کی بات چیت کے دوران انور 'شُدھی' اور 'تبلیغ' جیسے لفظ سنتا تھا۔ لیکن وہ اُن کا پورا مطلب نہیں سمجھتا تھا لیکن اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اِن سب باتوں کا تعلق کا کا رامیشور دیال کے ساتھ اُس کے ابا کے تعلقات سے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ انور کو یہی سکھایا گیا تھا کہ وہ اپنے ابا کے پرانے ساجھے دار کو 'کاکا' کہا کرے اور چاچا کی طرح اُن کی عزت کیا کرے۔ انور نے ہمیشہ سے انھیں اپنے ہی گھر کا ایک آدمی سمجھا تھا اور ہمیشہ سمجھتا رہے گا۔ وہ اپنے سگے تایا امجد علی سے بھی زیادہ اُن کی عزت کرتا تھا۔

اُس نے اپنے ابا کی اس دلیل کو مان لیا تھا کہ کمبلوں کے بیوپار میں ساجھے داری اِس لیے ختم کردی گئی تھی کہ انھیں صدر بازار میں چینی کے برتنوں کی دُکان میں لگانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور رامیشور دیال خود کوئی دوسرا کاروبار کرنے کی سوچ رہے تھے۔ اُس نے اپنے ابا کی بات پر یقین تو کرلیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں یہ بات اُس کے گلے کے نیچے نہیں اُترتی تھی۔ اور جب چودھری محمد عمر نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'اور پھر بیٹا تمھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کو اپنا اتحاد بنانا چاہیے اور اِن کافروں کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے' تو اُسے اُن کی نفرت بھری مسکراہٹ بالکل اچھی نہیں لگی۔

(6)

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آتا گیا انور کا زیادہ وقت اُسی میں صرف ہونے لگا اور اُس کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ شادی کی تیاری میں بہت سا کام کرنے کو تھا۔ پورے گھر پر سفیدی اور رنگ روغن ہونا تھا۔ بیٹھک کو پھر سے سجانا تھا۔ شادی میں آنے والے سب ہی لوگوں کے لیے کئی طرح کی منوں مٹھائی تیار کروانی تھی۔ بہت ہی پُر تکلف زبان میں سینکڑوں دعوت نامے، خوب صورت کارڈوں پر چھپوا کر اکبر علی کے رشتے داروں، دوستوں اور اُن لوگوں کو بھیجے گئے تھے جن کے ساتھ بیوپار کے سلسلے میں اُن کا لین دین تھا۔ انور نے بھی ضد کر کے اپنے اسکول کے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں کے پاس یہ دعوت نامے بھجوائے تھے۔ وہ ایک دعوت نامہ امرتسر میں اپنے دوست رتن کے پاس بھیجنا بھی نہیں بھولا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ شاید اِس دعوت نامے کو وہ اُس دن کانگریس کے پنڈال میں نہ پہنچنے کے لیے معافی کا خط سمجھ لے۔

اگلے چاند کی بارہویں تاریخ کو تایا امجد علی اپنے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ دو لاریوں پر گڑگاؤں سے دلّی پہنچ گئے۔ لیکن اس بار وہ سب لوگ ایک دوسرے گھر میں ٹھہرے اور صرف تایا امجد علی کچھ آخری انتظامات کے سلسلے میں اپنے بھائی سے بات چیت کرنے وہاں آئے۔ انور، رؤف اور بلقیس سے ملنے جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ کئی سال سے اُن دونوں سے نہیں ملا تھا لیکن پھوپھی اماں نے یہ کہہ کر اُسے نہیں جانے دیا کہ نکاح کی رسم پوری ہو جانے سے پہلے دُلہن کے بھائی کا براتیوں سے ملنے جانا مناسب نہیں ہے۔

شام کو سورج ڈوبنے کے بعد مہمان آ کر صحن میں بیٹھنے لگے۔ صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے جن پر تکیے رکھے ہوئے تھے اور جگہ جگہ حُقّے رکھے ہوئے تھے۔ زنان خانے میں پھوپھی امّاں کنبے کی آدھے درجن بڑی بوڑھیوں کی مدد سے بھی اُن عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام نہیں کر پا رہی تھیں جو بچّوں کے غول کے غول لے کر وہاں آ گئی تھیں اور جن کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ انور بھی اپنی نئی چمکدار ریشمی شیروانی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دُبلا اور چھوٹے قد کا ہونے کی وجہ سے کوئی اُسے تیرہ برس کا نہیں کہہ سکتا تھا اور اس لیے اُسے زنان خانے میں جانے کا 'فری پاس' ملا ہوا تھا اور وہ خوشی میں مگن ہو کر بار بار اندر سے باہر اور باہر سے اندر آ جا رہا تھا۔ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ڈومنیاں ڈھولک پر شادی کے گیت گا رہی تھیں لیکن مہمانوں کے قہقہوں اور مستقل بولنے کی آواز میں اُن کی باریک کھنک دار آواز مشکل سے ہی سنائی دیتی تھی۔ عورتوں کے اور خاص طور پر جوان لڑکیوں کے لباس میں رنگوں کی بہار تھی۔ ہر قسم کے شوخ، لال، نیلے اور ہرے رنگ۔ اِس موقع کے لیے خاص طور سے جو گیس کے ہنڈے لگوائے گئے تھے اُن کی روشنی میں اُن کے زیور جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں طرح طرح کے عطروں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ہر بار جب انور کسی کام سے پان سُپاری لینے یا کاکا رامیشور دیال کی طرف سے دُلہن کو دیئے گئے جوڑے اور گہنے پہنچانے اندر جاتا تھا تو اُسے ایسا لگتا تھا کہ وہاں کا سارا ماحول اُسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کبھی کوئی بڑی بوڑھی اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر یا سینے سے لگا کر جب یہ کہتی کہ 'ارے میرا بچّہ اتنا بڑا ہو گیا' تو وہ کھسیا جاتا۔ جوان لڑکیاں کن انکھیوں سے اسے دیکھتیں پر کچھ شرما کر اُس سے دور ہی رہتیں۔ بلقیس بھی جو پچھلے دو برسوں میں کئی انچ بڑھ گئی تھی اور اپنے نیلے غرارے کُرتے اور

کامدانی کے دوپٹے میں بالکل شہزادی لگتی تھی، انور سے کچھ شرما شرما کر ہی بات کرتی اور انور کو اُس کا یہ انداز بہت اچھا لگتا۔

برات قریب نو بجے آئی اور انور کو اپنے بھائی رؤف سے رشک ہونے لگا کیوں کہ سب کی توجہ اسی کی طرف تھی۔ اُس کا قد اُس کی عمر کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔ زری کی شیروانی اور گلابی پگڑی میں وہ بہت ہی شاندار لگ رہا تھا۔ اُس کے منہ پر پھولوں کا سہرا پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے اُس کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیتا تھا۔ سجی ہوئی گھوڑی پر سے اُتر کر وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اندر آیا اور اُسے صحن کے بیچ میں مخملی سند کے پاس بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں طرف کے دو مولویوں نے شادی کی رسمیں شروع کیں۔ عربی میں قرآن کی جو آیتیں پڑھی گئیں انھیں چھوڑ کر باقی ساری رسمیں بہت ہی چھوٹی اور سیدھی سادی ثابت ہوئیں۔ انور کے ساتھ ایک مولوی صاحب اندر گئے اور کافی شور وغل کے بعد دُلہن کے کمرے کی طرف بڑھے۔ چھ سات بڑی بوڑھیوں کے بیچ میں گھری ہوئی لال کپڑوں کی ایک گٹھری کو مخاطب کر کے مولوی صاحب نے پوچھا: 'انجم بیگم بنتِ اکبر علی، کیا تمھیں مبلغ پانچ ہزار روپے کے عوض عبدالرؤف ولد امجد علی کے ساتھ نکاح منظور ہے؟' لال کپڑوں کی گٹھری چپ چاپ بیٹھی رہی، بلکہ وہ تو ہلی تک نہیں لیکن کسی بڑی بوڑھی نے چلّا کر کہا۔ وہ کہتی ہے، ہاں منظور ہے، اب کیا وہ بے حیا بن کر چلّا کر کہے گی؟' اُس چھوٹی سی کوٹھری میں انور کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ بالکل بوکھلا گیا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ باہر نکلنے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ دُلہن کے جوڑے کی پرتوں میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور اُس نے انور کو روک لیا اور انجم نے بہت آہستہ سے اُس کے کان میں کہا: 'جب یہ سب کام ہو جائے تو ذرا آ کر مجھ سے مل جانا۔' اِس ڈر سے کہ کہیں وہ باقی رسم دیکھنے سے رہ نہ جائے، انور بھاگ کر باہر پہنچا اور اُس نے سُنا کہ مولوی صاحب پوچھ رہے تھے؛ 'عبدالرؤف ولد امجد علی کیا تمھیں پانچ ہزار روپے کے مہر پر انجم بیگم بنت اکبر علی کو اپنی بیوی بنانا منظور ہے؟' اور جب نوشہ نے تین بار کہہ دیا کہ 'ہاں مجھے منظور ہے' تو فوراً چھوہارے بانٹے گئے اور دونوں سمدھیوں کو مبارکباد دی جانے لگی۔

(7)

دُولہا اور اُس کے کچھ چُنے ہوئے دوستوں نے رات کو بیٹھک میں اڈّا جمایا۔ دوسرے دن وہ لڑکی کو رُخصت کرا کے اُس کے ساتھ جانے والے تھے۔ ہر طرف موج اور خوشی کا دور دورہ تھا اور کسی کو سونے کا خیال بھی نہیں آ رہا تھا۔ نوجوان آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور رؤف کی خوشی کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا اور باقی لوگ بڑی دلچسپی سے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گھر کے اندر کچھ عورتیں تو جا چکی تھیں لیکن قریب کے رشتے دار رہ گئے تھے اور ڈومنیاں اب رات کے سناٹے کا فائدہ اُٹھا کر انھیں جی بھر گانا سنا رہی تھیں۔ پھوپھی اماں باورچی خانے میں تھیں اور مہتروں، بھشتیوں، کہاروں، نائیوں اور دوسرے نوکروں کو گلابو سے کھانا اور مٹھائی دلوا رہی تھیں۔ انور کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے کا یہ اچھا موقع تھا۔

انجم اپنے پلنگ پر گٹھری بنی لیٹی تھی۔ بیاہ کے جوڑے کی اَن گنت پرتوں میں وہ کھو کر رہ گئی تھی۔ انور دبے پاؤں اُس کے پاس گیا اور بولا، 'باجی، میں ہوں انور'

'ذرا دروازہ بند کر لو' انجم نے دبی آواز میں کہا۔ 'نہیں تو میں تم سے کھُل کر بات نہیں کر پاؤں گی۔'

جب انور چٹخنی لگا کر مُڑا تو اُس نے دیکھا کہ انجم پلنگ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی اور میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اُس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

انجم کا بدن چھریرا اور رنگ گورا تھا۔ عمر کے لحاظ سے اُس کا قد کچھ زیادہ لمبا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں ابھی تک بچّوں جیسی معصومیت تھی۔ اُس کے ہاتھ بہت نازک تھے اور ہتھیلیوں پر رچی ہوئی مہندی کی وجہ سے اور بھی سفید لگتے تھے۔ اُس کی انگلیوں پر بہت سی نگوں والی انگوٹھیاں اور پتلی گردن میں سونے کا ایک بھاری سا ہار تھا۔ اُس کے سر پر لگا ہوا جھومر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سنہری تتلی آ کر اُس کے بالوں میں پھنس گئی ہو۔

انور حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا یہ آسمانی پری اُس کی وہی بہن تھی جس کے ساتھ وہ ہمیشہ سے کھیلتا اور لڑتا آیا تھا؟

انجم نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب جا کر انور نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

'لیکن باجی تم تو رو رہی ہو' انور کو بہت تعجب ہو رہا تھا۔ اُس نے پوچھا، 'کیا تم اِس شادی سے خوش نہیں ہو؟'

انجم نے بڑے پیار سے انور کو گلے سے لگا لیا اور جواب دیا: 'تیری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کل میں اِس گھر سے چلی جاؤں گی، ابّا سے، پھوپھی امّاں سے اور تم سے الگ ہو جاؤں گی۔ انور مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔' اور یہ کہہ کر انجم کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اُس کے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔

انور کے لیے یہ حالت بہت مشکل تھی کیونکہ وہ اپنی بہن کو ہمیشہ سے دانائی اور سنجیدگی کا مجسمہ سمجھتا آیا تھا اور اِس لیے اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اُسے اطمینان دلائے۔ اُسے یہ تو پتہ نہیں تھا کہ وہ کس بات سے ڈر رہی تھی لیکن شادی کی ساری خوشی اُسی وقت غائب ہو گئی۔ اُس کے لیے اب یہ خوشیاں منانے، اچھے اچھے کپڑے پہننے اور دعوت اُڑانے کا موقع نہیں رہ گیا تھا۔ ایک پل میں اُسے اِس حالت کا اصل مطلب سمجھ میں آ گیا جس سے وہ اب تک اپنی معصومیت میں بے خبر تھا اُس کی خوشی میں اب ایک درد بھی شامل ہو گیا تھا۔ اپنی پیاری بہن سے الگ ہو جانے کا درد۔ کل انجم چلی جائے گی اور وہ گھر میں اکیلا رہ جائے گا۔ وہ کس کے ساتھ کھیلے گا؟ اب وہ کسے چھیڑے گا؟ اب اسکول سے لوٹنے پر کون پیار بھری مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کرے گا۔ یہ سب سوچ کر وہ بھی انجم سے لپٹ کر رونے لگا۔ انجم پھر بڑی بہن کی طرح اُس کو دُلارنے لگی۔

(8)

مکان میں سب سے اُوپر والی منزل پر ایک کوٹھری تھی جس میں گھر کا سارا غیر ضروری سامان بھرا رہتا تھا۔ انور چپ چاپ وہاں چڑھ گیا اور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا۔

کھڑکی سے اُسے آسمان دکھائی دے رہا تھا جس پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ لیکن انور کے

دل کو اُن سے کوئی سکون نہیں ملا۔ نیچے آنگن میں ڈومنیاں بہت درد بھری آواز میں بابُل گا رہی تھیں۔ انور نے یہ گیت پہلے بھی کئی شادیوں میں سُنا تھا لیکن آج اِس گیت کا اثر خود اُس کے دل پر ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کی بہن اپنے ابّا سے رو رو کر کہہ رہی ہے۔

کاہے کو بیاہی بدیس
ارے لکھی بابُل میرے
ہم تو، رے بابل، بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں
ہم تو، رے بابُل، کھونٹے کی گئیاں
ہانکو جدھر ہنک جائیں۔
ہم تو، رے بابُل، جھاپے کی چڑیاں
رین بسے اُڑ جائیں۔

آدھی رات کو ڈومنیوں کا گانا بند ہوا لیکن انور کے دماغ میں وہ گیت گونجتا رہا اور یہ سیانا لڑکا اِس مسئلے پر سوچتا رہا کہ خوشی اور درد ایک ساتھ ملے کیوں رہتے ہیں۔

○

اور خُدا سوتا رہا......

(1)

دلّی کی گرمی۔ سارے شہر پر گرمی ایک بھٹکتے ہوئے بھوت کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ تارکول کی سڑکوں سے، دکانوں پر پڑی ہوئی ٹین کی چھتوں سے، پکّی دیواروں سے، سڑک کی بتّیوں کے لوہے کے کھمبوں سے، غرض یہ کہ ہر چیز سے گرمی نکل رہی تھی۔ سنسان سڑکوں پر لُو کے گرم جھونکے چل رہے تھے اور دُھول اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے بگولوں کی شکل میں اڑا رہے تھے۔ آسمان پگھلے ہوئے تانبے جیسا لگ رہا تھا اور سورج خود اپنی چکا چوند کرنے والی تیز روشنی میں گم ہو گیا تھا۔ آسمان سے انگارے برس رہے تھے اور زمین سے آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور دونوں نے مل کر سارے شہر کو ایک جہنّم بنا دیا تھا، وہی جہنّم جس کے بارے میں انور نے مولوی صاحب سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ دوپہر کے بعد تین چار گھنٹے تک سارا شہر سوتا تھا۔ دُکاندار اپنی دکانوں کے آگے موٹے موٹے ہرے پردے ڈال کر اندر سو جاتے تھے۔ خوش حال لوگ خس کے خوشبودار پردے لگا کر اپنے اپنے گھروں کے سب سے اندر والے ٹھنڈے اندھیرے کمروں میں سو جاتے تھے اور ان پردوں پر پانی چھڑکنے کے لیے باہر ایک آدمی مقرر کر دیتے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بیل گاڑی چر چر کرتی ہوئی سڑک پر سے گزرتی تھی اور پیاسے بیلوں کی سوکھی زبانیں باہر نکلی رہتی تھیں۔

اکبرعلی کے مکان میں ایک ٹھنڈا اندھیرا تہہ خانہ تھا جس میں ہر وقت سیلن کی بُو آتی رہتی تھی۔ روز گیارہ بجے اسکول سے لوٹ کر کھانا کھانے کے بعد انور اسی تہہ خانے میں بند ہو جاتا۔ اکبرعلی شاید ہی کبھی تہہ خانے میں جاتے، انھیں اپنی بیٹھک زیادہ پسند تھی۔ وہ وہیں خس کا پردہ لگا کر لیٹتے تھے۔ لیکن پھوپھی اماں کو تو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اُن کا لاڈلا بھتیجا کہیں دھوپ میں کُھلا نہ جائے، ٹھیک اسی طرح جیسے جاڑے بھر انھیں اس بات کی فکر رہتی تھی کہ کہیں اُسے زُکام نہ ہو جائے، اِس لیے آنگن میں لگے ہوئے گزھل کا سایہ پُوری طرح سمٹ کر اُس کی جڑ میں آجانے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ انور کو تہہ خانے میں بھیج دیتی تھیں۔

(2)

انور اپنی پھوپھی اماں کا کہنا مان کر فوراً تہہ خانے میں چلا جاتا تھا۔ تہہ خانے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے سیڑھیوں پر کھڑا رہتا تھا تاکہ اُسے اندھیرے کی عادت ہو جائے۔ جب وہ آنکھیں کھولتا تھا تو چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں اُسے چارپائیوں پر بچھے ہوئے بستروں کی سفید چادریں دکھائی دیتیں۔ وہ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ ٹھنڈے تکیے پر جب وہ اپنے گرم گال رکھتا تو اُسے بہت مزا آتا تھا۔

انور چارپائی پر لیٹ گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، پر اُسے نیند نہیں آئی۔ اُس کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ انور کو اِس بات پر ہمیشہ تعجب ہوتا تھا اور اس کے اسکول کے ماسٹروں کو بھی اُس سے یہ شکایت تھی کہ وہ تیز تو بہت تھا پر کسی چیز میں دیر تک دھیان نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ جب وہ حساب کا کوئی سوال کرتا تھا یا جیومٹری کے کسی مسئلے کو حل کرتا تھا تو کبھی کبھی اُس کا دھیان بھٹک کر باہر تار کے کھمبے پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی طرف چلا جاتا تھا اور وہ اُن بڑے بڑے کبوتروں کے بارے میں سوچنے لگتا تھا جو اُس نے کئی بار آسمان پر اُڑتے دیکھے تھے۔ اب وہ اتنا تو جان گیا تھا کہ ان بڑے بڑے کبوتروں کو ہوائی جہاز کہتے ہیں۔ وہ اپنے تصور میں اُن دُور کے ملکوں کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ جہاں اِن کبوتروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر جایا جا سکتا تھا۔ وہ انگلینڈ اور امریکہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہوں گے۔ اس نے اپنے اسکول کی کتابوں میں انگلینڈ

کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہاں بادشاہ رہتا تھا اور سب وائسرائے وہیں سے آتے تھے۔ وہاں بہت بڑے بڑے شہر تھے، دلّی سے بھی بڑے اور ان میں سب سے بڑا شہر تھا لندن۔ اور امریکہ! وہ تو پریوں کا دیس تھا۔ وہاں سے جادو کی 'چلتی پھرتی' تصویریں آتی تھیں جنھیں اُس نے بائیسکوپ کے پردے پر دیکھا تھا۔ ہاں ایسی تصویریں جو سچ مچ چلتی تھیں اور عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھیں۔ بھاگتی ہوئی موٹریں، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے اور خوب صورت عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے لمبی لمبی مونچھوں والے جنگلی مرد، سچ مچ یہ بائیسکوپ بہت ہی عجیب سی چیز تھی اور انور یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ تصویریں آخر 'چلتی' کیسے ہیں؟

یہ تصویریں بالکل سچ مچ کے آدمیوں جیسی لگتی تھیں۔ اُسے ایک بہت ہی مسخرا آدمی اچھی طرح یاد تھا جس کی تصویریں اُس نے دیکھی تھیں۔ اُس کے چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، وہ اوندھے پیالے جیسی ہیٹ پہنتا تھا، اُس کی پتلون تھیلے کی طرح لٹکتی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ ہاتھ میں چھڑی لیے رہتا تھا اور وہ منہ ایسا بناتا تھا کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ انور کو اپنے ان خیالوں پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

اُس کے خیالوں کو توڑتی ہوئی ماسٹر صاحب کی سخت آواز گونج اُٹھی۔ 'انور! ہنس کس بات پر رہے ہو؟ سوال کر لیا اپنا؟'

انور انھیں کس طرح سمجھاتا کہ کھڑکی کے باہر نظر جاتے ہی اُس کے دماغ میں کبوتروں اور ہوائی جہازوں اور 'چلتی پھرتی' تصویروں کے خیالات گھومنے لگے تھے اور اپنا سوال کرنے کی بجائے وہ اُس مسخرے آدمی کی حرکتوں پر ہنس رہا تھا جسے اُس نے پچھلے ہفتے بائیسکوپ میں دیکھا تھا؟ اِس لیے اُس نے چپ چاپ ماسٹر صاحب کی ڈانٹ سن لی۔

(3)

ہاں، اُس کے خیال سچ مچ زیادہ بھٹکنے لگے تھے۔ تہہ خانے میں لیٹے لیٹے سب سے پہلے تو اُسے اپنی بہن انجم کا خیال آیا، انجم کی شادی کو چھ مہینے ہو چکے تھے لیکن انور ابھی تک گھر میں اُس کی غیر موجودگی کا عادی ہو نہیں پایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ایک گوشہ خالی ہو گیا ہے جسے انجم کے ہر ہفتے آنے والے خط بھی نہیں بھر سکتے۔ وہ اپنے بھائی کو بڑے پیار بھرے خط لکھتی تھی لیکن اُس میں وہ اپنے نئے گھر میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتی تھی۔ اب وہ لوگ

گرد گاؤں میں نہیں تھے۔ امجد علی دلّی سے کوئی سو میل دور سلام پور نام کی ایک ریاست میں وزیر لگ گئے تھے، یہ بہت بڑا عہدہ تھا اور اب امجد علی جب بھی دلّی آتے تھے تو اُن کے ساتھ سنہری اور لال وردی پہنے ہوئے دو چپراسی ہوتے تھے اور وہ بہت بڑھیا موٹر میں گھومتے تھے جس کی نمبر پلیٹ پر اُس ریاست کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ انور کو یقین تھا کہ سلام پور میں انجم بہت خوش ہوگی کیوں کہ وہاں اتنے بہت سے نوکر چاکر، بڑھیا موٹر اور بے شمار روپیہ پیسہ وغیرہ تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد رؤف نے کالج میں نام لکھانے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا اور ریاست کی پولیس میں ایک نوکری کے لیے عرضی دی تھی کیوں کہ پولیس کا محکمہ اُس کے ابّا کے ہی ماتحت تھا اس لیے اُسے یہ نوکری مل جانے میں کوئی شک نہیں تھا۔

رؤف کے خیال سے انور کو کبھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف اُس کا چچیرا بھائی تھا بلکہ اب تو بہنوئی بھی تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں انور اُس کے بارے میں پیار اور محبّت کے ساتھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اِس ضدّی اور گھمنڈی لڑکے کے بارے میں سوچتے ہی انور کے دل میں نہ جانے کیوں مخالفت کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ رؤف کی طرف سے دھیان ہٹا کر اُس کی بہن بلقیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ بلقیس کا خیال آتے ہی انور کے دل میں پیار اُمڈ پڑتا تھا۔ اُسے اب تک گرد گاؤں کے کھیتوں کی وہ سیر یاد تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ بھاگتے وقت بلقیس کی چوٹی کس طرح پھدکتی رہتی تھی۔ اُس وقت سے وہ بڑی ہو کر ایک اچھی خاصی خوب صورت لڑکی بن چکی تھی۔ لیکن انجم کی شادی میں بلقیس اُس سے اتنا شرماتی کیوں رہی اور اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہی؟ اِن تین برسوں میں کیا بات ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اُن کے آپس کے تعلقات میں ایسی تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ اب کھل کر بے جھجک ہنس بول بھی نہیں سکتے تھے؟ انور کافی دیر تک اِس مسئلے کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اُس کے سامنے خود اپنا مسئلہ آ گیا۔ تین سال پہلے اُسے بلقیس کے ساتھ کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے میں، اُس کی چوٹی کھینچنے میں اور اُسے چھیڑنے میں بہت مزا آتا تھا۔ لیکن اِس بار جب اُس نے بلقیس کو دیکھا تھا تو اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ دیر تک اُسے تکتا رہے، اور جب اُس کی بڑی بڑی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی نہ ہوں تب ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہے۔ اس وقت بھی اُسے وہ سب پوشاکیں یاد تھیں جو بلقیس نے شادی کے دنوں میں پہنی تھیں......

وہ اِن مسئلوں کو کسی طرح حل نہیں کر پا رہا تھا کہ انسان کے آپس کے رشتے کیوں بدلتے رہتے ہیں۔ اسی اُدھیڑ بُن میں اُسے اپنے دوست رتن کا خیال آیا جس کے بارے میں اُسے کئی مہینے سے کوئی خبر نہیں ملی تھی، بس بیچ میں ایک بار اُس نے انجم کی شادی کی دعوت کے جواب میں شکریے کا ایک بہت ہی رسمی سا خط بھیجا تھا۔ اُس کے اِس خط سے ظاہر تھا کہ اُس نے انور کو کانگریس کے پنڈال میں وعدے کے مطابق نہ پہنچنے کے لیے معاف نہیں کیا تھا۔ انور کچھ جھنجھلا کر سوچنے لگا کہ 'یہ رتن ضرورت سے زیادہ سیاسی ہو گیا ہے۔ وہ کسی دوسری چیز کے بارے میں نہ بات کر [illegible] لکھ سکتا ہے۔' پھر بھی وہ اپنے دوست سے ملنے کے لیے کتنا بے تاب تھا۔

جب سورج ڈھل گیا تو شہر میں جیسے پھر سے جان آ گئی۔ نہا دھو کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور ایک بار پھر بازار میں چہل پہل ہو گئی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، شربت کی دُکانوں پر اور قلفی والوں کے پاس بھیڑ جمع ہو گئی۔ جامع مسجد اور لال قلعہ کے بیچ میں جو میدان پڑا ہوا ہے، جہاں گورے سپاہی پریڈ کرتے تھے وہاں ایک اچھا خاصا تماشہ جم گیا۔ نٹ، بازی گر، ہر مرض کی دوا بیچنے والے، کباڑی، ہر مال ملے گا دو پیسے والے، اونچی آواز میں گا گا کر گانوں کی کتابیں بیچنے والے، پیتل کے کٹورے بجاتے ہوئے مشک سے برف کا ٹھنڈا پانی پلانے والے۔ یہ سب کے سب اچانک نہ جانے کہاں سے نکل پڑے۔ شاہ سرمد کے مزار کے پاس جن کا سر مغل بادشاہ اورنگ زیب کے حکم سے اُڑا دیا گیا تھا، ہمیشہ کی طرح فقیروں اور مُریدوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور قوالی ہو رہی تھی۔ وہاں سے کچھ ہی دور پر ایک پادری اُردو میں مسیحی لٹریچر کی کتابیں بانٹ رہے تھے۔

انور کو اپنا شام کا وقت اِس ہنگامے کے درمیان بِتانا بہت پسند تھا۔ شام کے دُھندلکے میں یہاں کا نظارہ آدھی حقیقت اور آدھا خواب معلوم ہوتا تھا۔ یہاں وہ بھیڑ کے ساتھ گھل مل جاتا تھا اور اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا جیسے سمندر کی لہروں پر سوار ہو۔

آج انور ہمیشہ سے زیادہ خوش تھا۔ اُس کے ابا نے اُس سے کہا تھا کہ جب وہ میٹرک پاس کر لے گا تو اُس کا نام علی گڑھ یونی ورسٹی میں لکھوا دیا جائے گا۔ انور نے اِس یونی ورسٹی کی اجتماعی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور یہ سوچ کر وہ پھولا نہیں سما رہا تھا کہ گھر کی پھیکی بے رنگ زندگی کی بجائے (جو انجم کی شادی کے بعد اور بھی بے رنگ ہو گئی تھی) اب اُسے

اپنی ہی عمر کے سینکڑوں لڑکوں کے ساتھ زندگی بتانے کا موقع ملے گا۔

بہت خوش خوش وہ بھیڑ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُس جگہ سے گزرا جہاں 'دوسرا اور پانچ ٹانگوں والا بچھڑا' دکھایا جا رہا تھا۔ پھر وہ گھومتا گھومتا ایک دوسری بھیڑ میں جا کھڑا ہوا۔ وہاں ایک بازی گر نے ایک آدمی کو مسمریزم سے بے ہوش کر دیا تھا اور اُس سے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دلوا رہا تھا اور وہ بے ہوش آدمی نہ جانے کیسے ہر سوال کا جواب صحیح صحیح دیتا تھا۔ 'سفید شیروانی اور لال ترکی ٹوپی والے لڑکے کی جیب میں کتنے پیسے ہیں؟' بازی گر نے پوچھا اور زمین پر بے ہوش لیٹے ہوئے آدمی نے چادر کے نیچے سے جواب دیا: 'چودہ آنے!' انور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے باہر نکالے ایک اٹھنّی، ایک چونّی، ایک اکنّی اور چار پیسے۔ پورے چودہ آنے تھے۔ ہر آدمی انور کو دیکھنے لگا۔ انور کچھ ایسا کھسیا گیا کہ اُس کے پسینہ چھوٹنے لگا اور وہ اس بات پر حیرت کرتا ہوا وہاں سے چل دیا کہ اُس میں کتنی بازی گری ہے اور کس حد تک سچ مچ خفیہ باتوں کا پتہ لگا لینے کی طاقت۔ اُس کے ابا جادوگروں، نجومیوں، مسمریزم کرنے والوں اور دوسرے بازی گروں کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتے تھے، لیکن انور کے دماغ میں چودہ آنے والی پہیلی جوں کی توں قائم رہی۔

وہاں سے آگے بڑھ کر انور ایک دوسری بھیڑ میں جا پہنچا، جہاں بہت سے لوگ ایک آدمی کے چاروں طرف گھیرا باندھے کھڑے تھے اور وہ آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ ایک دوسری طرح کا مسمریزم تھا اور ہر آدمی اپنی جگہ پر مورتی کی طرح کھڑا ہوا اُس مقرر کے الفاظ کے بہاؤ کو دنگ رہ کر سن رہا تھا۔ انور نے سوچا کہ یہ کوئی سیاسی پرچارک ہوگا جو کسی بہت انقلابی بات کا پرچار کر رہا ہے۔ کیونکہ اُس آدمی کی آواز میں بے حد جوش تھا اور وہ بڑی لگن اور محنت سے اپنی بات سمجھا رہا تھا، حالانکہ اُس کے میلے کچیلے سوٹ اور تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کو دیکھنے سے وہ کسی طرف سے لیڈر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ لچھے دار ہندوستانی میں تقریر کر رہا تھا۔ 'بھائیو، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی قوم کی طاقت کا کیا راز ہوتا ہے؟ انگریز کس چیز کی بدولت آج ساری دنیا کے چودھری بنے بیٹھے ہیں؟ کس چیز نے آج امریکہ کو دنیا کا سب سے امیر ملک بنا دیا ہے؟ کس چیز کے بل پر جاپان دیکھتے دیکھتے دنیا کی ایک بڑی طاقت بن بیٹھا ہے؟' پھر وہ بڑے ڈرامائی انداز سے ایک لمحے کے لیے رُکا اور ہر آدمی، انور بھی دَم سادھ

کر ان سوالوں کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔' بھائیو! میں آپ کو بتاتا ہوں، اس کا راز ہے اچھی صحت اور طاقت ور جسم۔ ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ صحت لاکھ نعمت ہے، اور جان ہے تو جہان ہے' لیکن جب آپ اپنی نوجوانی کی غلطیوں سے اپنے ہاتھوں، اپنی صحت لٹا دیتے ہیں، جب آپ اپنی پھول جیسی جوانی کو مسل کر خاک میں ملا دیتے ہیں تو آپ کی صحت اچھی کیسے بن سکتی ہے؟ میرے پاس یہ گولیاں ہیں.....'

تو یہ بات تھی! دُھواں دھار تقریر کرنے والے یہ صاحب طاقت کی گولیاں بیچتے تھے! یہ معلوم کر کے انور مسکرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک پان والے کی دُکان پر اُسے گوپال دکھائی دیا جو پچھلے سال فیل ہو گیا تھا اور اس لیے اب وہ انور کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن اُن دونوں کی دوستی اب بھی باقی تھی۔ اُن کی دوستی ایک جیسی چیزوں کو پسند کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے تھی کہ اگر ایک پورب تھا تو دوسرا پچھم۔ گوپال مست، بے فکر اقسم کا لڑکا تھا۔ اُسے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا اور ہر وقت اُس کی جیب میں ڈھیروں پیسے کھنکتے رہتے تھے۔ انور دل ہی دل میں گوپال سے بہت متاثر تھا کیونکہ گوپال میں خود اعتمادی تھی اور وہ دنیا کو سمجھتا تھا اور زندگی کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ کر اُس کا مزا لیتا تھا۔ دوسری طرف گوپال بھی اس دُبلے پتلے، بھولے اور جھینپو لڑکے کی طرف اس لیے کھنچتا تھا کہ اُسے کھیل کے مقابلے میں کتابوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔

انور کو ایک دوست سے ملنے کی بہت خوشی تھی اور وہ لپک کر بڑے تپاک سے گوپال سے ملا۔ ٹھیکیدار کے بیٹے نے فوراً اُسے قلفی کھانے کی دعوت دی۔

'بھئی شکریہ، مجھے تو قلفی کھانا منع ہے۔ میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔' انور کو اپنی کمزور صحت کا ذکر کرتے ہوئے بڑی شرم آتی تھی۔

'تو کم سے کم ایک پان تو کھاؤ۔'

'نہیں رہنے دو، میں پان نہیں کھاتا۔ ابا پان کھانے کو منع کرتے ہیں۔'

'اوہ، تم بھی کیسے پھیکے آدمی ہو۔ اچھا، ہمارے ساتھ چلو گے تو؟ مجھے ذرا سائیکل کا ایک لیمپ خریدنا ہے۔'

دونوں ساتھ ساتھ کئی دکانوں پر گئے۔ کبھی ایک دُکان پر رُک کر کوئی چیز دیکھنے لگتے تو کبھی

دوسری دُکان پر۔ سائیکل کے لیمپ کا انھیں دھیان ہی نہیں رہا۔ دُکانوں پر بتّیاں جل گئی تھیں مگر ابھی تک اُن کی خریداری پوری نہیں ہوئی تھی۔ گھومتے گھومتے وہ مسجد کے مغرب کی طرف والی دُکانوں پر پہنچے جہاں مسجد کی اونچی دیوار کے سائے میں طرح طرح کے کپڑوں، رنگین رُومالوں اور تولیوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ گوپال نے ایک ریشمی رُومال خریدا اور دکاندار پانچ روپے کے نوٹ کے باقی پیسے ابھی لوٹا بھی نہیں پایا تھا کہ بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدموں کی آواز اور 'مارو! مارو!' کا شور اُن کے کانوں میں پڑا اور اس کے فوراً ہی بعد 'مار ڈالا! مار ڈالا!' کی چیخیں سنائی دیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتے کہ ماجرا کیا ہے، دُکانداروں نے جلدی جلدی اپنی دکانیں بند کر دیں اور لوگ ڈر کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ جان کا خطرہ دیکھ کر، دونوں لڑکے چاوڑی بازار کی طرف بھاگے جہاں جلدی جلدی لوگ اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ رہے تھے۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس چیز سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔ مسجد کے مینار پر سے مؤذن نے اذان دے کر مومنوں کو نماز کے لیے بُلایا اور اُسی وقت پاس کے کسی مندر میں گھنٹہ بجنے لگا۔ ایک تانگا سرپٹ بھاگتا ہوا اُن کے پاس سے گذر گیا۔ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ کوئی داہنے بھاگا، کوئی بائیں اور چاروں طرف اور زیادہ گڑبڑی پھیل گئی۔ کہیں کوئی بچہ رو اُٹھا، کوئی عورت چیخ پڑی اور کسی نے انور اور گوپال کو گھسیٹ کر ایک تنگ و تاریک زینے پر پہنچا دیا۔

'بیٹا، ہندو مسلم فساد ہو گیا' اُس آدمی نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ سڑک کی دوسری طرف سے کوئی درد بھری آواز میں چلاّیا، 'مار ڈالا' اور اُس کے بعد ہی ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ اور کراہ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ انور نے سوچا کہ 'کوئی مارا گیا' اور یہ سوچتے ہی اُسے تسلی ہونے لگی۔ لیکن وہ ہندو تھا کہ مسلمان؟ اندھیرے میں سے اُسی آواز نے پھر بڑے پیار سے کہا، 'بیٹا اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس وقت سڑک پر نہ نکلتا۔ تم لوگ تھوڑی دیر یہیں ٹھہرنا۔ میں جا کر اپنی دکان پر دیکھتا ہوں کہ وہاں سب لوگ خیریت سے ہیں کہ نہیں۔' اندھیرے میں سے ایک پرچھائیں نکل کر سنسان سڑک پر غائب ہو گئی اور ایک بار پھر انور سوچنے لگا۔ اس آدمی نے ہماری، ایک ہندو اور ایک مسلمان لڑکے کی جان بچائی ہے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ خود ہندو تھا یا مسلمان۔

(4)

نہ جانے کتنی دیر تک وہ اُن تنگ و تاریک سیڑھیوں پر بیٹھے رہے۔ گوپال یوں تو بہت تیس مار خان بنتا تھا لیکن وہ بہت بزدل نکلا۔ وہ لگاتار گھگھیا کر یہی کہہ رہا تھا، 'ارے بھگوان! اب کیا ہوگا؟' ڈر تو انور کو بھی لگ رہا تھا لیکن ڈر سے زیادہ اُسے اِس حادثے کی دردناکی اور حماقت پر غصہ آرہا تھا۔ ہندو مسلم فساد! لیکن آخر کیوں؟

اُس نے دوسرے شہروں میں اس طرح کے فسادات ہونے کی خبریں سنی تھیں لیکن وہ بہت دور کے حادثے معلوم ہوتے تھے جو دلّی میں کبھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک کیا ہندو اور مسلمان آزادی سے اپنا اپنا کام نہیں کر رہے تھے؟ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کوئی میل نہیں تھا، انھیں اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ کوئی انھیں چھرا مار دے گا۔ لیکن ایک دم سے کیا ہوگیا تھا؟ آخر گوپال بھی تو ہندو اور وہ خود مسلمان تھا؟ پھر بھی اُس کے دل میں گوپال کو مار ڈالنے کا کوئی خیال نہیں تھا اور اُسے یقین تھا کہ گوپال بھی اُس کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ پھر دوسرے گوپال اور انور بھی اسی طرح دوست کیوں نہیں رہ سکتے تھے؟ آخر کیوں؟

ان کے پیچھے سے کوئی سیڑھیاں اُتر رہا تھا اور اپنی اِس حالت میں دونوں لڑکے دہشت کے مارے چیخ اُٹھے۔

'کون ہے؟ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'

وہ کسی عورت کی آواز تھی۔ یہ دیکھ کر دونوں کی ہمت بندھی۔

'ہم...... ہم......' انور نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ 'آپ جانتی ہیں باہر فساد ہو رہا ہے۔ لوگ مارے جا رہے ہیں۔ اس لیے...... اِس لیے...... کسی نے ہم سے کہا کہ جب تک لڑائی دنگا ختم نہ ہو جائے ہم یہاں بیٹھے رہیں۔'

اب تک گوپال کی بھی جان میں جان آچکی تھی۔ اُس نے اُس عورت سے جس کا چہرہ اُنھیں اب بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا، کہا: 'بائی جی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر کے لیے اندر آجائیں۔ اِن سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے تو ہماری ٹانگیں اکڑ گئیں۔'

'اچھی بات ہے، آجاؤ۔ لیکن تم دونوں تو ابھی بچے ہو۔' اور جس ڈھنگ سے اُس نے

اُنھیں 'بچّے' کہا اُس میں حقارت بھی تھی اور مایوسی بھی۔ انور نے اِس بات کو محسوس تو کیا پر وہ اس کا مطلب اُس وقت نہیں سمجھ پایا جب تک کہ گوپال نے اُس کے کان میں یہ نہیں کہا کہ 'یار ہم لوگ بڑے قسمت والے ہیں، یہ تو رنڈی کا گھر ہے؟'

رنڈی؟ اُن 'دوسری عورتوں' میں سے ایک جنھیں انور نے ایک بار اسی بازار سے گزرتے وقت دیکھا تھا، لیکن اُس کے ابّا نے کہہ رکھا تھا کہ شریف آدمیوں کو اُن کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیے، اُن کے گھر میں جانا تو دور رہا۔ سیڑھیوں کے اُوپر پہنچ کر اُس کے قدم اپنے آپ رُک گئے لیکن گوپال اُسے کھینچ کر ایک کمرے میں لے گیا جو بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جب انور بیوقوفوں کی طرح پلکیں جھپکانے لگا تو ایک زور کا بھونڈا قہقہہ پڑا۔

(5)

اُس کمرے کی سجاوٹ کچھ عجیب ہی ڈھنگ کی تھی۔ فرش پر ایک سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی جس میں بہت سے پیروں تلے روندے جانے کی وجہ سے بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور کئی جگہ اس پر پان کے دھبّے بھی پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے اور آدھ ننگی اور ننگی عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جنھیں دیکھ کر ہی انور کا منہ شرم سے لال ہوگیا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ دروازہ ایک دوسرے کمرے میں جاتا تھا اور ایک بار جب کوئی نوکر اندر سے نکل کر آیا تو انور نے دیکھا کہ وہاں ایک مسہری پڑی ہوئی ہے۔

کمرے میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ وہ عورت جو اُن دونوں کو سیڑھیوں پر ملی تھی، لگ بھگ پینتالیس برس کی بھرے بدن کی عورت تھی۔ وہ بیچ میں بیٹھی ہوئی سامنے ایک بڑا سا پاندان رکھے، پان لگا رہی تھی۔ دو لڑکیاں، جن میں سے ایک کی عمر لگ بھگ بیس برس کی تھی اور دوسری کی اس سے بھی کچھ کم رہی ہوگی، ایک طرف بیٹھی تھیں۔ وہ شلواریں اور تنگ کُرتے پہنے تھیں جن کی وجہ سے اُن کے جسم کی گولائیاں بہت زیادہ نمایاں ہوگئی تھیں۔ وہ دونوں سانولی تھیں لیکن اُن کے گالوں پر ڈھیروں سرخی اور پاؤڈر پُتا ہوا تھا۔ وہ دونوں دکھاوے کے لیے بہت شرمائی ہوئی بیٹھی تھیں لیکن جس طرح وہ اُن دونوں لڑکوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں اُس میں شرارت صاف جھلکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اُنھیں دیکھ کر انور کو اُس پھرتیلے چیتے کی یاد آ گئی جسے اُس نے

ایک بار سرکس میں دیکھا تھا۔ اُن دونوں لڑکیوں کے جسم بھی اُسی چیتے کی طرح تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی شکار پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ انور کو اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں اُن سے اُس کی آنکھیں چار نہ ہو جائیں کیوں کہ اُس سے اُسے ایک عجیب سی اُلجھن ہوتی تھی اور اُس کے دل میں ایسی عجیب عجیب اُمنگیں اُٹھتی تھیں جن میں کشش بھی تھی پر جن سے اُس کا دُور بھاگنے کو جی چاہتا تھا۔ تھوڑی دور پر کچھ سازندے بیٹھے دھیمی آواز میں فسادات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ وہ گھر کیسے واپس پہنچیں گے۔

انور نے دیکھا کہ گوپال کو اُس کی طرح گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ٹھیکیدار کا بیٹا اِس ماحول کا عادی ہے۔ اُس کی زبان جس میں ہمیشہ سے مٹھاس اور تیزی تھی، اب پھر قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ انور کو اِس بات پر کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی کہ گوپال اُس گھر کی مالکن پر اپنی حیثیت اور دولت کا رُعب ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں اُن دونوں لڑکیوں سے نظریں بھی لڑاتا جاتا تھا۔ دونوں لڑکیاں گوپال کی موٹروں، بنگلوں، ریشمی ساڑیوں اور زیوروں کی باتیں سُن کر کافی رُعب میں آ گئی تھیں۔

جب پان لگ گئے تو بائی جی نے انھیں چاندی کی طشتری میں رکھ کر چھوٹی والی لڑکی کو دے دیا۔ مٹکتی ہوئی وہ پہلے گوپال کے پاس گئی اور بڑے ادب سے جھک کر اُس نے طشتری اُس کے آگے بڑھا دی۔

گوپال نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: 'اگر پان کھلانا چاہتی ہو تو اپنے ہاتھ سے کھلانا ہوگا۔'

لڑکی کھِسیا کر ہنسی اور گلوری گوپال کے کھلے ہوئے منہ میں رکھ دی۔ اور اس کے پان مُنہ میں رکھتے ہی گوپال نے ایک زور کا چٹخارہ لے کر اُس کی اُنگلیوں کو چوم لیا۔ انور سمجھتا تھا کہ اس پر وہ گوپال کے منہ پر تھپڑ مار دے گی لیکن سب لوگ ہنس پڑے جیسے یہ بھی کوئی مذاق رہا ہو۔ گوپال نے اُسے بانہہ پکڑ کر روکا اور جیب میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اُس کی مُٹھی میں رکھ دیا اور ایسا کرتے وقت وہ اُس کی ہتھیلی میں گُدگُدی کرنا نہیں بھولا۔

اب انور کی باری تھی۔ لڑکی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر انور کا دل تو بیٹھنے لگا۔ جب وہ اُسے پان دینے کے لیے جھکی تو انور کی ناک میں بہت سستے عطر کی تیز خوشبو آئی۔ اس سے پہلے کہ انور یہ کہہ پاتا کہ وہ پان نہیں کھاتا اُس لڑکی نے اُس کے منہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ انور بوکھلایا ہوا منہ کھولے بیٹھا تھا۔

'یار تم بھی بڑے بیوقوف ہو' گوپال نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا: 'ایسا موقع بھی کوئی ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔' انور دُعا کر رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔

لیکن اُس لڑکی نے تو انور کے کھلے ہوئے منہ میں پان رکھ دیا تھا اور طشتری لیے اُس کے سامنے کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اناڑیوں کی طرح پان چباتے ہوئے انور کو یکا یک خیال آیا کہ اُسے طشتری میں کچھ پیسے رکھنا چاہیے، اِس لیے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ تھا باہر نکالا۔ ایک اٹھنّی، ایک چونّی، ایک اکنّی اور چار تانبے کے پیسے۔ جب پیسے کھنک کر طشتری میں گرے تو کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ موقع کا فائدہ اُٹھا کر گوپال نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بڑی بے تکلفی سے اُس کے گال مسلنے لگا۔

انور نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی پان نہیں کھایا تھا۔ پان چباتے چباتے اُس کے منہ میں پیک بھر گئی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے نگل جائے یا تھوک دے۔ سپاری اُس کے حلق میں اٹک گئی تھی اور اُس عورت نے شاید پان میں تھوڑا سا تمباکو بھی ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے انور کا سر چکرانے لگا۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ننگی تصویریں، سازندے، پاندان کے پاس بیٹھی ہوئی وہ عورت اور چیتوں جیسی وہ دونوں لڑکیاں جو اُسے ایسے گھور رہی تھیں جیسے اُسے ابھی کھا جائیں گی اور قہقہہ لگاتا ہوا گوپال جس کے پان سے لال دانت دکھائی دے رہے تھے۔ انور کو لگ رہا تھا کہ ہر شخص اور ہر چیز جھوم رہی ہے، گھوم رہی ہے، ناچ رہی ہے۔

کسی طرح انور اپنے جوتے ڈھونڈ کر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور ایک سانس میں سیڑھیاں اُتر گیا جیسے اُس کے پیچھے ایک ساتھ کئی بھوت لگ گئے ہوں۔ اُسے یہ منظور تھا کہ وہ فساد میں کسی غنڈے کے ہاتھوں مارا جاتا پر وہ اُس گھر میں ایک پل کے لیے بھی نہیں رُک سکتا تھا۔

(6)

کچھ دن بعد فساد ختم ہو گیا۔ پتہ یہ چلا کہ شہر کے دو غُنڈوں میں کوئی ذاتی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُن میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان اور دونوں طرف کے کٹر مذہبی لوگوں نے اِس موقع کا فائدہ اُٹھا کر جھوٹی افواہیں پھیلائی تھیں اور دونوں فرقوں کے بیچ جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ انور نے

چاوڑی بازار والی بات اپنے ابا کو نہیں بتائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے مجبور ہو کر ہی وہاں جانا پڑا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ اُس کے ابا کہیں اس کا غلط مطلب نہ نکالیں۔

فساد تو ختم ہو گیا لیکن اُس کی وجہ سے دلوں میں جو دشمنی پیدا ہو گئی تھی وہ دُور نہیں ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے تھے۔ اپنے ابا کی بیٹھک میں انور نے طرح طرح کے بھیانک قصے سنے کہ سارے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اکبر علی نہ تو چودھری محمد عمر کی طرح گالی بکتے تھے اور نہ ہی کبھی سختی سے بولتے تھے لیکن انور یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے ابا کا دل اب اپنے ہندو دوستوں کی طرف سے ہٹنے لگا تھا اور اسی لیے جب کبھی کا کا رامیشور دیال آتے تھے، حالانکہ اُن دنوں انھوں نے آنا بہت کم کر دیا تھا، تو اکبر علی اُن سے بہت ہی رسمی طریقے سے ملتے تھے۔

انور عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ابا اور چودھری محمد عمر کے منہ سے سُنتا کہ فساد کے زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے تھے تو اس پر پہلا ردِّ عمل یہ ہوا تھا کہ وہ بھی سب ہندوؤں سے نفرت کرنے لگے۔ لیکن جب وہ کا کا رامیشور دیال یا گوپال سے یا اپنے اسکول کے اُن ماسٹر صاحب سے ملتا تھا جو اُسے جغرافیہ پڑھاتے تھے تو وہ کسی بھی طرح اُن سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اُن میں سے کسی سے بھی ملتا تھا تو وہ یہ بھول جاتا تھا کہ جس سے وہ باتیں کر رہا ہے وہ آدمی ہندو ہے۔ وہ اُن کے ساتھ پہلے کی طرح ہی ادب یا محبت سے پیش آتا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے آپ پر الزام لگاتا کہ وہ چودھری صاحب یا اُن کے بیٹے شفیع کی طرح پکا مسلمان نہیں ہے کیوں کہ یہ لوگ تو کھلے عام ہندوؤں سے نفرت کا اعلان کرتے تھے۔ پنجابی بیوپاری چودھری محمد عمر نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کا نام تھا 'مسلمان صرف مسلمان دکانداروں سے خریدیں'۔ اِس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا جائے جسے وہ اب تک بہت گھٹیا کام سمجھتے تھے۔ اِس تحریک کے نتیجے کے طور پر اگر محمد عمر اور اکبر علی کی چینی کے برتنوں کی دُکان پر زیادہ گاہک آنے لگے تھے تو یہ صرف اس بات کا ثبوت تھا کہ مسلمانوں میں آپس میں کتنا بھائی چارہ ہے۔ یہ سب اللہ کی شان تھی اور اس کے لیے اللہ کا شکر ادا کیا جانا چاہیے۔

ستمبر میں اسکول کی چھٹیاں ہوئیں اور حالانکہ مارچ میں انور کو میٹرک کا امتحان دینا تھا لیکن

وہ اس کے لیے ابھی تک کوئی خاص تیاری نہیں کر رہا تھا۔ اب وہ بھی بیٹھک کے اسی کونے میں لوگوں کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ ان دنوں عام طور پر اکثر فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے پر بات چیت ہوتی تھی۔ اُس حساس لڑکے کے لیے فسادات کے بارے میں دل دہلانے دینے والی باتیں سننا ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا تجربہ تھا۔ یہ آئے دن کے واقعات ہو گئے تھے پھر بھی اُن کا بھیانک پن اُسے دنگ کر دیتا تھا۔ وہ مختلف شہروں میں ہونے والے خون خرابے اور تباہی کی جتنی ہی زیادہ خبریں سنتا تھا اتنی ہی زیادہ اُس کی دلچسپی اِس بات میں کم ہو جاتی تھی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مارا یا مسلمانوں نے ہندوؤں کو۔ اُسے تو صرف یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جو کل تک آپس میں بھائی بھائی اور دوست تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ کیا اُس کے ملک والوں کی عقل ماری گئی تھی؟ انور کو یہ سب ویسی ہی بھیانک باتیں لگتی تھیں جیسے وہ جا کر کاکا رامیشور دیال کے چھرا بھونک دے یا گوپال آ کر اُن کے گھر کو آگ لگا دے۔ اِس نوجوان لڑکے کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی آواز لگاتار اُس کے سر کے اندر ہتھوڑے سے چوٹ لگا رہی ہے، 'اِسے روکنے کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے، ضرور کیا جانا چاہیے! فوراً کیا جانا چاہیے!!' لیکن وہ کیا کر سکتا تھا؟ جب اتنے بڑے بڑے لیڈر کچھ نہیں کر سکے تو مشکل سے پندرہ برس کا ایک لڑکا کیا کر سکتا تھا؟

آخر کار اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ چودھری محمد عمر نے ہمیشہ کی طرح اپنے حقارت بھرے لہجے میں کہا کہ گاندھی دِلّی آئے ہیں۔ وہ انھیں کبھی بھی مہاتما گاندھی نہیں کہتے تھے، اِس پر اکبر علی نے بھی کچھ مایوسی سے کہا: 'ایک زمانہ تھا جب وہ حالت کو سنبھال سکتے تھے۔' انور کے دماغ میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ 'میں جا کر مہاتما گاندھی سے ملوں گا' وہ ضرور کچھ کر سکتے ہیں، انھیں ضرور کچھ کرنا پڑے گا۔ کیا انھوں نے ہی مجھے خواب میں اُس راکشش سے نہیں بچایا تھا؟ کیا انھوں نے ہی ہندوستانیوں کو یہ نہیں سکھایا کہ انگریزوں کو نہ ماریں؟ اور لوگوں نے اُن کا کہنا مانا۔ اس لیے اگر اب وہ ہندو مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ وہ ایک دوسرے کو نہ ماریں تو وہ یقیناً اُن کا کہنا مانیں گے۔' یہ خیال اُس کے دل میں اتنی تیزی سے اُٹھا اور اس کا دل جوش کے مارے اتنے زوروں سے دھڑکنے لگا کہ وہ چپکے سے بیٹھک میں سے کھسک گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کے ابّا کو اُس کے اس ارادے کا پتہ نہ چل جائے اور اُسے روک نہ لیں۔

(7)

مہاتما گاندھی دریا گنج کے پاس ہی کوچہ چیلاں میں مولانا محمد علی کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پتلی چکر دار گلیوں کو پار کرتے وقت انور سوچ رہا تھا کہ یہ تو بہت ہی اچھا شگون ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مولانا اور مہاتما بہت گہرے دوست تھے اور جیل سے چھٹنے کے بعد مولانا کانگریس کے صدر چُنے گئے تھے۔ دو اتنے بڑے بڑے لوگوں کی دوستی کا نتیجہ، جن میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان، اچھا ہی ہو سکتا تھا۔

مولانا محمد علی کے گھر پر ہی اُن کے دو اخباروں کا دفتر بھی تھا۔ ایک اُردو کا 'ہمدرد' اور دوسرا انگریزی کا 'کامریڈ'۔ جس وقت انور نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا، مولانا بیٹھے اپنے اخبار کا اداریہ لکھ رہے تھے۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے کالے لبادے میں اُن کا جسم بہت بڑا لگ رہا تھا۔

'کون ہے؟' مولانا نے نظر اٹھائے بغیر گرج کر پوچھا۔

انور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا تعارف کیا کرائے۔ اُس نے ہکلا ہکلا کر کہا۔ 'میں ہوں.....معاف کیجیے گا.....میں.....میں.....'

مولانا نے لکھنا بند کر دیا اور اپنا خوب صورت داڑھی والا رُعب دار چہرہ اُوپر اُٹھا کر دیکھا کہ کون آیا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ایک اسکول کا لڑکا دروازے پر بوکھلایا ہوا کھڑا ہے تو اُن کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولے: 'صاحبزادے آجاؤ اندر آجاؤ'

انور کی ہمّت بندھی اور وہ بولا: 'میں نے ایک بار آپ کو ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں دیکھا تھا۔ میں وہاں اپنے ابا کے ساتھ گیا ہوا تھا.....لیکن اُس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی گئی۔

'اچھا، تو تمھارے ابا انصاری کے دوست ہیں۔ بیٹھو، بیٹا بیٹھو۔ کہو اس وقت کیسے آنا ہوا؟'

'میں مہاتما گاندھی سے ملنا چاہتا ہوں' انور نے بے جھجک کہہ دیا اور اپنے آنے کا مقصد بتا کر اُسے بڑی تسلی ہوئی۔

'اچھا تو تم اِس کام سے آئے ہو؟ اُوپر چلے جاؤ، بیٹا۔ ویسے گاندھی جی آج کسی سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن نوجوانوں سے مل کر انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔'

'شکریہ مولانا صاحب۔ آداب عرض۔' انور نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا 'جیتے رہو بیٹا'۔

مولانا نے جواب دیا اور انور کمرے سے باہر نکل بھی نہیں پایا تھا کہ مولانا پھر سر جھکا کر لکھنے لگے۔

اوپر پہنچ کر انور نے دیکھا کہ گاندھی جی فرش پر پالتی مارے بیٹھے چرخا کات رہے تھے۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے، اِس لیے تھوڑی دیر تک تو انھیں انور کے آنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور انور کو بہت قریب سے اِس چھوٹی سی عظیم شخصیت کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گول گنبد کی طرح گھٹا ہوا سر، لمبی نوکیلی ناک اور باہر کو نکلے ہوئے دو بڑے بڑے کان۔ گول گول شیشوں والی عینک کے پیچھے سے دونوں آنکھیں چرخے پر جمی تھی۔ اُن کا جسم ایک لڑکے سے بھی چھوٹا اور دُبلا پتلا تھا اور زندگی میں پہلی بار انور کو اپنے چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کے بارے میں کچھ تسلی ہوئی۔

چرخے کی ریں ریں کے علاوہ کمرے میں بالکل سناٹا تھا۔ انور ڈرتے ڈرتے کھانسا اور چرخا چلنا فوراً بند ہو گیا۔ دو اُداس آنکھیں اُوپر اُٹھیں اور انور کو دیکھنے لگیں۔ یکا یک اُس چہرے پر سے اُداسی دُور ہوگئی اور بوڑھے نے مسکرا کر دیکھا، بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لان پر اُس نے انور کی طرف دیکھا تھا۔

'بیٹھو، بیٹھو۔' مہاتما گاندھی نے انور سے بیٹھنے کو کہا۔ انور کے کان دلّی کی منجھی ہوئی زبان سننے کے عادی تھے، اُسے گاندھی جی کی ہندوستانی میں گجراتی کی صاف جھلک سنائی دی۔ لیکن اُن کی آواز میں بے حد نرمی تھی۔ انور اب بالکل گھبرا نہیں رہا تھا، وہ جوتے اُتار کر فرش پر بیٹھ گیا۔ چرخا پھر چلنے لگا کیونکہ مہاتما گاندھی چرخا چلاتے چلاتے باتیں کرنے کے کافی عادی معلوم ہوتے تھے۔

انور کا کھدّر کا پاجامہ اور شیروانی دیکھ کر گاندھی جی بہت خوش ہوئے اور انھوں نے یہ بتانا شروع کیا کہ ہاتھ کے کتے ہوئے سوت سے ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا پہننے میں کتنے فائدے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔ لیکن انور تو فسادات کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات شروع کرے۔ کھادی کی اہمیت کے بارے میں گاندھی جی کی باتیں سنتے سنتے اُس کے خیالات بھٹکنے لگے۔ وہ اُن تمام بھیانک باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے فسادات کے بارے میں سنی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کو قتل کرنا، ایک دوسرے کے گھروں میں آگ لگانا، اور مندروں اور

مسجدوں کی بے حُرمتی کرنا اور گاندھی جی کی دھیمی آواز اور چرخے کی ریں ریں کو روندتی ہوئی اُسے وہ بھیانک آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ 'مارو! مارو!!' اور 'مار ڈالا! مار ڈالا!' وہ اپنے دل کا درد گاندھی جی کو کیسے بتائے؟ وہ انھیں کس طرح بتائے کہ اُس کے ابا مسلمان ہیں اور اُن کی وہ بے حد عزّت کرتا ہے اور اُس کے ایک ہندو کاکا ہیں جنھیں چاچا کی طرح پیار کرنا اور چاچا کی طرح ان کی عزّت کرنا اُسے ہمیشہ سے سکھایا گیا تھا۔ لیکن اب وہ دونوں ویسے گہرے دوست نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ وہ اب تک اپنی زندگی میں رہے تھے؟ وہ انھیں کس طرح بتائے کہ گوپال اپنی تمام خرابیوں کے باوجود اُس کا اچھا دوست تھا اور وہ اُس کی دوستی کھونا نہیں چاہتا تھا؟ وہ اُنھیں رتن کے بارے میں بتانے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ انھیں بتانا چاہتا تھا کہ رتن کی دوستی نے اُس کی زندگی کے رُخ کو کس طرح موڑ دیا تھا۔ لیکن اب اِن ساری دوستیوں میں فرقہ پرستانہ مُنافرت کا زہر گھل گیا تھا۔ کاش وہ ساری باتیں مہاتما گاندھی کو سمجھا سکتا! کاش وہ ایسا کر پاتا!...... لیکن اُسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کا گلا رُندھ گیا تھا اور وہ بہت لاچار اور دُکھی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

چرخا چلنا بند ہو گیا اور گاندھی جی ایک لفظ بھی کہے بغیر انور کے پاس آئے اور اُس کی تُرکی ٹوپی اُتار کر بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُن کے چھونے میں اتنا پیار تھا کہ انور اور بھی لاچار محسوس کرنے لگا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ 'مہاتما گاندھی۔' اُس نے اپنی سسکیوں کے بیچ کہنا شروع کیا۔ 'اِن ہندو مسلم فسادات کے بارے میں کچھ کیجیے! خدا کے لیے کچھ کیجیے! آپ ہی ہم سب لوگوں کو بچا سکتے ہیں۔'

اپنے آنے کا مقصد اِس طرح بتا کر اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور آنسو پونچھ کر جب اُس نے نظر اُوپر اٹھائی تو مہاتما جی کے چہرے پر ایک نیا ہی جذبہ تھا۔ اب انور کی سمجھ میں آ گیا کہ لوگ انھیں مہاتما کیوں کہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر اتنا درد، اتنی مہربانی اور اتنا رحم تھا کہ جیسے ہر انسان کا دُکھ درد وہ خود محسوس کر رہے ہوں لیکن ساتھ ہی اُن کے چہرے پر بے حد سکون اور سنجیدگی بھی تھی اور جب انور نے اُن نرمی بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُس کے دل کو سکون ملا۔ اُسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو بنا سمجھائے اُس کی بات سمجھ سکتا تھا۔ اُسے ایک ایسا

آدمی مل گیا تھا۔ جو ایک دُکھی اور روتے ہوئے لڑکے کا مذاق اُڑانے کی بجائے اُس کے جذبات کو سمجھ کر مسکرا کر اُسے دیکھتا تھا۔ انور کے گال ابھی تک آنسوؤں سے تر تھے پر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ کی ایک لکیر دوڑ گئی۔

'ہاں بیٹا' مہاتما جی نے پیار بھرے لہجے میں دور اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا 'میرے دل کو بھی ویسی ہی چوٹ لگی ہے جیسے تمھارے دل کو۔ اگر بھگوان نے مجھے راستہ دکھایا تو میں ضرور کچھ کروں گا۔'

(8)

دوسرے دن صبح حکیم بیدل بیٹھک میں زور زور سے اخبار پڑھ کر سنا رہے تھے۔ انور چپکے سے آ کر ہمیشہ کی طرح ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ گاندھی جی کے بیان پر، جس میں انھوں نے اکیس دن کا برت رکھنے کی بات کہی تھی، ہر آدمی کافی جوش میں تھا۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان اب تک جس اتحاد کے ساتھ کام کرتے آئے تھے اُسے وہ آگے چل کر بھی جاری رکھیں تا کہ آخر میں سارا ملک اِس اتحاد سے پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

'گاندھی جی نے آخر کار حل نکال ہی لیا! اُنہوں نے راستہ ڈھونڈ ہی لیا!' انور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ انھوں نے اتنا بڑا جو قدم اُٹھایا ہے کیا اُس میں انور کی اُن کے ساتھ ملاقات کا بھی کچھ ہاتھ ہے؟ کیا تاریخ کی رفتار کو اُس نے سچ مچ ایک نیا موڑ دیا تھا؟

کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟

دل میں اِس خیال کے آتے ہی اُس کا رُواں رُواں کھِل اُٹھا۔ وہ روز بڑی بے صبری سے اخبار پڑھتا تھا اور یہ دیکھ کر اُس کا حوصلہ بہت بڑھتا تھا کہ گاندھی جی کے اِس قدم پر سارے مُلک میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ فسادات فوراً بند ہو گئے تھے، اتحاد کی تحریک پھر شروع ہو گئی تھی، ہر جگہ جلسوں میں گاندھی جی کی درازیِٔ عمر کی دُعائیں مانگی جا رہی تھیں، تجویزیں پاس کی جا رہی تھیں اور جلسے ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی دلّی میں مختلف فرقوں کے لیڈروں نے اتّحاد کی کانفرنس کی۔ اکبر علی کو بھی کانفرنس میں بُلایا گیا اور انور نے ضد کر کے انھیں اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسے بھی ساتھ لے چلیں گے۔ کیا یہ اُس کی اپنی کانفرنس نہیں تھی۔'

اب لیڈر آ آ کر ڈائس پر بیٹھنے لگے۔ اکبر علی نے ایک ایک کر کے انور کو بتانا شروع کیا کہ ان میں کون کون ہیں۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے جو رُعب دار ہستی بیچ میں بیٹھی ہوئی تھی وہ موتی لال نہرو تھے جو اِس کانفرنس کے صدر تھے۔ کالا چشمہ لگائے ہوئے بنگال کے بڑے نیتا سی۔ آر۔ داس تھے۔ اُدھر سروجنی نائیڈو بیٹھی تھیں جنھیں لوگ 'بلبلِ ہند' بھی کہتے تھے۔ اور وہ پھرتیلا سا نوجوان جو اِدھر اُدھر بہت بھاگ دوڑ کر رہا تھا وہ موتی لال نہرو کے بیٹے جواہر لال تھے۔ انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ڈائس پر سفید بالوں والی ایک انگریز عورت بھی بیٹھی تھی۔ پر اُس کے ابا نے اُسے بتایا کہ وہ مسز بیسنٹ تھیں جو ہندوستان کی دوست تھیں اور سَوراج کی مانگ کو صحیح مانتی تھیں۔

تقریر شروع ہونے کا وقت ہو گیا اور انگریزی کی دُھواں دھار تقریروں کی رَو میں انور بہا چلا جا رہا تھا لیکن مولانا محمد علی اُردو میں بولے اور اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے جن الفاظ میں اتحاد کی اپیل کی انھیں انور کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

'میں بہت مذہبی آدمی ہوں لیکن میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اِن فسادات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے دلوں میں جو تلخی اور کدورت پیدا ہو گئی ہے وہ صرف رواداری اور اہنسا سے دور ہو سکتی ہے۔ ہمیں کتنا بھی اُکسایا جائے پر ہمیں پُر امن رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کا جو یہ خونی سلسلہ چل رہا ہے اُسے ختم کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہو گا ورنہ ہم اپنی آزادی کی منزل سے دُور ہوتے جائیں گے اور ہمارے دُشمنوں کو ہماری اس بیوقوفی پر ہنسنے کا موقع ملے گا کہ ہم ایسے وقت پر آپس میں لڑ رہے ہیں جب کہ ہمیں آزادی کی لڑائی میں اپنا اتحاد قائم رکھنا چاہیے۔'

جب لوگوں نے مولانا کی تقریر پر تالیاں بجائیں تو انور نے مُڑ کر اپنے ابا کی طرف دیکھا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر داڑھی پر گر رہے تھے۔ نہ جانے کیوں یہ دیکھ کر انور کو خوشی ہوئی کیوں کہ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ گاندھی جی کا مشن کامیاب رہا۔ محبت اور انسانیت کے خدا کو پھر اُس کے تخت پر بیٹھا دیا گیا تھا اور لوگوں کے دلوں میں پھر اُس کے لیے جگہ پیدا ہو گئی تھی۔

○

قیدِ غم

(1)

میٹرک کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ دماغ پر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا۔

امتحان تو ختم ہو گیا تھا پر نتیجہ نکلنے میں ابھی کم سے کم دو مہینے کی دیر تھی۔ اتنے دن تک انتظار کرنے اور وقت کاٹنے کا کوئی اچھا طریقہ ڈھونڈ لینے کے علاوہ کام ہی کیا تھا۔ انور کو تو دوسروں سے بھی زیادہ وقت کاٹنا تھا کیوں کہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں تو اکتوبر میں نام لکھے جاتے تھے۔ انور کو تو پوری گرمیاں کاٹنے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈنا تھا۔

انور کی زندگی کی طرح ملک میں بھی ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت تو سیاسی حلقوں میں بھی کوئی خاص ہلچل نہیں تھی۔ بیٹھک میں اب بات چیت بھی زیادہ تر مقامی یا نجی معاملوں کے بارے میں ہوتی تھی۔ چینی کے برتنوں کی دُکان زوروں پر چل رہی تھی۔ زیادہ تر مال جاپان سے آتا تھا۔ جاپان نے بے حد کم داموں پر چینی اور کانچ کی چیزیں تیار کرنے کا کوئی گُر حاصل کر لیا تھا۔ کاکا رامیشور دیال نے کپڑے کی بہت بڑی دُکان کھول لی تھی اور چونکہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک لگ بھگ بالکل ٹھپ ہو گئی تھی اور کھدر کے کپڑے سے شوقین اور خوش حال لوگوں کا کام نہیں چلتا تھا اِس لیے وہ زیادہ تر بدیسی کپڑا ہی بیچتے تھے۔ ساٹن، مخمل، ریشم، ململ اور وائل۔

انور اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں بتاتا تھا۔ وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اپنے ابّا کی لائبریری سے اُردو کی نثر اور نظم کی لافانی کتابیں، جاسوسی ناول، انگریزی میں لڑکوں کے لیے بہادری کے قصّے اور شیکسپیئر کی کہانیاں۔ روز شام کو وہ جامع مسجد کے پاس پُرانی کتابوں کی دُکانوں کے چکّر لگاتا تھا اور گھنٹے بھر تک پُرانی کتابوں کے دھول سے اٹے ڈھیر میں ڈھونڈنے کے بعد اگر وہ دو تین آنے میں کوئی اچھی سی کتاب پا جاتا تو اُسے ایسی خوشی ہوتی جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

لیکن کوئی صرف کتابوں کے سہارے کتنا وقت کاٹ سکتا ہے۔ اِس لیے کبھی کبھی گرمیوں کے پہاڑ جیسے دن کاٹنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا تھا۔ انور کے دوست بہت تھوڑے سے ہی تھے اور اُن کے گھر جانے میں بھی اُسے جھجک ہوتی تھی۔ اِس لیے ایک دن جب گوپال اُس کے یہاں آیا اور بہت دیر تک اپنے خاص ڈھنگ سے باتیں کرنے کے بعد جب اُس نے انور کو اُس کے اور اُس کے پتا جی کے ساتھ چل کر رائے سینا میں جسے وہاں کے لوگ نئی دلّی کہنے لگے تھے۔ وائسرائے کی کوٹھی اور دُوسری عمارتیں دیکھنے کی دعوت دی تو انور بہت خوش ہوا۔

دوسرے دن بہت ہی سویرے ٹھیکے دار صاحب کی کھٹارہ فورڈ گاڑی آ پہنچی اور ہارن کی آواز سنتے ہی انور خوشی سے بے چین ہو کر بھاگا بھاگا باہر پہنچا۔ گوپال کے پتا جی لال کشن لال بہت ہی موٹے آدمی تھے اور اُن کی آواز بھی اتنی ہی موٹی تھی۔ اُن کے ٹھوڑی کے نیچے موٹاپے کی وجہ سے کھال لٹک آئی تھی اور جب وہ بولتے تھے تو سونے کا ایک دانت چمک اٹھتا تھا۔ انھیں اپنے مذاقیہ ہونے پر بڑا ناز تھا اور راستے بھر وہ اپنے چٹکلوں اور مزیدار کہانیوں سے دونوں لڑکوں کو ہنساتے رہے۔ اپنی بات چیت کے دوران وہ بار بار 'سالا' اور 'سسُرا' اور اُس سے بھی زیادہ موٹی موٹی گالیاں استعمال کرتے تھے۔ انور کو اُن کے مُنہ سے گالیاں سُن کر بُرا بھی لگتا تھا اور مزا بھی آتا تھا اور وہ دل ہی دل میں رامیشور کاکا کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا جو بہت شرافت اور نرمی سے بولتے تھے۔

پندرہ منٹ بھی نہ لگے ہوں کہ موٹر لال اینٹوں کی نئی پکّی نامکمل عمارتوں کے سامنے سے گذر رہی تھی اور کشن لال نے بڑے فخر کے ساتھ اُن ادھورے بنگلوں کی طرف اشارہ کیا جو اُن

کی ملکیت تھے۔ بیچ بیچ میں موٹر کسی بنتے ہوئے مکان کے سامنے رکتی تھی اور موٹو ٹھیکیدار صاحب اُتر کر اپنے مستریوں کو ہدایتیں دیتے تھے اور اس طرح اپنا رُعب جتاتے تھے۔ اُس کے بعد وہ دوسری زیادہ رُعب دار عمارتوں کے سامنے سے گذرے۔ ابھی کچھ سال پہلے یہاں دُور دُور تک بنجر ریگستان تھا اور اب وہیں پرانے بھولے بسرے شہروں کے کھنڈروں کے بیچ ایک بالکل نئی راجدھانی بن کر تیار ہو رہی تھی۔ نئی اور پرانی عمارتیں، نامکمل اور ٹوٹی ہوئی عمارتیں ایک دوسرے کے پاس کھڑی تھیں اور اکثر تو یہ بتانا بھی مشکل ہو جاتا تھا کہ ان میں سے کس کا تعلق ماضی کے ساتھ ہے اور کس کا مستقبل کے ساتھ۔

ایک بڑی سی گول عمارت کے سامنے پہنچ کر موٹر رُک گئی اور لالہ کشن نے لڑکوں کو بتایا کہ وہ اسمبلی چیمبر کی عمارت تھی جہاں آگے چل کر ہندوستان کے مستقبل کے قانون داں بیٹھیں گے۔ لالہ کشن لال پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کو تھوڑا بہت عمارتی سامان سپلائی کرتے تھے اس لیے وہ ہر عمارت میں آزادی سے آ جا سکتے تھے۔ وہ دونوں لڑکوں کو لے کر اُس عمارت کے اندر گئے۔ وہاں گیلی مٹی، چونا اور سیمنٹ کی بُو بسی ہوئی تھی اور بنا چھت کے بڑے بڑے ہال عجیب بھیانک لگتے تھے۔ برآمدوں اور چھوٹے چھوٹے گلیاروں کی بھول بھلیوں میں اُن کے پیروں کی آہٹ بڑے بھیانک ڈھنگ سے گونج رہی تھی۔ انور کو نہ جانے کیوں ایسا لگا کہ وہ کسی پرانے محل کے کھنڈروں میں گھوم رہے ہیں جس کی چھتیں سینکڑوں برس پُرانی ہو کر گر گئی تھیں۔ اور پتھر کی دیواروں پر سے پلستر چھوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے وہاں ایک عجیب سی سیلن کی باسی باسی بُو پیدا ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ پھر کھلی جگہ میں نکل آئے تو انور کو ایسا لگا کہ وہ ماضی کے اندھیرے سے نکل کر پھر حال میں آ گئے ہیں۔

اسمبلی چیمبر سے وہ لوگ موٹر میں بیٹھ کر قلعہ جیسی دیواروں سے گھری ہوئی وائسرائے کی کوٹھی دیکھنے گئے۔ لالہ کشن لال کے ایک انجینئر دوست نے اُن لوگوں کے ساتھ جا کر انھیں سمجھایا کہ ہر ہال اور کمرہ کس کام کے لیے بنایا جا رہا تھا۔ انور کے لیے اُن سب کمروں کی فہرست یاد رکھنا بھی مشکل تھا۔ لاٹھ صاحب کا صبح کے وقت بیٹھنے کا کمرہ، اُن کی میم صاحب کا تیسرے پہر آرام کرنے کا کمرہ، لاٹھ صاحب کا بیڈ روم۔ اُن کی میم کا بیڈ روم، اُن دونوں کا پرائیویٹ

ڈائننگ روم، اسٹیٹ ڈائننگ رُوم، بینکویٹ ہال، بال رُوم، بلز رُوم، لکھنے کے کمرے، بڑے کمروں سے لگے ہوئے چھوٹے کمرے، ریسپشن روم، گیسٹ روم اور پھر سکریٹریوں، باڈی گارڈوں، گھریلو نوکروں، خانساماؤں اور ڈرائیوروں کے رہنے کے کمرے، کچن جو خود پورے پورے بنگلوں کے برابر تھے، اس کے علاوہ موٹر خانوں کی ایک قطار جن میں موٹریں رکھی جائیں گی اور تہہ خانے جن میں دنیا کی بہترین شرابوں کا ذخیرہ رہے گا..... انجینئر صاحب بڑے فخر کے ساتھ سمجھا رہے تھے کہ اِس پورے محل کی سجاوٹ کس ڈھنگ کی ہوگی۔ اُنہوں نے بتایا کہ دنیا کی بہترین لکڑی کا بنایا ہوا فرنیچر ولایت سے منگایا گیا تھا۔ گھروں میں اور یہاں تک کہ برآمدوں میں ایرانی قالین بچھائے جائیں گے، دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں ہوں گی کھانے کے کمروں میں بہترین چینی اور کانچ کے برتن ہوں گے۔ بینکویٹ ہال میں بلوری فانوس ہوں گے......

انور اپنے اِس باتونی گائیڈ کی آدھی باتیں بھی نہیں سُن رہا تھا۔ وہ تو اِس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ اِن تمام چیزوں کا فائدہ صرف دو آدمی اٹھائیں گے۔ ایک وائسرائے اور دوسری اُن کی میم صاحب۔ آخر یہ کس قسم کے لوگ ہیں جنھیں رہنے کے لیے سو کمرے چاہییں؟ وہ مغل زمانے کے محل دیکھ چکا۔ اُس زمانے کے بادشاہ اور شہنشاہ بھی اس سے زیادہ سادگی سے رہتے تھے۔ کیا یہ نئے حکمراں جان بوجھ کر پُرانے زمانے کے بادشاہوں سے شان وشوکت میں بڑھ جانا چاہتے تھے؟ لیکن وہ اپنے اِن خیالوں کو اپنے دل میں ہی چھپائے رہا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اِس رُعب دار عمارت کے اندر اُن خیالوں کو ظاہر کرنا نہ صرف بدتمیزی ہوگی بلکہ ایسا خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔

جس وقت وہ باہر نکل کر اُس میدان کی طرف چلے جہاں بہت بڑا باغ لگایا جارہا تھا۔ اُسی وقت کہیں زور سے گھنٹہ بجا اور مزدوروں کے گروہ کے گروہ باہر نکل کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کوئی سایہ دار جگہ ڈھونڈنے لگے۔ وہ لوگ کچھ مزدوروں کے پاس سے ہوکر گزرے اور انھوں نے دیکھا کہ وہ صرف پیاز کے ساتھ رُوکھی روٹی کھا رہے تھے۔ باغ کی کھدی ہوئی زمین کے اُس پار، جہاں پھولوں کی جھاڑیاں نکلنے لگی تھیں، ٹین کی نیچی چھتوں والی جھونپڑیوں کی ایک قطار تھی جس میں یہ مزدور رہتے تھے۔ حالات کا یہ فرق انور کو بُری طرح کھٹکنے لگا اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اِس محل کو بنانے والے یہ مزدور کیا سوچتے ہوں گے لیکن کیا اُن میں سوچنے کی طاقت ہے بھی؟

(2)

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ انور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اچھا خاصہ نتیجہ تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی سولہ کے اور تھے جنھیں فرسٹ ڈویژن ملا تھا اور چالیس لڑکوں کا نتیجہ تو اُس سے بھی اچھا رہا تھا۔ انھوں نے اسّی فیصدی نمبر پا کر امتیاز حاصل کیا تھا۔ اُس کے ابا کا یہی کہنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بہت زیادہ تعریف کرنے سے اُن کے بیٹے کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جائے لیکن بیٹا اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے ابا بہت خوش ہیں اور یہی اُس کے لیے سب سے بڑی بات تھی۔

سیاسی مورچے پر جو فرسودگی آ گئی تھی وہ ایک دوسری تحریک سے ٹوٹ گئی۔ ایک دن چودھری محمد عمر اس بات پر بہت گرم ہوتے ہوئے آئے کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے کی لائنوں پر عام ہڑتال ہو گئی تھی اور پنجاب کی طرف کوئی گاڑیاں نہیں جا رہی تھیں اس لیے وہ اپنے گھر لدھیانے نہیں جا سکتے تھے۔ ریلوے مزدوروں نے اپنی مزدوری اور کام کرنے کے حالات کے بارے میں اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے ہڑتال کر دی تھی اور اس طرح ریلوں کا آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ چودھری صاحب کو اس بات پر بڑا غصّہ تھا کہ دو کوڑی کی اوقات والے لوگ— سگنل مین، سوچ مین اور قلی۔ اِس طرح ہڑتال کر کے گھر جانے کے اُن کے سالانہ پروگرام میں رُکاوٹ ڈالیں۔ 'چونٹیوں کے پر نکلنے لگے ہیں۔' اُنھوں نے بڑی نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا: 'یہ مزدور اپنی اوقات بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ سب اُس گاندھی کی وجہ سے ہے۔ آٹا دال بیچنے والے اُس بنیے کی وجہ سے!'

اِس درمیان رتن کے پاس سے ایک چٹھی آئی جس میں اِس حالت کی بالکل ہی دُوسری تصویر پیش کی گئی تھی۔ وہ سیاسی کارکنوں کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا جو ہڑتال میں ریلوے مزدوروں کی مدد کر رہے تھے۔ اُس نے ہمیشہ کی طرح بہت جوشیلے الفاظ میں انور کو لکھا تھا۔ 'کاش تو یہاں لاہور میں ہوتا اور دیکھتا کہ کل رات ریلوے مزدوروں نے کتنا شاندار جلوس نکالا۔ دس ہزار لوگ انقلابی نعرے لگاتے ہوئے جلوس میں چل رہے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں مزدوروں کا انقلابی لال جھنڈا تھا جسے انھوں نے اپنے ہاتھ سے رنگا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ دیش میں ایک نئی طاقت پیدا ہو رہی ہے۔ مزدور طبقے کی طاقت! اور ایک بار جب اُن میں

جوش پیدا ہوگیا تو وہ گاندھی جی کی بزرگانہ باتوں سے رُکنے والا نہیں۔ اُن کے قدم ایک بار بھی نہیں جھجکیں گے وہ کوئی آگا پیچھا نہیں سوچیں گے۔'

انور فطرتاً ہی بہت ڈرپوک تھا اور جب سے اُس کے ابا سیاست سے الگ ہو گئے تھے تب سے قومی تحریک کی طرف سے اُس کا جوش ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ لیکن اُسے اِس بات پر فخر تھا کہ اُس کا دوست رتن اِس تحریک میں جُٹا ہوا تھا اور اپنے پنجابی دوست کے خط کو پڑھ کر وہ بھی بغاوت کا جذبہ محسوس کرسکتا تھا۔

(3)

پھوپھی امّاں کی عُمر اب ساٹھ کے قریب پہنچ چکی تھی، انھیں وقت اور تاریخ میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی لیکن یکا یک انھیں نہ جانے کیوں کیلنڈر میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ اکثر اپنے بھتیجے سے پوچھتی رہتی تھیں کہ انگریزی مہینے کی کون سی تاریخ ہے؟ ایک دن انور سے نہ رہا گیا، اُس نے پوچھا 'لیکن پھوپھی امّاں آپ کو پہلے تو کبھی تاریخ اور مہینے کی اتنی فکر نہیں رہتی تھی۔' اُس کی بوڑھی پھوپھی امّاں نے جواب دیا۔ 'یہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن تجھے نہیں معلوم کہ یہ جُون کا مہینہ ہے، اگلے مہینے تو ماما بن جائے گا۔' انور کو اِس بات کا مطلب سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔

انور اور انجم کو پھوپھی اماں نے ہی پالا پوسا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ بچّہ دلّی میں اُن کی دیکھ بھال میں پیدا ہو۔ ہر مہینے وہ انور سے اپنے بھائی کے نام خط لکھواتی تھی کہ بچّہ پیدا ہونے کے وقت انجم کو دلّی بھیجنا نہ بھولیں۔ جون کے آخر میں انجم کئی نوکر نوکرانیوں کے ساتھ دلّی آ پہنچی۔ انور کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رؤف اُس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ سال بھر بعد وہ اپنی بہن سے مل کر بے حد خوش ہوا لیکن اُس کا پیلا چہرہ اور آنکھوں کے گرد سیاہی کے گھیرے دیکھ کر اُسے کچھ فکر ہوئی۔ وہ پہلے سے بہت دُبلی ہوگئی تھی اور پیٹ کے بوجھ سے اُس کے پیر لڑکھڑا جاتے تھے۔

'ارے میں تجھ پر قُربان جاؤں' گلابو بُوا نے انجم کو گلے سے لگانے کے لیے لپکتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ 'میری بٹیا کتنی دُبلی ہوگئی ہے، بٹیا سسرال میں کیا پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا؟'

اکبر علی نے اندر آکر بیٹی کو گلے لگایا اور اُس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا کہ رؤف کیوں نہیں آیا۔ انجم نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر جواب دیا، 'انھیں کوئی سرکاری کام تھا۔ اِس لیے نہیں

آئے لیکن وہ کچھ دن بعد آئیں گے۔'

جب سب لوگ چلے گئے تو انجم نے انور کو اکیلے میں اپنے پاس بُلایا اور بڑے پیار سے اُسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ اِس طرح نہیں رو رہی تھی جیسے کوئی بہن بہت دن بعد اپنے بھائی سے ملنے پر روتی ہے، وہ تو سِسک سِسک کر رو رہی تھی اور آنسوؤں کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کی وجہ سے اُس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی انور اُسے خاموش نہ کر سکا۔ وہ مضبوطی سے اُس سے چمٹی رہی، اُس نے اپنے ناخن مضبوطی سے اُس کی بانہوں میں گڑا رکھے تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ چُپ ہوگئی اور اُس نے اپنے بھائی کی بانہہ چھوڑ دی۔ اس سے پہلے کہ انور سمجھ پاتا کہ انجم کو کیا ہوا ہے، وہ بے ہوش ہو کر اُس کی گود میں گر پڑی۔

'پھوپھی امّاں! ابّا! گلابو!' انور گھبرا کر چلّایا 'دیکھو تو باجی انجم کو کیا ہو گیا ہے!'

(4)

اس کے بعد کچھ دن ایسے بیتے کہ انور کو ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو، انور کے سارے شعور میں ایک بھیانک تناؤ رہا۔ وہ نہ ٹھیک سے کھاتا تھا، نہ اُسے ٹھیک سے نیند آتی تھی اور نہ ہی وہ کچھ پڑھ سکتا تھا۔ اُس سے نہ اپنی بہن کے پلنگ کے پاس بیٹھا جاتا تھا اور نہ وہاں سے دُور ہونے پر بھی اُسے چین ملتا تھا، اگر انجم زور سے کراہتی تو وہ ڈر سے کانپ اُٹھتا اور اگر وہ نڈھال ہو کر چُپ چاپ پڑی رہتی تو وہ بالکل ہی گھبرا جاتا اور سوچنے لگتا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گئی۔

ڈاکٹر انصاری اور انگریز ڈاکٹرنی کو اُسے دیکھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ دونوں لگ بھگ گھنٹے بھر تک اُسے دیکھتے رہے۔ بعد میں جب دونوں ہاتھ دھو رہے تھے تو انور نے انھیں انجم کی بیماری کے بارے میں باتیں کرتے سُنا۔ ساری باتیں تو اُس کی سمجھ میں نہیں آئیں کیوں کہ درمیان میں وہ ڈاکٹری کے بہت سے موٹے موٹے لفظ بول رہے تھے اور انگریز ڈاکٹرنی کا بولنے کا ڈھنگ بھی کچھ عجیب تھا لیکن جو تھوڑا بہت اُس کی سمجھ میں آیا وہی کافی تھا۔

''ہیمبرج ہو گیا ہے...... یہی تو مشکل ہو گئی ہے...... خُون رُک جائے تو کمال ہے۔'

'بے چاری لڑکی..... کتنی کمسن اور پیاری ہے..... میں اُس کے باپ کو جانتا ہوں، بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔'

'بہت کم عمر میں شادی کر دی گئی..... اتنی چھوٹی عمر میں بچّہ ہونا ہی نہیں چاہیے تھا..... یہ تو جان بوجھ کر مار ڈالنا ہے۔'

'جہالت ہے، بلا کی جہالت ہے، نہ جانے کتنی عورتوں کی جان اِس میں جاتی ہے۔'

'بچّہ نکالنا ہوگا ہمیں..... آپریشن کرنا ہوگا۔ نہیں تو۔ ہو جانے کا ڈر ہے۔'

بعد میں انور نے ڈاکٹر انصاری کو اپنے ابّا سے یہ کہتے سنا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ اسپتال لے جانا ناممکن ہے، گھر پر ہی آپریشن کرنا پڑے گا۔

دوسرے دن ڈاکٹر انصاری اور وہ انگریز ڈاکٹرنی اپنے کمپونڈروں اور ایک سفید پوش نرس کو لے کر آئے۔ وہ اپنے ساتھ لوہے کے کچھ چمکدار بکس بھی لائے تھے، جن میں چیر پھاڑ کے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ انور اُن اوزاروں کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا اور یہ سوچ کر ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اُس کی بہن کا پیٹ چیرا جائے گا۔ وہ بھاگ کر ایک کونے میں چھپ گیا۔

انجم کے پیٹ کا آپریشن کر کے اُس میں سے مرا ہوا بچّہ نکالا گیا۔ انور نے گلابو کو جس کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئی تھیں، کپڑے کی پوٹلی میں گُویا جیسی کوئی چیز لپیٹ کر لے جاتے ہوئے دیکھا۔ گلابو نے چُپ چاپ وہ پوٹلی اکبر علی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے اکبر علی چُپ چاپ مرے ہوئے بچّے کو دفن کرنے کے لیے پوٹلی لے کر باہر چلے گئے۔

جب ڈاکٹر انصاری اور وہ انگریز ڈاکٹرنی لمبے لمبے ربر کے دستانے اُتارتے ہوئے کمرے سے نکلے تو دونوں بہت تھکے ہوئے تھے اور اُن کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

انور نے دھڑکتے ہوئے دل سے ڈاکٹر انصاری سے جا کر پوچھا، 'ڈاکٹر صاحب باجی اچھی ہو جائیں گی نا؟'

ڈاکٹر صاحب نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے انور کی پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ 'ہاں بیٹا ضرور اچھی ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ!'

انشاء اللہ! اگر اللہ نے چاہا۔ تو اِس کا مطلب ہے کہ آخری فیصلہ اُس کی عدالت میں ہوگا۔

اِسی لیے اُس کے ابا اتنی دیر تک جانماز پر بیٹھے اللہ سے اپنی بیٹی کی جان کے لیے دُعا مانگتے رہتے تھے۔ اِسی لیے پھوپھی اماں اُس وقت بھی تسبیح پر اللہ کے ہزار نام لے کر دُعا پڑھ رہی تھیں یا قہار! یا جبّار! یا غفار! اللہ رحیم ہے، وہ انجم جیسی معصوم لڑکی کی جان کبھی نہیں لے گا۔ بہر حال انور کے لیے بھی سب سے اچھا راستہ یہی تھا کہ وہ اپنے ابا اور پھوپھی کے ساتھ مل کر دُعا مانگے۔ اُسے یہی تو بتایا گیا تھا کہ اللہ بچّوں کی دُعا زیادہ جلدی قبول کر لیتا ہے کیوں کہ بچّے معصوم ہوتے ہیں۔ اِس لیے اُس نے سوچا کہ اُس کی دُعا فوراً قبول ہو جائے گی۔

وہ گھر سے نکل کر سیدھے جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔ اگر اُسے دُعا ہی مانگنی ہے تو وہ خدا کے گھر میں جا کر دُعا مانگے گا۔ جون کی دوپہر میں ہانپتا کانپتا وہ دو دو زینے پھاند کر جامع مسجد کی سیڑھیوں کو پار کر گیا۔ دروازے پر جوتے اُتار کر وہ سیدھا بھاگتا ہوا منبر پر جا پہنچا جہاں کھڑے ہو کر اُس نے امام صاحب کو وعظ کرتے دیکھا تھا۔ قاعدے کے مطابق مغرب کی طرف مُنہ کر کے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور دبی زبان میں بولا، 'یا خدا، مجھے دُعا مانگنا نہیں آتا ہے، لیکن تو تو سب کے دل کی بات جانتا ہے، تو میری دُعا قبول کر لے اور میری بہن کی جان بچا لے، وہ ابھی کم عمر کی ہے اور ابھی اُس کی شادی ہوئی ہے اور اُس نے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، رحم کر، اُسے موت سے بچا لے۔' مسجد کے کھوکھلے گنبد سے ٹکرا کر اُس کی آواز لوٹ آئی اور انور کو ایسا لگا کہ اللہ میاں نے اُس کی بات سن لی ہے اور اُس کی مراد پوری کرنے کا وعدہ کر رہا ہے وہ گھر لوٹا۔ اُس کے دل کا بوجھ یکا یک نہ جانے کیوں ہلکا ہو گیا تھا۔ اُس نے جھانک کر مریضہ کے کمرے میں دیکھا اور اُسے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ نرس انجم کو دوا پلا رہی تھی۔ اُس رات کئی دن بعد اُس نے ٹھیک سے کھانا کھایا اور اطمینان کے ساتھ سویا۔ اُس کے دل میں کوئی کھٹکا نہیں تھا۔

(5)

ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ انور رونے کی آواز سن کر جاگ پڑا۔ کچھ دیر تک تو وہ سوچتا رہا کہ شاید وہ سپنا دیکھ رہا ہے لیکن جب اُس نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا تو اُوپر تاروں بھرا آسمان اور اُس کے پس منظر میں پاس ہی آنگن میں لگے ہوئے نیم کے پیڑ کا خاکہ دکھائی دیا پھر

اُسے پھوپھی امّاں کے رونے کی آواز سنائی دی اور اُن کے خوفناک الفاظ سُن کر اُس کی نیند بالکل غائب ہوگئی۔ پھوپھی اماں رو رو کر کہہ رہی تھیں 'ارے انجم تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی؟ تیری جگہ میں کیوں نہ مرگئی؟' انور بھاگا ہوا دالان میں پہنچا جہاں انجم کا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی میز پر ایک لیمپ رکھا ہوا تھا جس کی روشنی کا گھیرا اُس سفید چادر پر پڑ رہا تھا جس سے انجم کا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ 'انجم سو رہی ہوگی' انور نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ 'پھوپھی اماں کو شاید دورہ پڑ گیا ہے۔' لیکن اُس بوڑھی نرس کے چہرے پر ایسے جذبات تھے جنھیں دیکھ کر اُمید کی آخری کرن بھی بجھ جاتی تھی۔ 'بیٹا' اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ 'اپنی بہن کو آخری بار دیکھ لے۔' اور پھر انور کے دل کی دھڑکن جیسے یکا یک رُک گئی۔ چادر کا کونا دھیرے دھیرے ہٹا تو اُس کی پیاری بہن کا چہرہ اُس کے سامنے آگیا، کتنا سکون تھا اُس کے چہرے پر، بالکل ایسا لگتا تھا جیسے سو رہی ہو! انور اور قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا لیکن یکا یک ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ دہشت کے مارے وہ دم بہ خود کھڑا رہا۔ نہیں! نہیں! یہ اُس کی بہن نہیں تھی، یہ اُس کی بہن نہیں ہوسکتی۔ یہ کوئی اور چیز تھی، ایسی چیز جو نہ ہلتی جلتی ہے، نہ سانس لیتی ہے، جو زندہ نہیں ہے، یہ ایک جھوٹ تھا، ایک فریب تھا، زندگی کا چھلاوہ تھا، یہ موت تھی!

انور چاہتا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی وہ نہ رو سکا۔ اُداس ہو کر چُپ چاپ پیچھے مڑا اور پہلی بار اُس نے وہاں منہ لٹکائے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اُس کے ابّا اِس مصیبت کے وقت بھی خشوع وخضوع کے ساتھ بیٹھے دُعا پڑھ رہے تھے۔ اُن کے پاس ہی پھوپھی امّاں تھیں جو روتے روتے نڈھال ہوگئی تھیں۔ پھر تایا امجد علی بیٹھے تھے جو شاید رات کی گاڑی سے آئے ہوں گے اور اُن کی بغل میں سر جھکائے رؤف بیٹھا تھا۔ رؤف! رؤف! ڈاکٹر کی بات چیت کے کچھ الفاظ انور کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئے اور اُس پر ایک عجیب جنون چھا گیا۔

'تم! تُم!' اُس نے رؤف کو مخاطب کر کے چلّا کر کہا، 'تم نے میری بہن کو مار ڈالا!' اور اتنا کہہ کر وہ گھر سے اِس طرح بھاگا جیسے کسی بھوت سے یا کسی ناپاک چیز سے بھاگ رہا ہو۔

سڑک پر بالکل سناٹا تھا۔ درمیان میں کہیں کوئی دُودھ کی بالٹی لیے ہوئے جاتا دکھائی پڑ

جاتا تھا۔ انور دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھا بڑھتا جا رہا تھا۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ اپنے تن بدن کی سدھ بدھ بھلا کر وہ کہاں جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا، یہ تو خود اُسے بھی نہیں معلوم تھا۔ اُس کے دل میں بے حد تلخی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تلخی کس کے خلاف تھی۔ وہ ایک بہت بڑی طاقت کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ طاقت کیا ہے؟

جامع مسجد کا پھاٹک صبح کی نماز کے لیے ابھی کھلا تھا۔ انور اندر چلا گیا۔ جلدی جلدی اتنی اُونچی سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔ پانی کے حوض کے پاس پہنچ کر وہ رُک گیا۔ مسجد کے پاکیزہ سفید گنبدوں اور اُونچی اُونچی میناروں کی پرچھائیاں حوض کے گہرے پانی میں پڑ رہی تھیں اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بار بار کانپ جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ساری عمارت جیسے زلزلے کی وجہ سے لرز رہی تھی۔ مسجد کی پرچھائیں کی طرح ہی انور کا دماغ بھی جیسے گہرے اندھیرے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اُس میں بھنور اُٹھ رہے تھے۔

مینار پر سے مؤذن نے اذان دی اور اُس کی تیز آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی گونج اُٹھی۔ انور کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دُعا مانگوں! دُعا مانگوں! وہ جھنجھلا کر سوچنے لگا۔ لیکن کس سے دُعا مانگوں؟ اور کس لیے دُعا مانگوں اور کیوں دُعا مانگوں؟ اُس نے دُعا مانگی تھی لیکن پھر بھی اس کی بہن مر گئی۔ خدا نے بھی اُسے نہیں بچایا! اُس کے دل میں اِن تلخ خیالات کا طوفان اُٹھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ یہ اُس کا اعتقاد تھا، یہ اُس کا ایمان تھا۔

آخر کار وہ رو پڑا، اور اُس کے دل میں جتنا غم تھا وہ آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔ وہ مسجد کے لمبے چوڑے ویران صحن میں اُونچی اُونچی میناروں کے سائے تلے ایک چھوٹے سے بونے کی طرح کھڑا تھا۔ وہ اکیلا اور لاچار محسوس کر رہا تھا اور اُسے اُس بڑی طاقت سے ڈر لگ رہا تھا جسے اُس نے ابھی بُرا بھلا کہا تھا اور جس کے خلاف اُس نے بغاوت کی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر وہ تھکے ہوئے بے جان قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ کیا ایمان اور اعتقاد کے بغیر کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟

مشرق کی طرف والے پھاٹک سے باہر نکل کر سیڑھیاں اُترنے سے پہلے کچھ دیر تک وہ

اُوپر کھڑا رہا۔ اُس کے سامنے اُفق پر صبح کی لالی کا سنہرا اور گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ نیچے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ سفید ساڑیاں پہنے عورتوں کی ٹولیاں دریائے جمنا کی طرف جا رہی تھیں۔ سڑکوں پر ایک ٹرام کھڑکھڑاتی ہوئی گذر گئی۔ اچانک ایک سنسنی سی اُس کے بدن میں دوڑ گئی اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی بہن کی موت کے ساتھ زندگی ختم ہوگئی ہے اور یہ محسوس کر کے اُسے بڑی تسلّی ہوئی کہ زندگی اب بھی بدستور چل رہی تھی۔ اب بھی صبح کو سورج نکلتا تھا اور لوگ اپنے اپنے کام پر جاتے تھے۔ زندگی کے درمیان موت تھی اور موت کے درمیان زندگی۔

اب اُسے غالب کے اُس شعر کا مطلب سمجھ میں آیا جسے وہ اب تک لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

چٹان سے ٹکرا کر لوٹتی ہوئی آواز کی طرح اُس کے خیالات پھر اُس کے پاس واپس آ گئے۔ انسان پیدا ہوتا ہے اور انسان مر جاتا ہے اور اِس زندگی اور موت کے درمیان وہ تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کے کھلتے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا۔ چلتے پھرتے مرد اور عورتیں، اسکول جاتے ہوئے بچے، مسافروں سے بھری کھڑکھڑاتی ٹرام، صبح کی خبریں چلاّ چلاّ کر اخبار بیچنے والا...... انجانے ہی اُس پل میں انور کے دل میں ایک نیا اعتقاد پیدا ہوا۔ زندگی میں اعتقاد ــــ نجانے ہی انور اُس پل جوان ہو گیا......

○

کتاب تیسری

بادل کی گرج بجلی کی کڑک

ہلال اور تاج

(1)

جس دُور اندیش بزرگ نے اپنی برادری کے دقیانوسی لوگوں کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بُنیاد ڈالی تھی، اُس نے اُس کے لیے نشانی بھی بہت سوچ سمجھ کر چُنی تھی۔ اِس نشانی کے بیچ میں ایک کھجور کا درخت تھا جس کے ذریعے طالب علموں کو یہ یاد دلایا جاتا تھا کہ اُن کے دین کی جڑیں عربستان سے متعلق ہیں۔ اِس پیڑ کے ایک طرف ایک ہلال بنا ہوا تھا اور دوسری طرف تاج۔ بائیں طرف بنا ہوا ہلال اسلام کا روایتی نشان تھا اور دائیں طرف بنا ہوا تاج انگریز حکومت کی وفاداری کا مظہر تھا۔ اِس طرح ملک کے نئے حکمران اپنے ساتھ جو مغربی سائنس لائے تھے اُس کے ساتھ ایک تیرہ سو برس پرانی روایت کو جوڑنے کی تجویز بنائی گئی تھی۔ اِس طرح ہندوستان کے مسلمانوں میں جو اپنی حکومت ختم ہو جانے کے بعد گہری مایوسی میں ڈوبے ہوئے سب سے الگ ہوتے جا رہے تھے، اُن کو دوبارہ اُبھارنے کی تجویز بنائی گئی تاکہ وہ ملک کی حکومت میں اپنا حصّہ مانگ سکیں۔

یہ کالج، جو اب بڑھ کر ایک یونی ورسٹی بن گیا تھا، شروع شروع میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔ ایک سوکھے ریتیلے میدان میں بڑے بڑے ہال، چوک، پڑھائی کے کمرے اور لیباریٹیریز بنوائی گئی تھیں۔ اُس بنجر زمین پر بڑی محنت سے گھاس اُگائی گئی تھی تاکہ

داڑھی والے بزرگ شیخوں، سیدوں اور مرزاؤں کے بیٹے کرکٹ، ہاکی، ٹینس اور فٹ بال کھیل سکیں۔ کرکٹ کا میدان اُونچے گنبد والی مسجد کے ٹھیک نیچے تھا اور اکثر شام کو لارڈ کے میدان کے کرکٹ کے کھلاڑیوں کے انداز میں 'ہاؤز دیٹ امپائر؟' چلاّنے کی مشق کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں کی آواز پر مسجد میں اذان دینے والے مولوی صاحب کی آواز چھا جاتی تھی۔ ہلال اور تاج کو اپنا نصب العین ماننے والے تعلیم کے اِس مرکز کی کئی انوکھی اور اجتماع بالضدین باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی!

(2)

انور کو علی گڑھ آئے ہوئے یہ تیسرا سال تھا۔ پھر بھی وہ ابھی تک کچھ اُکھڑا اُکھڑا رہتا۔ یہاں پہنچنے پر اُس کی جو بُری حالت بنائی گئی تھی اُسے یاد کر کے اب بھی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُسے ستایا گیا تھا، اُسے گالیاں دی گئی تھیں اور درجنوں دوسرے طریقوں سے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ یہاں کے پرانے لڑکوں نے اُسے بتایا تھا کہ علی گڑھ میں نئے آنے والے لڑکوں کا اسی طرح استقبال کیا جاتا تھا لیکن انور اتنا جذباتی تھا اور اُس کی پرورش اتنے نازونعم سے ہوئی تھی کہ وہ ایسے پھوہڑ اور بھونڈے مذاق کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اِن مستی کرنے والوں کے آگے ہتھیار تو ڈال دیئے تھے، پر وہ اُس سے خوش نہیں تھا۔ وہ ہر وقت رُوٹھا رُوٹھا سا رہتا تھا اور کبھی کبھی جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تھا تو اپنی لاچاری پر آنسو بھی بہاتا تھا۔ اُسے وہاں کے ماحول میں گھل مل جانے میں دوسروں سے زیادہ وقت لگ گیا۔ کیونکہ وہ جتنا زیادہ چڑتا تھا؛ پُرانے لڑکوں کو اُس کا مذاق اُڑانے میں اُتنا ہی مزا آتا تھا۔ تیسرے سال میں بھی لوگ اُسے اکثر 'انور نواب' یا 'لاڈلا انور' کہتے تھے۔ اِس طرح کی جتنی ہی باتیں اُس کے خلاف کی جاتی تھیں اُتنا ہی زیادہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔

دو برس میں انور صرف ایک لڑکے کو اپنا دوست بنا پایا تھا۔ عثمان فضل بھائی اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا، پر عمر میں اس سے ایک سال بڑا تھا۔ اُس نے بھی انور کی طرح ہی اکنامکس اور پولٹیکل سائنس کے مضامین لے رکھے تھے۔ اُس کے باپ بمبئی میں صابن اور خوشبوؤں کا بیوپار

کرتے تھے۔ اُس میں اور انور میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں ہی کوئی کھیل نہیں کھیلتے تھے۔ لیکن عثمان کی پرورش ایک بہت بڑے شہر میں ہونے کی وجہ سے اُس میں انور سے زیادہ خود اعتمادی تھی اور اپنے رہن سہن کے معاملے میں وہ شوقین بھی زیادہ تھا۔ کھیل کود کی طرف اُس کا رویہ نفرت کا تھا اور اس کی طرف سے وہ اس طرح بے پرواہ رہتا تھا جیسے وہ کوئی بہت ہی گھٹیا چیز ہو۔ اُسے صرف ادب اور سیاست میں دلچسپی تھی، باقی ہر چیز کو وہ وقت کی بربادی سمجھتا تھا۔ پیسے والا ہونے کی وجہ سے وہ نئی سے نئی کتابیں خرید سکتا تھا اور خوشی خوشی انور کو بھی کتابیں پڑھنے کو دیتا تھا۔ وہ ڈاک سے اپنا پسندیدہ اخبار 'بمبئی کرانیکل' منگاتا تھا اور اُسی اخبار سے دونوں لڑکے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔

انور کو ہمیشہ سے اپنے قوم پرست ہونے پر ناز تھا لیکن عثمان کے ساتھ اُس کی دوستی نے ہی اُس کے سیاسی نظریے کو ایک مکمل صورت دی۔ شام کو جب دوسرے لڑکے کرکٹ یا ٹینس کھیلتے ہوتے اُس وقت یہ دونوں ریل کی پٹری کے اُس پار مٹر اور ارہر کے کھیتوں میں سیر کرتے رہتے...... کلاس میں جو کچھ انھیں پڑھایا جاتا تھا اُسے وہ ہندوستان کے سیاسی حالات پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اکثر وہ اسی نتیجے پر پہنچتے کہ کتابوں میں لکھے ہوئے اُصولوں اور زندگی کی حقیقتوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عثمان ہمیشہ بڑے یقین کے ساتھ اپنی بات کہتا تھا اور وہ اپنے عقیدے کا بہت پکا تھا۔ کبھی کبھی وہ انور کے پیدائشی دیّو پن پر، اُس کی ڈانواڈول طبیعت پر اور ہر سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی عادت پر جھنجھلا اُٹھتا تھا۔ انور اپنے دوست کی صاف گوئی اور قوتِ ارادی کی تعریف تو کرتا تھا مگر وہ خود ذاتی تعلقات کے بندھنوں میں اتنی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا کہ وہ جن لوگوں کی عزّت کرتا تھا یا جن سے وہ پیار کرتا تھا اُن کے بارے میں وہ فوراً کوئی آخری فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔ عثمان کی رائے میں گوپال کے پتا جی جیسے لوگ ٹوڈی اور خوشامدی تھے، کاکا رامیشور دیال غیر وطن پرست مہاجن تھے جو ولایتی کپڑا بیچتے تھے اور اِس طرح 'دشمن' کی مدد کرتے تھے اور حالانکہ وہ انور کا دل نہ دکھانے کے خیال سے کبھی ایسا کہتا نہیں تھا پر اُس کے رویے سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اکبر علی جیسے لوگوں کو کٹر رجعت پسند سمجھتا تھا۔ انور جانتا تھا کہ واقعیت کے مطابق عثمان کا خیال ٹھیک ہی تھا لیکن انور تو کسی ایسے

داخلی جذبے کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا جو واقعیت سے زیادہ طاقتور تھا!

لیکن وہ ہمیشہ سیاست پر ہی باتیں نہیں کرتے تھے۔ عثمان اکثر بمبئی اور وہاں کی چہل پہل کی بھی باتیں کرتا تھا اور علی گڑھ کی 'مُردہ' زندگی سے اُس کا مقابلہ کرتا تھا۔ اُس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اگر اُس کے بابا کی یہ ضِد نہ ہوتی کہ وہ ایک 'مسلم' ادارے میں پڑھے تو وہ بمبئی ہی میں پڑھنا زیادہ پسند کرتا۔ وہ اکثر بہت کُڑھ کر شکایت کرتا تھا۔ 'لعنت ہے' یہاں نہ کوئی زندگی ہے، نہ کوئی چہل پہل ہے، نہ کوئی سوسائٹی ہے، کہیں لڑکی کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔'

اِس یونی ورسٹی میں ویسے تو کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن 'لڑکی' یہاں کے لیے ایک نایاب چیز تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ یونی ورسٹی کے ساتھ ایک مسلم گرلز کالج تھا لیکن وہاں بہت سخت پردہ کرایا جاتا تھا اور کالج کی لڑکیوں کو، شریف مسلم گھرانے کی بیٹیوں کو مردوں کی نظروں سے بچانے کے لیے کالج کے چاروں طرف بیس بیس فٹ اُونچی دیواریں تھیں۔ یونی ورسٹی کا علاقہ شہر سے کچھ دور تھا اور ہاسٹل کے وارڈن سے اجازت لیے بِنا کوئی شہر نہیں جا سکتا تھا۔ اِس لیے اسٹیشن ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی عورت کی صورت دیکھنے کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑیوں کو تاکنا یونی ورسٹی کے طالب علموں کی ایک خاص تفریح تھی جس میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں تھی۔

انور اور عثمان جیسے لڑکوں کے لیے جو شام کو بالکل خالی رہتے تھے، کئی وجہ سے اسٹیشن ایک اڈّا بن گیا تھا۔ وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ریستوراں میں کچھ ڈھنگ کی چائے مل سکتی تھی اور بُک اسٹال پر نئی کتابیں، رسالے اور اخبار مل سکتے تھے اور پھر یہ لالچ تو رہتا ہی تھا کہ پلیٹ فارم کا چکّر لگاتے وقت گزرتی ہوئی ٹرین میں کوئی اچھی صُورت دکھائی دے جائے۔

(3)

چھٹیوں کے بعد اکتوبر میں یونی ورسٹی پھر کھلی اور انور جب گھر سے لوٹا تو اُسے پتہ چلا کہ عثمان ایک دو ہفتہ بعد آئے گا۔ اسی درمیان اُسے رہنے کے لیے سرسیّد کورٹ میں جگہ دی گئی۔ اُس کے ساتھ دو نئے لڑکے بھی اُن ہی کمروں میں رکھے گئے تھے جس کی وجہ سے اُسے کافی مایوسی

ہوئی کیونکہ وہ تو یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ عثمان سے اُس کا دو سال پرانا ساتھ اِس سال بھی جاری رہے گا۔ جن دو لڑکوں کے ساتھ اُسے رہنا تھا اُن سے مل کر بھی اُسے کوئی خاص تسلّی نہیں ہوئی۔

اُن میں سے ایک لڑکا لکھنؤ کا تھا۔ کالی رنگت، دُبلا پتلا جسم اور آنکھوں پر چشمہ۔ نام تھا مشتاق احمد۔ لیکن شاعر ہونے کی وجہ سے راز تخلص کرتے تھے، چال ڈھال میں زنانہ پن، ہر وقت لمبی لمبی زلفوں سے گھٹیا خوشبودار تیل کی مہک آتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے اُن کے تکیے کے غلاف پر ہمیشہ تیل کا چکنا دھبہ پڑا رہتا۔ دوسرا تھا اصغر حسین، جو راز سے بالکل اُلٹ تھا۔ ہٹا کٹا کسرتی جسم، شاعروں، پڑھنے لکھنے والوں اور اِس قسم کے دوسرے گھٹیا انسانوں سے سخت نفرت، جسے وہ چھپاتا نہیں تھا۔ انور سے وہ عمر میں کافی بڑا تھا اور کئی بار فیل ہونے کے بعد اس سال اُس نے بی۔ اے پاس کیا تھا پھر اُسے اتنی بار فیل ہونے پر بھی کوئی فکر نہیں تھی۔ اب بھی اُسے امتحان پاس کرنے کے مقابلے میں کھیل کود کا چیمپئن بن جانے کی زیادہ فکر تھی۔

اِن تینوں کی تکڑم بھی عجیب و غریب تھی۔ اصغر رات کو دس ہی بجے سو جاتا تھا اور صبح چھ بجے سے اُٹھ کر ڈمبل گھمانے لگتا تھا اور تین میل لمبی دوڑ لگانے نکل جاتا تھا۔ راز صاحب کبھی دو بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ راتوں کو جاگ کر وہ شاعری کرتے رہتے تھے اور غالب کے انداز میں غزلیں کہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ صبح دس بجے سے پہلے اگر جگا دیا جائے تو انھیں سخت ناگوار گذرتا تھا۔ اصغر کھانے کے معاملے میں شیر تھا۔ صبح ناشتے پر ہی سیر بھر دُودھ آدھے درجن مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ اور تلے ہوئے تین انڈے صاف کر جاتا تھا۔ راز ایک ایک کر کے کتنے ہی چائے کے پیالے پی جاتا تھا اور بیچ بیچ میں بیٹھا بسکٹ کُترتا رہتا تھا۔ پہلوان بولتا نہیں گرجتا تھا۔ شاعر بولتا نہیں ممیاتا تھا۔ ایک کا خیال تھا کہ دنیا میں سینڈو سے بڑا کوئی آدمی نہیں ہوا، دوسرے کا یہ پکا یقین تھا کہ جس نے لکھنؤ کے انیس اور آتش اور مومن جیسے شاعروں کو نہیں پڑھا، اُس نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ اِن دونوں کے درمیان انور کی جان مصیبت میں رہتی تھی۔ وہ پوری طرح دونوں میں سے کسی سے بھی اتفاق نہیں کر سکتا تھا پھر بھی اکثر اُسے دونوں کے جھگڑے میں بیچ بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔

اصغر اور راز میں سے وہ دل ہی دل میں اصغر کو زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ اصغر میں ہر وہ چیز

تھی جو انور میں نہیں تھی۔ اچھی تندرستی، ہر وقت کی مستی اور پھر وہ ایک اچھا کھلاڑی بھی تو تھا جو تیرنا جانتا تھا، گھوڑ سواری جانتا تھا اور اُسے کرکٹ کھیلنے یا، ہرڈل پھاندنے، ہر کھیل میں مہارت حاصل تھی۔ اصغر کو بھی یہ دُبلا پتلا جھینپولڑکا بہت پسند تھا۔ اُس کی حفاظت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا اور اُس نے ہاسٹل کے تیس مار خانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اگر کوئی انور کو ستائے گا یا چھیڑے گا تو اُس کی خیر نہیں ہے۔ جہاں تک شاعر صاحب کا سوال تھا انور کو انھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں سانپ کا خیال آتا تھا۔ اُسے اُن کی زنانی چال ڈھال سے، اُن کے تیل سے چپڑے ہوئے بالوں سے اور گھنٹوں بیٹھ کر چھت کو تاکتے رہنے یا خیالوں میں ڈوبے ہوئے خلاء میں تکتے رہنے سے چڑ تھی۔

(4)

آخر کار عثمان بمبئی سے واپس لوٹا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی سیاسی خبریں لایا تھا حالانکہ اُسے رہنے کے لیے دوسرا کمرہ دیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ پہلا موقع ملتے ہی اپنے دوست سے باتیں کرنے پہنچ گیا۔ اُسے انور کو بہت سی باتیں بتانی تھیں، اِس لیے دونوں کھیتوں کی سیر کو نکل پڑے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ واپسی میں وہ چائے پینے اسٹیشن جائیں گے۔ اکتوبر ختم ہو رہا تھا اور ہوا میں تھوڑی تھوڑی خنکی آچکی تھی۔ مٹر کے کھیت بیگنی اور لال رنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے ہر چیز پر سونا بکھیر دیا تھا۔

عثمان نے اپنی چھٹیاں دوسرے طالب علموں کی طرح کتابیں پڑھنے یا واہی تباہی وقت برباد کرنے میں نہیں بتائی تھیں۔ وہ بہت اہم سیاسی تحریکوں کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے انور کو باردولی کی کسان ستیہ گرہ کے بارے میں بتایا جس نے پورے گجرات کے دیہات میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ عثمان کا آبائی گھر اُسی ضلع میں تھا۔ عثمان نے بڑے جوش کے ساتھ بتایا کہ وہاں کے کسان اپنے حقوق کے لیے کس بہادری کے ساتھ سرکار اور زمینداروں کی طاقت کے خلاف لڑے تھے، انھیں گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ انھیں پیٹا گیا، اُن کی جائیداد ضبط کر لی گئی لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی۔ آخر میں جیت اُن ہی کی ہوئی۔ سارے قیدی رہا کر دیئے گئے اور سرکار کو کسانوں کی شکایتوں کے بارے میں جانچ

کرنی پڑی۔ جس وقت عثمان کسانوں کی اِس لڑائی کی تفصیلات بیان کر رہا تھا اُس وقت انور کے تصور میں ایک جوشیلا منظر اُبھر آیا جیسے ہزاروں جیالے کسان اپنے حقوق کے لیے کمر کس کر میدان میں اُتر آئے تھے اور ظلم و جبر کی ظالم طاقتوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر رہے تھے۔ انور اور عثمان ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہو کر گزر رہے تھے۔ درجنوں چولھوں سے اُٹھتا ہوا نیلا دھواں بل کھاتا ہوا نیلے آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ کسان کندھوں پر اپنے ہل رکھے اپنے بیلوں کی جوڑی ساتھ میں لیے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سیدھے سادے دُبلے پتلے لوگ جن کے بدن پر ایک میلی کچیلی لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جب وہ اِن دونوں نوجوانوں کے پاس سے گزرتے تو انھیں سلام کرتے۔ جب دونوں دوست گاؤں کی گندی بدبودار گلی پار کر کے باہر نکلے اور ریل کی پٹری کی طرف مُڑے تو انور سوچنے لگا کہ باردولی میں جو آگ بھڑک اُٹھی ہے وہ یوپی کے اِن گاؤں تک کب پہنچے گی؟

اتنے میں عثمان نے ایک دوسری سیاسی جدّ و جہد کا ذکر شروع کر دیا تھا جو اُس نے بمبئی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کپڑے کی ملوں کے ہزاروں مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی اور یہ کہا تھا کہ جب تک اُن کی مانگیں پوری نہیں کی جائیں گی تب تک وہ ایک بھی کارخانہ نہیں چلنے دیں گے۔ انھوں نے بھی اپنی مانگیں منوالی تھیں۔ عثمان کا دعویٰ تھا کہ کسانوں اور مزدوروں کی یہ جدّ و جہد لگان گھٹوانے یا مزدوری بڑھوانے کی چھوٹی موٹی جدّ و جہد نہیں تھی بلکہ اُن سے ہندوستان میں ایک نئی عظیم طاقت کے پیدا ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب کانگریس و انگریزی حکومت کے اندر ڈومینین اسٹیٹس کی مانگ کرتے ہوئے صرف تجویز پاس کروانے والے وکیلوں کی تنظیم نہیں رہ جائے گی۔ اُس نے بتایا کہ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے نوجوانوں کی رہنمائی میں 'اِنڈی پنڈینس آف انڈیا لیگ' بن گئی ہے جو کانگریس کے پرانے لیڈروں کو مکمل آزادی کے انقلابی مقصد کی طرف لے جانے کے لیے ملک کے نوجوانوں کو تیار کر رہی تھی۔ انور ادھر کئی برسوں سے رتن سے نہیں ملا تھا اور اُس کے خط بھی کبھی کبھار ہی آتے تھے اور وہ بھی بہت چھوٹے۔ لیکن عثمان کی باتیں سن کر اُس کے دل میں فوراً یہ خیال اُٹھا کہ 'یہ رتن سے کتنا ملتا ہے! کاش میں ان دونوں کی ملاقات کروا سکتا۔'

(5)

جب وہ اسٹیشن پہنچے تو تھک کر بالکل چور ہو چکے تھے لیکن وہ بہت خوش تھے اور اُن کا جوش اُمنڈ پڑ رہا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور پنجاب میل اُسی وقت پلیٹ فارم پر آئی تھی۔ یہ ٹرین، جو بہت دُور ہُگلی کے کنارے بسے ہوئے کلکتہ شہر سے آتی تھی اور دلّی سے ہوتی ہوئی پنجاب کے میدانوں کو پار کر کے بہت دور آگے تک چلی جاتی تھی، نہ جانے کیوں اتنی رومانی لگتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی دل میں نہ جانے کیوں ایک ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ انور کے لیے یہ ٹرین اُن تمام جگہوں کی علامت تھی جن کی وہ سیر کرنا چاہتا تھا، وہ اُن تمام جوشیلے اُمور کی علامت تھی جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ لمبی سی ہری گاڑی ہانپتی کانپتی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کے کنارے آ کر رُک گئی۔ پلیٹ فارم پر ایک اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ انور اور عثمان بھی اُس بھیڑ میں کھڑے مسافروں کو تاک رہے تھے۔ اُن کی نظریں کسی اچھی صورت کی تلاش میں تھیں۔ اتنے میں انور نے ایک ایسا خوب صورت چہرہ دیکھا جیسا اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے جھانک رہی تھی۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے کوئی پندرہ یا سولہ سال کی لڑکی رہی ہوگی جس کے خوب صورت لمبوترے چہرے کے چاروں طرف گھنگھریالے بالوں کا ایک گھیرا تھا۔ انور صرف اتنا سمجھ پایا کہ اُس کی بڑی بڑی معصوم کالی آنکھیں کسی آدمی کو یا کسی چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں، لیکن اُس کے فوراً ہی بعد وہ ڈبہ آگے نکل گیا تھا اور اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے سینکڑوں مسافروں کے شور وغل اور دھینگا مشتی میں وہ مُکھڑا اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک اُن کی مڈبھیڑ پولٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر سلیم سے ہو گئی۔ لمبا چوڑا ڈیل ڈول، لال چہرہ، کپڑوں کے معاملے میں بے حد محتاط۔ لگتا تھا وہ کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اُس تمام گڑبڑ اور بھاگ دوڑ میں انھوں نے کسی کی مدد چاہتے ہوئے بہت گھبراہٹ میں پوچھا، 'لڑکو، تم نے میری بیٹی کو تو نہیں دیکھا ہے؟'

دیکھنا تو دُور رہا، انور اور عثمان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ پروفیسر سلیم کے کوئی بیٹی بھی ہے، لیکن انور کو ایک دم سے اُن بڑی بڑی معصوم کالی آنکھوں کی یاد آئی جنھیں اُس نے کچھ ہی دیر پہلے کسی کو کھوجتے دیکھا تھا۔ اُس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ 'جی ہاں دیکھا ہے، وہ آگے والے

ڈبّے میں ہے۔' اور جب لڑکی کے باپ گھبرائے ہوئے اُس ڈبّے کی طرف بڑھے تو انور بھی بھیڑ کو چیر کر اُن کے ساتھ ہولیا۔ خوش قسمتی، تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا کیونکہ اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنے ابّا کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُن سے لپٹ گئی۔ قُلی نے سامان اُٹھالیا اور وہ سب اسٹیشن سے باہر نکلنے کے لیے پھاٹک کی طرف چلے۔ چلتے چلتے وہ لڑکی بہت ہنس ہنس کر کانپور سے یہاں تک کے اپنے لمبے سفر کے بارے میں اپنے ابّا کو بتا رہی تھی۔ انور کو بیچ میں ٹانگ اڑانے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی مگر وہ لپک کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا اور چاروں طرف کے شور غل سے زیادہ اُونچی آواز میں بولا 'میرے لائق کوئی اور خدمت؟' ٹانگہ لے آؤں؟' پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ 'نہیں نہیں' ٹھیک ہے انور، تم تکلیف نہ کرو، میں اپنی موٹر میں آیا ہوں' اور اتنا کہہ کر وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنی بیٹی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔ اُس لڑکی نے شاید انور کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

'چلو یار، ایک پیالی چائے پئیں گے۔' عثمان نے کہا۔ گارڈ نے سیٹی دی تھی، اور گاڑی چلنے والی تھی۔ مسافروں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ کچھ گاڑی کے ڈبّوں میں گھس گئے تھے اور کچھ اسٹیشن سے باہر نکل رہے تھے۔ بس کالی شیروانیاں پہنے ہوئے کچھ لڑکے پلیٹ فارم کا چکّر لگا رہے تھے اور زنانہ ڈبّے کے سامنے پہنچ کر اُن کے قدم دھیمے ہوتے ہوئے اپنے آپ رُک جاتے تھے۔ ریفریشمنٹ رُوم کی طرف بڑھتے ہوئے عثمان کہہ رہا تھا 'بمبئی میں جتنے بھی بڑے بڑے کانگریسیوں سے میں ملا اُن سب ہی نے یہی کہا کہ لڑائی تو ہوگی۔ ایسی آخری لڑائی جس میں جیت اور ہار کا فیصلہ ہو جائے گا اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ تمھارے اور میرے جیسے لوگوں کو تیار رہنا چاہیے......' لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ انور اپنے دوست کی سیاسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اُس کی باتیں سن تک نہیں رہا تھا۔

(6)

اُس رات انور سو نہ سکا۔ اِس لیے جب اصغر خرّاٹے لینے لگا اور راز صاحب مشقِ شعر و شاعری کے لیے پیچھے والے کمرے میں چلے گئے تو وہ چپکے سے کمرے کے باہر نکل آیا۔ وہ کسی کھلی جگہ میں جانا چاہتا تھا جہاں کوئی نہ ہو۔ اُسے ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہو رہا تھا۔

باہر آنگن میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک دو کمروں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ چوتھائی چاند کی مدّھم روشنی میں مسجد کے گنبد اور مینار تاروں بھرے آسمان کو چوم رہی تھیں اور انور کو ایسا لگا کہ اُس نے پہلے کبھی ان سب چیزوں کی پوری خوب صورتی کو نہیں سراہا تھا۔ چاند، ستارے، وہ سڈول مینار، شاندار گنبد اور اندھیرے میں گھنٹہ گھر کی دُھندلی دُھندلی شکل۔

رات میں نہ جانے کتنے پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو، چنبیلی کے پھولوں کی مست مہک اور شب دُلہن کی نشیلی تیز خوشبو، وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ گھاس ابھی حال ہی میں کاٹی گئی تھی اور اُس میں سے ایک عجیب سوندھی سوندھی خوشبو نکل رہی تھی۔ اوس سے بھیگی ہوئی زمین سے بھی سوندھے پن کی خوشبو آ رہی تھی۔

چاروں طرف خاموشی تھی اور ایک عجیب خوشی جسے بیان کرنا مشکل تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس کے دل میں درد بھی تھا، نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ ساری دنیا اُسے خاموش لگ رہی تھی پھر بھی اُس کے دل میں ایک عجیب بے چینی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے دل میں جو گہری تمنا چھپائے ہوئے تھا وہ کسی دن پوری بھی ہوگی۔

انور اُسی طرح گھاس پر لیٹا رہا۔ ایک گھنٹہ — دو گھنٹے — نہ جانے کتنی دیر — وہ جاگ رہا تھا پھر بھی اُس کا دماغ سو رہا تھا۔ اُوپر گھنٹہ گھر کی گھڑی نے جب کچھ بجائے تو وہ یہ بھی نہ گن سکا کہ کتنے بجے ہیں۔ وہ سوچ نہیں سکتا تھا، وہ صرف محسوس کر سکتا تھا۔ وہ رات کا حُسن، اُس کی خاموشی اور اُس کا درد پی جانا چاہتا تھا، اُسی طرح جیسے پیاسی زمین برسات کے پہلے چھینٹے کا سارا پانی جذب کر لیتی ہے۔

وہ گھاس میں منہ دے کر لیٹ گیا۔ وہ اپنے چکنے گالوں پر زمین کی ملائمت محسوس کر رہا تھا۔ گھاس کی نوکیں اُسے گدگدا رہی تھیں۔ ایک دم سے اُس کا جی چاہا کہ وہ کوئی بہت بڑا کام کر ڈالے۔ اُس نے اپنی مُٹھی میں کچھ گھاس پکڑ کر اُسے جڑ سے اُکھاڑ لیا۔ گھاس اُکھڑنے سے جو ہلکی سی کھڑدری آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی جسم سے جسم کا کوئی حصہ نوچ لے، اُس سے انور کو نہ جانے کیوں بہت تسلّی ہوئی۔ اُس نے اپنے ناخن نرم گیلی مٹی میں دھنسا دیئے۔ اچانک اُس کا جی چاہا کہ وہ مٹی کو کھود دے، اُس کی شکل بگاڑ دے، اپنا سارا بدلہ اُس سے چکا لے۔ اُس نے

پاس کی ایک جھاڑی سے گُلاب کا ایک پھول توڑا اور ایک ایک کرکے اُس کی ساری پنکھڑیاں نوچ کر زمین پر بکھیر دیں۔

پھول توڑتے ہوئے اُس کی انگلی میں کانٹا چُبھ گیا اور جب اُس نے اُنگلی کو مُنہ میں ڈال کر چُوسا تو خون، اُس کا اپنا خون اُسے کڑوا لگا، کڑوا لیکن میٹھا!

جب وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو بالکل تھک چکا تھا پھر بھی اُسے ایک عجیب سا اطمینان تھا لیکن کوئی سوتے میں بھی اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ وہی 'دوسری عورت' تھی جسے اُس نے بچپن میں دیکھا تھا اور اب بھی وہ چلا کر کہہ رہی تھی، 'میں عورت ہوں، عورت کی بیٹی ہوں۔ تم مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟' لیکن جب وہ پاس آئی تو انور نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ لمبوترا تھا اور چہرے کے چاروں طرف گھنگھریالے کالے بالوں کا گھیرا تھا اور بڑی بڑی معصوم کالی آنکھیں تھیں۔

(7)

دوسری صبح جب انور نے بال بنانے کے لیے آئینہ دیکھا تو اُس کے اپنے گالوں پر اور ٹھوڑی پر اُگے ہوئے بال یکا یک بہت بڑے معلوم ہوئے۔ بال تھے تو بہت کافی عرصے سے، پر اُن کی طرف اُس نے اب تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اُس کے چکنے صاف ستھرے چہرے پر وہ کتنے ملائم اور ریشمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار جہاں اُس نے داڑھی بنانا شروع کر دی تو پھر اُس کی کھال بھی اصغر اور راز کی طرح سخت اور کھردری ہو جائے گی کیوں کہ وہ دونوں روز داڑھی بناتے تھے۔

لیکن آج اُسے اپنی داڑھی کے بالوں سے نہ جانے کیوں اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ اُن کی وجہ سے نہ جانے کیوں شرمندہ تھا۔ اُن کی وجہ سے وہ بالکل لونڈا لگتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ مرد لگے۔ اور اِس لیے ایک خالی پیریڈ میں وہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور کمرہ اندر سے بند کرکے اصغر کا داڑھی بنانے کا سامان نکال لایا اور گال پر صابن رگڑنے لگا۔ پہلی بار جب اُس نے اپنی داڑھی پر ریزر چلایا اور صابن کے جھاگ کے ساتھ کچھ بال اُتر آئے تو اُس کے تن بدن میں جیسے جھرجھری سی دوڑ گئی۔ جب اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اُس کی ٹھوڑی ایک جگہ سے کٹ گئی تب

بھی اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ٹھڈی پر خون کی ایک پتلی سی لکیر اُبھر آئی لیکن اُسے ذرا بھی فکر نہیں ہوئی کیونکہ اُس نے بڑی ہوشیاری سے پرانے داڑھی بنانے والوں کی طرح اُس پر پھٹکری مَل دی۔ پھٹکری لگاتے ہی کٹے ہوئے زخم میں ایک ہلکی سی چُبھن ہوئی جس میں انور کو بہت مزا آیا اور خون بہنا ایک دم بند ہوگیا لیکن زخم کا نشان باقی رہ گیا۔ یہ اُس کی جوانی کا پہلا گھاؤ تھا!

اُس دن سے انور اپنے کپڑوں کی طرف بھی زیادہ توجہ دینے لگا۔ وہ اپنے چہرے کو غور سے دیکھنے کے لیے جو پہلا ضرور تھا لیکن دیکھنے میں اتنا بُرا نہیں تھا، آئینے کے سامنے کچھ دیر کھڑا رہتا۔ اب عثمان کے ساتھ ٹہلنے جانا بھی پہلے سے کم ہوگیا اور اکثر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اکیلے سیر کو جاتا تھا اور جب وہ عثمان کے ساتھ جاتا بھی تھا تو موقع پاتے ہی بات چیت کا رُخ سیاست کی طرف سے نجی باتوں کی طرف موڑ دینے کی کوشش کرتا تھا۔

'عثمان، اچھا ایک بات بتاؤ' اُس نے ایک دن اچانک پوچھا 'محبت کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟'

بمبئی کے آزاد ماحول میں پلے ہوئے عثمان نے جواب دیا 'میں محبت کو بالکل بکواس سمجھتا ہوں۔ میں تو سیاسی کام کروں گا۔ میں کسی بیوقوف لڑکی کے گلے سے بندھنا نہیں چاہتا۔'

'لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ لڑکی بیوقوف ہی ہو؟' اُردو کے پُرانے شاعروں کی غزلوں سے محبت کا سبق سیکھے والے انور نے فوراً اعتراض کیا۔ 'وہ تمھارے کام میں تمھیں انسپریشن بھی دے سکتی ہے۔'

'لڑکیاں سب ہی بیوقوف ہوتی ہیں' عثمان نے اپنا آخری فیصلہ دیتے ہوئے کہا اور پھر یکا یک چُپ ہوگیا، حالانکہ چُپ ہوجانا عثمان کے لیے ایک عجیب بات تھی۔ شاید وہ اپنی اِس رائے کے بارے میں ثبوت ڈھونڈنے کے لیے اپنے تجربے کی گہرائیوں میں غوطے لگا رہا تھا۔

دُوسرے دن انور عثمان کے آنے سے پہلے ہی ہوسٹل سے کِھسک گیا۔ کرکٹ کے کھلاڑی سفید پتلونیں پہنے ہوئے مسجد کے پیچھے والے میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اسٹاف کلب میں موٹی موٹی توندوں والے یا دُبلے پتلے گنجے پروفیسر ٹینس کھیل رہے تھے۔ انور نے اُن کے درمیان پروفیسر سلیم کو بھی دیکھا جو اپنے زمانے میں کیمبرج میں ٹینس کے ایک مانے ہوئے

کھلاڑی رہ چکے تھے۔ ادھیڑ عمر میں جسم کچھ بھاری ہو جانے کے باوجود وہ اب بھی کافی زور سے بلّہ چلا لیتے تھے۔ پھر وہ سول سروس کلب کے سامنے والی سڑک سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف چل دیا لیکن لال ڈگی کے پاس پہنچ کر وہ میریس روڈ کی طرف مُڑ گیا۔ اُس نے سوچا کہ میل بھر کا چکّر تو پڑ جائے گا لیکن اتنی دور زیادہ چل لینا میرے لیے فائدہ مند ہوگا۔ گرلس کالج کی اُونچی اُونچی دیواریں جن میں کہیں ایک کھڑکی بھی نہیں تھی، سنتریوں کی طرح اُس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اُس کے دل میں یہ خیال کیوں اُٹھا کہ پروفیسر کی بیٹیا سلیم دن میں یہیں پڑھنے آتی ہوگی؟ اور اُس کے کچھ ہی دیر بعد جب وہ ایک بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا جس کے پھاٹک پر پیتل کی ایک تختی لگی تھی، اپنے آپ ہی اُس کی چال دھیمی اور دل کی دھڑکن تیز کیوں ہو گئی تھی؟ ظاہر ہے مخملی لان کی ہری ہری گھاس اور مہندی کی باڑ کے اُس پار پھولوں کی خوب صورت کیاریوں کو دیکھنے کے لیے ہی اُس کی نظریں اُدھر اُٹھ گئی تھیں۔ اگر لگے ہاتھوں اُسے سفید غرارہ، آسمانی کُرتا اور اُسی رنگ کا دوپٹہ پہنے کوئی اکہرے بدن کی لڑکی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھتی دکھائی دے گئی تھی تو اِس میں اُس کی کوئی بدتمیزی یا بے ہودگی تو نہیں تھی اور اگر اسٹیشن تک جانے کی بجائے انور کچھ دیر بعد واپس لوٹ گیا تھا تو اُس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اسٹیشن پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جاتی اور واپسی میں شاید اُسے زُکام ہو جاتا۔

اُس ہفتے انور نے میریس روڈ کے کئی چکّر لگائے۔ وہ بہت ہی سہانی اور خاموش سڑک تھی، شاید ہی کبھی کوئی موٹر یا اِکّہ تانگا اُدھر سے دھول اُڑاتا ہوا گذرتا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ انور کی ہی طرح اور بہت سے لڑکے وہاں ایسے ہی صحت بنانے کے لیے ٹہلنے آتے تھے اور لگے ہاتھوں اگر اُنھیں یہاں وہاں جوان شانوں پر لاپروائی سے پڑا ہوا دھنک کے رنگ کا کوئی دوپٹہ، ساڑی میں لپٹا ہوا کوئی سڈول جسم، کوئی خوب صورت ہرن جیسی آنکھیں، یا کالی کالی گھٹاؤں جیسے بالوں کی چوٹی گوندھتی ہوئی دکھائی دے جاتی تو اُنھیں اِس میں اعتراض ہی کیا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی علی گڑھ کی ایک بہت مقبول تفریح تھی جس کا بہت سارے لوگوں کو شوق تھا اور اِسی لیے ظاہر ہے کہ انھوں نے انور کو بھی اپنے ہی جیسا سمجھ لیا۔

'ہیلو انور، کوئی پنچھی دکھائی دیا؟' ایک دن شام کو پروفیسر سلیم کے بنگلے کے سامنے ٹہلتے

وقت ایک دوسرے لڑکے نے اُس کے پاس آ کر پوچھا۔
'پنچھی؟ کیسا پنچھی؟' انور اِس سوال پر سچ مچ چکرا گیا۔
'پنچھی نہیں جانتے کیا ہوتا ہے۔ پنچھی یعنی فیشیا۔ یہی میرس روڈ کی چڑیاں یا جل پریاں۔'
انور اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اُسے یہ مذاق پسند نہیں آیا اور یہ بات اُس نے اُس دوسرے لڑکے سے صاف صاف کہہ بھی دی۔

'یار، اب اتنے پاک باز نہ بنو' اُس لڑکے نے جواب دیا۔ 'ہم سب ایک ہی ناؤ میں ہیں۔ کیا تم بھی یہاں اپنی نظریں سینکنے نہیں آتے؟ لیکن اگر مجھ سے پوچھو تو پروفیسر سلیم کی بیٹی سلمیٰ کی ایک جھلک کے آگے باقی سب لڑکیاں مل کر بھی پھیکی پڑتی ہیں۔ ہے نا پٹاخہ؟' اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے بہت ہی بیہودہ ڈھنگ سے بوسہ لینے کی آواز پیدا کی۔

انور کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُس لفنگے کی ناک پر ایک گھونسہ جڑ دے جو اتنی بے ہودہ باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اپنے پیدائشی دبو پن کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اچانک مُڑا اور دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھا ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ اُس کی اِس حرکت پر اُن مجنوں صاحب کو بہت حیرت ہوئی اور وہ وہیں پتھر کی طرح گڑ کر رہ گئے۔

اِس چھوٹے سے حادثے کا انور کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا، اُس کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ کیا لوگ لڑکیوں کے بارے میں اِسی طرح باتیں کرتے ہیں؟ جو چیز اُس کے لیے خوب صورتی تھی۔ کیا خوب صورت چیزیں اِس لیے نہیں ہوتیں کہ انھیں دیکھ کر تعریف کی جائے؟

وہی ایک پل میں پُر شہوت اور فحش ہو گئی تھی۔ اُس نے، انور علی نے، اکبر علی کے بیٹے نے، جو ایک شریف گھر کا بیٹا تھا، ایسی غیر شریفانہ حرکت کی تھی۔ اُس کی نیت خراب نہ بھی رہی ہو تو اُس سے کیا ہوتا ہے۔ سب کی نظروں میں تو وہ بھی اُن ہی لفنگوں میں سے تھا جو بُری نظر سے لڑکیوں کو تاکتے ہیں۔ ہاں، بالکل اُن ہی آوارہ لوگوں اور شرابیوں کی طرح جو رات کے وقت چاوڑی بازار سے اُن 'دوسری عورتوں' کو پرکھتے ہوئے اور اُن کے بارے میں گندی گندی باتیں بکتے ہوئے گذرتے ہیں۔ انور اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا، اور اپنے اِس 'گناہ' کا مقابلہ بُری سے بُری باتوں سے کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں بار بار کہتا رہا، 'اب میں کبھی میرس روڈ پر ٹہلنے نہیں

جاؤں گا، کبھی نہیں۔' وہ نہیں جانتا تھا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو اُس سکھ سے مرحوم رکھنے کا اُس نے جو فیصلہ کیا تھا، اُس میں اِس بات کی رضامندی بھی چھپی ہوئی تھی کہ اب تک وہ میرلیس روڈ پر صرف مہندی کی صاف ستھری کٹی ہوئی جھاڑیوں اور رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کو ہی دیکھنے نہیں جاتا تھا بلکہ اُن سے پرے بھی کوئی چیز تھی جسے وہ دیکھنے جاتا تھا۔

(8)

نومبر میں علی گڑھ کا موسم بہت اچھا رہتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ پڑنے لگتی ہے لیکن بہت سردی نہیں پڑتی۔ پڑھائی پورے زوروں پر جاری رہتی ہے لیکن امتحان کافی دور ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ اُن کاموں کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہوتا ہے جنھیں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر بنائی گئی یونی ورسٹی کے طالب علموں کے خاص حقوق سمجھے جاتے ہیں۔ سارے میچ اور ٹورنامنٹ اسی زمانے میں ہوتے ہیں، ڈیبیٹ ہوتی ہے، باہر سے بڑے بڑے لوگ آکر لیکچر دیتے ہیں، ڈرامے ہوتے ہیں اور پکنکس ہوتی ہیں اور اِس بدیسی نمونے سے ذرا ہٹ کر اُسے کچھ حد تک ہندوستانی رنگ دینے کے لیے ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس میں دُور دُور سے بڑے بڑے شاعر بُلوائے جاتے ہیں اور لڑکوں میں سے بھی شاعری کا دم بھرنے والوں کو اپنی شعری قابلیت ہونے یا نہ ہونے کا ثبوت دینے کا موقع ملتا ہے۔

مشاعرہ کا دن آیا اور شعر و شاعری کا شوق رکھنے کی وجہ سے انور نے مشاعرہ ہونے سے گھنٹہ بھر پہلے آگے آکر ایک سیٹ گھیر لی۔ وہیں کے مقامی مبتدی شاعروں کی شاعری سے وہ کافی بور ہو چکا تھا۔ اُن کے بعد جو پُرانے شاعر آئے اُن کی فرسودہ شاعری سے تو وہ اور بھی بور ہوا لیکن اُس کے بعد دو باتیں ایسی ہوئیں جن کی وجہ سے اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ ایک تو یہ کہ پروفیسر سلیم اپنی بیٹی سلمیٰ کے ساتھ وہاں تشریف لائے اور انھیں اتفاق سے ٹھیک انور کے سامنے ڈائس پر بیٹھنے کی جگہ دی گئی اور دوسری بات یہ ہوئی کہ راز نے اپنی نظم پڑھی۔

انور کو بے ساختہ غالب کا یہ مصرع یاد آیا، 'یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے۔' شروع شروع میں تو اُسے سلمیٰ کی طرف دیکھنے میں کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ میرلیس روڈ والے اُس حادثے کے

بعد سے سلمیٰ کا خیال آتے ہی نہ جانے کیوں وہ جھینپ سا جاتا تھا۔'اگر اُس نے مجھے اپنے گھر کے سامنے لفنگوں کی طرح ٹہلتے دیکھ لیا ہوگا تو کیا ہوگا؟' لیکن جیسے ہی راز نے کھڑے ہو کر اپنی نظم کا پہلا مصرع پڑھا اُس کے یہ خیالات دُور ہو گئے۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی نگاہیں یہاں تک کہ سلمیٰ کی نگاہیں بھی راز پر جم گئیں۔ اب انور بنا کسی جھجک کے سلمیٰ کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے کان اپنے ساتھی کی نظم کو سن رہے تھے۔

انور راز کو ہمیشہ سے یونی ورسٹی کا سب سے بدصورت لڑکا سمجھتا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنی نظم 'محبوبہ سے شاعر کا خطاب' پڑھی تو اُس میں ایک عجیب تبدیلی آ گئی انور کے سامنے اب بالکل ہی دوسرا راز تھا۔ وہ بہت لمبا بلکہ اُونچا ہو گیا تھا۔ دُبلا پتلا ہونے پر بھی وہ اُس وقت بڑا سورما لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نئی لَو چمک رہی تھی۔ وہ اپنے سوکھے ہوئے پتلے پتلے ہاتھوں کو نظم پڑھتے وقت جذبات کے مطابق ہلا رہا تھا۔ اُس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے ہر دل میں ایک لہر سی پیدا ہو رہی تھی۔ کبھی اُس کی آواز اتنی دھیمی ہو جاتی کہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی سے الگ بات کر رہا ہو اور کبھی پورے جوش کے ساتھ گونج اٹھتا۔ یہ انسان کی روح تھی جو سراسر شعلہ بن کر لپک اُٹھی تھی۔ یہ جسمانی بدصورتی پر انسان کی ذہانت کی فتح کا معجزہ تھا۔ اُس کی نظم کے ہر بند پر تالیاں بج رہی تھیں۔ پہلے تو شاعر نے اپنی شان میں گیت گایا جس کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ 'میری جڑیں اِس دھرتی میں جمی ہوئی ہیں لیکن میرا سر آسمان کو چھو رہا ہے، میں ستاروں کو اِس دھرتی کے راز بتاتا ہوں، میں عوام کا شاعر ہوں۔' اور پھر اُس نے اپنی محبوبہ کی شان میں قصیدہ گایا تھا، کچھ اس طرح کہ 'تم گلاب کے پھول کی مہک ہو، تم پہاڑی جھرنے کا گیت ہو، تم میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی شان اور دھرتی کی زرخیزی ہے۔' انور نے ہر طرح کی نظم پڑھی تھی اور اُس کا لطف اُٹھایا تھا، لیکن یہ کوئی اور ہی چیز تھی، کوئی ایسی چیز تھی جس میں تصور کی بے حد اُڑان تھی پھر بھی وہ اِس زمین سے تعلق رکھتی تھی، اُس میں قدرت کی بُنیادی طاقتوں جیسا زور تھا پھر بھی وہ نازک تھی، یہ ایسی نظم تھی جس سے خون کی رفتار تیز ہو جاتی تھی اور اُس کی گونج ہر دل میں سنائی دیتی تھی۔ یہ نظم بے جان نہیں تھی، اُس میں جان تھی، اُس میں نااُمیدی نہیں بلکہ اُمید تھی، وہ شربت کی طرح نہ تو میٹھی تھی اور نہ ہی اُسے سُن کر نیند آنے لگتی تھی، بلکہ اُس میں تو جدّ و جہد کی للکار تھی۔

انور نے راز کی نظم سنی اور دیکھی بھی۔ اُس نے اُس نظم کو سلمیٰ کے چہرے میں دیکھا۔ شاعر کے ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر جذبے کے مطابق اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک باجے کا سنگیت دوسرے باجے میں بھی اپنے ہی سنگیت کی لَے پیدا کر رہا ہو۔ اُس کا چہرہ کتنا ذہین، کتنا حساس تھا، اُس پر نازک سے نازک چیز کا کتنی جلدی اثر ہوتا تھا۔ جب اُس چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی تب تو وہ خوب صورت لگتا ہی تھا۔ پر جب وہ خاموش ہوتا تھا تب بھی وہ کچھ کم خوب صورت نہیں لگتا تھا۔ انور کو ایسا لگا کہ اُن بڑی بڑی کالی معصوم آنکھوں میں اُداسی تھی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید وہ اکیلی تھی اور ساتھی کی تلاش میں تھی۔ اُس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا اور سلمیٰ کے لیے ہمدردی سے بے چین ہو اُٹھا۔ وہ اُس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ اُس کے لیے کچھ کر بھی سکتا تھا! بس اُس کے کہنے کی دیر تھی۔ راز اپنی نظم کا آخری بند پڑھ رہا تھا۔

'میری محبوب بس تمھارے کہنے کی دیر ہے۔ میں آسمان سے چاند توڑ کر تمھارے ماتھے پر سجادوں گا۔ اور ستاروں کو نوچ کر اُن کی بالیاں تمھارے کانوں میں پہنادوں گا۔ لیکن میری زندگی، تم چاند ستاروں کی تمنا نہ کرو۔ شاعر کا دل اِن چاند ستاروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اور یہ صرف تمھارا ہے اور ہمیشہ تمھارا رہے گا۔'

راز کی نظم ختم ہوتے ہی سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ انور نے دیکھا کہ ایک لمحہ کے لیے سلمیٰ اپنے خیالوں میں ایسی ڈوبی رہی کہ اُسے اِس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ نظم ختم ہوگئی ہے۔ شاعر کی نظم شاید ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ محض اُس کا خیال تھا یا سچ مچ سلمیٰ نے اُداس ہو کر ایک دبی ہوئی آہ بھری تھی اور آہ بھرتے ہی اُس کی آنکھوں میں ایک پردہ سا چھا گیا تھا؟ لیکن دوسرے ہی پل وہ بھی اوروں کی طرح زور سے تالیاں بجا رہی تھی اور اُس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔ انور کے دل میں حسد ایک کانٹا بن کر چُبھنے لگا۔ کاش یہ نظم راز نے نہیں بلکہ اُس نے پڑھی ہوتی!

راز نے مشاعرہ لُوٹ لیا تھا لیکن رات کو جب انور اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو اُس نے دیکھا، اصغر گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ مشاعروں، ڈیبیٹوں اور لیکچروں میں اپنا وقت خراب کرنے کا

قائل نہیں تھا۔ راز اپنی چارپائی پر ویسے ہی کپڑے پہنے لیٹا ہوا چھت کو تاک رہا تھا اور سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا رہا تھا۔ انور راز کو بتانا چاہتا تھا کہ اُسے اُس کی نظم بے حد پسند آئی تھی اور اُسے اُس بات کا بہت افسوس تھا کہ اُس نے اِس سے پہلے اُس کی ادبی اہمیت کو نہیں پہچانا تھا۔ وہ اُس کے سامنے اپنی یہ دلی خواہش ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ آگے چل کر دونوں میں گہری دوستی بنی رہے گی۔ لیکن اُسے اِس طرح کی باتیں کہنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اِس طرح جذبات کا اظہار کرنے میں اُسے بے حد ڈر لگتا تھا۔ اِس لیے اُس نے بُدبُدا کر صرف اتنا ہی کہا 'بہت ہی عمدہ نظم تھی، راز ہر شخص تعریف کر رہا تھا' لیکن اُس کے جواب میں راز نے جو کہا اُسے سُن کر انور چکر میں پڑ گیا۔ اپنی سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتے ہوئے شاعر نے کہا۔ 'سچ؟ لیکن لوگوں کی تعریف سے مجھے کیا غرض؟'

اُس رات انور کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ راز نے جو کہا تھا اُس کا مطلب تھا۔ اگر لوگوں کی تعریف سے اُسے کوئی غرض نہیں ہے تو پھر کس کی تعریف سے اُسے غرض ہے؟

(9)

آکسفورڈ میں ایک یونین سوسائٹی تھی، اِس لیے علی گڑھ میں بھی ایک تھی۔ مسلم یونی ورسٹی یونین ایک زبردست تنظیم تھی جس کا ہر سال الیکشن ہوتا تھا۔ سال بھر میں یونین کی طرف سے دس بارہ ڈیبیٹ اور لیکچر ہوتے تھے۔ یونین کی ایک چھوٹی سی لائبریری اور ریڈنگ روم بھی تھا اور باقی وہ صرف شاندار روایتوں پر قائم تھا لیکن یونین میں ایک بات بہت اچھی تھی۔ اُس کا انتظام چلانے، یا بگاڑنے کا سارا کام لڑکے خود کرتے تھے اور اُس کی حدوں کے اندر انھیں بولنے کی پوری آزادی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے کچھ بہترین مقرر اور بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کو پہلی ٹریننگ اِسی چھوٹی سی پارلیمنٹ میں ملی۔ یونین ہال میں چاروں طرف لگی ہوئی تختیوں پر کالے پڑتے ہوئے سنہری حرفوں میں اُن کے نام آج بھی درج ہیں۔

علی گڑھ آنے کے بعد پچھلے دو برسوں میں انور نے اکثر ان ناموں کو بڑے حسد سے دیکھا تھا، لیکن اُس کے دل میں یہ خواہش کبھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھی اُن میں سے ایک ہو۔ لیکن اب وہ

اِس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کبھی اُسے شہرت ملی تو اِسی ہال میں ایک مقرر کے طور پر ملے گی۔ ڈیبیٹ عام طور پر سیاسی مسئلوں پر ہوتی تھی۔ شروع شروع میں اپنے ابّا کی بیٹھک میں کافی وقت گذار کر اور اِدھر حال ہی میں ہر بات کی معلومات رکھنے والے عثمان کے ساتھ رہ کر اُس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور اب وہ سیاست کے کسی بھی سوال پر باتیں کر سکتا تھا لیکن کیا وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر بول سکے گا؟ یونین اِس بات کے لیے بدنام تھی کہ وہاں نئے اور نوآموز بولنے والوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیا جاتا تھا۔ کچھ لڑکے تو یونین کی ڈیبیٹوں میں صرف بلّی کی بولی بولنے اور مقرر کا مذاق اُڑانے میں اپنا کمال دکھانے کے لیے ہی آتے تھے۔ اِن لوگوں کو اِس بات میں کمال حاصل تھا کہ بڑے موقع سے قہقہہ لگا کر یا غلط موقع پر تالیاں بجا کر وہ بولنے والے میں گھبراہٹ پیدا کر دیتے تھے۔ اِن سننے والوں کا خیال آتے ہی بڑے بڑے سورماؤں کا دل کانپ جاتا تھا۔ انور اِن لوگوں کے زبردست حملوں کا مقابلہ کس طرح کر پائے گا؟

'اب مسٹر انور علی اِس تجویز کے خلاف تقریر کریں گے۔'

یونین کے پریسی ڈینٹ کی آواز کہیں بہت دور سے، کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انور کو ایسا لگا کہ جیسے وہ خواب میں کسی کی آواز سن رہا ہو۔ 'اٹھو، اب تمھارے بولنے کی باری ہے۔' کسی نے اُسے کہنی مار کر کہا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا اُس کے گال اور کان کی لویں گھبراہٹ کے مارے سرخ ہوئی جا رہی تھیں، اُس کے پیر کانپ رہے تھے اور زبان سوکھ گئی تھی۔ اِس عالم میں وہ پریسی ڈینٹ کے داہنی طرف اسٹیج کے اُس حصّے کی طرف چلا جہاں سے کھڑے ہو کر اُسے تقریر کرنا تھا۔ وہ بار بار اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اُس نے ساری دلیلیں خوب اچھی طرح تیار کر رکھی تھیں اور عثمان کی دی ہوئی کتابوں کی مدد سے اُس نے اُن کی تائید میں بے شمار سیاسی حقائق بھی جمع کر لیے تھے۔ وہ کوئی ایک درجن بار اپنی تقریر پڑھ چکا تھا۔ اُسے بالکل رٹ لیا تھا اور کئی بار وہ اِس کی بھی مشق کر چکا تھا کہ وہ کس طرح تقریر کرے گا۔ پھر اُسے بولنے میں ڈر کس بات کا؟

'مسٹر پریسی ڈینٹ، سر' اُس نے خاص پارلیمنٹری انداز میں کہنا شروع کیا، 'آج ہمارے سامنے بحث کا موضوع یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی مستقبل بالکل مختلف ہے اور اِس

لیے اُن کی سیاسی جماعتیں بھی مختلف ہونی چاہییں۔ میں اِس تجویز کی شدید مخالفت کرتا ہوں کیونکہ......'

اور اتنا کہہ کر اُس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ کوئی ایک ہزار سفید پاجامے، اتنی ہی کالی شیروانیاں اور لال تُرکی ٹوپیاں، ایک ہزار دشمن، ایک ہزار تنگ نظر اور متعصب جو اپنے طنز کے تیر کسی بھی وقت اُس پر چلانے کے لیے نشانہ سادھے بیٹھے تھے۔ انور نے انھیں دیکھا تو اُسے ایسا لگا کہ وہ الگ الگ لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک بپھرا ہوا سمندر ہے جو کسی بھی وقت اُسے اپنی طوفانی لہروں کی لپیٹ میں لے لے گا۔ اُس کی زبان سوکھ گئی، اُس کا گلا گھٹنے لگا اور کن پٹیوں میں دھمک ہونے لگی......

'مسٹر پریسی ڈینٹ سر......' وہ بار بار یہی کہتا رہا لیکن اُس کے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ پوری تقریر وہ بھول گیا۔ اُسے اُس کا ایک بھی فقرہ، ایک بھی لفظ نہیں یاد آرہا تھا۔ ہال میں ایک بے رحم قہقہہ گونج اُٹھا اور تھوڑی ہی دیر میں ایسا محسوس ہوا کہ ہزار راکشس ایک ساتھ مل کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ جب اُسے کوئی راستہ نہ سوجھا تو بالکل لاچار ہو کر اُس نے مدد کے لیے پریسی ڈینٹ کی طرف دیکھا اور اُسی وقت اُس نے محسوس کیا کہ دو بڑی بڑی کالی معصوم آنکھیں اُسے دیکھ رہی ہیں۔ اُن آنکھوں میں مسکراہٹ تھی لیکن اُس کا مذاق اُڑانے والی مسکراہٹ نہیں۔ اُس مسکراہٹ میں ہمدردی تھی، وہ مسکراہٹ اُسے اُکسا رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں اُس سے کہہ رہی ہیں، 'بولو، ہمت کرو، ڈرتے کیوں ہو؟ اتنے بڑے ہو کر بچّوں کی طرح بھیڑیئے سے ڈرتے ہو؟' اُن آنکھوں میں اتنی دوستی تھی، اتنا بھروسہ تھا، انسانی بھائی چارے کی اتنی سادگی تھی کہ انور بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ بھیڑیئے کا مقابلہ کرنے کے لیے مُڑا۔ اب اُس کے سامنے بھیڑیا نہ تھا۔ اُس کے سامنے ایک ہزار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جن میں سے ایک درجن بھی مشکل سے ایسے رہے ہوں گے جو اُٹھ کر اتنے لوگوں کے سامنے بولنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ان لوگوں نے اُس کی ہنسی اڑانے کی ہمت کی! اچھی بات ہے، وہ انھیں دکھا دے گا! یہ سچ ہے کہ اُس نے جو کچھ بولنے کے لیے یاد کیا تھا اُسے وہ بھول چکا ہے مگر اُس کی زبان تو اُس سے نہیں چھِن گئی ہے۔

جب قہقہہ لگانے والے راکشس دم لینے کے لیے تھوڑی دیر کو رُکے تو انور نے پھر بولنا شروع کیا، 'مسٹر پریسی ڈینٹ سر، میں آپ لوگوں کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔' وہ ایک پل کے لیے رُکا اور سننے والے بھی اِس سوچ میں پڑ گئے کہ آخر وہ ایسی کیا بات بتانے والا ہے۔ انور نے کہنا شروع کیا، 'بات یہ ہے کہ میں نے اپنی تقریر لکھ لی تھی اور اُسے طوطے کی طرح رٹ لیا تھا، لیکن جب میں یہاں بولنے کے لیے کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مجھے اُس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہ گیا ہے۔'

لوگ ہنس پڑے۔ لیکن اِس بار اُن کی ہنسی میں وہ پہلے والا زہر نہیں تھا انھیں اُس کی لاچاری دیکھ کر سچ مچ مزا آرہا تھا بلکہ وہ اُس کی ہمت کی داد بھی دے رہے تھے کہ اُس نے سب کے سامنے اِس بات کو مان لیا۔

'تقریر رٹنا میری غلطی تھی، اب میں یہ غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ میں اپنی تقریر کے الفاظ البتہ بھول گیا ہوں لیکن میں یہ تو نہیں بھولا ہوں کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا اور وہ سب میں سیدھے سادے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔ میں اُن بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں کر سکوں گا جو میں نے آپ لوگوں پر رُعب ڈالنے کے لیے رٹ لیے تھے۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگ بہت سی بکواس سے بچ گئے۔' سننے والوں میں ایک بار پھر ہنسی کی لہر دوڑ گئی اور انور کی اِس بات میں انھیں بہت مزا آیا۔

'لڑکا ہے بڑے جگرے والا۔ اور سوجھ بوجھ والا بھی ہے۔' سننے والوں نے اپنے دل میں کہا۔

اُس کے بعد تو سننے والے انور کی مٹھی میں تھے اور وہ انھیں اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اُن کے سامنے کوئی سیاسی دلیلیں پیش نہیں کیں، سیاست اور فلسفے کے بڑے بڑے مستند ماہروں کے رُعب دار فقرے نہیں پیش کیے۔ کوئی لمبے چوڑے اعداد وشمار اُن کے سامنے نہیں رکھے، اُس نے اُن کے سامنے لیکچر جھاڑنے کی کوشش نہیں کی، وہ تو اُن سے زندگی کی سیدھی سادی حقیقتوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ اُن کے سامنے اپنے تجربے کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس بات کو بھول گیا کہ وہ ڈیبیٹ میں حصہ لے رہا ہے، اُس نے چٹخے دار زبان استعمال نہیں کی، اپنے مخالفوں کی دلیلوں کو کاٹنے کی کوشش نہیں کی، اُس نے تو بس یہ کیا کہ

حقیقت کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا ویسا ہی اُن کے سامنے پیش کر دیا۔ اُس نے انھیں کا کا رامیشور دیال کے ساتھ اپنے ابا کی دوستی کے بارے میں اور گوپال اور رتن کے ساتھ خود اپنی دوستی کے بارے میں بتایا۔ اُس نے انھیں دلّی کے فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں بتایا۔ حالانکہ وہ انھیں یہ نہیں بتا سکا کہ اُس رات اُسے اور گوپال کو کہاں پناہ ملی تھی۔ اُس نے انھیں مہاتما گاندھی کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں اور یہ بھی بتایا کہ اُس چھوٹے سے عظیم شخص نے فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کے لیے کس طرح اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ آخر میں اُس نے انھیں بتایا کہ اُس نے جلیاں والہ باغ میں خود اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا اور سننے والوں کے سامنے اُس خوفناک حادثے کی ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی۔ مست، بے فکرے لوگوں کی بھیڑ میں گھومتے ہوئے دو لڑکے، دیش بھگتی کے نعرے اور تقریریں، 'وہ آگئے، وہ آگئے' کی آوازیں، اپنا پستول دکھاتا ہوا وہ لال منہ والا جرنیل، آگ اُگلتی ہوئی بندوقیں، درد سے کراہتا ہوا نندو اور سینہ تان کر جرنیل کی طرف بڑھتا ہوا اجیت سنگھ جو گولیوں کی آواز سے بھی اُونچی آواز میں چلّا کر گولی چلانا بند کرنے کو کہہ رہا تھا اور جس کے دل میں اُس تمغے کو چیرتی ہوئی ایک گولی لگی تھی جو اُسے ایک انگریز افسر کی جان بچانے کے لیے انعام میں دیا گیا تھا۔ اِس کے بعد انور نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا 'اور پھر مسٹر پریسی ڈینٹ پورے باغ پر موت کا سنّاٹا چھا گیا اور صرف زخمی اور مرتے ہوئے لوگوں کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے وہ آوازیں آج تک سنائی دیتی ہیں۔ ہم سب لوگوں کو اُس دردناک واقعہ کے نو برس بعد آج وہ کراہیں سنائی دے سکتی ہیں۔' اِس کے بعد اُس کی آواز یکا یک اُونچی ہوگئی 'جن لوگوں نے جلیاں والہ باغ میں اپنا خون بہایا تھا اُن کا خون بیکار نہیں جائے گا۔ انھوں نے اپنی جان اِس لیے دی کہ ایک دن ہم آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ اُس دن ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کا خون ایک ساتھ بہا تھا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل الگ ہے انھیں پہلے مستقبل کی اِس دھارا میں سے سب کو الگ الگ کرنا ہوگا!'

جب وہ اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھا تو سب نے تالیاں بجائیں۔ انور کو اپنی تقریر کے جوش کی وجہ سے چکّر آرہا تھا اور اُس نے جیسے دھند لکے کے ایک پردے کے پیچھے دیکھا کہ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی دو خوب صورت آنکھیں بڑی تعریف کے انداز میں اُسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ

جانتا تھا کہ اس کی تقریر بہت کامیاب رہی اور یہ کہ اُس لمحے سے دنیا میں اُس کی بھی پوچھ ہوگی، دنیا میں اُس کی بھی ایک ہستی ہوگی اور یہ کہ اب اُسے کسی بھی بھیڑ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جیسے انسانوں سے سیدھے سادے الفاظ میں بات کرنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

(10)

کئی دن تک انور کے دوست اور اُس کی کلاس کے لڑکے اِس شاندار تقریر پر اُسے مبارک باد دیتے رہے۔ کچھ لوگ دل ہی دل میں اُس سے جلنے بھی لگے تھے اور اِن ہی لوگوں نے انور کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹی سچّی باتیں اُڑا کر اُس کی شہرت کو ختم کر دینے کا بیڑہ اُٹھالیا۔ انور نے محسوس کیا کہ اُس کے بارے میں ہر طرف کچھ کانا پھوسی چل رہی ہے۔ لوگ اُس سے آ کر بڑی معصومیت سے پوچھتے تھے کہ اپنی تقریر کے لیے یہ تخلیقی تحریک کیا اُسے میرلیس روڈ کے چکّر لگاتے وقت ملی تھی۔ دوسرے لوگ اِس بات کا ذکر کرتے کہ سلمیٰ سلیم نے اُس کی تقریر کے بعد بہت زوروں سے تالیاں بجائیں تھیں اور انور کو مبارک باد دیتے کہ انور کے مدّاحوں میں ایسی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ انور کو ان باتوں پر غصہ آتا تھا پر وہ اپنا غصّہ پی جاتا تھا۔ لیکن ایک دن جب وہ پولیٹکل فلاسفی کے لیکچر کے لیے کلاس روم میں گھسا تو اُس نے دیکھا کہ بلیک بورڈ پر ایک کارٹون بنا ہوا ہے جو یقیناً اُس کے اور سلمیٰ کے بارے میں تھا۔ کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ سلمیٰ کہہ رہی ہے۔ ’میرے رومیو، تم نے کتنی اچھی تقریر کی‘ اور جواب میں یہ لکھا تھا، ’یہ سب تمھاری ہی تخلیقی تحریک کے باعث ہوا، میری جولیٹ۔‘ انور نے ایک نظر کارٹون کو دیکھا اور جب وہ پیچھے مُڑا تو ساری کلاس اُس پر ہنس رہی تھی۔ وہ غصّے سے پاگل ہو اُٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو مار بیٹھے، کسی کی جان لے لے۔

’کس نے بنایا ہے یہ کارٹون؟‘ اُس نے گرج کر پوچھا۔ ’اگر ہمّت ہے اُس میں تو وہ سامنے آئے!‘

’کاٹے گا!‘ کسی نے پیچھے سے کُتّے کی بولی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ اور انور اُس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اتنے میں پروفیسر سلیم آ گئے اور وہ لپک کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اب کوئی دھما کہ ہونے والا ہے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ پروفیسر سلیم بلیک بورڈ کو استعمال کرنے سے پہلے کسی لڑکے سے اُسے صاف کروا لیتے تھے۔ آج بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پروفیسر سلیم بہت اچھا پڑھاتے تھے اور بولتے بہت عمدہ تھے، اسی لیے لڑکے اُن کا لیکچر بڑے غور سے سنتے تھے۔ اُس دن وہ یہ پڑھا رہے تھے کہ فرانس میں انقلاب کے وقت کون کون سے سیاسی اُصول مروّج تھے۔ پورے لیکچر کے دوران کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی لیکن انور لیکچر میں اپنا دھیان نہ لگا سکا۔ اُس کے دماغ پر اب بھی اُسی گندے کارٹون کا خیال چھایا ہوا تھا۔

گھنٹہ بجا اور پیریڈ ختم ہو گیا۔ پروفیسر سلیم نے کھٹ سے کتاب بند کر دی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے پیچھے مُڑ کر انور کو بلایا اور کہا 'انور، تم ذرا میرے کمرے میں آ کر مجھ سے مل لو۔'

تو اِس اسکینڈل کی خبر پروفیسر صاحب کے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ انور برآمدے میں اُن کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کلاس میں لڑکے کیا کہہ رہے ہوں گے۔ وہ خوش ہو کر یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اب اُس کی ایسی خبر لی جائے گی کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ لیکن وہ اِس معاملے میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ اِس لیے وہ سیمینار والے کمرے میں کچھ اِس طرح گھُسا جیسے قربانی کا بکرا حلال ہونے کے لیے جاتا ہے۔

'بیٹھو انور' وہ کرسی کے کنارے بیٹھ گیا۔

'اُس دن تم نے بہت اچھی تقریر کی، تم آگے چل کر بہت اچھے مقرر بن سکتے ہو۔'

'تھینک یو، پروفیسر!' اُس نے کہا لیکن دِل ہی دِل میں وہ کہہ رہا تھا، 'اِن سب باتوں سے کیا فائدہ، یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے بکرے کو حلال کرنے سے پہلے اُسے کھلا پلا کر موٹا کیا جاتا ہے، کیوں نہیں آپ چھری نکال کر اِس قصّے کو ختم ہی کر دیتے؟ یہ شش و پنج تو مجھے یوں ہی مار ڈالے گا۔'

'تم دلّی کے اکبر علی صاحب کے بیٹے ہو نا؟'

'جی ہاں'

'بہت مشہور خاندان ہے۔

اور انور سوچ رہا تھا کہ یہ سب تو تمہید ہے، اِس کے بعد اُسے اتنے بڑے خاندان کے بیٹے کی ذمہ داریوں کے بارے میں لیکچر دیا جائے گا، لیکن پروفیسر صاحب کا دوسرا سوال سُن کر وہ دنگ رہ گیا۔

'ہاں انور، تم نے میری بیٹی سلمیٰ کو دیکھا ہے نا؟'

'نو سر۔ میرا مطلب ہے یس سر۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اُسے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔'

'وہ اُس دن ڈیبیٹ میں بھی تھی۔' سلیم صاحب نے اُسے یاد دلایا۔

'جی ہاں جی ہاں، یس سر' اور یہی سوچ کر کہ اب اس کے بعد پروفیسر صاحب کیا کہنے والے ہیں، اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے تو بالکل ہی دوسری بات کہی۔ 'کل اُس کی سال گرہ ہے اور اُس کی خواہش ہے کہ کل تیسرے پہر چار بجے تم ہمارے یہاں چائے پیو۔'

انور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ 'کیا تمھارے لیے آنا ممکن ہوگا؟'

یہ بھی کوئی سوال تھا، کیا جنّت میں جانا اُس کے لیے ممکن ہوگا؟ کیا قوسِ قزح پر ناچنا اُس کے لیے ممکن ہوگا؟ کیا اُس کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ ایک ہی وقت میں روسو، شیکسپیئر اور غالب بن جائے؟

'یا کہیں اور جانا ہے تمھیں؟'

انور جو مخبوط الحواس بنا کھڑا رہا تھا، اُس نے اپنے جذبات کو چھپائے بغیر کہا، جی نہیں کہیں نہیں جانا ہے مجھے، مجھے بے حد خوشی ہوگی آ کر۔ میری طرف سے اپنی بیٹی کا شکریہ ادا کیجیے گا۔ میں وہاں چار بجے پہنچ جاؤں گا۔'

'لیکن میرا گھر معلوم ہے تمھیں؟'

'جی ہاں۔' انور نے سچ سچ کہہ دیا۔ 'میں نے اُدھر سے گزرتے ہوئے آپ کے نام کی تختی لگی ہوئی دیکھی ہے۔'

○

دردِ بے دوا......

(1)

پروفیسر محمد سلیم بی۔اے آنرز (آکسن) نے تین سال تک انگلینڈ میں رہ کر جو بھی ولایتی رسم یا روایت اپنائی تھی اُس سے انھیں بے حد پیار تھا اور اسی لیے انھیں اپنی اِس ولایتی ڈگری سے بھی بہت پیار تھا۔ حالانکہ وہ ادھیڑ عمر کے رنڈوے تھے مگر انھیں اب بھی اپنا ٹریننگ کالج والا ٹینس بلیزر پہننا بہت پسند تھا جس کی اُوپر والی جیب پر کالج کا نشان کڑھا ہوا تھا، لگاتار دُھلتے رہنے کی وجہ سے کوٹ کا کپڑا بالکل گھس گیا تھا اور جیب پر کڑھے ہوئے نشان کا سنہرا کام کالا پڑنے لگا تھا۔ اور حالانکہ کوٹ کئی بار ڈھیلا کیا جا چکا تھا لیکن اب وہ پروفیسر صاحب کی لگاتار بڑھتی ہوئی توند پر کسی طرح آتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ پروفیسر صاحب کے پاس اور بھی بہت سے کوٹ تھے لیکن پھر بھی یہ اُن کا سب سے زیادہ پسندیدہ لباس تھا اور روز شام کو اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلنے جاتے وقت وہ پابندی سے یہی کوٹ پہنتے تھے۔ کیونکہ ایک تو یہ کوٹ اُن کی جوانی کے دنوں کی یادگار تھا اور دوسرے وہ اُس مغربی تہذیب کی نشانی تھا جسے وہ اپنے آکسفورڈ کے دنوں سے پسند کرنے لگے تھے۔

علی گڑھ میں پروفیسر سلیم اپنی پکّی صاحبیت کے لیے بدنام تھے۔ دوسرے پروفیسروں کی طرح وہ نہ صرف مغربی ڈھنگ کے کپڑے پہنتے تھے بلکہ انھوں نے سولھوں آنے مغربی رہن

سہن اپنالیا تھا۔ عید، بقرعید جیسے موقعوں پر بھی وہ شیروانی پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مسجد میں کبھی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے اور انھوں نے کبھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو 'ریشنلسٹ' کہتے تھے اور کھلے عام قدامت پسندی اور پردے کا مذاق اُڑاتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں میں جو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج تھا اُس کی مذمت کرتے تھے۔ اُن کے بارے میں یہ بھی سُنا جاتا تھا کہ جب کبھی وہ انگریز افسروں کی یا انگریزی ڈھنگ سے رہنے والے اپنے دوسرے دوستوں کی دعوت کرتے تھے تو انھیں ایک آدھ پیگ شراب پی لینے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

جو لوگ پروفیسر سلیم کے شروع شروع کے دنوں میں علی گڑھ میں رہ چکے تھے، اُن کا کہنا تھا کہ پروفیسر صاحب کو اپنی زندگی میں ایک بات کا بے حد افسوس تھا۔ وہ کسی بھی طرح اپنی کٹر مذہبی بیوی کو پردہ چھوڑنے اور مغربی ڈھنگ کا رہن سہن اپنانے پر راضی نہیں کر سکے تھے۔ کئی برس تک انھیں اِس بات کا بہت دُکھ رہا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اپنے ساتھیوں سے عورتوں کے پردہ کرنے کے بارے میں بحث کرتے وقت جب کوئی اُن کی بیوی کی مثال اُن کے سامنے رکھ دیتا تھا تو اُن سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا۔ ظاہر ہے اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بہت کم عمر میں جب وہ کالج میں پڑھتے تھے تب ہی اُن کی شادی ہو گئی تھی اور تین سال ولایت میں رہنے کی وجہ سے اُن کے اور اُن کی بیوی کے درمیان ایک وسیع دماغی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے وہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہیں مٹا سکے تھے۔ لیکن چھ برس پہلے جب انفلوائنزا کی بیماری پھیلی تھی تب اُس میں اُن کی بیوی اپنی اکلوتی بیٹی سلمٰی کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ سلمٰی اُس اَن مل، بے جوڑ شادی کا اکلوتا سُکھ بھرا نتیجہ تھی۔ سلیم صاحب اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی بے چاری جاہل بیوی کے مر جانے کے بعد اُس سے نفرت کرتے۔ جب تک وہ زندہ رہی تب بھی انھیں اُس پر ترس ہی آتا تھا لیکن اُس کے مرتے ہی انھوں نے دِل ہی دِل میں مُصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی پر اُس کی ماں کی ذرا سی بھی چھاپ نہ پڑنے دیں گے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اُن کی دیکھ ریکھ میں سلمٰی ایک نئی آزاد عورت بنے گی۔

سلمٰی کا بچپن اکیلے میں گذرا تھا اور وہ کافی دُکھی بھی رہتی تھی۔ اس کی یادداشت کی تہہ میں اُس کے ماں باپ کے جھگڑوں کی تصویر نقش ہو کر رہ گئی تھی کیوں کہ دونوں ہی اپنی بیٹی کو اپنے

اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اگر ماں چاہتی کہ بیٹی قرآن شریف پڑھے تو باپ کی کوشش یہ رہتی کہ اُن کے دوستوں کی محفل میں،ٹوِنکل ٹوِنکل لِٹل اسٹار، سنائے اور اِس طرح اپنی ہونہار اور بے حد تیز بیٹی کے کمال دکھا کر وہ اپنی بیوی کی غیر موجودگی کی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باپ چاہتے تھے کہ اُن کی بیٹی انگریز بچّوں کی طرح سیدھی سادی فراک پہنا کرے اور ماں اُسے چمک دار زری اور ریشم کے کپڑوں سے لاد دیتی اور اُوپر سے بھدّے اور بھاری بھاری زیور پہنا دیتی جنھیں پروفیسر صاحب برداشت بھی نہ کر سکتے تھے۔
اُن دونوں کے بیچ سلمیٰ اپنے آپ کو بالکل لاچار اور بیکس محسوس کرتی تھی۔ ایک ایسی گھر میں پلنے کی وجہ سے جہاں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا تھا، جہاں کسی بھی چیز کے بارے میں ماں باپ کی رائے ایک نہیں تھی، سلمیٰ بچپن سے ہی بہت بکی بکی باتیں کرنے لگی تھی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے اُسے اپنی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور اِس لیے اپنے اِس اکیلے پن سے بچنے کے لیے اُس نے اپنے آپ میں ہی گھُٹ گھُٹ کر رہنا سیکھ لیا تھا۔ دوسروں کی دوستی نصیب نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنے تصور میں دن میں خواب دیکھنا سیکھ لیا تھا۔
اُس کے ابا اُسے پڑھنے کے لیے جو کتابیں لا کر دیتے تھے اُن میں اُس نے خوب صورت سنڈریلاؤں اور جانباز شہزادوں کے کتنے ہی قصّے پڑھے تھے اور اِنہیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے دِل میں نہ جانے کتنے جوشیلے واقعات کے بارے میں سوچا کرتی تھی، جن میں ظاہر ہے سب کی ہیروئن وہ خود ہوتی تھی۔

(2)

ماں کے مر جانے پر سلمیٰ بالکل اپنے ابا کے ہاتھوں میں آگئی۔ انھوں نے فوراً اُسے نینی تال کے ایک کانوینٹ اسکول میں بھرتی کرا دیا جہاں انگریز، اینگلو انڈین اور انگریزی ڈھنگ سے رہنے والے امیر ہندوستانی گھروں کی لڑکیوں کے ساتھ اُس نے بھی اپنی انگریزی مشنری ٹیچروں سے انگریزوں کی طرح انگریزی بولنا سیکھ لیا لیکن سات سو لڑکیوں کے درمیان رہ کر بھی سلمیٰ اکیلی تھی۔ وہ اُن میں گھل مل نہ سکی۔ شروع شروع میں تو اُسے اُن کے بھونڈے اور بھدّے طور طریقوں سے، اُن کے زوردار قہقہوں سے، اُن کے بولنے کے اینگلو اِنڈین طریقے سے اور

چوروں کی طرح جنس کے معاملوں میں کھسر پھسر سے اُسے کچھ نفرت سی ہوئی تھی۔ ماں کی تربیت کی وجہ سے اُس کی نشو و نما میں خالص ہندوستانیت آ گئی تھی جس کو اُس کا باپ اُسے کانوینٹ میں بھیج کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سال میں نینی تال میں رہنے کی وجہ سے وہ لگ بھگ بالکل انگریز کی طرح انگریزی تو بولنے لگی اور انگریزی ادب میں اُسے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ اینگلو انڈین ڈھنگ کا رہن سہن کبھی نہ اپنا سکی۔ زندگی کی طرف، اور محبت کی طرف۔ اُن لڑکیوں کا جو بھونڈا اور بے کیف رویہ تھا وہ سلمیٰ کے رومانی مزاج کے بالکل خلاف تھا اور اُسے اُن اینگلو انڈین لڑکوں کے درمیان جنھیں سالانہ سوشل پروگراموں اور ایسے ہی دوسرے موقعوں پر لڑکوں سے ملنے دیا جاتا تھا، اُس کے اپنے سپنوں کا شہزادہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

سلمیٰ نے بہت کم عمر میں سینئر کیمبرج پاس کر لیا۔ اُس وقت وہ سولہ سال کی تھی۔ اُس کے بعد وہ علی گڑھ کے گرلس کالج میں داخل ہو گئی کیوں کہ اُس کے ابا چاہتے تھے کہ وہ اُن کے پاس رہ کر گھر کی دیکھ بھال کرے اور اپنے خوشگوار مستقبل کے لیے کامیاب شادی کے لیے، تیاری کرے۔ پروفیسر صاحب بہت دُور کی سوچتے تھے اور بیٹی کے مستقبل کے بارے میں وہ کسی طرح کا جوا نہیں کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ اُس کے لیے اچھا شوہر ڈھونڈنے کا کام نہ تو اس رومانٹک لڑکی کی ہر پل بدلنے والی پسند پر چھوڑ سکتے تھے اور نہ ہی پُرانے ڈھنگ سے وہ اُس کے لیے لڑکا تلاش کروانے کو تیار تھے۔ اُن کی تجویز یہ تھی کہ وہ کسی اچھے نوجوان کو ڈھونڈ کر اُسے پڑھنے لکھنے میں مدد دے کر کوئی ایسی اچھی نوکری دلا دیں گے جو سلمیٰ جیسی خوب صورت اور ہوشیار لڑکی کے شوہر کے لائق ہو۔ اُن کی نظر میں انور بہت اچھا 'کچا مال' تھا اُس میں تازگی تھی، بول چال میں بہت تمیز دار تھا، سمجھ دار تھا اور پڑھائی میں اچھا تھا، وہ نئے خیالات کا تھا اس لیے سلیم صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنی بیوی کو پردے میں نہیں رکھے گا۔ تھوڑی سی مدد سے وہ آئی سی ایس کا امتحان آسانی سے پاس کر سکتا تھا اور کچھ دن بعد سلمیٰ ایک کلکٹر کی بیوی بن سکتی تھی۔ ایک لڑکی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

لیکن پروفیسر صاحب کافی چالاک تھے اِس لیے وہ اپنی بیٹی کو اپنے پلان کا پتہ نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس کے رومانی خوابوں کی دنیا اُجڑ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ یہی سمجھے کہ وہ اپنا شوہر خود پسند کر رہی ہے۔ 'زبردستی کی شادی' کا خیال پروفیسر صاحب

کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کیوں کہ انھیں اپنے 'معقول' ہونے پر بڑا ناز تھا، لیکن اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے تو محبت کی شادی بھی 'طے' کرائی جا سکتی ہے۔ پروفیسر صاحب اتنے بیوقوف بھی نہیں تھے کہ شروع سے ہی انور کا دماغ خراب کر دیتے۔ اِس لیے سلمیٰ کی سال گرہ کی دعوت میں کچھ اور چُنے ہوئے لڑکوں کو بھی دعوت دی گئی تھی جن میں راز بھی تھا۔ اِس لیے نہیں کہ پروفیسر صاحب یہ سمجھتے تھے کہ اُس چکنے چپڑے شاعر کو کبھی بھی سلمیٰ کے ساتھ شادی کرنے کے خواب دیکھنے کی اجازت دی جاسکتی تھی، بلکہ اس لیے کہ شاعروں کو ہمیشہ سے فیشن ایبل عورتوں کا دل بہلانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، وہ دو چار نظمیں پڑھ کر سنائے گا تو محفل میں رنگ آجائے گا۔

(3)

انور دعوت میں تو گیا لیکن وہ سارا وقت بہت دُکھی رہا۔ اُسے یقین تھا کہ پروفیسر صاحب اور سلمیٰ دونوں ہی پر اُس کا 'امپریشن' اچھا نہیں پڑ رہا ہے، حالانکہ وہ جان لڑا کر اِس کوشش میں تھا کہ وہ اِس سنہرے موقع کا فائدہ اُٹھا کر سلمیٰ سے دوستی پیدا کرلے۔ عثمان کو بھی بُلایا گیا تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ انور کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ پہنچا کہ عثمان درمیان میں سلمیٰ پر فقرے بھی کستا جاتا تھا۔ سلمیٰ اپنے سفید لباس میں کسی دیوی کی طرح خوب صورت اور سنجیدہ لگ رہی تھی۔ راز ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اور چونکہ پروفیسر صاحب نے خود اپنی طرف سے لڑکوں کو سگریٹ پینے کی اجازت دے دی تھی اِس لیے وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور دھوئیں کے چھلّے بنا کر چھت کی طرف پھینک رہا تھا۔ دوسرے لڑکے بڑی بے حیائی سے سلمیٰ کی چاپلوسی کر رہے تھے، اُس کے ہر لفظ کو بڑے غور سے سن رہے تھے اور اگر وہ کوئی ذرا سی بھی ہنسی کی بات کہہ دیتی تھی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیتے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنا عجیب شکل کا پائپ، جو وہ پچھلی بار سوئٹزرلینڈ سے لائے تھے، منہ میں لگائے ہوئے بڑی دریا دلی سے مسکرا کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب کوئی لڑکی پہلی بار اپنے آدھے درجن مدّاحوں سے ملے تو اُس کے شریف باپ کو یہی صورت اختیار کر لینی چاہیے۔

انور کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سلمیٰ کو دیکھ

رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح اُسے دیکھتا رہے۔ لیکن کچھ دیر بعد اُس نے سوچا کہ اِس طرح گھورنا بہت بیوقوفی ہے، اِس لیے وہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ اُس نے بھی بات چیت میں حصّہ لینے کی کوشش کی لیکن اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے وہ اتنی زور سے بولا کہ سب نے بھویں چڑھا کر اُسے دیکھا اور وہ شرما کر چپ ہوگیا۔ سلمیٰ اُس پر بہت مہربان تھی اور درمیان میں اُس سے پوچھ لیتی تھی 'مسٹر انور علی آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں' اور یہ کہہ کر وہ سموسے یا کیک کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھا دیتی تھی۔ انور اِس ڈر سے انکار نہیں کر پاتا تھا کہ کہیں اِسے اُس کی بدتمیزی نہ سمجھ لیا جائے اور اس لیے وہ ہر چیز کو 'تھینک یو سو مچ' کہہ کر قبول کر لیتا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی پلیٹ اُوپر تک بھر گئی تھی اور وہ اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ کھا بھی نہیں پا رہا تھا۔ اِس پر سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ اُس کے ہاتھ سے گر کر ایک پلیٹ ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ سلمیٰ نے اُسے چائے بنا کر دی اور اُس کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کو دیکھنے میں وہ کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اُس نے پیالی تو پکڑ لی مگر پلیٹ نیچے گر گئی۔ سلمیٰ اور پروفیسر سلیم دونوں ہی نے اُس سے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے لیکن وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بہانے سے اُٹھ کر وہاں سے چلا جائے۔ لیکن اتنے میں کسی لڑکے نے یہ تجویز پیش کی کہ راز اپنی کچھ نظمیں سنائے اور انور کے وہاں سے اُٹھ کر چلے جانے کی نوبت نہیں آئی۔ اور جب سلمیٰ نے بھی بہت جوش کے ساتھ اِس تجویز کی تائید کی تو راز کے سامنے بھی نظمیں سنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

راز نے شروع شروع میں جو غزلیں سنائیں اُن میں تو انور کو کوئی خاص مزا نہیں آیا۔ آخر غالب، ذوق اور مومن جیسے پرانے استاد اس سے کہیں اچھی غزلیں کہہ گئے تھے اور وہ اُن سب کو پڑھ چکا تھا۔ غزل میں سوال اِس چیز کا نہیں ہوتا کہ کیا بات کہی گئی ہے، بلکہ کس انداز سے اور کتنے خوب صورت لفظوں میں کہی گئی ہے۔ اور یہ ظاہر تھا کہ برسوں محنت کرنے کے بعد ہی راز کی غزلوں میں وہ استادانہ مہارت آسکتی تھی۔ لیکن اتنے میں کسی نے 'محبوبہ سے خطاب' کی فرمائش کی۔ پہلے تو راز کو کچھ ہچکچاہٹ ہوئی، 'وہ نظم تو آپ سب لوگ مشاعرے میں سُن چکے ہیں۔ مشاعرے کی بات الگ تھی راز صاحب۔' سلمیٰ نے کہا۔ 'چھوٹی سی محفل میں سننے میں کچھ اور ہی لُطف آئے گا۔' اور عثمان جو ہمیشہ کوئی نہ کوئی فقرہ کسنے کی تاک میں رہتا تھا، بولا کہ اِس قسم کی نظمیں تو صرف ایک کو

سنانے کے لیے ہوتی ہیں۔ سلمیٰ شرما گئی۔ اُس کے گورے گورے گالوں پر لالی دوڑ گئی۔ راز نے عثمان کو گھور کر دیکھا، لیکن پروفیسر صاحب کے ساتھ سب لوگ اِس مذاق پر کھلکھلا کر ہنس دیے۔

راز نے نظم پڑھی لیکن اِس بار کچھ دھیمی آواز میں، اور حالانکہ لفظ وہی تھے، لیکن انور کو اُس میں ایک نیا ہی لطف آیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آواز دھیمی ہونے کی وجہ سے اُس میں یہ انداز پیدا ہو گیا تھا جیسے کوئی بہت رازداری کی بات کہہ رہا ہو؟ اب اِس نظم کو سن کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ شاعر دنیا کو چیلنج دے رہا ہے بلکہ ذاتی طور پر کسی سے فریاد کر رہا ہے، اب اُس میں لفظوں کا زور نہیں تھا بلکہ سچے جذبات اُبھر کر سامنے آ گئے تھے یا اُس کی وجہ یہ تھی کہ سلمیٰ کی موجودگی سے جو اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اتنی دور تھی۔ اُن لفظوں میں انور کے لیے ایک نئے معنی پیدا ہو گئے تھے؟ اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ شاعری بلور کی طرح ہوتی ہے اور ایک ہی نظم میں الگ الگ وقتوں پر ہم اپنے مُوڈ اور ماحول کے مطابق نئے حُسن کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور اُس میں نئے معنی پیدا کر سکتے ہیں۔ اب اُس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ بات کتنی سچ ہے کیوں کہ کچھ ہی دن پہلے جن الفاظ کو سن کر اُس کا دل لرز اُٹھا تھا اُن ہی کا اثر اس وقت اُس کے دل پر بالکل اُلٹا پڑ رہا تھا۔ اُسے اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا، اُس کے دل میں ایک عجیب سی میٹھی بے چینی اُبھر رہی تھی۔ وہ کسی ایسی چیز کے لیے تڑپ رہا تھا جو اُس کی سمجھ کے باہر تھی۔ جتنی دیر راز اپنی نظم پڑھتا رہا اُتنی دیر انور نے سلمیٰ کی طرف نہیں دیکھا کہ کہیں وہ اُسے اُس کی گستاخی نہ سمجھ بیٹھے۔ وہ تمام وقت شاعر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ راز بھی نظریں پھیرے ہوئے لگاتار چھت کے ایک کونے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب نظم ختم ہونے کو آئی تو اُس کی نظریں بھی بھٹکنے لگیں اور جس وقت اُس نے یہ مصرع پڑھا 'تمھارے اک اشارے پر میری جاں......' تو انور نے دیکھا کہ اُس نے جلدی سے ایک نظر سلمیٰ کی طرف دیکھا جو دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے بڑے غور سے نظم سن رہی تھی۔

راز کی نظم ختم ہونے کے بعد کوئی ایک منٹ تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا۔ کوئی بھی نہیں بولا۔ ایسا لگتا تھا کہ نغمہ ابھی تک فضا میں گونج رہا ہے۔ اتنے میں پروفیسر سلیم نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کسی لڑکے نے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ اچانک کمرہ طرح طرح کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔ کوئی کہہ رہا تھا 'پروفیسر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ' اور پروفیسر صاحب سب

سے باری باری کہہ رہے تھے۔ 'تمھارے آنے کا شکریہ، یہ پارٹی بہت اچھی رہی۔' اور عثمان اپنے خاص انداز میں کہہ رہا تھا۔ 'میں تو چاہتا ہوں کہ مس سلیم سال میں کئی بار اپنی سال گرہ منایا کریں اور ہمیں ایسی پارٹیوں میں آنے کا موقع ملا کرے۔' جس کے جواب میں سلمیٰ نے فوراً کہا 'تب تو میں بہت جلد بوڑھی ہو جاؤں گی۔' لیکن انور کو اِس موقع پر کہنے کے لیے ایک بھی فقرہ نہیں سوجھا اور اُس نے رسمی طور پر شکریہ ادا کر کے ہی صبر کر لیا۔

انور سب سے بعد میں وہاں سے چلا اور جب اُس نے پروفیسر سلیم سے ہاتھ ملایا تو انھوں نے انور سے کہا، 'پھر آنا انور' اور اس کے بعد کافی زور دے کر یہ بھی کہا، 'جب جی چاہے آجایا کرو، مجھے یقین ہے کہ تمھارے آنے سے سلمیٰ بھی خوش ہوگی۔ بات یہ ہے کہ یہاں اُس کا کوئی بھی تو دوست نہیں ہے۔' اِس پر سلمیٰ نے بھی کہا، 'ضرور ضرور، جس دن بھی شام کو آپ کو کوئی خاص کام نہ ہو آپ یہاں آجایا کیجیے۔' اُس کے جواب میں انور بار بار صرف باپ بیٹی کا شکریہ ہی ادا کرتا رہا۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ جوان لڑکیوں سے ہاتھ ملانا چاہیے، اِس لیے اُس نے ہاتھ اُٹھا کر آداب عرض کیا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

(4)

انور نے اس کھلی دعوت کا فائدہ اُٹھایا اور دو دن بعد پھر وہاں جا پہنچا۔ پروفیسر صاحب ہمیشہ کی طرح بڑے مہربان تھے اور انھوں نے جس تپاک سے اپنے اِس نوجوان طالب علم کا استقبال کیا اُسے دیکھ کر انور سچ مچ متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر بعد سلمیٰ کمرے میں آئی اور اُس کے ساتھ ہی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو کا ایک جھونکا بھی آیا۔ اُس کے رویّے سے بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ انور کا استقبال کر رہی ہے۔ چائے منگوائی گئی لیکن پروفیسر صاحب کو کلب میں ایک پارٹی میں جانا تھا اِس لیے وہ موٹر لے کر چلے گئے اور اِن دونوں کو وہاں اکیلا چھوڑ گئے۔

انور کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی جوان لڑکی کے ساتھ اکیلا تھا۔ اُس نے سوچا یہ تو بہت انہونی بات ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ جب کوئی لڑکی، وہ نئے ڈھنگ کی لڑکی ہی کیوں نہ ہو، کسی انجان مرد سے ملتی ہے تو اُس کا باپ یا ماں یا کوئی چچا ماموں یا کم سے کم کوئی بھروسے والا نوکر ہمیشہ آس پاس منڈلاتا رہتا ہے لیکن یہاں تو وہ سلمیٰ کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھا چائے

پی رہا تھا اور باورچی خانے میں جو نوکر کھانا پکار ہے تھے اُن کے علاوہ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت ہی خوشگوار صورت تھی لیکن ساتھ ہی انور کو کچھ پریشانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ شرمار ہا تھا اور کچھ اُسے اُلجھن بھی ہو رہی تھی۔ وہ سلمیٰ کے سوالوں کا جواب ہاں یا نا میں دیتا اور بیچ بیچ میں بڑی دیر تک چُپ بیٹھا رہتا۔ انور نے دیکھا کہ بات کرنے کے معاملے میں سلمیٰ بہت تیز تھی۔ فرّاٹے دار انگریزی بولتے بولتے وہ ایک دم سے صاف ہندوستانی بولنے لگتی تھی۔ وہ دو تہذیبوں کے درمیان پلی تھی اور مغرب اور مشرق کی تہذیب کے ملے جُلے اثر نے اُس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ اُس میں انگریزی اسکول کی پڑھی ہوئی لڑکی کی بے باکی بھی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں کھُل کر بات کر سکتی تھی، لیکن ساتھ ہی چونکہ وہ اپنی ماں کی بیٹی تھی اس لیے اُس کی آنکھوں میں ایک قدرتی حیا تھی جس کی وجہ سے اُس کا بے جھجک بات کرنے کا ڈھنگ کچھ اور ہی خوب صورت ہو گیا تھا۔

انور نے پہلی مرتبہ سلمیٰ کو اتنے قریب سے اتنی اچھی طرح دیکھا تھا۔ چُست ریشمی کُرتے پر وہ پیلے رنگ کا ایک تنگ اُونی سوئیٹر پہنے تھی جس کی وجہ سے اُس کے جوان جسم کے باغی اُبھار اور نمایاں ہو گئے تھے۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور انور کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اُس کے چہرے پر جو گلابی پن تھا وہ پاؤڈر یا سُرخی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ اُس کی اچھی صحت کی نشانی تھی۔ اُس نے اپنے کالے کالے گھنگھریالے بالوں کی دو موٹی سوٹی چوٹیاں گوندھ رکھی تھیں جو اُس کے چہرے کے دونوں طرف اُس کے سینے پر پڑی ہوئی تھیں، اُس کا سر ذرا سا بھی ہلنے پر سانپ کی طرح لہرا جاتی تھیں۔ اُس نے بڑی بے پرواہی سے ہلکے آسمانی رنگ کا جارجٹ کا دوپٹہ اپنے کندھوں پر ڈال رکھا تھا اور انور، جو ابھی شام کی ٹھنڈی ہوا کے تیر کی طرح چبھتے ہوئے تھپیڑے کھا کر آیا تھا، اِس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ آخر وہ اتنی سردی میں اُونی شال کیوں نہیں اوڑھتی۔

'مسٹر انور، یونین میں تو آپ اتنا اچھا بولتے ہیں لیکن یہاں تو آپ منہ بھی نہیں کھولتے۔' سلمیٰ نے اچانک کہا اور انور یہ دیکھ کر شرما گیا کہ اُس کی کھسیائی ہوئی خاموشی کو اس طرح للکارا جا رہا ہے۔

'ارے ہاں، معاف کیجیے گا۔' اُس نے معافی مانگتے ہوئے ہکلا کر کہا، 'میں تو آپ کی باتیں سننے میں بالکل کھو گیا تھا اور پھر—' یہ بات کہنے سے پہلے وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا، 'مجھے آپ سے تھوڑا سا ڈر بھی لگ رہا تھا۔'

'مجھ سے اور ڈر؟' سلمیٰ نے سوچا کہ انور مذاق کر رہا ہے۔

'دیکھیے بات یہ ہے کہ میں آپ جیسی لڑکی سے اِس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔'

اِس بھولے پن سے کی گئی تعریف پر سلمیٰ بہت خوش ہوئی۔ اپنی تعریف سُن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پھر سلمیٰ ہی کیوں نہ خوش ہوتی؟ اُسے یہ پیلی رنگت کا دُبلا پتلا لڑکا اچھا لگنے لگا تھا جو اتنا سیدھا سادہ اور بھولا تھا، لیکن یونین میں اُس کی تقریر سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ بیوقوف نہیں تھا۔ سلمیٰ نے پوچھا کہ وہ تقریر سچ مچ بھول گیا تھا یا اپنی دلیلوں میں زیادہ اثر پیدا کرنے کے لیے اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا اور جب انور نے یہ منظور کرلیا کہ وہ سچ مچ مشکل میں پھنس گیا تھا تو سلمیٰ نے اُسے بتایا کہ اپنے اسکول کے 'یومِ والدین' کے جلسے میں وہ بھی ایسی ہی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اُسے 'مرچنٹ آف وینس' کے عدالت والے سین میں پورشیا کی تقریر سُنانا تھا جسے اُس نے اچھی طرح رَٹ لیا تھا، لیکن اُس نے وہ رَٹی ہوئی تقریر سنانا شروع ہی کیا تھا، 'دی کوالٹی آف مرسی اِز ناٹ اسٹرینڈ۔ اِٹ ڈراپتھ فرام ہیون آن دی پلیس بنیتھ۔ اِٹ اِز ٹوائس بلیسڈ' کہ اتنے میں اُسے ایک ویٹر دکھائی دیا جو اسٹرابیری آئس کریم کی پلیٹیں مہمانوں کو دے رہا تھا۔ سلمیٰ یہ سوچ کر کہ اُس کے لیے آئس کریم نہیں بچے گی، اتنی فکر مند ہوئی کہ وہ پورشیا کی تقریر بالکل بھول گئی۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک آئس کریم کے چھوٹے چھوٹے گلابی پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح بار بار یہی دُہرا رہی تھی کہ 'اِٹ بلیتھ ہم دیٹ گیوز، اینڈ ہم دیٹ ٹیکس۔' اُس نے یہ واقعہ اتنے دلچسپ طریقے سے بیان کیا کہ انور کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ سلمیٰ بھی ہنس پڑی۔ اُس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگنے لگی۔ جوانی کی اُمنگوں سے بھرپور اِس ہنسی سے انور کی ہچکچاہٹ بالکل دُور ہوگئی اور اب اُسے اپنے قریب بیٹھی ہوئی اِس خوب صورت لڑکی سے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اب وہ دونوں دوست ہوگئے تھے۔ جیسے وہ اور گوپال یا وہ اور رتن دوست تھے یا شاید اُس سے بھی زیادہ گہرے دوست!

اور وہ اسی طرح ہنستے رہے، باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کو قصّے سناتے رہے، یہاں تک کہ کمرے میں اندھیرا ہوگیا اور اُس دھندلکے میں صرف سلمیٰ کی دو آنکھیں چمکتی رہیں۔ کسی نوکر نے آکر بتّی جلا دی اور انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی تھی۔ پروفیسر سلیم نے

کلب سے آ کر اُن دونوں کو دوستوں کی طرح باتیں کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ انور اُٹھا اور جانے کی اجازت مانگنے لگا لیکن وہ سلمٰی کا مہمان تھا اور سلمٰی اُس کی ایک بھی بات سننے کو تیار نہ تھی۔ وہ بولی 'ناممکن ہے، تمھیں ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر جانا ہوگا۔'

انور اب روز شام کو پروفیسر سلیم کے گھر پہنچ جاتا اور جب بھی وہ شام کی چائے پینے وہاں جاتا تو ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر ہی لوٹتا۔ انھیں بات چیت کرنے کے لیے روز کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ سلمٰی کو شاعری کا خاص شوق تھا اور انور اقبال یا جوش کی یا کسی نئے شاعر کی کوئی کتاب لے آتا اور اُسے اپنی پسند کی کوئی نظم پڑھ کر سناتا اور جب سلمٰی بھی اُسے پسند کرتی تو اُسے اُس میں ایک نیا ہی مزا آتا۔ کبھی کبھی وہ راز کی غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں بھی لاتا، جو راز اُسے پڑھنے کے لیے دیتا تھا۔ سلمٰی اکثر کہا کرتی تھی کہ راز جیسے نوجوان شاعروں کی شاعری میں ایک ولولہ اور جوش ہوتا ہے، جو پُرانے اُستادوں کی شاعری کی باریکیوں میں نہیں ملتا۔ ہفتے میں ایک بار وہ سنیما دیکھنے جاتے اور سنیما کے پردے پر دوسروں کی خوشی دیکھ کر خوش ہوتے اور اگر تصویر اچھی نہ بھی ہوتی، ٹین کی چھت والے اُس گھٹے ہوئے ہال میں شاید ہی کبھی اچھی تصویر آتی تھی، تب بھی سلمٰی کے پاس رہنے کی وجہ سے انور کو بری تصویر بھی اچھی لگتی۔ کیونکہ پردے پر ہیروئین کی شکل میں اُسے سلمٰی ہی دکھائی دیتی۔

انور اس طرح خوشی کے گلابی دھندلکے میں اپنے دن بتا رہا تھا۔ اُسے اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ سلمٰی کے ساتھ اُس کی دوستی کو لے کر لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں اور انھیں بدنام کرنے کی کتنی کوششیں کرتے ہیں۔ اُس نے سلمٰی کے بارے میں اپنے جذبات کا جائزہ لینے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور اگر کوئی اُس سے کہتا کہ اُسے سلمٰی سے عشق ہوتا جا رہا ہے تو وہ اُس بات کو بدنیتی سے معمور ایک الزام کہہ کر ٹال دیتا۔ اسی طرح ہر نوجوان مرد اپنے آپ کو پھنسانے کے لیے خود جال بُنتا ہے اور کمال یہ ہے کہ جب وہ اُس جال میں پھنس جاتا ہے تو اُسے حیرت اور پریشانی ہوتی ہے۔

(5)

یونی ورسٹی میں دیکھتے دیکھتے ہر طرف 'انور سلمٰی رومانس' کا چرچا ہونے لگا۔ انور کے کمرے میں رہنے والے اُس کے ساتھیوں پر اُس رومانس کا ردِّعمل بالکل ہی الگ الگ ہوا۔ اصغر نے

اُسے پروفیسر سلیم کے گھر پابندی سے جانے کے بارے میں ایک آدھ بار چھیڑا ضرور، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔ راز اپنی الگ ہی ایک دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ وہ نہ کبھی کسی کے بھید جاننے کی کوشش کرتا تھا نہ کسی کو اپنا راز بتاتا تھا۔ لیکن ہر چیز کا مذاق اُڑانے والا عثمان زیادہ کھل کر کہتا تھا۔ جب بھی اُسے موقع ملتا وہ انور کو ایک لڑکی کی وجہ سے اپنی پڑھائی اور اپنے دوستوں کی طرف سے لاپروائی برتنے کے لیے لتاڑتا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا، 'مائی ڈیئر انور، میری بات مانو کوئی بھی لڑکی اِس لائق نہیں ہوتی۔' اگر کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی تو انور اُسے منہ توڑ جواب دیتا اور بڑی سختی سے اُس سے کہہ دیتا کہ اُسے اُس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن بمبئی والا یہ لڑکا اِن معاملات کے بارے میں اپنی رائے اتنے دعوے کے ساتھ دیتا تھا اور اتنے یقین کے ساتھ اپنا فیصلہ سناتا تھا کہ اُس کے آگے انور کو کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا۔ اِس کے علاوہ وہ جانتا تھا کہ عثمان ایک سچا دوست ہے اور اگر وہ کوئی بات سختی سے بھی کہتا تھا تو دل دُکھانے کے لیے نہیں کہتا۔

لیکن پوری یونی ورسٹی میں سینکڑوں لوگ جو باتیں کر رہے تھے اور اُسے اور سلمیٰ کو بدنام کر رہے تھے، اُن کے بارے میں انور کا رویہ یہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ لڑکوں کے کسی گروہ کے پاس سے گزرتا تھا اور اُسے آتا دیکھ کر وہ یکا یک چُپ ہو جاتے تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ اُسی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک دن اُس نے اپنے کانوں سے سُنا کہ وہ لوگ اُس کے بارے میں کس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اُس دن شام کو وہ پروفیسر سلیم کے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ کھیتوں کی طرف ٹہلنے چلا گیا تھا۔ اور وہاں سے سورج ڈھلے لوٹا تھا اور پھر چائے پینے سوئمنگ باتھ ریستوراں میں چلا گیا تھا۔ وہ جا کر چُپ چاپ ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیچ والی بڑی سی میز کے چاروں طرف کوئی آدھے درجن لڑکے باتیں کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ انھیں اُس کے آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ اُس نے چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ اتنے میں اُن لڑکوں کی بات چیت کے دوران بار بار اپنا نام سنا۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے۔ اُسے کسی کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں اُڑانے سے سخت نفرت تھی اور وہ جانتا تھا کہ اُس کے بارے میں اور سلمیٰ کے بارے میں، جس طرح کی باتیں کی

جائیں گی انھیں وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ اِس چیز کو قطعی پسند نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی وجہ سے کسی بے قصور لڑکی کے نام پر کیچڑ اُچھالا جائے۔ انور وہاں سے چپکے سے کھسک جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ویٹر چائے لے آیا اور انور کو اُن کی باتیں سنتے رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُس نے اپنے اوور کوٹ کا کالر کھڑا کر لیا تاکہ کوئی اُسے پہچان نہ سکے۔ اتنے میں انور کو کسی کو یہ کہتے ہوئے سن کر بڑا تعجب ہوا کہ 'دیکھو، تم لوگ انور اور سلمیٰ کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ سراسر بکواس ہے۔' اِن الفاظ کو کہنے والا کونے میں اپنی میز پر سے اُٹھا اور بیچ والی میز کے پاس پہنچ گیا' اور میں تُم لوگوں کو یہاں اِس قسم کی باتیں کرنے نہیں دوں گا۔ سمجھ گئے؟' وہ بہت لمبا چوڑا چھ فٹ کا جوان تھا جو ایک ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ پہنے تھا اور اُس پر ایک پرانی کالے رنگ کی فیلٹ ہیٹ لگائے تھا۔ ریستوراں کی دھندلی روشنی میں اُس کی صورت بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ اُس کی آواز میں بڑا رعب تھا اور چیلنج بھی تھا، جس کی وجہ سے کوئی اُس کی بات ٹالنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ انور اور سلمیٰ کے بارے میں بیہودہ باتیں کرنے والے لڑکے چُپ ہو گئے۔ صرف ایک لڑکے نے دبی زبان میں کھسیا کر کہا کہ 'ہم تو مذاق کر رہے تھے!' اپنا بل دے کر کچھ ہی منٹ بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

انور نے کالا اوورکوٹ پہنے ہوئے اُس آدمی کو پہچان لیا۔ وہ ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اُس کا نام سبحان تھا۔ وہ اُس چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا نام لڑکوں نے 'روسی' رکھ چھوڑا تھا کیوں کہ یہ لوگ ہمیشہ بڑے جوش کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے کہ سوویت یونین میں کیسی ترقی ہو رہی ہے۔ یہ ایک عجیب اور خفیہ سا گروہ تھا جس میں آسانی سے کسی کو گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اِس گروہ کے لوگ اُونچی اُونچی باتیں کرتے تھے اور عام طور پر باہر کے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ اُن کی اِس علیحدگی پسندی پر جھنجھلا کر دوسرے لڑکوں نے نہ صرف اُن سب کو ملا کر پورے گروہ کا ایک نام رکھ دیا تھا بلکہ الگ الگ بھی سب کے نام بگاڑ کر رُوسی ڈھنگ کے کر دیئے تھے۔ سُبحان کو لوگ 'سبحانوسکی' کہتے تھے، موسیٰ کا نام تھا موسی کوف اور ظہیر کا بدل کر ظہیروف کر دیا گیا تھا۔ انور اِن لوگوں سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اِس وقت مشکور ہو کر 'سبحانوسکی' کی میز پر گیا، اِس بات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہ اُس نے بڑی ہمت کا ثبوت دے کر اُسے اِن

اسکینڈل پھیلانے والوں کے حملے سے بچایا تھا۔

'السلام علیکم! میرا نام انور ہے۔'

'میں جانتا ہوں۔ بیٹھو۔' وعلیکم السلام تشریف رکھیے! اُس نے سیدھے سیدھے کہا۔ میرا نام سبحان ہے لوگ مجھے سبحانو سکی کہتے ہیں۔'

'آپ نے اُن لوگوں سے جو کچھ کہا وہ میں نے سنا۔ میں آپ کا شکریہ —'

'ٹھیک ہے۔' سبحان نے اُسے اپنا جملہ پورا کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ 'مجھے اسکینڈل بازی سے سخت چڑ ہے، یہ متوسط طبقے کے اخلاقی زوال کی نشانی ہے۔'

'آپ نے بہت اچھا کیا...... میرا مطلب ہے...... یہ بہت ہی شرم کی بات ہے کہ دو آدمیوں کے پاک اور بے داغ تعلقات کے بارے میں اِس طرح کی غلط باتیں کہی جائیں......'

'مرد اور عورت کے بیچ 'پاک اور بے داغ تعلقات' جیسی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں جب تک مرد نامرد نہ ہو۔ اُن کے تعلقات بالکل ویسے ہوتے ہیں جیسے بکرے اور بکری کے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر آدمی کے کچھ خاص گلینڈز کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اُس میں جنسی رغبت پیدا ہوتی ہے اور اِس جنسی رغبت کے مطابق ہارمون بننے لگتے ہیں۔ مجھے تو اعتراض اِس بات پر ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی لبیڈو (LIBIDO) پر بحث کیوں کرے۔'

بکرے! بکریاں! جنسی رغبت؟ انور دنگ رہ گیا۔ اب سے پہلے کسی نے بھی اُس سے اِس طرح باتیں نہیں کی تھیں۔ یہ باتیں کھلے عام ریستوراں میں بیٹھ کر تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ اُس کے دل کو دھکا بھی لگا اور وہ حیران بھی ہوا۔ اور سب تو ٹھیک تھا لیکن یہ لبیڈو کیا بلا ہوتی ہے۔

'لبیڈو؟' اُس نے تعجب سے یہ لفظ دُہرایا۔

'جسے محبت کہتے ہیں۔ لیکن تمھارے جیسے رومانٹک لوگوں نے اِس لفظ کو اتنا رگڑا ہے کہ اُس کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ گیا ہے۔ تم لوگ جسم کی ایک قُدرتی بھوک کو بلا وجہ روحانیت کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہو۔'

'آپ کو کیسے معلوم کہ میں رومانٹک آدمی ہوں؟' زیادہ تر رومانٹک لوگوں کی طرح انور کو بھی اپنے حقیقت پسند ہونے پر ناز تھا۔

'میں نے تمھاری تقریر سنی تھی۔ تم نے اُس میں دنیا بھر کی رومانٹک بکواس کی تھی— مستقبل کے دھارے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک ساتھ بہنا، وغیرہ وغیرہ۔ تم لوگ تو سمجھتے ہو کہ زندگی شاعری ہے۔ اور سامراجیوں کی توپیں سنگیت کی لَے پر چلتی ہیں۔'

اُس کے بعد پندرہ منٹ تک انور کو زندگی کے بارے میں اور محبت کے بارے میں— مارکس اور فرائیڈ کے اُصولوں پر مبنی ایک ایسا دھواں دھار لکچر سننا پڑا کہ اُس کا سر چکرا گیا۔ پھر بھی اُسے یہ اکھڑ قسم کا دیوانہ سا آدمی بہت اچھا لگا۔ کیوں کہ اُس میں اپنی بات کھل کر کہنے کی ہمّت تھی۔ اُس نے انور کے خیالات اور اُس کے اعتقاد کے کمزور پہلوؤں پر بھی جو حملے کیے اُن کا اثر بھی انور پر اچھا ہی پڑا۔ وہ دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور چلتے ہوئے سبحان نے بڑی بے تکلفی سے اُس کی پیٹھ پر ایک زور کی دھپ لگاتے ہوئے کہا 'تمھارا دماغ کچھ اُلجھا ہوا ضرور ہے، جیسا کہ سب ہی متوسط طبقے کے انٹلکچوئلس کا ہوتا ہے، لیکن اگر تھوڑا بہت پڑھ لوگے تو تمھاری یہ طبقاتی گھٹن دور ہو جائے گی۔ اب بھی تم اچھے خاصے مارکسٹ بن سکتے ہو۔'

(6)

انور اپنے نئے دوست سے رخصت ہو کر سیدھا ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے دماغ میں ابھی کوئی طوفان اُٹھ چکا ہو۔ سبحانوسکی نے جو خیالات ظاہر کیے تھے وہ سچ مچ انقلابی تھے۔ کوئی بھی سماجی اقدار ایسی نہیں تھیں جن پر اُس نے حملہ نہ کیا ہو۔ مذہب، قومیت، اخلاقیات اور محبت! لینن کی رائے کے مطابق اُس نے کہا تھا کہ مذہب ایک افیم ہے جس کی مدد سے حکمران طبقہ عوام کو غافل کر دیتا ہے۔ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لینے کے لیے قوم پرستی سرمایہ داروں کا ایک ہتھیار ہے۔ اخلاقیت نری بکواس ہے اور محبت؟ ویسی ہی چیز ہے جیسے کوئی ایک گلاس پانی پی لے۔ اُس نے بہت موٹے موٹے ڈراؤنے انگریزی الفاظ استعمال کیے تھے جیسے 'ڈائلکٹس'، بورژوازی'، 'پرولتاری'، 'اوڈی پس کامپلکس'، 'فلکسینشز'، 'اِن ہبیشنز' وغیرہ۔ اِن لفظوں سے زیادہ ڈراؤنا اُس کا رویّہ تھا۔ ڈراؤنا بھی اور دلچسپ بھی۔ سبحان نے اپنے رویّے کو OBJECTIVITY کہا تھا اور انور پر SUBJECTIVE ہونے کا الزام لگایا تھا۔ انور کی سمجھ میں یہ

تو آتا تھا کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں آدمی کو واقعیت پسند ہونا چاہیے لیکن وہاں بھی آدمی کی ذات کا دخل ہوتا ہے لیکن کیا کوئی جمالیات اور جذبات کے معاملے میں واقعیت پسند ہو سکتا ہے؟ کیا گلاب کے خوشبو کا تجزیہ کرنے کے لیے اُسے کسی لیباریٹری میں جانچنا ضروری ہے، یا بلبل کے گیت میں بجلی کی لہروں کا پتہ لگانے کے لیے کسی تجربے کی ضرورت ہے؟

ان ہی خیالوں میں اُلجھا ہوا جب انور اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ کھانا میز پر لگا ہوا ہے۔ اصغر کرکٹ کپتان کی پارٹی میں گیا ہوا تھا لیکن راز ہمیشہ کی طرح اندر کے کمرے میں لیٹا لگاتار سگریٹیں پھونک رہا تھا۔ انور کھانا کھانے بیٹھا تو اُسے ایک درد بھرا راگ سنائی دیا۔ راز لیٹا ہوا گنگنا رہا تھا لیکن یہ اُس کی اپنی غزل نہیں تھی۔ انور نے پہچان لیا کہ وہ غالب کی ایک بہت مشہور غزل تھی اور اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ راز بار بار ایک ہی شعر دہرا رہا تھا۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

یہ عشق کی ایک نئی تعریف تھی جو سبحان کی 'پانی کے گلاس' والے نظریے سے کتنی مختلف تھی! غالب کی رائے میں۔ اور عشق کے بارے میں غالب سے بڑھ کر کون جانتا تھا؟ عشق ایک 'دردِ بے دوا__' تھا پھر بھی اُس میں آدمی کو زندگی کا سچا مزا ملتا ہے! پہیلی کے اندر ایک اور پہیلی لگتی تھی، پر اسی پہیلی میں کہیں سچائی چھپی ہوئی تھی۔

راز کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ دوسرے کمرے میں انور بیٹھا ہوا ہے، اِس لیے وہ بڑے ہی درد بھرے لہجے میں بار بار اِسی شعر کو دُہراتا رہا۔ نہ جانے کیوں انور کو ایسا لگا کہ اُس نے سلمٰی کے سامنے اپنی نظم 'محبوبہ سے خطاب' بھی اِسی انداز میں پڑھی تھی اور بار بار اِس شعر کو سننے کے بعد انور کو دھیرے دھیرے اِس بات کا احساس ہوا کہ راز بھی سلمٰی سے محبت کرتا ہے۔ راز بھی؟ کیا مطلب اِس کا؟ اِس طرح کے خیال دل میں لانے پر وہ اپنے آپ پر جھنجھلانے لگا۔ جس لڑکی کو وہ ابھی کچھ ہی ہفتوں سے جانتا ہے، وہ اُسے کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگتی ہو، پر وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے؟ وہ اُن جذباتی بیوقوفوں میں سے نہیں ہے جو کسی لڑکی کو دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو جائیں۔ وہ اور سلمٰی تو بس دوست ہیں۔ کیا وہ خود سینکڑوں بار دوسروں سے یہ

نہیں کہہ چکا تھا کہ وہ سلمیٰ سے عشق نہیں کرتا لیکن اُس کی بات پر یقین کون کرتا تھا۔
کیا وہ خود بھی اپنی بات پر یقین کرتا تھا؟

(7)

انور نے اپنی قربانی کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلمیٰ سے کہے گا کہ راز اُس سے محبت کرتا ہے، وہ راز کی طرف سے وکالت کرے گا اور اُن کی شادی کرا دے گا۔ اپنے تصور میں اپنے آپ کو ایک مضبوط، خاموش، تیاگ وادی کے رُوپ میں دیکھنے لگا جس نے ایک دوست کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ سلمیٰ اور راز خوش رہیں۔ اُن کی خوشی اُس کے دل میں روشنی کے لیے کافی ہوگی۔ ایک خوب صورت لڑکی اور ایک ذہین شاعر کی جوڑی بہت ہی اچھی رہے گی۔ اِس لیے اُس کے جیسے ٹوٹ پونجیے آدمی کو اُن کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے۔ لیکن اُسے یہ قربانی دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بڑے دن کی چھٹیاں قریب آ گئی تھیں اور اکبر علی نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا کہ وہ اِس بار اپنی چھٹیاں سلام پور میں گزارے کیوں کہ وہ کئی برس سے اپنے تایا ابا اور بھائی بہنوں سے نہیں ملا تھا۔ انور تو علی گڑھ میں ہی رہنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے ابا کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ مگر جب سلمیٰ کو یہ بات بتائی تو اُس نے کہا، 'لیکن تم تو ہمارے ساتھ آگرے چل رہے ہو نا؟'

'آگرہ؟'

'ہاں، اور کیا۔ ابا نے تم سے کچھ نہیں کہا؟ ابا بھی بالکل بھول بھلکڑ ہیں نا؟ تین دن بعد پورے چاند کی رات ہوگی۔ اور ہم تاج محل کو اس کے بھرپور حسن میں دیکھ سکیں گے۔'

انور نے تاج محل نہیں دیکھا تھا۔ چاندنی رات میں اور وہ بھی سلمیٰ کے ساتھ تاج محل دیکھنا۔ سچ مچ جنت کا لُطف آئے گا لیکن وہ راز کو کیسے بھول سکتا تھا۔

'کیا ہم سب لوگ چلیں گے؟' انور نے سلمیٰ سے خود چلنے کا وعدہ کرنے کے بعد پوچھا۔

'ہاں، سب لوگ چلیں گے۔ یعنی میں اور ابا اور تُم۔'

'کیا راز ہمارے ساتھ نہیں چلے گا؟'

'میں نے اُس سے تو کہا نہیں ہے۔' سلمیٰ کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

انور نے اصرار کیا۔ لیکن اُسے بھی ساتھ لے چلنا چاہیے۔ تاج کے خوب صورت باغ میں اُس کی نظم سننے میں بے حد مزا آئے گا۔'

اور انور کے اتنا کہتے ہی بندھ ٹوٹ گیا۔ سلمٰی کے منہ سے لفظوں کی ایک زوردار دھار پھوٹ نکلی۔ راز نے اُسے بہت پیار سے بھرے خط لکھے تھے اور اُن کے ساتھ اپنی نظمیں بھی بھیجی تھیں جو سب اُسی کے بارے میں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس نے سلمٰی کو ایک عجیب مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اُس کے لیے اِن خطوط کو اپنے ابا سے چھپانا ناممکن ہوگیا تھا، اور جب انھیں اِس بات کا پتہ لگا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اُس نے بھرّائی آواز میں کہا 'کتنی بُری بات ہے۔' اور پھر کچھ سنبھل کر بولی۔ 'اُس کا سارا رویّہ بہت شرمناک رہا ہے۔ مجھے تو کسی سے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے لیکن تم سے میں یہ سب اِس لیے کہہ رہی ہوں کہ تُم میرے دوست ہو اور میں تم پر بھروسہ کرسکتی ہوں۔'

اُس وقت انور راز کی پیروی کرنے کا اپنا ارادہ بالکل بھول گیا۔ حُسن اور شاعرانہ تخیّل کی جوڑی ملانے کا خیال اُس نے چھوڑ دیا۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ سلمٰی نے اُسے اپنا دوست کہا تھا جس پر وہ بھروسہ کرسکتی تھی۔

بلکہ اُسے خوشی ہی ہوئی کہ راز اُن کے ساتھ آگرہ نہیں جا رہا تھا۔

(8)

پروفیسر صاحب کی کار آگرہ روڈ پر ایک کے بعد ایک میل کے پتھر پار کرتی ہوئی بھاگی چلی جارہی تھی۔ پروفیسر صاحب موٹر چلانے میں بہت ہوشیار تھے اور حالانکہ شوفر اُن کے ساتھ رہتا تھا، پھر بھی وہ گاڑی ہمیشہ خود ہی چلاتے تھے۔ امریکہ سے یہ ماڈل ابھی نیا ہی آیا تھا اور اُس کے اسپرنگ بہت اچھے تھے لیکن اُس پرانی سڑک میں بے شمار گڈھے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کار آلوؤں کی بوری کی طرح اُچھل پڑتی تھی۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انور اور سلمٰی ہر تکلیف میں ایک نیا ایڈونچر محسوس کرتے تھے اور جب گاڑی کسی بڑے گڈھے میں پھنس کر زور سے اُچھلتی اور اُن کے سر اُوپر لوہے کی چھت سے جا ٹکراتے تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ لیکن کبھی کبھی جب پروفیسر صاحب اپنا کمال دکھانے کے لیے پوری رفتار پر گاڑی موڑتے، یا کسی بیل

گاڑی سے بچنے کے لیے بریک لگاتے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انور اور سلمٰی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ جب بھی ایسا ہوتا تو سلمٰی شرما کر ہنس پڑتی اور انور کے بدن میں بجلی کی ایک لہری دوڑ جاتی۔ اُسے آہستہ آہستہ یہ پتہ چلتا جا رہا تھا کہ خوب صورت لڑکی کے ساتھ رہنے میں جو سُکھ ملتا ہے وہ صرف روحانی سکھ ہی نہیں ہوتا۔

'کیا مارکس اور فرائیڈ کے اُصولوں کو ماننے والا اسجانوسکی ٹھیک کہتا تھا؟'

راستے میں کار پنکچر ہوگئی۔ آگرہ روڈ پر یہ کوئی بات نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب نے تجویز کیا کہ جتنی دیر میں ڈرائیور گاڑی کا پہیہ بدلتا ہے اُتنی دیر میں وہ لوگ پاس کے گاؤں میں چل کر دیکھ لیں، شاید کھانے کے لیے ٹماٹر یا کچھ دوسری سبزیاں مل جائیں۔ ہنستے اور آپس میں مذاق کرتے ہوئے وہ جتے ہوئے کھیتوں کو پار کر کے دور دکھائی دیتی ہوئی جھونپڑیوں کی طرف چل پڑے۔

بچپن میں جب انور اپنے تایا ابا کے یہاں جاتا تھا تو اُس نے گڑگاؤں کے پاس کچھ گاؤں دیکھے تھے۔ اُس نے علی گڑھ کے آس پاس بھی کچی جھونپڑیاں دیکھی تھیں اور اُن کی غربت کو دیکھ کر اُس کا دل رو اُٹھا تھا۔ لیکن اُس وقت انھوں نے جو گاؤں دیکھا اُس کی حالت تو بیان ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر گلی میں دو چار کالے، دُبلے پتلے اور لگ بھگ بالکل ننگے لڑکے کھیل نہ رہے ہوتے تو ایسا لگتا کہ وہ گاؤں نہیں کسی ویران گاؤں کے کھنڈر ہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ کنگالی اور اُداسی نے ہمیشہ کے لیے گاؤں میں اپنا گھر کر لیا ہے۔ ایک بھی جھونپڑی ایسی نہیں تھی جو ٹوٹی پھوٹی نہ رہی ہو۔ ایک بھی مرد یا عورت ایسی نہیں تھی جو چیتھڑے نہ پہنے ہو۔ ایک بھی بچہ ایسا نہیں تھا جو تندرست ہو۔ انھوں نے کئی جگہ پوچھا پر انھیں کہیں اپنے مطلب کی سبزیاں نہیں ملیں۔ پروفیسر صاحب سوچنے لگے کہ یہ لوگ کیا اکال یا کسی بیماری کا شکار رہ چکے ہیں۔ اور اُن کی سماجی دلچسپی جاگ اُٹھی۔ انھوں نے ایک کسان سے پوچھا جس کی پسلیاں اُس کی تنی ہوئی کالی کھال میں سے جھانک رہی تھیں۔ اُس نے جواب دیا کہ فصل تو ہمیشہ جیسی ہی ہوئی تھی اور برسات میں ہمیشہ کی طرح ہیضہ سے اور سردیوں میں نمونیہ سے کچھ لوگوں کے مر جانے کے علاوہ گاؤں میں کوئی بیماری بھی نہیں پھیلی تھی۔ گاؤں میں انھوں نے جو بھیانک غریبی، تباہی اور موت جیسی اُداسی دیکھی وہ وہاں کی مستقل حالت تھی، بالکل اسی طرح جیسے اُن کے سر پر

سرمئی رنگ کا آسمان تھا یا اُن کے پیروں کے تلے گہرے مٹیالے رنگ کی سوکھی زمین۔ جب وہ واپس لوٹے تو دیکھا کہ اُن کی موٹر کو بھوکے بچّوں کے گروہ نے گھیر رکھا تھا جو بھیک مانگ رہے تھے۔

انور کی ساری خوشی ختم ہوگئی اور جب وہ نہر کے کنارے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے رُکے تو انور کو اُن شامی کبابوں اور پراٹھوں اور بھُنی ہوئی مُرغیوں میں کوئی مزا نہیں آیا جو سلمٰی اپنے ساتھ بید کی ایک ٹوکری میں لائی تھی۔ جب موٹر سفر کی آخری منزل طے کر رہی تھی، اُس وقت سلمٰی نے اپنے ساتھی کے چہرے پر ایک اُداسی دیکھی لیکن وہ سمجھ دار تھی اس لیے اُس نے بیکار کے سوال پوچھ کر اُسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُسے باتونی لڑکوں سے سخت چڑ تھی جو تمام وقت اپنا رُعب جمانے میں اتنا مصروف رہتے تھے کہ انھیں اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا تھا اور اُسے اُداس چہرہ بنائے اپنے پاس بیٹھا ہوا یہ لڑکا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی ایک مسکراہٹ سے اُس کی ساری اُداسی دور کر سکتی ہے۔

(9)

محراب دار پھاٹک میں سے تاج محل کو پہلی بار دیکھتے ہی انور تو خوشی کے مارے ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کوئی چیز اتنی خوب صورت اور حسین بھی ہوسکتی ہے۔ انور کی آتما اُس سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک آواز نے کہا 'یہ تو محض پتھر ہے، سلمٰی کو دیکھو جیتا جاگتا تاج محل ہے۔' ایک دوسری آواز نے کہا 'دو مُردہ لوگوں کے لیے اتنی بڑی اور شاندار عمارت جب کہ لاکھوں کروڑوں کسان اُن جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو تم ابھی آگرہ روڈ پر دیکھ آئے ہو۔'

رات کو وہ چاندنی میں تاج محل دیکھنے پھر آئے۔ اب انور کی اُداسی اور نا اُمیدی دُور ہو چکی تھی اور اُس کی روح نے اس نظارے کی جادو بھری خوب صورتی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے پیار کی یہ لازوال یادگار چاند کی کرنوں میں نہائی کھڑی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیگم کی یاد کو اَمر کرنے کے لیے ہی اُس کی تعمیر کرائی تھی لیکن جس جذبے سے مُتاثر ہو کر اُس نے اُس کی تعمیر کرائی تھی، وہ جذبہ عالم گیر تھا۔ وہ سیاست اور معاشیات کی حدوں سے پرے تھا، وہ وقت کی حدوں سے بھی آگے تھا اور اَمر! کئی صدیوں تک ہر مُلک اور قوم کے عاشق، غریب اور امیر، رئیسوں کی بیٹیاں اور کسانوں کی لڑکیاں، یہاں آ کر انسانی فن

کے اِس معجزے کو دیکھیں گی اور سراہیں گی۔ انھیں یہ یادگار ایسی لگے گی جیسے اُن کے اپنے خوابوں کو پتھروں میں منجمد کر دیا گیا ہو، اُن کے جذبات کو صاف ستھرے سنگِ مرمر کے مجسمے کی شکل میں ڈھال دیا گیا ہو، اُن کی آہوں اور آنسوؤں کو ایک جگمگاتے ہوئے بے داغ ہیرے کی شکل دے دی ہو۔ وہ یہاں سے واپس لوٹیں گے تو اُن کے دل پر سے ایک بوجھ اُتر چکا ہوگا اور اُن کا عقیدہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوگا کیوں کہ وہ پیار کی مسلسل بہنے والی دھارا کا امرت پی چکے ہوں گے اور خود اپنے آنسو اُس دھارا میں ملا چکے ہوں گے۔ اپنے شعور کی کسی دُھندلی سی تہہ سے اُسے پروفیسر سلیم کی آواز آتی سنائی دی۔ 'انور تم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا کرو گے؟'

ابھی کچھ طے نہیں کیا ہے، پروفیسر صاحب۔' انور نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے تصورات کے تار کو توڑتے ہوئے جواب دیا۔ 'ابا چاہتے ہیں کہ میں تجارت کروں، لیکن مجھے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس میں۔'

تم نے سول سروس کے مقابلے میں بیٹھنے کے بارے میں کبھی غور کیا ہے؟'

انور نے سرکاری افسر بننے کی بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے کبھی سنجیدگی سے اِس سوال پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ اُسے عام طور پر یہ خیال ضرور تھا کہ وہ سرکاری افسر شاہی کی مشین میں آسانی سے فِٹ نہیں ہو سکے گا، پھر بھی اُس نے پروفیسر صاحب کے اِس سوال کے جواب میں صاف 'نہیں' کہہ دینا بھی مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انھوں نے یہ سوال ایک خیر خواہ کی حیثیت سے پوچھا تھا۔ وہ کوئی گول مول جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ اتنے میں اُسے سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ 'لیکن ابا بیٹھنا تو چاہیے ہی۔ اور اُن کے کامیاب ہو جانے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔'

'ہاں، میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم اگر چاہو تو میں اُس کے قاعدے قانون منگوا دوں اور جو مضامین تم لو اُن میں اسپیشل کوچنگ کا انتظام کروا دوں۔ اگر دو سال بعد بھی بیٹھنے کا ارادہ ہو تب بھی تیاریاں ابھی سے شروع کر دینی چاہییں۔'

انور اِس کے علاوہ کر ہی کیا سکتا تھا کہ پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتا اور اُن سے یہ وعدہ کر لیتا کہ وہ اِس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے گا۔ حالانکہ اُسے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اتنے

سخت مقابلے میں کامیاب ہو سکے گا۔

'نان سنس۔' پروفیسر صاحب نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ 'اگر دوسرے لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں تو تُم بھی کامیاب ہو سکتے ہو بلکہ دوسروں سے زیادہ آسانی سے کامیاب ہو سکتے ہو۔'

اور پھر موٹر میں سے کمبل نکالنے کے بہانے سلیم صاحب انور اور سلمٰی کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے کھسک گئے۔ دونوں سنگِ مرمر کی ایک بنچ پر بیٹھے ایک چوکور تالاب میں ہرے ہرے پانی کی گہرائی میں ایک دوسرے تاج محل کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف صنوبر کے پیڑوں کے سیاہ سائے خاموش کھڑے سرد رات میں کانپ رہے تھے۔ وہ دونوں اکیلے تھے پھر بھی انور کو سلمٰی کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ٹپٹایا ہوا بیٹھا تھا۔ اُس کی زبان پر جیسے کسی نے تالا لگا دیا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ کسی طرح پروفیسر صاحب لوٹ آئیں۔ اتنے میں بادل کا ایک ٹکڑا چاند پر سے گذرا اور تاج نے موتی کی طرح چمکتی ہوئی دھندلے رنگ کی چادر اوڑھ لی جس میں اُس کا رُوپ اور نکھر آیا۔ اس دُھندلی روشنی میں انور نے ہمت کر کے اپنا سر اُٹھایا اور سلمٰی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ سلمٰی کی آنکھیں تو جیسے اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بس ایک نظر! لیکن اُس ایک ہی نظر نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا۔ اُس ایک لمحے میں انور کے سارے شک، سارے ڈر، ساری غلط فہمیاں دُور ہو گئیں۔ چاندنی میں تاج کی خوب صورتی اب اُس کے لیے کوئی باہر کی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ یہی خوب صورتی اُس کے دل میں بھی اپنی چاندنی بکھیر رہی تھی۔ اُس نے جو بہت بڑی دریافت اس لمحے میں کی تھی، اُس کے لیے یہی موزوں ماحول تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ وہ سلمٰی سے محبت کرتا ہے۔ وہ یہ بھی جان گیا کہ وہ بھی اُس سے پیار کرتی ہے اور اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محبت کیا ہوتی ہے، درد کی دوا بھی اور دردِ بے دوا بھی۔

'سلمٰی!' اُس نے دبی زبان میں کہا۔

'انور!' سلمٰی نے بھی اُسی طرح دبی زبان میں جواب دیا۔

جب پروفیسر صاحب کمبل لے کر لوٹے اُس وقت تک اُن دونوں نے اِس کے علاوہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ پھر بھی ساری دنیا بدل گئی تھی۔

(10)

اُن کی موٹر علی گڑھ کی طرف سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ موٹر کی بتّی کی روشنی دو متوازی لکیروں میں دُور تک جا کر آگے اندھیرے میں کھو جاتی تھی۔ انور کو دوسرے دن گھر جانا تھا اور پروفیسر صاحب کو اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں شریک ہونا تھا، اس لیے اُن لوگوں نے سخت سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے اُسی رات لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سرد ہوا تیر کی طرح چُبھ رہی تھی اور انھیں اوور کوٹ اور مفلر کس کر لپیٹ لینے پڑے۔ پروفیسر صاحب فیلٹ ہیٹ اپنی آنکھوں پر جھکائے اوور کوٹ کا کالر کھڑا کیے اور ہاتھوں میں فر کے استر والے دستانے پہنے موٹر چلا رہے تھے۔ ان کے مُنہ میں لگی ہوئی سگریٹ سے موٹر کے اندر دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

پیچھے کی سیٹ پر سلمٰی اور انور گھٹنوں پر کمبل ڈالے ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔ انور کے ہاتھوں نے سلمٰی کے نرم ٹھنڈے ہاتھوں کو ڈھونڈ لیا اور ملائمیت کی لہریں اُن دونوں ہاتھوں کے بیچ بہنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد انور کے گالوں کو سلمٰی کی ریشمی لٹوں نے چھو لیا اور ایک بھینی بھینی مدہوش کرنے والی خوشبو اُس کے نتھنوں میں بس گئی۔ سلمٰی نے اونگھ کر اُس کے کندھے کا سہارا لے لیا تھا۔

باہر اندھیرا اور سردی تھی۔ پیڑوں کی چوٹیوں کے درمیان چیختی ہوئی ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی۔ باہر دور تک جُتے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ باہر اُن کسانوں کے گاؤں تھے جن میں وہ غریبی اور کنگالی اور گندگی کے درمیان اپنی زندگی بسر کرتے تھے، بالکل ویسے ہی گاؤں جیسے انور نے اُسی دن دیکھا تھا۔ باہر ظلم تھا اور ستم تھا اور کروڑوں بے زبان افراد آزاد ہونے کے منتظر تھے۔ باہر جنگلی جانوروں کا خطرہ تھا اور طوفان چیخ دے رہا تھا۔ اندر کا ماحول گرم اور آرام دہ تھا۔ بند موٹر میں ایک گدّے دار سیٹ پر بیٹھا ہوا اور کندھوں سے لگا ہوا کوئی نرم خوشبودار جسم اور دھیرے دھیرے سُلا دینے والی ایک مست خوشبو......

○

سنہری ناگن

(1)

انور کے ابّا نے اتنا زور دیا کہ انور کو مجبور ہو کر اپنے تایا ابّا کے یہاں سلام پور جا کر رہنا پڑا۔ امجد علی کے یہاں جا کر رہنے کا مطلب تھا کہ جیسے کسی راجہ کے یہاں مہمان گئے ہوں۔ رہنے کو عالیشان مکان اور ہر وقت خدمت کرنے کے لیے نوکروں کی ایک پوری فوج...... یہ سچ مچ شاہی ٹھاٹ باٹ تھا۔ انور کا دل اِن سب باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ پوری طرح اس سے نفرت بھی نہیں کر پاتا تھا۔

لیکن اس بار وہاں رہ کر اُس نے بہت مزے لُوٹے۔ وہ رؤف کے ساتھ شکار کھیلنے گیا اور اُسے بے حد مزا آیا۔

اور پھر بلقیس کی بھی تو کشش تھی۔ اب وہ چھوٹی سی شرارت کی پوٹلی نہیں رہ گئی تھی جس کے گالوں پر سیب جیسی لالی ہوا کرتی تھی۔ اور نہ وہ کس کر بندھی ہوئی چوٹی رہ گئی تھی جو بچپن میں کھیتوں میں بھاگتے وقت اُوپر نیچے پھدکتی تھی۔ انور نے دیکھا کہ اب وہ ایک بے حد خوب صورت نوجوان لڑکی ہوگئی ہے اور یہ محسوس کر کے وہ نہ جانے کیوں اُس کے سامنے کچھ سٹپٹایا سا رہتا تھا۔ انور دِل ہی دل میں ہمیشہ اپنے آپ کو دُھتکارتا رہتا تھا کہ وہ اپنی اِس نوجوان تایا زاد

بہن کی جوانی کو دیکھ کر آخر کھسیا کیوں جاتا تھا۔ ہر بار اُس کی آنکھیں جا کر اُس کے سڈول چہرے پر یا اُس کی ٹھڈی کے گڈھے پر جا کر ٹِک جاتی تھی...... اور نہ جانے کیوں اُس کے ہونے والے شوہر سے دل ہی دل میں جلنے لگتا تھا۔

ایک دن انور جب امجد علی کی کوٹھی پر لوٹا تو وہ تھک کر بالکل چُور ہو چکا تھا۔ پہنچتے ہی اُسے پتہ چلا کہ اُس کے خط آئے ہوئے ہیں۔ اُس نے پہلے وہ جانا پہچانا نیلا لفافہ کھولا۔ سلمٰی کا بے حد پیارا لمبا سا خط تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُس کے دن کتنے بے رنگ گزر رہے ہیں اور جاڑے کی بھیانک لمبی شامیں کاٹنا اُس کے لیے کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُسے انور کی بے حد یاد آتی ہے اور اُس نے پوچھا تھا کہ وہ علی گڑھ کب تک لوٹ کر آئے گا۔ 'مجھے پہلے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ تمھارا ساتھ میرے لیے کتنا ضروری ہو گیا ہے، تمھارے بنا زندگی بہت سونی ہے انور۔' اور یہ پڑھ کر اُس کا دل سلمٰی کے لیے تڑپ اُٹھا اور پیار، نرمی اور ممنونیت کے آنسو اُس کی آنکھوں میں چھلک آئے۔

سلمٰی کا خط پھر لفافے میں رکھ کر اُس نے اپنے پلنگ پر گدے کے نیچے رکھ دیا کہ سونے سے پہلے وہ اُسے ایک بار پھر فرصت سے پڑھے گا۔ پھر اُس نے دوسرا لفافہ اٹھایا۔ وہ خط علی گڑھ سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور اُس پر پتہ ٹائپ کیا ہوا تھا اِس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کس کا خط ہو سکتا تھا۔ خط کھولا تو اُسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اُس پر کسی کا نام بھی نہیں تھا، نہ کوئی دستخط ہی تھے۔ لیکن خط پڑھنا شروع کرتے ہی اُسے کوئی شک نہیں رہ گیا کہ وہ خط کس نے لکھا تھا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر رتن نے اُسے اتنے گول مول طریقے سے خط کیوں لکھا ہے۔

لکھنے والے نے اِس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ کاغذ پر انور کا نام بھی نہ لکھا جائے خط اِس طرح شروع کیا تھا۔ 'میرے پیارے دوست۔ تمھارے لیے مجھے پہچاننا مشکل نہیں ہوگا۔ میں سُنہرے گنبد والے شہر والا تمھارا دوست ہوں۔' ظاہر تھا کہ یہ امرتسر کا ذکر تھا۔ 'میں تمھارا وہی ساتھی ہوں جس کے ساتھ بچپن میں ایک دن شام کو تُم اُس باغ میں گئے تھے جہاں خون کے رنگ کے لال گلاب کھلے تھے۔' یہ تو جلیان والا باغ کا ہی ذکر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کا مضمون گول مول ہوتا گیا۔ 'جیسا کہ تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا ہم نے اس باغ کو پھر سے

سجانا شروع کیا ہے، خون کے رنگ کے یہ گلاب ایک ایک کر کے اُکھاڑ کر پھینک دیے جائیں گے اور ایک دن وہ آئے جب اس میں صرف امن کے سفید گلاب کھلیں گے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ زمین پتھریلی ہے اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن ہم نے پہلا کدال مار دیا ہے اور ہمارے راستے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں پر ہمیں اسی طرح کدال چلاتے رہنا پڑے گا۔ اِس سلسلے میں مجھے کسی بھی دن تمھاری ضرورت پڑ سکتی ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ تم میری مدد کرنے سے انکار نہیں کرو گے۔ تم کئی بار دعوت دے چکے ہو کہ میں آ کر تمھارے ساتھ ٹھہروں۔ میں تمھاری اِس دعوت کا فائدہ اٹھانے والا ہوں۔ لیکن پہلے میں یہ معلوم کر لینا چاہتا ہوں کہ کیا اب بھی تم مجھے اپنے یہاں بُلا کر ٹھہرانے کے لیے تیار ہو۔ اس لیے مجھے پتے پر جواب ضرور بھیج دینا— ہرسکھ رائے معرفت پوسٹ ماسٹر، جنرل پوسٹ آفس، لاہور۔ خط پر اپنا نام نہ لکھنا صرف یہ لکھ دینا— تمھیں بہت یاد کرنے والا دوست۔'

لاکھ کوشش کرنے پر بھی انور اُس پُر اسرار خط کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اتنا تو صاف تھا کہ رتن یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ آ کر اُس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن پھر یہ جاسوسی ناول جیسا راز کیوں پیدا کیا تھا اُس نے؟ کیا وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟ لیکن کیسی مصیبت؟ کیا پولیس سے کچھ گڑبڑ ہے؟ یکایک اُس کے دماغ میں ایک چنگاری سی جل اُٹھی۔ وہ بھاگ کر اپنے تایا ابّا کے کمرے میں گیا اور وہاں سے اخباروں کا ایک بنڈل اُٹھا لایا۔ اخبار روز وہاں ڈاک سے آتے تھے پر گھر میں انھیں کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ انور جب سے یہاں آیا تھا تب سے اُس نے بھی کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی خبروں کی سُرخیاں پڑھیں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑتے ہی اُس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر یہاں سے وہاں تک موٹے موٹے حرفوں میں کئی سرخیاں لگی تھیں:

لاہور میں دہشت پسندوں نے انگریز انسپکٹر کا خون کر دیا۔
دن دہاڑے پولیس تھانے کے سامنے گولی چلائی۔
سی آئی ڈی انقلابی طلباء کی تلاش میں۔
سارے پنجاب میں تلاشیاں اور گرفتاریاں۔

اس خبر کا رتن کے ساتھ اس وجہ سے تعلق نہیں تھا کہ اُس نے اپنے خط میں ایسی کوئی بات لکھی تھی، بلکہ انور کے دماغ پر بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ کے لیے نقش ہوگیا تھا اور اُس وقت وہی تصویر اُبھر کر اُس کے سامنے آ گئی تھی۔ جلیاں والہ باغ کے خوفناک حادثوں کی خوفناک تصویر اور اُس کے اُوپر نقش ہوا رتن کا بچپن کا چہرہ جس پر اپنے باپ کے بے رحم خون پر نہ کوئی دُکھ تھا نہ رنج بلکہ اُس کی نظریں کھوئی کھوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام کی ٹھنڈی آگ دہک رہی تھی۔

تو رتن، اُس کا بچپن کا دوست جس کے مُلائم بالوں کی لٹیں اُس کی پیلی پگڑی کے باہر نکلی رہتی تھیں وہ آج دہشت پسند ہوگیا ہے، وہ آج بم اور ریوالور کے راستے پر چل رہا ہے۔ اُس کے لیے مست شرارتی لڑکے کا تصور ایک قاتل کی شکل میں کرنا مشکل تھا۔ پھر بھی جلیاں والہ باغ کے اُس دن والے حادثے کے بعد سے انور کو خیال تھا بلکہ اُسے ڈر تھا کہ اسی طرح کی کوئی بات ہونے والی ہے۔ اب جب کہ اُسے اِس بات کا پتہ چل گیا تھا وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس پر اُسے افسوس تھا یا خوشی تھی۔ انور کی حساس اور بنیادی طور پر عدم تشدد والی فطرت سیاسی خون خرابے کے بالکل خلاف تھی۔ سینڈرس کا خون کر کے — سینڈرس اُس نوجوان انگریز کا نام تھا جو لاہور میں مارا گیا تھا — رتن کے باپ کی موت کا بدلہ کیسے لیا جا سکتا تھا؟ لیکن اِس طرح کے تشدد بھرے کاموں سے اُسے اخلاقی طور پر جتنی نفرت تھی اُس سے کہیں زیادہ اُسے اپنے دوست کو بچانے کی فکر تھی۔ اگر رتن اِن دہشت پسند کاموں میں بہت آگے بڑھ کر حصہ لینے لگا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ کسی دن اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ انور نے اپنے تصور میں اُسے دیکھا کہ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں، وہ جیل خانے میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے، وہ پھانسی کے تختے پر چڑھ رہا ہے، وہ پھانسی کے پھندے میں جھول رہا ہے! وہ ڈر کے مارے کانپ اُٹھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ رتن کے خیالات سے کتنا ہی اتفاق کیوں نہ کرتا ہو پر اگر کسی دن وہ اُس کے یہاں پناہ لینے آیا تو وہ اُسے رکھنے سے انکار نہیں کر سکے گا۔

اُس رات انور دوبارہ فرصت سے پڑھنے کے لیے تکیے کے نیچے سے سلمیٰ کا خط نکالنا بھی بھول گیا۔ اُس کے بجائے اُس نے رتن کا خفیہ خط دوبارہ پڑھا اور فرضی 'مسٹر ہر سکھ رائے' کو خط لکھ کر یہ یقین دلایا کہ وہ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اور یہ بھی لکھ دیا کہ وہ بڑی بے چینی سے اُن کا انتظار کرے گا۔

(2)

سلام پور کی راجدھانی میں اور پوری ریاست میں نئے سال کے میلے کی تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ ہر سال جاڑے میں اِس میلے کی بہار رہتی تھی۔ یہی ایک ایسا موسم تھا جو نواب صاحب اپنی ریاست میں بتاتے تھے، ورنہ گرمیاں یا تو پیرس کے رنگین شہر میں یا پھر مسوری کے پہاڑوں پر گزرتی تھیں۔ اِس سال میلے کے ساتھ ہی ولی عہد صاحب بہادر کے بالغ ہونے کا بھی جشن منایا جا رہا تھا اور اس لیے ہر چیز کا انتظام ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔

پچھلے پندرہ دن سے ریاست کا پورا عملہ، اُوپر سے لے کر نیچے تک، اِس میلے کا انتظام کرنے میں جٹا ہوا تھا۔ سارے وزیر، جن میں انور کے تایا امجد علی بھی تھے، خیمے لگوانے میں مصروف تھے جن میں بہت بڑا کارنیوال لگنے والا تھا۔ ظاہر ہے نواب زادہ صاحب کے لیے جو اپنے بالغ ہونے پر پھولے نہیں سما رہے تھے، بے حد خوشی کا موقع تھا اور کیوں کہ انھیں علی گڑھ سے آیا ہوا یہ کتابی کیڑا لڑکا بہت پسند آ گیا تھا اس لیے وہ ہر جگہ اُسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے — دربار میں، فوجی پریڈ میں جہاں کچھ سو سپاہیوں نے جن کی ڈھیلی ڈھالی وردیاں کسی نیلام سے خریدی گئی معلوم ہوتی تھیں، بہت ہی بھونڈے طریقے سے انھیں سلامی دی تھی، سنیما اور سرکس میں، جو نواب صاحب اور اُن کے مہمانوں کا دل بہلانے کے لیے خاص طور پر کلکتے سے منگوائے گئے تھے، انور کو شروع شروع میں تو کچھ مزا آیا کیوں کہ وہ ہر چیز کو بڑے تعجب اور انہماک سے دیکھتا تھا لیکن یہ فضول خرچی اور ٹزک بھڑک اُس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور کچھ ہی دن بعد وہ چھوٹے موٹے انگریز افسروں، نواب صاحب کے مصاحبوں، ولی عہد صاحب کے خوشامدیوں اور اُن کی ہر وقت کی چاپلوسی کی باتوں سے اُکتا گیا۔

'انور، میں تمھیں نشانہ لگانا سکھاؤں گا۔' نوجوان نواب زادہ کہتا اور ساتھ ہی بغیر کسی جھجک یا شرم کے یہ بھی کہتا کہ 'جانتے ہو اِس پوری ریاست میں مجھ سے اچھا نشانہ کوئی نہیں لگا سکتا۔'

'چھوٹے سرکار، اِس میں کیا شک ہے' کوئی مصاحب اُن کی ہاں میں ہاں ملا کر کہتا۔

اتنے میں دوسرا بول اُٹھا 'ایک دن میں نے خود چھوٹے سرکار کو ایک میل سے زیادہ کے فاصلے سے ایک فاختہ کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔'

اور یہ سن کر تیسرا مصاحب جو سب سے بلند تخیل تھا، سر ہلا ہلا کر کہتا 'مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے، کیا نشانہ تھا! ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔' اور یہ کہہ کر وہ اپنی اُنگلیوں کے سرے ہونٹوں پر رکھ کر زور کی ایک چٹخاری لیتا اور یہ بتاتا کہ وہ نشانہ کتنا اچھا تھا۔ 'سبحان اللہ! کیا نشانہ تھا! بجلی کی رفتار سے فاختہ اِس طرح جا رہی تھی۔۔ اس نے ہاتھ سے لہریا بنا کر بتایا۔ 'اور گولی بھی اُس کا پیچھا کرتی ہوئی بالکل اسی طرح گئی۔' اور پھر اُس نے ہاتھ سے بتایا کہ گولی کس طرح گئی تھی۔ یا پھر لڑکیوں کی باتیں ہوتیں۔۔ ویسی ہنسی مذاق کی باتیں نہیں جیسی کہ یونی ورسٹی کے لڑکے کرتے ہیں، بلکہ اُس قسم کی گندی اور بے ہودہ باتیں جیسی کہ عیّاش اور آوارہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹے سرکار کی عمر کو دیکھتے ہوئے انھیں ہر قسم کی جنسی زندگی کا۔۔ اُس کے عام پہلو کا بھی اور غیر معمولی پہلو کا بھی۔۔ بہت کافی تجربہ معلوم ہوتا تھا اور انور جیسے اناڑی کے سامنے اپنے زیادہ غیر معمولی تجربوں کی تصویر کھینچنے میں انھیں بے حد مزا آتا تھا۔ محل میں بے شمار خوب صورت اور جوان نوکرانیاں تھیں اور چھوٹے سرکار کی ایک تفریح یہ بھی تھی کہ وہ کسی چھوکری کو بُلا کر اپنے ساتھ لفٹ میں لے جاتے تھے اور اور لفٹ بیچ میں روک کر وہ مزا لوٹ کر کچھ ہی منٹ بعد لوٹ آتے تھے، اُن کے گالوں پر لالی ہوتی تھی اور بٹنوں جیسی آنکھوں میں ہوس کی چمک۔ آ کر وہ اپنے مصاحبوں کو سارا قصہ سناتے تھے اور سب سننے والے واہ واہ کرتے تھے۔ یہ والی ذرا شرمیلی تھی! وہ کافی کھائی کھیلی تھی! کسی تیسری کو اپنے جسم کی قیمت میں موتیوں کا ہار چاہیے تھا! چوتھی کسی دن چھوٹے سرکار کے حرم میں لے لیے جانے کے خواب دیکھ رہی تھی! اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے چرچے ہوتے تھے۔۔ یہاں تک وہ انور جو بہت ہی شرافت کے ماحول میں پلا تھا، یہ محسوس کرنے لگتا کہ اُس کا دَم گھٹ جائے گا۔

انور کو بھی اِس رنگین دنیا کا لطف اٹھانے کا موقع دینے کی کوشش کی گئی۔ ایک بار تو یہاں تک کیا گیا کہ اُسے ایک چٹ پٹی چھوکری کے ساتھ لفٹ میں بند بھی کر دیا گیا۔ اُس چھوکری کو بھی اِس ہنس مکھ لڑکے کے ساتھ کچھ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ عین وقت پر بیگم صاحبہ آ گئیں تو انور کی جان چھوٹی۔ بعد میں ایک دن جب اُس کے اِس نواب دوست نے اُس سے چل کر اُن پچاس کے قریب طوائفوں کا۔۔ اُن 'دوسری عورتوں' کا۔۔ معائنہ

کرنے کو کہا جو اِس میلے کے موقع پر مہمانوں کا دل بہلانے کے لیے سارے مُلک سے بلوائی گئی تھیں تو انور کے تو ہوش اُڑ گئے۔

(3)

لوسی لاٹوش ایک کیبرے ڈانسر تھی جس نے فرانسیسیوں جیسا نام رکھ چھوڑا تھا اور وہ بولتی بھی تھی کچھ فرانسیسیوں کی طرح، لیکن یہ بات ہر آدمی کو معلوم تھی کہ وہ کبھی بمبئی سے آگے نہیں گئی ہے۔ نواب صاحب نے اُسے مسوری کے کسی نائٹ کلب میں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اُس پر لٹو ہوگئے تھے۔ وہ اُس پر بہت پیسہ لٹاتے تھے، اُسے بہت قیمتی تحفے دیتے تھے۔ زیور اور کپڑے، عطر اور پھول ہر چیز یہاں تک کہ انھوں نے اپنی ایک بہت پسندیدہ موٹر بھی اُسے دے دی تھی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی ایک ڈیملر روڈسٹر موٹر تھی اور یہ رنگ لوسی کو بے حد پسند تھا۔ انور نے اُسے بس ایک بار میلے میں دیکھا تھا۔ وہ ایک جوہری کی دُکان پر کھڑی موتی کے کچھ زیور پسند کر رہی تھی جن کی قیمت ظاہر ہے نواب صاحب کو دینی تھی۔ پوڈر اور سرخی سے پُتا ہوا چہرہ، اُس کی صفا چٹ بھویں اور اُس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی لال لکیر — یہ سب چیزیں دوپہر کی بے رحم روشنی میں پھیکی اور چپ چپی لگ رہی تھیں۔ انور اُسے دیکھ کر تعجب کرتا رہا کہ آخر اُس میں ایسی کیا بات تھی کہ بوڑھے نواب صاحب جیسا عورتوں کا پُرانا شوقین آدمی بھی اُس کے پھندے میں آگیا تھا؟

لیکن اُس رات جب انور نے اُسے دربار ہال میں کچھ چُنے ہوئے مہمانوں کے سامنے ناچتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ لوسی کیوں کر لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہے۔ جب وہ اچھی طرح سج بن کر، کپڑے پہن کر روپ کو نکھار دینے والی روشنی میں آتی تھی اُس وقت وہ کسی بھی دوسری عورت سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ اُس میں یہ خوبی تھی کہ اُس کے سامنے جتنے بھی مرد موجود تھے سب اپنے کو زیادہ مرد سمجھنے لگتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرد اُس پر لٹو ہو جاتے تھے اور عورتیں اُس سے نفرت کرتی تھیں۔

کسا ہوا چمکدار لباس پہن کر اور سر پر سانپ کے پھن جیسی ٹوپی لگا کر اُس نے سنہری ناگن کا ناچ کیا، یہ اُس کا سب سے مشہور ناچ تھا۔ اُس کا لمبا نازک جسم سپیرے کی مست کر دینے والی دُھن پر ناچتے وقت بالکل سانپ کی طرح لہرا اُٹھتا تھا۔ اُس کا لوچدار جسم، اُبھرا ہوا سینہ، پتلی کمر

اور بھرے ہوئے گول گول کولھے بالکل پانی کی لہروں کی طرح ہلنے لگتے تھے۔ جیسے اُس کے بدن میں ہڈیاں ہوں ہی نہیں، جیسے وہ سچ مچ ایک ناگن ہو، زہریلی ناگن جو کسی کو ڈس کر اُسے ہمیشہ کے واسطے سُلا دینے کے لیے پھن پھیلائے بیٹھی ہو۔

لیکن ناگن کا رُوپ وہ اِس لیے نہیں بھرتی تھی کہ اُسے یہ پسند تھا بلکہ اِس لیے کہ وہ اس کے ذریعے کچھ اور حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اُسے آرٹ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو ناچ کر صرف دوسروں کا دل اپنے قابو میں کرنا چاہتی تھی۔ ناچ میں وہ بالکل ویسی ہی ناگن تھی جس نے حضرت آدم کو سیب کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بین کی دُھن پر وہ لہرا لہرا کر، اِٹھلا اِٹھلا کر، مست ہو کر ناچ رہی تھی، جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ دیکھنے والوں پر جادو سا چھا گیا تھا۔ وہ رقاصہ نہیں تھی، وہ ناگن نہیں تھی، وہ تو ایک چھلاوہ تھی، ایک لُبھانے والی طاقت تھی۔ انور بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُس پر بھی اُس کا جادو اثر کرتا جا رہا ہے اور وہ بین کی دُھن میں بالکل مست ہو گیا تھا کہ اتنے میں کسی نے زور سے اُس کے کُہنی ماری اور اُس کا دھیان ٹوٹ گیا۔ یہ چھوٹے سرکار کی حرکت تھی۔

'اے' اُس نے اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور کے کان میں کُھسر پُھسر کرتے ہوئے کہا۔ 'ذرا بڑے میاں کو دیکھو۔ ایسا لگتا ہے کہ دورہ پڑنے والا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنے پرائیویٹ سونے کے کمرے میں اس تماشے کے دوسرے حصّے کے لیے گرما رہے ہیں۔'

بوڑھے نواب صاحب گنگا جمنی کام کی ایک بہت بڑی کرسی پر بیٹھے جھوم رہے تھے اور ناچ کی دُھن کے ساتھ تال دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہوس کی آگ دہک رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اُن کی آنکھیں ابھی باہر نکل پڑیں گی۔ لوی جانتی تھی کہ اُس کے جادو کا کتنا اثر پڑ رہا ہے، اس لیے وہ بار بار نواب صاحب کے اور قریب جا کر ناچ رہی تھی اور اُن کی طرف دیکھ کر جادو بھری مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں۔

اچانک نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اِس سے پہلے کہ کوئی اُن کا ادب کرنے کے لیے کھڑا ہو پاتا، وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ناچ ایک دَم سے رُک گیا۔ حالانکہ کونے میں بیٹھے ہوئے بین والے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے، اس لیے وہ بین بجاتا رہا۔ اُس بڑے

سے ہال میں گونجتی ہوئی اُس کی بین کی آواز بہت بھیانک لگ رہی تھی کیوں کہ اچانک وہاں بالکل خاموشی چھا چکی تھی۔ نواب صاحب کے خاص مصاحب نے گھبرا کر جلدی سے لوسی کے پاس جا کر اُس کے کان میں کچھ کہا اور اُسے لے کر چلا گیا۔

انور ڈر رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ہوگئی ہے اور یہ کہ اب نواب کا غصہ کسی نہ کسی پر اُترے گا لیکن چھوٹے سرکار نے اُسے یقین دلایا۔ 'کوئی بات نہیں ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب بڑے میاں زیادہ دیر اپنے اُوپر قابو نہیں رکھ سکتے......'

'تمھارا مطلب ہے......'

'ہاں ہاں، بالکل ہی!' چھوٹے سرکار نے آنکھ مار کر حامی بھری۔ 'دراصل، معاملہ اِس سے بھی نازک ہے، بات یہ ہے کہ بڑے میاں اب خود تو کچھ کر نہیں سکتے۔ بس اپنے سامنے کسی دوسرے سے کروا کر ہی مزا لیتے ہیں۔'

(4)

اُس رات کو جشن کے آخر میں جو دعوت ہونے والی تھی وہ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے شروع ہوئی اور انور سوچنے لگا کہ اُس نے اتنا بہت سا کھانا اپنی عمر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ گننے سے کچھ حاصل نہیں تھا کہ کتنی طرح کے کھانے اور پکوان وہاں موجود تھے کیوں کہ کھانے پینے کے شوقینوں کے لیے تو جنّت کا سامان تھا۔ انگریزی ڈھنگ کا کھانا بھی تھا، ریذیڈینٹ صاحب اور دوسرے انگریزی افسروں کے لیے ہندوستانی کھانا بھی تھا، آس پاس کے کچھ راجاؤں کے لیے جو گوشت نہیں کھاتے تھے اُن کے لیے ویجیٹیرین کھانا بھی تھا۔ کوئی آدھے درجن قسم کا سوپ تھا، کوئی ایک درجن قسم کا مُرغ بنایا گیا تھا، کم سے کم چھ قسم کے پُلاؤ تھے اور پڈنگ اور مٹھائیوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔ نواب صاحب ہر چیز چکھتے تھے اور ایک دو نوالے کھانے کے بعد اپنی پلیٹ میں بچا ہوا کھانا میز پر بیٹھے ہوئے کسی دوسرے آدمی کے آگے بڑھا دیتے تھے اور جس کی طرف بھی وہ اپنی جھوٹی پلیٹ بڑھاتے وہ اُسے اپنے لیے بڑی عزت کی بات سمجھتا۔ لیکن اِس بیڑھ عیاش کی پلیٹ میں سے جھوٹا کھانے کے خیال سے ہی انور کو متلی ہو رہی تھی۔

جہاں تک شراب کا سوال تھا، انور کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شرابیں اتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ وہسکی، برانڈی، شمپین اور جن کے نام اُس نے سُن رکھے تھے، اُن کے علاوہ وہاں ہر رنگ کی بے شمار شرابیں اور تھیں۔ پورٹ اور شیری اور ورموتھ اور وَوڈ کا اور برگنڈی، فرانسیسی شرابیں، اسپینی شرابیں اور پُرتگالی شرابیں اور کئی دوسری شرابیں جن کے نام بھی لینا آسان نہیں تھا اور پھر کاک ٹیل تیار کرنے کے چاندی کے برتنوں میں اِن شرابوں کی طرح طرح سے ملا کر کاک ٹیل تیار کی جا رہی تھی اور لگا تار جام بھر بھر کر لوگوں کو دیے جا رہے تھے۔

کیونکہ دعوت بہت باقاعدہ ہو رہی تھی، اس لیے لوسی ایک نیا ڈنر گاؤن پہن کر آئی تھی جس کا گلا اتنا گہرا کٹا ہوا تھا کہ اُس کا گورا گورا سینہ آدھے سے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ نواب صاحب کی بغل میں بیٹھتی، حالانکہ نواب صاحب تو یہی چاہتے تھے۔ اُسے چھوٹے سرکار اور انور کے بیچ میں بٹھایا گیا اور جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی بغل میں بیٹھا ہوا لڑکا شراب نہیں پی رہا ہے تو اُس نے اُسے سوم رس کا مزا لینا سکھانے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لی۔

'کم آن، لوسی' چھوٹے سرکار نے بڑی خوشامد سے کہا 'انور کو بھی پلاؤ نا۔ سارا مزا اُس کی وجہ سے کر کرا ہو رہا ہے'

'تھورنچ یووری، پرنس۔' اُس نے اپنے نقلی فرانسیسی لہجے میں کہا 'پیئے گا کیوں نہیں لیکن صرف اپنی پیاری لوسی کے ہاتھ سے پیے گا۔ وونچو، مائی سویٹ لٹل بوائے؟'

انور کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اُسے اِس طرح سب کے سامنے 'سویٹ لٹل بوائے' کہا جائے۔ شرم کے مارے اُس کا مُنہ لال ہو گیا اور اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا 'نہ — نہ — نو —' تھینک یو میں — میں — آپ جانتی ہیں — میں پیتا نہیں۔'

'کم، کم' سوئیٹی، تمہیں میرے ساتھ تو پینا ہی پڑے گا' اور یہ کہہ کر اُس نے انور کی ران پر ہاتھ رکھ کر جو دھیرے سے دبایا تو انور کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

انور نے دیکھا کہ اُس لمبی سی میز پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیٹھے ہوئے سارے لوگ اُسی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ بُری طرح شرما گیا۔ لوسی نے کسی سے 'نہیں' سننا تو سیکھا نہیں تھا اور اِسی لیے اُس نے کاک ٹیل کا گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور اُسے

پھُسلا پھُسلا کر، اُس کی خوشامد کر کے اور اُسے دھونس دے کر شراب پلانے لگی۔ انور یا تو شراب پی لیتا یا پھر بدتمیزی پر اُتر آتا اور گلاس لے کر توڑ دیتا جس کا مطلب تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور وہ اِس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لیے انور نے لوسی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس خالی کر دیا۔ اِس پر وہاں موجود سارے مہمانوں کو بہت مزا آیا اور کچھ لوگوں نے تو اُس کی تعریف کرنے کے لیے تالیاں بھی بجائیں۔

(5)

انور کو ایسے لگا جیسے دوہری دھار والا تیز اُسترا اُس کے گلے کے نیچے دھیرے دھیرے اُتر رہا ہو۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ یا تو اُس کا دم گھُٹ جائے گا یا پھر وہ خون کی قے کر دے گا۔ پر اُن دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ اُس کا حلق بہت جلد ہی اچھا ہو گیا اور جب یہ دوہری دھار والا اُسترا پیٹ میں اُتر گیا تو اُس کے بدن کے اندر ایک آگ جیسی لگ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اُس کی سانس کے ساتھ اگر لپٹیں نہیں تو دھواں ضرور نکلے گا، لیکن وہ بھی نہ ہوا۔ یہی تو دلچسپ بات تھی، دلچسپ! بے حد دلچسپ!!

انور ہنس رہا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں یا کس بات پر ہنس رہا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ہر چیز بہت دلچسپ تھی۔ اُس کے سر کے اُوپر فانوس بہت خطرناک طریقے سے لٹک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا کوئی پیڑ اُلٹا لٹک رہا ہے۔ سوڈے کی سائفن کی شکل بھی عجیب لگ رہی تھی جس میں سے سوڈا اِس طرح نکلتا تھا جیسے گھوڑا دبانے پر پستول میں سے گولی نکلتی ہے۔ کاک ٹیل بنانے کے برتنوں کی شکل بھی کچھ عجیب تھی اور سفید وردیاں پہنے ہوئے خانساماں بھی عجیب لگ رہے تھے جو ایک خاص دُھن کے ساتھ سنگیت پیدا کرتے ہوئے مست ہو کر کاک ٹیل بنا رہے تھے، جیسے یہ بھی کوئی انوکھا مذہبی کام ہے۔

دلچسپ! بے حد دلچسپ!! انور کے چہرے پر بیوقوفوں جیسی ہنسی کھیلنے لگی۔ وہ کھیسیں نکالے سب کو دیکھ رہا تھا اور اُس کی اِس شکل نے ہر آدمی اور چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر آدمی کتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ نواب صاحب کی چمکتی ہوئی گنجی چاند کے دونوں طرف دو سینگ

نکلے ہوئے تھے اور ریذیڈنٹ کا لال لال چہرہ بالکل بندر کا پچھواڑہ لگتا تھا۔ لوسی بھی جس کی گلابی اور سفید چھاتیاں کھلے گلے والے گاؤن میں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ لیکن وہ اُس گاؤن کے اندر بس اتنی ہی چھپی تھیں کہ اندھا چور بھی پکڑ لے۔ انور نے اِس مذاق پر خود زور کا قہقہہ لگایا لیکن ظاہر ہے وہ کسی کے سامنے اُسے دوہرا نہیں سکتا تھا۔

وہ تو دوسروں کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ وہ کیسی کیسی دلچسپ چیزیں دیکھ رہا تھا۔ نواب صاحب کا سینگ دار چہرہ بکری کا سر بن گیا تھا اور ریذیڈنٹ صاحب ایک پیڑ کی چوٹی پر بیٹھے بلڈاگ کی طرح بھونک رہے تھے، حالانکہ اُن کی صورت اب بھی بندر جیسی لگ رہی تھی۔ موٹے راجہ صاحب کی پگڑی میں ایک منحوس صورت زندہ گِدھ اٹکا ہوا تھا، پر انھیں اُس کی خبر نہیں تھی اور ظاہر ہے انور انھیں کیوں بتانے لگا؟

'اے چھوٹے نواب، یہ اپنے دوست کو بڑھا دو۔ اب لوسی نے اُسے شراب کیا پلا دی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف دیکھتا ہی نہیں!' جب نواب صاحب کی بھنے ہوئے مُرغ کی جھوٹی پلیٹ انور کی طرف بڑھائی گئی تو سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے لیکن انور کھانا ہی کب چاہتا تھا۔ 'لو جلدی سے کھالو' چھوٹے نواب نے اُس کے کان میں چپکے سے کہا 'نہیں تو بڑے میاں ناراض ہو جائیں گے۔' انور کو بڑے میاں کے ناراض ہو جانے کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن اُس وقت اُس کا دل بڑا ہو گیا تھا اِس لیے اُس نے ایک بوٹی اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی۔

(6)

انور کو بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ کب اور کیسے ڈائننگ ہال سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اُسے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کب لڑکھڑاتا ہوا محل کے اُس برآمدے میں جا پہنچا جہاں بہت کم روشنی ہو رہی تھی۔ اور اُسے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ لوسی نے اُسے وہاں کیسے ڈھونڈ نکالا۔ لیکن اُسے صرف یہ محسوس ہوا کہ دو پتلی پتلی لیکن طاقتور بانہوں نے اُسے بڑے جذباتی انداز میں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور ایک چہرہ اُس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے کے چاروں طرف نقلی طور پر سنہرے کیے گئے بالوں کا بڑا سا گچھا تھا۔ اُس کی گرم گرم سانس میں شمپین اور ہوس کی بو بسی ہوئی

تھی، اُس نے اپنے لال لال گیلے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ لپ اسٹک کا مزہ، بھوکے، جذباتی اور تجربہ کار ہونٹوں کا مزا۔ اور پھر ایک پتلی سی سانپ جیسی زبان اُس کے منہ پر پھیرنے لگی۔ پھر اُس کے ہونٹوں میں سے ہوتی ہوئی اُس کے منہ میں چلی گئی، پھر باہر نکلی، پھر اندر چلی گئی۔ بس اس کی وجہ سے سب کچھ ہوا۔ انور کو متلی ہونے لگی۔ اُس نے اپنے آپ کو لوسی کے چنگل سے چھڑا لیا اور بھاگ کر سیدھا لان پر پہنچا۔ وہاں وہ اپنا دُکھتا ہوا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ گیا اور قے کرنے لگا۔

قے کرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اُس کا پیٹ اینٹھ کر نچوڑے دے رہا ہے، لیکن ہر اُلٹی کے بعد اُس کی طبیعت کچھ ہلکی اور بہتر ہو جاتی تھی۔ اُس کے دماغ کے دُھندلے پن میں نہ جانے یہ انوکھا خیال کہاں سے آیا کہ قے کے ساتھ وہ نہ صرف کھانا اور شراب، نواب صاحب کی جھوٹی پلیٹ کا مُرغ اور کڑوی کاک ٹیل، لوسی کی لپ اسٹک کا وہ باسی میٹھا مزا باہر اُگل رہا ہے بلکہ سلام پور آنے کے بعد سے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا وہ سب کچھ نکالے دے رہا ہے، وہ ایک پُورے نظام کو، ایک پورے زندگی کے ڈھرّے کو، ایک پورے زمانے کو، جو سڑ چکا تھا اور زہریلا ہو چکا تھا، باہر نکالے دے رہا ہے۔

○

پیار کا پھندا

(1)

علی گڑھ واپس پہنچ کر انور بہت خوش ہوا۔ دوستوں کے ساتھ برآمدوں کے چکّر یا پھولوں کی کیاریوں کے بیچ دھوپ میں نہائے ہوئے لان پر ٹہلنا اور دنیا بھر کی باتوں کا چرچا کرنا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ سب ہی پر سیاست کا بھوت سوار تھا اور ہر طرف سائمن کمیشن کا چرچا ہو رہا تھا جو اِس بات کا پتہ لگانے کے لیے سارے ملک کا دورہ کر رہا تھا کہ ہندوستانی کس حد تک اپنی حکومت خود چلانے کے قابل ہیں اور ساتھ ہی ملک میں پھیلی ہوئی دہشت پسندی کی لہر کی بھی جانچ کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اِس طرح کی باتوں کا بھی چرچا رہتا تھا کہ ایک نیا اینگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر آیا ہے جس کی دو بہت قاتل جوان لڑکیاں ہیں جن کے درشن کرنے کے لیے اسٹیشن جانا ضروری ہے یا یہ کہ اپنا احمق جوائنٹ مجسٹریٹ چھٹیوں میں گھر گیا تھا اور وہاں سے بڑی پٹاخہ بیوی لایا ہے، اِس لیے یونین کی اگلی ڈیبیٹ میں اُسے بلانا ضروری ہو گیا ہے لیکن اتنے میں کوئی اخبار ہاتھ میں لیے بھاگا بھاگا آتا اور ہانپتے ہوئے کہتا۔ 'ایک اور بم پھٹا اِس بار منماڑ کے پاس' اور نوجوان لڑکیوں کا چرچا چھوڑ کر اہنسا، دہشت پسندی اور مزدوروں کی ہڑتالوں کی باتیں کرنے لگتے......

انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اُس کا دوست راز بھی جسے یوں دنیا کی کسی بات میں دلچسپی نہیں

تھی، اِس بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ چھٹیوں میں لکھنؤ گیا تھا اور اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سائمن کمیشن کے خلاف پُر امن مظاہرہ کرتے ہوئے اور 'سائمن واپس جاؤ' کا نعرہ لگاتے ہوئے کانگریس والینٹیروں پر کس بے رحمی سے انگریز پولس افسروں نے اپنے گھوڑے دوڑا دیے تھے۔ اُس نے بتایا کہ جو لوگ گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے آنے سے بچ گئے تھے اور اپنی جگہ پر ڈٹے رہے تھے، اُن کی کھوپڑیاں لاٹھی سے کھول دی گئی تھیں۔ اِس حادثے کو بیان کرتے وقت شاعر کا چہرہ غصّے سے نیلگوں پڑ جاتا تھا اور اُس کا گلا رُندھ جاتا تھا اور وہ مشکل سے ہی بول پاتا تھا۔ 'یہ — یہ حرامی — انھوں نے جواہر لال تک کو نہیں چھوڑا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایک پولیس افسر کو اُن پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے دیکھا اور کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بھیڑ میں تھے کہ وہ انھیں پہچان نہ پایا ہو۔ وہ سڑک کے بیچ میں اکیلے کھڑے تھے اور چاروں طرف پولیس والینٹروں پر لاٹھیاں برسا رہے تھے، وہ چاہتے تو ایک طرف کو ہٹ جاتے اور اپنے آپ کو بچا لیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ شیر کی طرح بہادری کے ساتھ وہیں ڈٹے رہے۔ ایک گھوڑ سوار پولیس والا اپنی لاٹھی گھماتا ہوا اُن کی طرف بڑھا اور بڑی بے رحمی سے دو لاٹھیاں اُن کی پیٹھ پر جڑ دیں، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ یہ ہے اپنا جواہر! میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایک والینٹیر نے آگے بڑھ کر تیسرا وار — جو جواہر کے سر کو نشانہ بنا کر کیا گیا تھا اپنے اُوپر نہ روک لیا ہوتا تو اُن ظالموں نے انھیں مار ہی ڈالا ہوتا۔'

ہمارا جواہر! علی گڑھ کی طرح ہی سارے ملک کے نوجوان جواہر لال کو بڑے پیار سے اپنا جواہر کہتے تھے۔ وہ اُن کے اپنے تھے، اور وہ سب اُن کے تھے۔ انور کو یاد تھا کہ اُس نے انھیں ڈاکٹر انصاری کے بنگلے پر دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ موتی لال کے چہرے پر رونق تھی اور اُن کے سفید بال چاندی کی طرح چمکتے تھے۔ اُن کی رُعب دار شخصیت کے سامنے اُس وقت انور کو اس خوب صورت اور خاموش نوجوان کی شخصیت کچھ ماند پڑ گئی تھی، پھر بھی انور کو ایک پل کے لیے ایسا لگا تھا کہ خوب صورت چہرے اور کھلاڑیوں جیسے پھُر تیلے بدن میں بہت طاقت چھپی ہوئی ہے۔ انور کو افسوس ہو رہا تھا کہ اُس وقت اُس نے اُن سے جان پہچان کیوں نہ پیدا کر لی کیوں کہ اُس کے بعد ہی وہ نوجوان کے دل و دماغ پر چھا گئے تھے۔ سارے مُلک میں لاکھوں نوجوان انھیں 'ہمارا جواہر' کہنے لگے تھے۔ راز کی باتیں سنتے وقت انور کو اِس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بہت

سارے لیڈروں میں جواہرلال کی طرف ہی نوجوان کیوں کھنچے آتے تھے۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام لیڈروں میں سب سے کم عمر کے تھے؟ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ کھادی کے کپڑے پہن کر بھی وہ اتنے خوب صورت اور اسمارٹ لگتے تھے؟ انور نے کبھی انھیں تقریر کرتے نہیں سُنا تھا لیکن جن لوگوں نے سنا تھا وہ انھیں بہت اچھا مقرر نہیں سمجھتے تھے۔ اصل میں نوجوان نسل کے لوگ اُن کے بولنے کے ڈھنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ جو باتیں وہ کہتے تھے اُن کی وجہ سے انھیں اپنا سمجھتے تھے۔ پُرانے لیڈر بہت سوچ سوچ کر اور رُک رُک کر اپنی بات کہتے تھے اور انھوں نے برسوں کی کوشش کے بعد یہ طریقہ اپنایا تھا۔ لیکن اِن کے مقابلے میں جواہرلال میں نوجوانوں جیسی بے چینی تھی، بلکہ اُن میں نوجوانوں جیسا جوش تھا۔ اُن کی حال ہی کی ایک تقریر کے ایک حصّے کا انور پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اُس نے اُسی حصّے کو اخبار سے نقل کر کے رٹ لیا تھا۔ بنگال اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے جواہرلال نے کہا تھا۔ 'نوجوانوں کی تحریک ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کرے گی، اور ہر چیز کو بدل دے گی، ہر چیز کو تہس نہس کر دے گی۔ یہ بغاوت کا جوش ہے، ہر اُس چیز کے خلاف بغاوت جو بُری ہے۔ یہ ایسی لہر ہے جو انتظار نہیں کرتی، کسی کا انتظار نہیں کرتی۔'

راز کہہ رہا تھا۔ 'اپنا جواہر ہی ایک ایسا لیڈر ہے جس کی بات پوری طرح ہماری سمجھ میں آتی ہے اور جس کے پیچھے ہم چل سکتے ہیں۔' راز میں سچ مچ کی تبدیلی آئی تھی۔ پہلے وہ جاڑوں میں بھی ململ کے بیلدار کُرتے پہنا کرتا تھا لیکن اب اُس نے موٹے سے موٹا کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ کئی مہینے سے اُس نے ایک بھی غزل نہیں لکھی تھی۔ اب وہ صرف انقلابی اور سیاسی نظمیں لکھتا تھا۔ انور نے دیکھا کہ راز اب بائیں ہاتھ سے کوئی چیز نہیں اُٹھا سکتا تھا اُس ہاتھ سے وہ چائے دانی بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ لاٹھی چارج میں اُس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور حالانکہ راز کبھی اِس بات کو مانتا نہیں تھا لیکن انور کو شک تھا کہ جواہرلال پر لاٹھی کا وہ تیسرا وار اُسی نے روکا تھا۔

(2)

سچ مچ یونی ورسٹی واپس آ کر دوستوں کے ساتھ، اُن دوستوں کے ساتھ جن کی رگوں کے خون میں بھی وہی بے چینی کی دھڑکن تھی۔ گرما گرم سیاسی بحثیں کرنے میں انور کو بہت مزا آتا

تھا۔لیکن اِس سے بھی زیادہ خوشی کی بات تو اُس کے لیے یہ تھی کہ وہ ایک بار پھر سلمیٰ کے پاس آ گیا تھا 'جس کے بنا زندگی کی ہر چیز بیکار تھی'۔انور نے اُردو اور انگریزی کی نظمیں بہت پڑھی تھیں، لیکن جیسا کہ ایک بار راز سے بحث کرتے ہوئے اُس نے بڑی حقارت سے کہا تھا کہ اُسے اِن 'عاشق مزاج لوگوں کی بکواس' سے سخت نفرت ہے۔سلمیٰ نے نظم کا سارا راز اُسے سمجھا دیا تھا۔وہ خود دنیا کی ساری شاعری تھی لیکن جلد ہی انور یہ بھی محسوس کرنے لگا کہ اُن کے بڑھتے ہوئے تعلقات میں وقت کا عنصر بہت خلل انداز ہوتا تھا۔

سنیما ہال کے جانے پہچانے اندھیرے میں سلمیٰ کے پاس بیٹھنے میں اتنا لطف تھا۔سردی کا موسم آدھا بیت چکا تھا۔سلمیٰ نے اپنے بدن پر ایک اُونی شال کس کر لپیٹ رکھا تھا۔بتیاں بُجھ گئیں اور پردے پر اشتہار دکھائے جانے لگے۔انور کا ہاتھ چپکے سے سلمیٰ کے چھوٹے سے ملائم ہاتھ تک پہنچ گیا اور اس سردی میں ایک دوسرے کے جسم میں خوشگوار گرمی کی ایک لہری دوڑنے لگی جس نے اُن دونوں کے دلوں کو پیار کے ہار میں گوندھ دیا۔اشتہاروں کے بعد نیوز ریل دکھائی گئی جس میں سلمیٰ کو بہت ہی کم دلچسپی تھی۔انور سوچ رہا تھا کہ شاید اُس میں قومی اہمیت کے بھی کچھ واقعات دکھائے جائیں، اور نیوز ریل میں اِس طرح کا ایک سین تھا بھی۔۔ کلکتہ میں کانگریس کا چوتیسواں اجلاس۔یہ دو مہینے پہلے کا واقعہ تھا،لیکن سچ مچ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا اور انور کے لیے اور سنیما گھر میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماش بینوں کے لیے وہ کسی بھی طرح سے پُرانا اور غیر دلچسپ واقعہ نہیں تھا۔لوگ پردے پر چلتی ہوئی تصویروں کے نیچے چھپے ہوئے الفاظ کو بُدبُدا کر پڑھ رہے تھے۔جب پردے پر عوام کے مقبول لیڈروں کی صورت دکھائی دیتی تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا۔۔ یہ تھے پنڈت موتی لال اور یہ رہے مہاتما گاندھی۔سبھاش بوس جیسے جوشیلے دانشور لیڈر کے جسم پر کانگریس کے والینٹیروں کے کمانڈر اِن چیف کی وردی کچھ بے تکی لگ رہی تھی۔اُس کے بعد انور کو ڈاکٹر انصاری کی جانی پہچانی صورت دکھائی دی اور آخر میں جواہر لال نہرو آئے......اپنے ہیرو کی صورت دیکھتے ہی تماش بین ایک دم نہ صرف تالیاں بجانے لگے بلکہ چند نوجوان تو نعرے لگانے لگے اور انور بھی پورے جوش کے ساتھ تالیاں بجانے لگا۔

اپنا بایاں ہاتھ سلمیٰ کے ملائم گدگدے ہاتھ میں سے نکالتے ہی انور کو ایسے لگا کہ سلمیٰ پر

ایک عجیب ردِّعمل ہوا جس کی وجہ اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک اُسے ایسا لگا کہ سلمٰی اُس سے دور ہوگئی ہے اور حالانکہ وہ اُس کے پاس سے ذرا بھی نہ ہٹی تھی پھر بھی انور کو ایسا لگا کہ ابھی ایک لمحہ پہلے وہ جذبات کے جس بندھن میں بندھے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گیا۔ بغل میں بیٹھی ہوئی سلمٰی میلوں دُور معلوم ہونے لگی۔

نیوز ریل میں دکھائے گئے تاریخی واقعات کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور جب نیوز ریل ختم ہوئی اور پردے پر اصلی فلم کے اداکاروں اور ڈائریکٹر وغیرہ کے نام آنے لگے تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس فلم میں سلوچنا اور بلمور یا کام کر رہے تھے۔ سلمٰی اِس جوڑی کی دیوانی تھی اور انور سمجھتا تھا کہ سلمٰی کے اُس عجیب ردِّعمل کی جو بھی وجہ رہی ہو پر اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن پردے پر پہلی بار سلوچنا کا پورا چہرہ دکھائی دیتے ہی سلمٰی نے اُس کی طرف مُڑ کر کہا۔ 'آؤ چلیں۔' اس سے پہلے کہ انور کچھ کہہ پاتا، سلمٰی اُٹھ کر چل دی۔ وہ لوگوں کے پیروں میں اُلجھتی، اُن کی جھنجھلائی ہوئی باتوں کی پرواہ کیے بنا باہر چلی جا رہی تھی۔

'میں سمجھتا تھا کہ تُم سلوچنا کی فلم دیکھنے کے لیے بہت بے قرار تھیں، ہے نا؟' اُس نے تانگے پر چڑھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی تک بوکھلایا ہوا تھا۔

'ہاں، تھی تو لیکن اب جی نہیں چاہتا۔' سلمٰی نے کہا۔ 'اور پھر یہ بھی بات ہے کہ پاپا آج باہر کھانا کھا رہے ہیں۔ چلو گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔ پھر مجھے تُم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'

بیٹھک کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ انور اور سلمٰی نے صوفہ اُس کی خوشگوار آنچ کے سامنے کھینچ لیا اور بتّی جلائے بغیر ہی وہاں بیٹھ گئے۔۔۔ کھانا کھاتے ہوئے تمام وقت اُس کا رویّہ تو دوستی کا رہا تھا لیکن وہ کچھ دُور دُور سی رہی تھی اور اس وقت بھی، جب کہ وہ اُس کی بغل میں بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر ناچتی ہوئی لپٹوں کی دمک تھی، انور کو اُس کے رویّے میں ایک خاص رُوکھا پن دکھائی دیا۔

'تمھیں سنیما میں کیا ہو گیا تھا؟' انور نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ 'میں تو بالکل ڈر ہی گیا تھا۔'

اُس نے اپنی کالی کالی شفاف آنکھوں سے اُسے اِس طرح دیکھا جیسے اُس پر الزام لگا رہی

ہو۔ اُس کی آواز سے ایسا لگتا تھا کہ اُس کے وقار کو ٹھیس پہنچی ہے۔ انور کے سوال کے جواب میں اُس نے خود ایک سوال پوچھا' تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کیوں کھینچ لیا تھا؟'

'ظاہر ہے، نیوز ریل میں جواہر لال کو دیکھ کر تالیاں بجانے کے لیے! تم کیا سمجھیں؟'

'تو تمھارے لیے جواہر لال کی اہمیت مجھ سے زیادہ ہے!' سلمیٰ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اُسے اِس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ کتنا مضحکہ خیز اور بے تکا مقابلہ کر رہی ہے۔

انور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ تو تمھیں جواہر لال سے جلن ہو رہی ہے!

سلمیٰ کا رُوٹھا ہوا موڈ ٹھیک ہوا اور اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ 'کیوں نہیں۔' اور پھر اس نے انور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ 'مجھے ہر اُس آدمی سے اور ہر اُس چیز سے جلن ہوتی ہے جو تمھیں ایک پل کے لیے بھی مجھ سے دُور ہٹاتی ہے۔'

ایک پل کے لیے تو انور اُس کی آنکھوں میں جذباتی قبضے کی وہ چمک دیکھ کر سہم گیا۔ وہ اُس کی جلن کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے جتنی دلیلیں دینا چاہتا تھا، وہ سب اس کی زُلفوں کی بھینی بھینی مہک کو محسوس کرتے ہی غائب ہو گئیں۔

سلمیٰ کا سر انور کی بانہوں پر ٹکا ہوا تھا اور آگ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت اور دلکش لگ رہی تھی۔ انور نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اُن میں اپنے لیے پیار کا سمندر اُمڈتا دیکھ کر وہ بالکل اُس کے بس میں ہو گیا۔ سلمیٰ کے ہونٹ جن پر لِپ اسٹک کی ایک بہت ہی ہلکی سی تہہ تھی، آدھے کھلے ہوئے تھے اور جب انور نے اُس کے سنگِ مرمر جیسے چکنے ماتھے پر سے اُس کے کالے ریشمی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹائی تو سلمیٰ کی گرم سانس کا ایک جھونکا اُس کے گال کو گدگدا گیا۔ سلمیٰ کے ہونٹوں کو چُومنے کا اُس نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا لیکن نہ جانے کیسے اُس کے ہونٹ سلمیٰ کے ہونٹوں سے چپک گئے۔

اُس نے پہلے کبھی ہونٹ چومے نہیں تھے۔ اُس نے کبھی اپنے ارادے سے کسی لڑکی کے ہونٹ نہیں چومے تھے۔ شراب کے نشے میں لوسی نے جو کچھ اُس کے ساتھ کیا تھا وہ تو بہت ہی گھناؤنا تجربہ تھا جسے اُس نے قے کے ساتھ اُگل دیا تھا۔ اُسے صرف ایک دُھندلا دُھندلا اندازہ تھا کہ 'ہونٹ سے ہونٹ لگانے' کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اب اُسے معلوم ہو گیا لیکن پھر بھی وہ اپنی

خوشی کو نہیں بیان کر سکتا تھا۔ سلمیٰ نے بھی مست ہو کر اُس کا پوری طرح ساتھ دیا اور اُس کے اِس ردِّ عمل سے جوش پا کر انور نے کئی بار اُس کے ہونٹوں کو چوما اور اُسے ایسا لگا کہ اُس کی زندگی کے نازک اور سب سے پیارے تجربے اس ایک پل میں سمٹ آئے ہیں۔ جتنے غروب آفتاب اُس نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے اُن سب کی رنگینی، جتنے پھول اُس نے سونگھے تھے اُن سب کی خوشبو، گیلی مٹی کا مست کر دینے والا سوندھا پن، موسم گرما کی صبح میں بہتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا ملائم لمس، کہیں دُور بجتی ہوئی بانسری کی جادو بھری دُھن، رقاصہ کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی چھن چھن اور مجیروں کی آواز...... اُس ایک پل میں اس کے سارے جُرأت آمیز تصورات بھی سمٹ آئے تھے، اُڑنے والے گھوڑے اور دل کو رجھانے والی حُوریں، ستاروں جڑے کامدانی کے دوپٹے جیسے آسمان تک پہنچتے ہوئے ہاتھ جو اُسے بڑی ملائمت سے دھرتی پر اُتار کر لا رہے تھے۔ اُس ایک پل میں یہ سب تو تھا ہی، اُس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کیوں کہ اس انتہائی خوشی کی گھڑی میں ایک غم کی ٹیس بھی ملی ہوئی تھی اور ایک خواہش کے خاتمے نے دوسری خواہش کو جنم دیا تھا جو رہ رہ کر کانٹے کی طرح چبھتی تھی اور جو پہلی خواہش سے زیادہ زوردار اور زیادہ ڈرا دینے والی تھی۔

آتش دان میں آگ بُجھ چکی تھی۔ سلمیٰ نے اپنے آپ کو انور کی بانہوں سے چھڑایا تو وہ کچھ کپکپا اُٹھی اور بڑے پیار سے انور کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی 'اب تم جاؤ، نہیں تو ہم لوگ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے اور پاپا بھی اب آتے ہی ہوں گے۔'

اس ایک لمحے میں وہ کتنی سمجھدار ہو گئی تھی، کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ سلمیٰ کی بات کا مطلب سمجھ کر انور شرما گیا۔ یہ خیال آتے ہی کہ وہ اپنے جذبات کے جوش میں سلمیٰ کو نقصان پہنچا سکتا تھا، اُسے ایک پل کے لیے ایسا لگا کہ کسی نے اُس کے سینے میں چھرا اُتار دیا ہو۔ سلمیٰ نے جب اُسے راستہ دکھانے کے لیے برآمدے کی بتّی جلائی تو انور کو ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا اُسی کو دیکھ رہی ہے اور سلمیٰ سے وداع ہوتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے جذبات کی رَو میں اور آگے بڑھ گیا ہوتا تو عمر بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

'تمھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے تمھیں پچھتاوا ہو رہا ہو' سلمیٰ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ پچھتاوا؟ وہ سلمیٰ کو بتانا چاہتا تھا کہ اُس نے اُسے کس قدر سُکھ دیا ہے، وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ

سلمیٰ کا کتنا احسان مند ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِس بات کو کیسے کہے۔ اس لیے وہ سلمیٰ کی طرف دیکھتا رہا، اُسے معلوم تھا کہ وہ بیوقوفوں کی طرح اُسے تک رہا ہے، پھر بھی وہ بغیر پلک جھپکائے اُسے دیکھتا رہا لیکن سلمیٰ سمجھ گئی اور مسکرادی اور تب انور بھی مسکرادیا۔

جس وقت وہ احاطے سے باہر نکل رہا تھا اُسے سلمیٰ کی آواز سنائی دی 'بھولنا نہیں، کل اتوار ہے ذرا جلدی آجانا۔'

(3)

جس وقت انور ہاسٹل لوٹا اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر بوسے کا مزا باقی تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور انور نے سوچا تھا کہ راز اور اصغر سو گئے ہوں گے۔ کیوں کہ انور راز کے دل کی حالت جانتا تھا اِس لیے جب بھی وہ سلمیٰ کے گھر سے واپس لوٹتا تھا اُسے ایسا لگتا تھا کہ وہ راز کا گناہ گار ہے اور اب تو وہ لگ بھگ روز ہی سلمیٰ کے یہاں جانے لگا تھا۔ جہاں تک اصغر کا سوال تھا اُسے جذبات چھو تک نہیں گئے تھے اور وہ ہر بات کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اِس لیے وہ انور کو بھی چھیڑتا رہتا تھا اور اُس سے پوچھتا رہتا تھا کہ اُس کا رومانس کس منزل میں ہے۔ لیکن وہ کچھ اِس طرح گھما پھرا کر پوچھتا تھا کہ اُس میں ایک قسم کا بیہودہ پن آجاتا تھا، جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے کمرے میں بتی ابھی تک جل رہی ہے تو وہ اِس بات کے لیے تیار ہوگیا کہ اب کم سے کم آدھے گھنٹے تک اُسے اصغر کے بے ہودہ سوالوں اور راز کی بے تکی خاموشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن جب اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بالکل ہی اجنبی آدمی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دُبلا پتلا لڑکا تھا جس کے چہرے کا رنگ بالکل پیلا تھا۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا اور اُس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بستر بند اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس رکھا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ابھی شام کو ہی وہاں پہنچا تھا اور رات کو اُن کے کمرے میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ 'اصغر یا راز کا کوئی دوست ہوگا' انور نے سوچا لیکن یہ اجنبی اُسے دیکھ کر اس طرح مسکرا کیوں رہا تھا؟ شاید اصغر نے اپنی عادت کے مطابق اُسے بھی انور کے 'رومانس' کے بارے میں بتادیا ہوگا اور اِسی لیے اُس کے چہرے پر ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ انور کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ صورت کچھ دیکھی ہوئی لگ رہی تھی پھر بھی انور اُسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا

تھا جیسے اُس نے یہ صورت کبھی خواب میں دیکھی ہو۔

'ہیلو انور!' آواز بھی پہچانی ہوئی تھی۔ پہچانا نہیں؟'

'کون؟ رتن؟' وہ چلاّ کر اپنے دوست کے گلے سے لپٹ گیا 'لیکن تمھارے بال؟' رتن نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ کر دیا اور جھُک اُٹھانے لیتے ہوئے اصغر اور پیچھے کے کمرے میں لیٹے ہوئے راز کی طرف اشارہ کیا۔ 'بعد میں سب کچھ بتاؤں گا۔' رتن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ 'پہلے یہ بتاؤ کیا میں کچھ دن تک یہاں تمھارے مہمان کی حیثیت سے رہ سکتا ہوں؟ مجھے تمھارا خط ملا تھا اور تم نے جو یقین دلایا تھا اُس کے بھروسے پر میں چلا آ گیا لیکن شاید تم نے اپنا خیال بدل دیا ہو'

'کیسی بات کرتے ہو؟' انور نے جھڑک کر کہا۔ 'اِس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ تم ضرور ٹھہر سکتے ہو اور ٹھہرو گے، یہاں میں تمھارے لیے چارپائی کا انتظام کرتا ہوں۔'

اور وہاں دیکھو میں تمھارے دوستوں کو اپنا نام پتہ بتا چکا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔' اور یہ کہہ کر رتن نے ایک لمبوترا کارڈ انور کے آگے بڑھا دیا جس پر چھپا ہوا تھا۔

'رام چوپڑا، انشورنس ایجنٹ۔'

تو اب رتن اِس نام سے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔

'سمجھ گئے نا؟'

انور نے کارڈ واپس کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ داڑھی مُنڈوا دینے کے بعد رتن پہلے سے زیادہ دُبلا اور پیلا لگنے لگا تھا لیکن اب اُس کے بات کرنے کے ڈھنگ میں ایک نئی خوداعتمادی تھی اور وہ بہت نپے تُلے الفاظ میں اپنی بات کہتا تھا۔ لڑکپن کا جوشیلا پن اب بالکل باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جو یہ جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے، اُسے کیسے پا سکتا ہے، یہ ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جس کے دل میں کوئی شبہ نہیں تھا، کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی، صرف یقین تھا۔ پکّا یقین — اٹل یقین —!!

اپنے دوست کو اس نئے رُوپ میں دیکھ کر انور اُس سے متاثر بھی ہوا اور ساتھ ہی اُسے اُس سے کچھ ڈر سا بھی لگا۔

(4)

اگلے دن اتوار تھا، اس لیے انور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے دوست کو لے کر مراٹھوں کے پُرانے قلعے کی طرف ٹہلنے چلا گیا۔ یہ قلعہ یونی ورسٹی سے دو میل شمال کی طرف تھا۔ اُس سنسان جگہ میں شاید ہی کبھی کوئی آتا تھا، اِس لیے وہ بڑی دیر تک بغیر کسی خلل کے دل کھول کر باتیں کر سکتے تھے۔

ریل کا پھاٹک پار کرنے کے بعد جب انور کو پکا یقین ہو گیا کہ کوئی اُن کی بات نہیں سُن سکتا تو اُس نے وہ سوال پوچھا جو کل رات سے اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے کہا: 'رتن، میں اِس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ کل رات میں تمھیں دیکھتے ہی پہچان نہیں سکا۔ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تمھاری داڑھی، مونچھ اس طرح بالکل صفاچٹ ہو گی۔ یہ تو بتاؤ کہ تُم نے آخر اپنی داڑھی اور بال کیسے کٹوا دیے۔ تمھارے مذہب میں تو یہ منع ہے نا؟'

رتن کچھ دیر تک چُپ چاپ چلتا رہا پھر بولا: 'ایک بہت بڑے آدمی سے جب یہی سوال کیا گیا تھا تو اُس نے اِس کا جواب یہ دیا تھا کہ جب کوئی قوم کی خاطر سر کٹانے پر تیار ہو تو وہ بال کٹانے سے کیا ڈرے گا۔ داڑھی مونچھیں صفاچٹ کروا دینے سے اور بال کٹوا دینے سے ہمارا بھیس بڑی آسانی سے بدل جاتا ہے اور ہم پولیس کے پنجے سے بچے رہتے ہیں۔'

انور ابھی تک اُس دلیر آدمی کی بات سوچ رہا تھا جس کا حوالہ ابھی رتن نے دیا تھا۔ اُس نے پوچھا 'کس نے کہی تھی یہ بات؟ بہت ہی کمال کا آدمی رہا ہو گا کوئی؟'

'وہ ہے ہی کمال کا آدمی — ہمارا لیڈر بھگت سنگھ۔' اور یہ نام لیتے وقت رتن کی آواز میں عقیدت بھی تھی اور پیار بھی۔

بھگت سنگھ! انور نے اپنے ساتھ کے کچھ پنجابی لڑکوں سے اُس کا نام سنا تھا۔ اُس نے نوجوان بھارت سبھا کے نام سے نوجوانوں کی ایک انقلابی تنظیم بنائی تھی اور کہا جاتا تھا کہ پنجاب میں دہشت پسند تحریک کا کرتا دھرتا وہی ہے۔ کافی عرصے سے وہ کئی صوبوں کی پولس کو تگنی کا ناچ نچا رہا تھا اور ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔

'سینڈرس کو بھگت سنگھ نے ہی گولی ماری تھی نا؟' انور نے پوچھا۔ عام طور پر لوگوں کا یہی

خیال تھا اور اُس نے اِسی خیال کو دُہرا دیا۔

'یہ بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔' رتن نے مضبوطی سے جواب دیا اور پھر انور پر اپنی اِس بات کا ردِّ عمل دیکھ کر اُس نے کہا۔ 'تمھیں بھی نہیں، حالانکہ میں تم پر بھی اُتنا ہی وشواس رکھتا ہوں جتنا خود اپنے پر۔ مگر میں پارٹی کا ڈسپلن نہیں توڑ سکتا۔ اِس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ انقلابی کام میں اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی کہ کوئی کام کس نے کیا ہے، جس اُنگلی سے پستول کا گھوڑا دبایا گیا تھا وہ کسی کی بھی انگلی ہو سکتی تھی، لیکن سینڈرس کو کسی ایک آدمی نے نہیں مارا، وہ ایک پوری قوم کے غصّے کا شکار ہوا اور اِس طرح قوم نے سینڈرس سے اُس کے اُس وار کا بدلہ لے لیا جس نے لالہ لاجپت رائے کی جان لے لی تھی۔'

ایک سوال انور کو لگاتار پریشان کر رہا تھا اور اب اُسے وہ سوال پوچھنا ہی پڑا۔ 'رتن، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم مجھے اپنی پارٹی کا کوئی راز بتاؤ لیکن ایک بات میں تم سے ضرور جاننا چاہتا ہوں۔ اُس بات کی میرے لیے بہت اہمیت ہے۔ کیا تُم نے — خود تُم نے اپنے ہاتھوں سے ابھی تک کسی کا — ؟'

'خون کیا ہے؟' رتن نے یہ بھیانک الفاظ کہہ کر بات پوری کر دی جنھیں کہنے میں انور کو دقّت ہو رہی تھی 'سچ پوچھو تو میں نے نہیں کیا ہے۔ ابھی تک مجھ سے یہ کرنے کو کہا ہی نہیں گیا ہے لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ابھی تک کوئی موقع نہیں نکلا ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'

رتن نے جس ڈھنگ سے یہ بات کہی اُس میں ایک ایسی سنجیدگی تھی جسے سُن کر انور کو بڑی فکر ہوئی۔ اُس کی یہ سنجیدگی اُس کی پرانی کڑواہٹ سے الگ تھی اور انور جانتا تھا کہ رتن نے جن حالات میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنے باپ کو قتل ہوتے دیکھا تھا اُن ہی کی وجہ سے اُس کے جذبات میں کڑواہٹ آ گئی تھی۔ پھر بھی اُسے یہ جان کر تسلّی ہوئی کہ اُس کا دوست ابھی تک قاتل نہیں بنا ہے۔ 'اچھا انور اب تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ مان لو اگر میں نے کسی انگریز کا یا کسی پولیس افسر کا خون کیا ہوتا تو کیا تم مجھ سے نفرت کرنے لگتے کیا تم مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے؟'

'ہرگز نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایسا کبھی نہ کرتا۔' انور نے اُسے یقین دلاتے کہا۔

'میں تمھارے دہشت پسندی کے اصولوں کے خلاف ضرور ہوں لیکن میں تمھارے مقصد کی عزت کرتا ہوں۔'

اور اس طرح وہ دونوں ہنسا کے اخلاقی پہلو پر بحث کرنے لگے۔ اُن ہی کی طرح ہزاروں دوسرے نوجوان سارے ملک میں اسی سوال پر بحث کر رہے تھے۔ انور نے شروع شروع میں ہی بغیر کسی سوچ بچار کے گاندھی جی کے اُصولوں کو اپنا لیا تھا کیوں کہ وہ اُسے اچھا لگا تھا۔ بعد میں گاندھی جی کے مضامین اور کتابیں اور اُن کی تقریروں کا مطالعہ کرنے سے اُس کا یقین اور پکّا ہوگیا تھا۔ وہ زور دے کر رتن کو سمجھ رہا تھا کہ آزادی جیسے اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع بھی اچھے ہی استعمال کیے جانے چاہییں۔ رتن مقصد اور ذرائع میں اِس قدر فرق کرنے کا ہی مذاق اُڑا رہا تھا اور یہ بحث کر رہا تھا کہ ظلم کا تختہ اُلٹنے کے لیے کوئی بھی ذریعہ مناسب ہے 'سامراجیوں کی ہنسا کا جواب ہنسا سے ہی دیا جا سکتا ہے۔' اُس نے زور دے کر کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گاندھی جی کی اہنسا بزدلوں کے لیے ایک آڑ ہے۔ گاندھی جی کے بارے میں رتن کے مُنہ سے ایسی بے ادبی کی بات سن کر انور کو بہت دھکا پہنچا اور اُس نے اہنسا کے اصول کو معقول ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رتن کو یہ بتایا کہ تہذیب یافتہ زندگی کی بنیاد محبت ہے نفرت نہیں اور یہ کہ جو آزادی اہنسا کے ذریعے حاصل کی جائے گی وہ انتشار اور خون خرابے سے حاصل کی گئی آزادی سے زیادہ دیرپا ہوگی۔ 'اگر ہم سچ مچ گاندھی جی کے کہنے پر چلیں تو ایک دن ہمارے دُشمن بھی ہماری بات کو ماننے لگیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ ہماری مانگیں صحیح ہیں۔'

رتن اس کا جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ یکا یک اُسے اپنے اصول کے حق میں ایک عملی دلیل پیش کرنے کا موقع مل گیا اور اُس کا خیال تھا کہ اس عملی دلیل کے آگے باقی ساری دلیلیں بیکار ہو جائیں گی۔

(5)

اب پرانے قلعے کی دیواریں اور چاروں طرف کی کھائی خوفناک دکھائی دینے لگی تھیں۔ انور نے چکّر دار سڑک چھوڑ کر گھاس کی جھاڑیوں کے بیچ سے ہوتے ہوئے چھوٹے راستے سے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بحث میں کھوئے ہوئے اونچی اونچی گھاس کے بیچ سے ہو کر جا رہے تھے کہ

اتنے میں انور کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا داہنا پیر کسی نرم اور چکنی چیز پر پڑا۔ وہ ابھی ٹھیک سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ گھاس میں سرسراہٹ ہوئی اور دوسرے ہی پل انور نے دیکھا کہ ایک زہریلا کالا سانپ اپنی کنڈلی توڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔ یونی ورسٹی کے آس پاس کے علاقے میں بے حد سانپ تھے اور انور جانتا تھا کہ وہ کتنے زہریلے تھے۔ انور پتھر کی مورت کی طرح وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اُس پر جادو کر دیا ہو۔ ڈر کے مارے انور کی آواز بند ہوگئی تھی اس لیے وہ رتن کو جو اُس سے کچھ ہی قدم آگے گیا ہوگا، پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ سانپ نے حملہ کرنے کے لیے اپنا چتکبرا پھن اوپر اُٹھایا اور انور ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے زہریلے دانتوں کے بیچ سے ایک پتلی سی دوہری زبان بجلی کی طرح لپکی اور اگلے ہی پل اُس کالے سانپ نے انور کو ڈس لیا ہوتا لیکن اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی اور سانپ موت کے درد سے تڑپتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ انور نے اطمینان کا سانس لے کر نظر اوپر اٹھا کر دیکھا لیکن اُس کا دل ابھی تک دہلا ہوا تھا۔ رتن ہاتھ میں پستول لیے کھڑا ہنس رہا تھا اور پستول میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔

'دیکھا تم نے، اِن زہریلے کالے سانپوں کا دل محبت اور اہنسا سے نہیں بدلا جا سکتا۔' اپنے دوست کی جسمانی اور اخلاقی ہار پر رتن کو کچھ خوشی ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا 'اِن زہریلے سانپوں کو گولی سے ہی اُڑانا ہوگا— اور یہی بات سامراجی سانپوں کے بارے میں بھی سچ ہے۔'

لیکن انور اُس کالے سانپ کو بھول چکا تھا اور وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ ابھی موت کے منہ سے بال بال بچا ہے۔ وہ تو رتن کے ہاتھ کی پستول کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا دوست دہشت پسند ہے پھر بھی اُسے سچ مچ پستول چلاتے دیکھ کر ایک صدمہ سا پہنچا تھا، تو اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جب کسی کو مارنے کا وقت آئے گا تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

'اچھا آؤ۔' رتن نے پستول اپنے اوورکوٹ کی اندر والی کسی چور جیب میں رکھتے ہوئے کہا: 'تمھارے حق میں اچھا ہی ہوا کہ میں اہنسا کو نہیں مانتا لیکن مجھے اِس بات کا ڈر ہے کہ کہیں کسی نے گولی چلنے کی آواز سن نہ لی ہو۔'

کھائی کو پار کرتے ہوئے انور نے اُسے یقین دلایا۔ 'تم فکر نہ کرو، اِس سُنسان قلعے میں کوئی نہیں آتا ہے۔'

(6)

انور نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں عورت کا مُوڈ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا، 'انسان کی زندگی میں جوار کی لہروں کی طرح اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔' اِس بات کو بدل کر کسی دل جلے نے اِس طرح کر دیا تھا کہ 'عورت کے ساتھ انسان کی زندگی میں جوار کی لہروں کی طرح اُتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔' کیوں کہ ایک پل تو عورت مرد کی پوجا کر کے اُسے چوٹی پر پہنچا دیتی ہے اور دوسرے ہی پل جب لہر نیچے اُترتی ہے تو اُسے گھاس پھوس کی طرح کنارے پر لا پٹکتی ہے۔ انور نے ابھی تک جوار کی لہروں کو اُترتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ جس اکیلی عورت کو جانتا تھا، سلمیٰ کو اُس کے ہر پل بدلتے ہوئے مُوڈ سے وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا کہ جواروں کی لہروں میں چڑھاؤ اُتار کس طرح آتا ہوگا۔

ابھی سنیچر کی رات ہی کو تو اُس نے بوسہ لے کر، بلکہ لگا تار کئی بوسے لے کر پیار کے اِس بندھن کو پکّا کیا تھا لیکن پیر کے دن ہی جب وہ شام کے وقت ان ہی خوشگوار لمحوں کے تجربے کو دُہرانے کے لیے سلمیٰ کے گھر پہنچا جو اُس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور یادگار لمحے بن چکے تھے تو اُس نے دیکھا کہ سلمیٰ نہ صرف رُکھائی سے پیش آ رہی ہے، بلکہ غصّہ بھی ہے۔

وہ تو بڑے تپاک سے سلمیٰ سے ملا لیکن اُس نے بہت ہی رسمی ڈھنگ سے بغیر کوئی دلچسپی دکھائے صرف 'ہیلو' کہا تو انور بھی کھسیا کر چُپ ہوگیا کیوں کہ وہ سلمیٰ کے مُوڈ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلمیٰ اس وجہ سے رُوٹھی ہوئی ہے کہ وہ اتوار کو وعدہ کر کے نہیں آیا تھا، لیکن پھر بھی پہلے اس کی وجہ تو پوچھنا چاہیے تھی اور اگر وہ کوئی ٹھیک جواب نہ دے پاتا تب ہی وہ سزا کے طور پر اُس سے ناراض ہو جاتی۔ سلمیٰ کی اِس ضِد سے انور کو بہت دُکھ ہوا اور وہ اُداس ہوگیا۔ وہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں خیالوں میں ڈوبا ہوا چُپ چاپ بیٹھا رہا اور سلمیٰ یہ جتاتی رہی کہ وہ اپنی بُنائی میں بہت مشغول ہے۔

آخر کار سلمیٰ نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید ضرورت سے زیادہ رُکھائی دکھا رہی ہے، اِس لیے بُنائی الگ رکھ کر اُس نے بڑے طعنے سے کہا، 'کل شاید تمھیں دوستوں کے ساتھ سیاست پر بحث کرنے سے فرصت ہی نہیں ملی۔'

خاموشی ٹوٹ گئی تھی اور اب وہ سلمٰی سے معافی مانگ سکتا تھا۔ اگر سلمٰی نے اُسے موقع دیا ہوتا تو وہ پہلے ہی معافی مانگ لیتا کیوں کہ وہ تو آیا ہی اِسی لیے تھا۔ 'سلمٰی مجھے بہت افسوس ہے، لیکن دِلّی سے ایک بہت پرانے دوست اچانک آگئے تھے بس اُن ہی کے چکر میں پھنسا رہا۔'

'انھیں بھی یہاں لے آتے۔' سلمٰی کو لڑکوں سے ملنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی کیوں کہ اُن میں اُس کے چاہنے والے بھی ہو سکتے تھے، اُس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ انور اُسے اپنے دوستوں سے ملائے۔

تم جانتے ہو کہ تمھارا کوئی بھی دوست خوشی سے یہاں آ سکتا ہے۔

یہ تو معلوم ہے مجھے لیکن وہ بہت ہی رُوکھے قسم کا آدمی ہے اور میں نے سوچا کہ شاید تمھیں اُس سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

'کیا نام ہے اُس کا؟'

'رام لال۔'

'رام لال؟ مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمھارے ہندو دوست بھی ہیں۔'

سلمٰی نے جس لہجے میں یہ بات کہی وہ انور کو اچھا نہیں لگا، اُس نے یہ بات کہہ کر بہت تنگدلی کا ثبوت دیا تھا جس پر انور کو بہت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اُس نے کچھ چڑ کر کہا، 'خیر، چلو اب تو معلوم ہو گیا۔'

'ارے نہیں، میری بھی یادداشت کتنی خراب ہے، تمھارا ایک سِکھ دوست بھی تھا جس کا ذکر تم نے ڈبیٹ میں کیا تھا، کیا نام تھا اُس کا؟'

'رتن۔'

اتنے میں پروفیسر سلیم وہاں آگئے اور انور اُن کا ادب کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

'ہیلو انور، میں تم ہی سے ملنا چاہتا تھا، سلمٰی ذرا چائے بھجوا دو۔' اور انور کو ابھی تک کھڑا دیکھ کر انھوں نے کہا۔ 'بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔'

پروفیسر صاحب کے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود انور پریشان ہی رہا۔ اُسے نہ جانے کیوں یہ ڈر تھا کہ پروفیسر صاحب اب رام لال کی بات چیت چھیڑیں گے اور ہوا بھی یہی۔

اُنھوں نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے انور سے سیدھا سوال کیا، 'یہ رام لال کون ہے؟'

سوال اِس طرح اچانک پوچھا گیا تھا کہ ایک پل کے لیے تو انور کوئی جواب نہ دے سکا پھر اُس نے کہا' میرا دوست ہے، میں اُسے بچپن سے جانتا ہوں۔'

'یہ تو صحیح ہے لیکن تم اس کی سیاست کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ آج کل زمانہ بہت خطرناک ہے، جتنی بھی احتیاط کی جائے کم ہے۔ یونی ورسٹی والوں کا خیال ہے کہ وہ کسی قسم کا انقلابی ہے، تمھیں ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے، ورنہ تمھارا سوِل سروِس میں جانے کا چانس ختم ہو جائے گا۔'

لیکن انور کو سوِل سروِس کی فکر نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے دوست کی طرف ایک آدمی کا کیا فرض ہونا چاہیے۔' مجھے افسوس ہے لیکن میں اپنے دوست کو اس طرح نکال نہیں سکتا۔' اُس نے سوچ سوچ کر دھیرے دھیرے یہ بات کہی اور اُسے خود تعجب ہوا کہ اس میں اتنی ہمت آئی کہاں سے؟

پروفیسر صاحب ہمیشہ کی طرح بہت نرمی سے باتیں کر رہے تھے۔' تم خود ہی سوچ کر فیصلہ کرلو، اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو دوستی اور مہمان نوازی کی ان جھوٹی باتوں کی وجہ سے اپنی زندگی برباد نہ کرتا۔' اور یہ کہہ کر وہ کپڑے بدلنے چلے گئے۔

سلمٰی چپکے سے کمرے میں آ کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ سلمٰی کو وہاں دیکھ کر انور اُس کی طرف اِس اُمید سے مُڑا کہ شاید وہ اُس کی بات کو سمجھے گی اور اُسے سہارا دے گی لیکن سلمٰی اپنی نظریں پھیر کر اپنی بُنائی میں لگ گئی۔ تو وہ بھی اُس کی طرف نہیں تھی۔

کچھ بے چین ہو کر انور اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلمٰی نے بُنائی پر سے نظریں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی،' انور جانتے ہو میں کیا بُن رہی ہوں؟ تمھارے لیے سویٹر۔'

'شکریہ۔' تو سلمٰی مجھے پھنسانے کے لیے یہ اُونی جال بھی سلائیوں سے بُن رہی ہے۔' میں چلا۔'

'کھانا کھا کر نہیں جاؤ گے؟'

'نہیں۔'

'انور!'

'کیا ہے؟'

'ضد نہ کرو، ابّا نے تمھاری اپنی بھلائی کے لیے ہی اُس آدمی کا ساتھ چھوڑ دینے کو کہا ہے۔'

'میں جانتا ہوں لیکن میں ضِد نہیں کر رہا ہوں ۔ میں جو کچھ کر رہا ہو ، ٹھیک ہی کر رہا ہوں ۔'

اچانک سلمیٰ اپنی بُنائی پھینک کر صوفے پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلّا کر بولی، 'ضد تو کر ہی رہے ہو ، تم بالکل خچر کی طرح اڑیل ہو ۔'

'میں جا رہا ہوں ۔' انور نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔

تو وہ تمھارا رام لال تمھارے لیے سب کچھ ہے اور میں کچھ بھی نہیں ہوں، اگر ایسی بات ہے تو اُسی کے پاس جاؤ اور اب یہاں کبھی نہ آنا — کبھی نہیں ۔' اور اتنا کہہ کر وہ صوفے پر گر پڑی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

انور احاطے کے پھاٹک سے باہر نکل چکا تھا۔ اُس کے دماغ میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ وہ کس کا ساتھ دے۔

لیکن اُس کے لیے اِس بات کا فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیوں کہ ہاسٹل واپس پہنچنے پر راز نے اُسے بتایا کہ اُس کا دوست رام لال اچانک بغیر کچھ کہے سنے چلا گیا ہے۔ میز پر پرووائس چانسلر کا ایک نوٹس پڑا ہوا تھا جس میں لڑکوں کو تاکید کی گئی تھا کہ وہ بنا اجازت لیے کسی کو اپنے کمرے میں نہ رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی مہمان آ جائے تو اُس کی خبر فوراً پراکٹر کو دی جائے۔

'کیا اُس نے اِس کو دیکھا تھا؟' انور نے پوچھا۔

راز نے سر ہلا دیا۔ تو رتن اِسی لیے چلا گیا!

انور کو اپنے دوست کے اس طرح چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس طرح وہ اپنے آپ کو پولیس کے چنگل سے بچائے گا۔ پھر بھی اُسے ایسا لگا کہ اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے۔ اب سلمیٰ سے اُس کے تعلقات ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

اور اِسی لیے وہ بے حیائی کر کے پھر میرس روڈ کی طرف چل دیا۔ وہ جا کر اپنی بدتمیزی کے لیے سلمیٰ سے معافی مانگے گا۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے وہ سلمیٰ سے ٹکر لینے چلا تھا لیکن اُس وقت بھی وہ جانتا تھا کہ وہ سلمیٰ کی بات ٹال نہیں سکے گا کیوں کہ وہ اُسے پیار کرتا تھا۔ اُس نے اپنے جذبات کا یہ جال خود بُنا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُس سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور وہ نکلنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

○

اِنقلاب زندہ باد

(1)

فروری ختم ہوتے ہی اچانک بارش شروع ہوگئی اور مارچ کے شروع میں ایسی ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چلنے لگیں کہ تیر کی طرح چبھتی ہوئی ہڈیوں تک جالگتی تھیں۔ علی گڑھ کے چاروں طرف کے ریگستانی علاقوں سے دُھول کے بھنور اُٹھ اُٹھ کر سڑکوں پر اِس طرح منڈلاتے تھے جیسے مُردوں کی ارواح ناچ رہی ہوں۔ انور جیسے ایم۔ اے کے طالب علم کے لیے دن بھر میں دو تین لیکچروں میں حاضری دے آنے سے زیادہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی ڈیبیٹ ہو جاتی تھی لیکن اُن میں بھی کوئی نئی بات نہیں تھی اور زیادہ تر بولنے والے کی بحثوں کے پٹے ہوئے مذاق بار بار دہراتے رہتے تھے۔ نمائش کی چہل پہل بھی ختم ہو چکی تھی اور ٹورنامنٹس شروع ہونے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان برفیلی ہواؤں سے بچنے کے لیے یونی ورسٹی نے بھی بے حرکتی بلکہ بے حسی کا کمبل اوڑھ لیا تھا۔

لیکن ملک میں سیاسی گرمی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی اور اخباروں سے انور کو پتہ چلتا تھا کہ یہ گھرتی ہوئی گھٹائیں کسی دن بھی ٹوٹ کر برس پڑیں گی۔ ملک کے کونے کونے سے دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کی خبریں آرہی تھیں اور انور اکثر سوچا کرتا تھا کہ اُس کے دوست رتن عُرف

رام لال کا اُن میں کتنا ہاتھ ہوگا۔ بمبئی میں ایک بار پھر فرقہ وارانہ فساد ہوگیا تھا۔ کسی نے یوں ہی افواہ پھیلا دی تھی کہ پٹھان لوگ بچے چُرا کر لے جا رہے ہیں اور جب تک یہ پتہ چلا کہ یہ خبر جھوٹی تھی، اُس وقت تک کافی لوگ مارے جا چکے تھے اور سینکڑوں لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ دوسرے شہروں میں جہاں کہیں بھی سائمن کمیشن جانچ کرنے کے سلسلے میں دَورے پر گیا تھا، وہاں ہڑتالوں، کالے جھنڈوں، زبردست مظاہروں اور 'سائمن، واپس جاؤ' کے نعروں سے اُس کا استقبال کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے بدیسی کپڑے کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے لنکا شائر اور مینچسٹر جیسے کپڑے کی صنعت کے مرکزوں کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ 4 مارچ کو گاندھی جی ولایتی کپڑے کی ہولی جلانے کے جُرم میں کلکتے میں گرفتار کر لیے گئے اور اُس کے کچھ ہی دن بعد پنڈت موتی لال نہرو نے کونسل میں سرکار کو کراری شکست دی اور کونسل میں سرکار کے خلاف 'استعفیٰ دو! استعفیٰ دو!' کے نعرے لگائے گئے۔ کونسل کے ممبروں نے سرکار کا بجٹ گھٹا کر صرف ایک روپیہ کر دیا تھا اور سرکار نے بھی اس کے جواب میں گاندھی پر اتنی ہی رقم کا — ایک روپے کا — جرمانہ کر دیا تھا۔

اِن تمام ہنگاموں کے درمیان انور نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ بہت بڑی حد تک پروفیسر سلیم کے اثر کی وجہ سے اُسے یونی ورسٹی کی ہسٹری سوسائٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ لیکن آگے چل کر اُسے پتہ چلا کہ یہ حالات کے اُس سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس نے اُس کی ساری زندگی کا رُخ بدل دیا اور اُس میں ایک نیا ہی رنگ پیدا کر دیا۔

پروفیسر سلیم نے انور کو اُس کے اِس نئے عہدے کے لیے مبارک باد دیتے ہوئے اُسے یاد دلایا کہ اگلے مہینے سے وہ سِول سروس کے امتحان کے لیے لڑکوں کو تیار کرنے کے واسطے ایک کلاس لینا شروع کریں گے اور انھوں نے انور سے کہا کہ وہ بھی اُس کلاس میں شامل ہو جائے۔ انور نے اُس امتحان میں بیٹھنے کا کوئی پکا ارادہ نہیں کیا تھا لیکن نہ بیٹھنے کا بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اِس لیے اُس نے سوچا کہ پروفیسر صاحب کو مایوس کرنے یا سلمٰی سے بحث کرنے سے کیا فائدہ، کیوں کہ سلمٰی تو اُس دن کے انتظار میں تھی جب اُس کا انور سِول سروس میں آ جائے گا۔

انور کی عمر اِس وقت اُنیس برس سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ گریجویٹ تھا اور محبت بھی کرتا

تھا۔ لیکن ابھی تک اُس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آگے چل کر وہ زندگی میں کیا کرے گا۔ اُسے بنیادی طور پر تاریخ کے بارے میں ریسرچ کرنے میں دلچسپی تھی۔ اِس لیے اُس نے ایم۔ اے میں تاریخ لے لی تھی۔ اُس کے ابا چاہتے تھے کہ وہ وکیل بنے اور سب ہی مسئلوں کی طرح ہی اِس مسئلے پر بھی اپنی برادری کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا 'مسلمانوں میں قابل وکیلوں کی بہت ضرورت ہے اور اِس لیے انور ایل ایل بی کے لیے بھی پڑھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ شام کے وقت ہونے والی لاء کلاس میں کبھی کبھی ہی جاتا تھا۔ پروفیسر سلیم جو اُس سے ہونے والے سسُر کی طرح رُعب سے بات کرتے تھے، چاہتے تھے کہ وہ سول سروس کے امتحان میں بیٹھے اور وہ اُس کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

اُس کے دل کی گہرائی میں یہ سوال اُسے ہر وقت پریشان کرتا رہتا تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گا لیکن اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے بہت سے ہم وطنوں کی طرح ہی اُس کی زندگی کے ڈھرّے کا فیصلہ بھی کسی ایک آدمی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ اس کی زندگی کا راستہ تو اُن واقعات کے مطابق طے ہوگا جو ابھی تک وقت کی کوکھ میں پل رہے تھے اور اُن طاقتوں کے ذریعے طے ہوگا جو تاریخ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

(2)

21 مارچ کا دن تھا۔ گرمی کچھ کم تھی اور حالانکہ ہوا میں رات کے وقت اب بھی کچھ خنکی رہتی تھی پھر بھی میرس روڈ سے دو میل پیدل چل کر آنے کی وجہ سے انور کے جسم میں کچھ گرمی آ گئی تھی۔ سلمٰی اُس شام بہت خوش تھی۔ وہ دونوں بیڈمنٹن کھیلے تھے۔ انور سلمٰی سے ہار گیا تھا اور اپنی اِس ہار پر بے حد خوش تھا۔ سلمٰی نے اُسے اپنی بچپن کی تصویروں کا البم دکھایا اور اُس نے جوش کی ایک نئی نظم پڑھ کر اُسے سنائی تھی اور پروفیسر صاحب نے اُن دونوں کو اپنی آکسفورڈ کے زمانے کی زندگی کے دلچسپ قصّے سنائے تھے۔ دونوں ہی بے حد خوش تھے اور جب پروفیسر صاحب اپنا پائپ لینے کے لیے اُٹھ کر چلے گئے تھے تو سلمٰی نے انور کو ایک بوسہ بھی دیا تھا۔

جس وقت انور ہوسٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں گیا اُس وقت وکٹوریا گیٹ کے گھنٹہ گھر کی

گھڑی نے گیارہ بجائے۔ اُس نے سوچا تھا کہ گھنٹہ بھر تک اپنے گرم بستر میں لیٹ کر کوئی کتاب پڑھے گا اور پھر چین سے سو کر سنہرے خواب دیکھے گا۔ لیکن کمرے میں گھستے ہی اُس نے دیکھا کہ سبحان کپڑے پہنے بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔

'ہیلو، سبحانوسکی کیا انقلاب کی گھڑی آ پہنچی ہے؟' اُس نے اپنے 'ردی' دوست کا استقبال کرتے ہوئے مذاق میں کہا۔ سبحان بھی اِس کے مذاق کا کبھی بُرا نہیں مانتا تھا۔

'ہاں، اِس بار تو آ ہی پہنچی ہے۔' سبحان نے جواب دیا 'تم نے اخبار نہیں پڑھا آج کا؟'

'ہاں ہاں، پڑھا کیوں نہیں؟ صبح اُٹھ کر پہلا کام یہی کیا تھا، لگتا ہے سارے کامریڈ ایک ہی ساتھ گرفتار کر لیے گئے ہیں، تم اب ہم لوگوں سے کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم لوگ اِس ظلم کے خلاف اپنی آواز اُٹھانے کے لیے کوئی میٹنگ کریں؟'

'وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا' سبحان نے کہا 'ابھی تو تم میرے ساتھ دلّی چلو، اُن سب لوگوں کو میرٹھ لے جایا جا رہا ہے اور اگر ہمارا داؤ لگ گیا تو ہم اُن کے ساتھ غازی آباد تک چلے جائیں گے، لیکچر کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔'

'تو تیرتھ کرنے جا رہے ہو! اچھی بات ہے کامریڈ۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس ٹکٹ خریدنے کے لیے کافی 'ماسکو گولڈ' ہے یا ہمیں بنا ٹکٹ ہی سفر کرنا پڑے گا؟'

اور اِس طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ دونوں چل پڑے۔ انور اِس لیے راضی ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا کہ چلو مزا رہے گا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سبحان نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کیوں چُنا تھا۔ وہ اُن اِنے گِنے لوگوں میں سے تھا جسے سیاست میں دلچسپی تھی لیکن وہ کسی پارٹی کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا اس لیے سیاست کے میدان کے سارے شکاری انور کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کانگریسی، کمیونسٹ، مسلم لیگی اور یہاں تک کہ سرکار کے ٹوڈی بھی جو اپنے آپ کو لبرل کہتے تھے، اُس کے ضمیر کو اپنے بس میں کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ اُن میں سبحان تھا، خود اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسرے کی بات سننے کو بھی تیار رہتا تھا۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ 'لال' لیڈروں کی ایک جھلک دیکھ لینے سے انور جیسا

'گمراہ آئیڈیلسٹ' کمیونزم کے راستے پر لگ جائے گا تو اسے اسی میں خوش رہنے دو۔ جہاں تک انور کا سوال تھا وہ ان لیڈروں کو دیکھنے کے لیے اتنا خواہش مند ضرور تھا کہ ڈیڑھ سو میل کا سفر کرنے میں بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

وہ اخباروں میں پڑھ چکا تھا کہ ان لیڈروں میں سے ایک لجس لیٹیو کونسل کے ممبر تھے، ایک ڈاکٹر تھے، کئی طالب علم تھے، کئی ایسے دانشور تھے جن کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں تھا اور کلکتے اور بمبئی کی ٹریڈ یونینوں کے خاص عہدیدار تھے۔ اُن میں دو انگریز اور کئی مسلمان بھی تھے۔ کمیونسٹ تحریک ایک بین الاقوامی تحریک تھی اور اِسی لحاظ سے جو لوگ پکڑے گئے تھے وہ اِس تحریک کی پوری طرح نمائندگی کرتے تھے۔

انور کو 'لیڈروں' سے ایک پیدائشی چڑ تھی۔ اُسے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ کچھ لیڈروں کو چھوڑ کر باقی سارے ہر وقت اپنی لیڈری کا رُعب ڈالنے کے لیے ایک خاص قسم کے کپڑے پہنتے تھے، خاص قسم کی باتیں کرتے تھے اور کچھ خاص بندھے ہوئے لفظ ضرور بولتے تھے اور عوام کے سامنے بناوٹی خاکساری دکھاتے تھے۔ اُسے یہ بات بہت ہی عجیب لگتی تھی کہ اچھا کھانے اور اچھا پہننے والے لیڈر 'بھوکے عوام' کی باتیں کریں۔ اُسے کچھ ڈر تھا کہ جن قیدیوں سے ملنے وہ جا رہا تھا وہ اسی طرح کے آرام کرسی پر بیٹھ کر سیاست بگھارنے والے انقلابی ہوں گے۔ فرانس، روس اور آئرلینڈ کے اُن انقلابیوں جیسے نہیں ہوں گے جن کے بارے میں اُس نے کتابوں میں اتنا پڑھ رکھا تھا۔

جس وقت اُن کی گاڑی دِلّی کے اسٹیشن پر پہنچی اُس وقت جمنا پر سے صبح کا کہرا چھٹ رہا تھا۔ ابھی تک کافی اندھیرا تھا اور تیسرے درجے کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھے رہنے کی وجہ سے پلیٹ فارم پر اُترتے ہی انھیں ایک پیالی چائے کی فکر ہوئی۔ گھنٹوں اُبلی ہوئی اور کڑوی لیکن کھولتی ہوئی گرم چائے پی کر اُن کی جان میں جان آئی اور وہ میرٹھ والی گاڑی کی تلاش کرنے لگے۔ لیکن بمبئی سے آئے ہوئے قیدیوں کے لیے جو خاص ڈبہ الگ کر دیا گیا تھا اُس میں گھسنا آسان کام نہیں تھا، اُس کے سامنے ہتھیار بند پولیس والوں کا بھاری پہرہ تھا جو ڈبے کے دونوں طرف ٹہل ٹہل کر پہرہ دے رہے تھے۔

سبحان کسی طرح گھُس گھُسا کر ڈبّے تک پہنچ ہی گیا اور انور نے پہلی بار اِن بدنام کمیونسٹوں کی جھلک دیکھی۔ اُن کے بارے میں سب سے پہلی بات تو اس نے یہ دیکھی کہ وہ دیکھنے میں بالکل 'لیڈرز' نہیں لگتے تھے۔ وہ طرح طرح کے کپڑے پہنے تھے۔ کوئی سوٹ پہنے تھا تو کوئی دھوتی پر قمیص پہنے تھا، کوئی بند گلے کا سوئٹر پہنے تھا تو کوئی اوور کوٹ، کوئی شال اوڑھے تھا اور کسی کے سر پر ٹوپی تھی لیکن اُن میں سے کوئی بھی سفید کھدّر کی 'لیڈروں والی وردی' نہیں پہنے تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد اُن کے بال بکھرے ہوئے، داڑھیاں بڑھی ہوئی اور کپڑے گندے تھے لیکن سب کے سب بہت مست تھے۔ سبحان نے سب سے پہلے جس سے ملاقات کی وہ ایک بہت ہی دُبلا پتلا لمبا سا پارسی تھا۔ جس کی طوطے کی چونچ جیسی ناک پر بنا کمانی والی عینک ٹکی ہوئی تھی اور سفید بالوں کی لمبی لمبی لٹیں پیچھے لٹک رہی تھیں۔ اُس نے چھوٹتے ہی سامراج نظام کے انجن کے ساتھ 'ریڈ بوگی' جُڑ جانے کے بارے میں کوئی مذاق کیا۔ انور کو پتہ چلا کہ یہ جھاب والا صاحب تھے جو دراصل کمیونسٹ نہیں تھے، لیکن ہندوستان میں مزدوروں کے جتنے ٹریڈ یونین انھوں نے بنائے تھے اُتنے کسی اور نے نہیں بنائے تھے۔ اس سارے گروہ میں دو انگریز بہت چمک رہے تھے۔ ایک تو چارلی چیپلن جیسی مونچھوں والا دُبلا پتلا اسپریٹ SPRATT اور دوسرا بھاری بھرکم جسم والا بریڈلے BARADLEY جو سرمئی رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُن سب میں ایک ہی بھلا آدمی لگ رہا تھا۔ سبحان نے انور کو کچھ اور لوگوں کے نام بتائے جنھیں وہ پہچانتا تھا۔ موٹے شیشے کا چشمہ لگائے ہوئے گھنے گھنے کالے بالوں والے دانشور جیسے نظر آنے والے ڈاکٹر ادھیکاری جنھوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، تاڑ جیسے نمبکر، بکھرے ہوئے بالوں والے جوگلیکر اور کالج کے طالب علم لگنے والے مرکر، یہ چاروں مراٹھے تھے اور آپس میں باتیں بھی مراٹھی میں کر رہے تھے۔ انور یہ بولی اپنی زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔ اُس ڈبّے کے لوگوں کو دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ کسی کالج کی ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہو اور انور کو یہ دیکھ کر تسلّی ہوئی کہ کم سے کم یہ کمیونسٹ لیڈر بوڑھے تو نہیں تھے۔

آخر کار سبحان نے کسی طرح آگے بڑھ کر علی گڑھ یونی ورسٹی کے مارکسسٹ اسٹڈی سرکل کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور سب لوگ اُس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور

کچھ نے تو مٹھی تان کر اُسے انقلابی سلام بھی کیا۔ کسی نے کہا، 'تو یہ بیماری علی گڑھ میں بھی پھیل گئی ہے'، اور جب انور نے اپنی آٹو گراف بُک نکال کر اُن سے اسٹڈی سرکل کے لیے اُس پر کوئی پیغام لکھ دینے کو کہا تو سب نے ایک آواز سے کہا' ڈاک لکھیں گے—' اُن کا مطلب ادھیکاری سے تھا۔

'تم یونی ورسٹی میں کیا پڑھتے ہو؟' ادھیکاری نے اپنا قلم کھولتے ہوئے پوچھا۔

'کلاس میں فلاسفی' سبحان نے جواب دیا' اور باہر مارکسزم۔'

'مارکسزم سے بڑھ کر کوئی دوسرا فلسفہ نہیں ہے۔' ادھیکاری نے آٹو گراف بُک واپس کرتے ہوئے کہا جس پر خوب صورت لفظوں میں لکھا ہوا تھا 'اب تک فلسفیوں نے دنیا کی مختلف تشریحات کرنے کی کوشش کی ہے، ہمارا کام ہے اُسے بدلنا— کارل مارکس'

سبحان اُن کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجادی اور انجن نے اُس کے جواب میں دوہری سیٹی بجائی۔ اب جا کر سبحان کو انور کا خیال آیا۔ 'کامریڈ یہ ہیں ہمارے دوست انور علی ابھی مارکسسٹ تو ہیں نہیں لیکن جلد ہی راستے پر آجائیں گے۔'

'بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کامریڈ' اور ایک بار پھر سب نے اُن دونوں سے ہاتھ ملائے۔ انور کو اِن مارکسسٹوں کے جوش اور اُن کی لگن کا اندازہ ہوا۔ اُن میں سے زیادہ تر اُسی کے عمر کے تھے اور دیکھنے میں سب ہی متوسط طبقے کے دانشور معلوم ہوتے تھے جو مزدوروں کے بیچ انقلاب کا پیغام لے کر جا رہے تھے۔ اُسے اِس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ اِن لوگوں نے ایک ایسے کام کا بیڑا کیوں اُٹھایا ہے جسے عام لوگوں میں مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ اور دوسرا سوال اُس کے دل میں یہ اُٹھا کہ وہ کون سی چیز ہے جو اِن کی قوتِ ارادی کو بنائے رکھتی ہے۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ 'ریڈ بوگی' میں سے زوردار نعروں کی آواز سنائی دی 'سامراج واد مُردہ باد! اور انقلاب زندہ باد!' اور انور نے دیکھا کہ سپریٹ اور بریڈ لے یہ نعرے لگانے میں سب سے آگے تھے۔ دو انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر 'سامراج مُردہ باد' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ یہ سچ مچ ایک انوکھی بات تھی اور انور نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ مارکس کی کتابیں بڑے غور سے پڑھے گا جس نے اِس ناممکن کو ممکن بنایا۔

(4)

پہلے انھوں نے یہ پلان بنایا تھا کہ وہ کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ غازی آباد تک جائیں گے اور پھر وہاں سے علی گڑھ کی گاڑی پکڑ لیں گے۔ لیکن جب وہ لوگ اِس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ پنجاب میل کی جانی پہچانی گاڑی کو ڈھونڈنے لگے۔ پلیٹ فارم پر کھدر پوش لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کانگریس کے ترنگے جھنڈے تھے۔ ظاہر تھا کہ کوئی کانگریسی لیڈر وہاں سے جا رہا تھا اور وہاں کے کانگریسی اُسے وِداع کرنے آئے تھے۔ جب وہ اُس ڈبے کے پاس سے گزرے تو انھوں نے دیکھا، سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک آدمی مسکرا کر لوگوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی ان دونوں نے پہچان لیا یہ تو جواہر لال نہرو تھے۔ انور کے دل میں ہمیشہ سے ایک ہی لیڈر سے ملنے کی تمنا تھی اور وہ تھے جواہر لال نہرو اور اس وقت وہ اُن کے اتنے پاس کھڑا تھا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جسے وہ ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتا تھا۔ لیکن کیا جواہر لال نہرو اُس کے جیسے معمولی طالب علم سے ملنا گوارا کریں گے؟ اُس نے سُن رکھا تھا کہ اُن کا مزاج بے حد تیز ہے اور جب انھیں کوئی بات ناپسند ہوتی ہے تو وہ بڑے سے بڑے لیڈر کو بھی یہاں تک کہ اپنے باپ کو بھی نہیں بخشتے۔ اگر انور اُن کے پاس جا کر اُن سے کہے کہ وہ اُن سے کچھ منٹ بات کرنا چاہتا ہے تو کہیں وہ اُسے گستاخی تو نہیں سمجھیں گے؟ شاید وہ اُسے ڈبے سے باہر نکال دیں۔ اور اگر یہ ہوا تو سبحان اور یونی ورسٹی کے سارے لڑکے اُس کی ہنسی اُڑائیں گے۔

'آؤ گاڑی چل رہی ہے' سبحان نے کندھا پکڑ کر اُسے جھنجھوڑا۔ انور جیسے سپنا دیکھتے دیکھتے جاگ پڑا۔ دونوں سب سے پاس والے تیسرے درجے کے ڈبے میں گھُس گئے۔

غازی آباد کے اسٹیشن پر پھر بہت بڑی بھیڑ 'پنڈت جواہر لال نہرو کی جے' کے نعرے لگا رہی تھی اور انور نے اتنی بڑی بھیڑ دیکھ کر جا کر اس عظیم لیڈر سے ملنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

اس کے بعد گاڑی خُورجہ جنکشن پر رُکی۔ وہاں بہت ہی تھوڑے لوگ تھے اور انور نے سوچا کہ یہ آخری موقع ہے۔ اُس کے بعد گاڑی علی گڑھ پر ہی رُکے گی اور اگر وہ اب نہیں گیا تو پھر یہ موقع اُس کے ہاتھ کبھی نہیں لگے گا۔

'آؤ سبحان۔' اُس نے سبحان کو باہر گھسیٹتے ہوئے کہا 'چلو، چل کر پنڈت جواہر لال سے ملتے ہیں۔'

پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر نعرے لگاتے ہوئے مقامی والنٹیروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے انور اور سبحان ڈبے میں گھس گئے کیونکہ پنڈت جی ابھی تک والنٹیروں سے بات کر رہے تھے، اِس لیے جب تک گاڑی چل نہیں دی تب تک اُن کی توجہ ان دونوں کی طرف نہیں گئی۔

کھڑکی سے سر ہٹا کر انھوں نے پاس کی سیٹ پر پڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک اُٹھالی اور دو گھبرائے ہوئے نوجوانوں کی آنکھیں پھاڑ کر اپنی طرف گھورتے دیکھ کر انھوں نے انگریزی میں کہا: 'ہیلو' اور پھر اپنے ساتھی کی طرف مُڑ کر بولے 'محمود، یہ کون لوگ ہیں؟'

'میرا خیال ہے اسٹوڈنٹ ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور اِن کی کالی شیروانیوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کے لڑکے ہوں گے۔ میں بھی وہیں پڑھتا تھا۔' انور اور سبحان کو پتہ چلا کہ یہ ڈاکٹر سیّد محمود تھے جو کیمبرج کے زمانے سے پنڈت جی کے پرانے دوست تھے اور اب اُن کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔

پنڈت جی نے کتاب نیچے رکھ دی اور اُن کے خوب صورت چہرے پر جھنجھلاہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر دَوڑ گئی اور پھر وہ ان بِن بُلائے مہمانوں کی طرف مُڑ کر بولے: 'تم لوگ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟' وہ چپ چاپ سیٹ کے کنارے پر ٹِک کر بیٹھ گئے۔

انور جس آدمی کی پوجا کرتا آیا تھا وہ اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پنڈت جی تصویروں میں جتنے خوب صورت لگتے تھے سچ مچ وہ اتنے ہی خوب صورت تھے لیکن انور نے جیسا سوچا تھا اُس کے مقابلے میں اُن کا قد کافی چھوٹا تھا۔ اُن کی سفید گاندھی ٹوپی کافی ترچھی لگی ہوئی تھی اور کھدّر کی اُونی شیروانی کے تیسرے بٹن میں گلاب کا ایک تازہ سرخ پھول لگا ہوا تھا۔ ایک رئیس باپ کے اِس بیٹے کے بارے میں اَن گنت قصے مشہور تھے۔ جیسے یہ کہ وہ پرنس آف ویلز کے ساتھ پڑھتے تھے اور یہ کہ اُن کے کپڑے اکثر پیرس سے دُھل کر آتے تھے۔ لیکن یہ بات سب ہی لوگ جانتے تھے کہ انھوں نے قوم کی خاطر اپنی چلتی ہوئی بیرسٹری اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دی تھی۔ کئی برس سے وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے لیکن اُن کا تعلق کئی ایسے اداروں سے بھی تھا جو زیادہ انقلابی تھے جیسے اِنڈی پنڈنس آف انڈیا لیگ اور یوتھ لیگ۔ کئی لوگوں کو یہ یقین تھا کہ وہی کانگریس کے پُرانے دقیانوسی لیڈروں کی مکمل آزادی کے اصول کی طرف ڈھکیل رہے

تھے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال تھا کہ جلد ہی وہ کانگریس کے پریسی ڈینٹ بن جائیں گے۔

پنڈت جی کے خوب صورت ماتھے پر بے چینی کی وجہ سے بل پڑ گئے۔ 'بولیے، کچھ تو بولیے۔ ظاہر ہے آپ لوگ اتنی دور صرف مجھے گھورنے تو نہیں آئے ہیں۔'

انور کے دماغ میں سینکڑوں ایسے سوال مچل رہے تھے جن کے بارے میں وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مکمل آزادی کے بارے میں، سوشلزم کے بارے میں، کمیونسٹوں کی گرفتاری کے بارے میں، ہنسا اور اہنسا کے بارے میں۔ لیکن اِس طرح اچانک اُس سے کچھ بولنے کو کہا گیا تھا کہ وہ صرف یہی پوچھ سکا۔ 'پنڈت جی، کیا یہ سچ ہے کہ آپ پرنس آف ویلز کے ساتھ پڑھتے تھے؟'

'بکواس ہے۔' انھوں نے یہ دو لفظ اتنی زور سے اور اتنا جھنجھلا کر کہے تھے کہ انور کو تو ایسا لگا کہ اب انھیں چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا جائے گا۔ 'یہ سب بکواس ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب بے ہودہ قصّے پھیلاتا کون ہے؟ جیسے کسی ہندوستانی کے لیے بادشاہ کے بیٹے کے ساتھ پڑھنا کوئی بہت بڑی عزّت کی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف ہم کبھی ساتھ پڑھتے نہیں تھے بلکہ مجھے تو کبھی اُن سے ملنے یا بات کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کا دوسرا سوال یہ ہوگا کہ کیا میرے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے ہیں؟'

اِس قصّے کے بارے میں پوچھنے کی انور کی ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن کیوں کہ اب پنڈت جی نے خود ہی اِس بات کا ذکر کیا تھا تو انور نے بہت کھسیاتے ہوئے کہا: لوگ کہتے تو یہی ہیں۔'

'لوگ! آخر یہ لوگ کون ہیں؟ جنھیں کوئی نہیں جانتا لیکن جو ہر بات جانتے ہیں۔' پنڈت جی جب طعنے سے بات کرتے تھے تو اُن کا لہجہ سخت ہو جاتا تھا۔ 'جی ہاں، پیرس میں کپڑے دُھلوانے کی بات بھی ایک ہی کہی! اِس سے زیادہ بے تکی اور بیوقوفی کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی آدمی اتنا بڑا بیوقوف ہو کہ وہ ایسی شیخی کی حرکت کرے تو میری رائے میں تو اُسے دنیا کے سب سے بڑے بیوقوف کا انعام ملنا چاہیے۔ لیکن میں آپ لوگوں کو کیوں ڈانٹ رہا ہوں؟' اور انور نے ایک بہت ہی عجیب بات دیکھی۔ پلک مارتے اُن کے چہرے پر سے جھنجھلاہٹ کے نشان غائب ہو گئے اور اُس کی جگہ ایک دوستانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ 'اچھا، ہم لوگ ایک دوسرے کو جان لیں۔ میرا نام تو شاید آپ لوگوں کو معلوم ہی ہوگا۔' اِس بات پر انور اور سبحان

ہنس پڑے۔'اور یہ ڈاکٹر محمود ہیں۔'

انور نے اپنا اور سجان کا تعارف کرایا اور دونوں سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے بعد دونوں نے سوچا کہ سیٹ پر آرام سے بیٹھ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک سگریٹ سُلگا کر پنڈت جی نے اُن دونوں سے پوچھا کہ وہ سگریٹ تو نہیں پییں گے اور جب دونوں نے شکریہ کے ساتھ منع کر دیا تو انھوں نے کہا 'تو پھر سنترہ یا سیب کھالو' اور پھر ایک ٹوکری میں سے 'جو اُن کا کوئی چاہنے والا اُن کے لیے دے گیا تھا، سنترے اور سیب نکال کر انھوں نے ہوا میں اُچھالے۔ سجان نے تو اپنا سیب کیچ کر لیا لیکن انور والا نیچے گر پڑا۔

'فیلڈنگ میں کچے ہو۔' کیمبرج کے پڑھے جواہر لال نے ہنس کر کہا۔ 'معلوم ہوتا ہے کبھی کرکٹ نہیں کھیلے۔' اور اس کے بعد ان کے درمیان تکلفات کی جو دیواریں کھڑی تھیں وہ ٹوٹ گئیں اور ایسا لگنے لگا کہ ایک 'لیڈر' اور دو طالب علم نہیں بلکہ تین ایسے نوجوان آپس میں باتیں کر رہے ہیں جنھیں ایک جیسی باتوں میں دلچسپی ہے۔ جواہر لال بہت دوستانہ لہجے میں بات چیت کر رہے تھے لیکن اُن کے اِس لہجے میں بھی ایک قُدرتی جھجک تھی۔ وہ زیادہ تر کتابوں کے بارے میں، مصنفوں کے بارے میں، کالج کی عام زندگی کے بارے میں اور سیاست کی طرف لڑکوں کے رویے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

'اچھا یہ بتاؤ تُم نوجوانوں کا آج کل کے سیاسی حالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟' انھوں نے پوچھا۔ انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب لڑکوں کا رویہ موٹے طور پر کیسے بیان کرے۔ اِس لیے اُس نے کہا۔ 'میں خود تو گاندھی جی کے اُصولوں کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ میرے یہ دوست سجان مارکسسٹ ہیں اور میرا ایک اور دوست ہے جو ہتھیاروں کے بل پر انقلاب لانا چاہتا ہے، وہ انگریز افسروں کو جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے۔' لیکن اُس نے رتن کا نام نہیں بتایا۔

ایسا لگا کہ یہ سُن کر جواہر لال کچھ سوچنے لگے اور تھوڑی دیر تک وہ بالکل چُپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر انھوں نے ایک ایسی بات کہی جس کا انور اُس وقت کوئی مطلب نہیں سمجھ سکا اور اس وقت جو بات چیت ہو رہی تھی اُس سے اُس کا کوئی تعلق بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی بات سوچ رہے تھے جو اُن کے منہ سے نکل گئی تھی۔ انھوں نے کہا 'طوفان آنے والا ہے' اور

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے اُن کی نظروں کے ساتھ ساتھ انور کی نظریں بھی باہر آسمان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ دیکھنے لگا کہ کیا آسمان پر واقعی طوفان آنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ جواہر لال دوسرے ہی قسم کے طوفان کی طرف اشارہ کر رہے تھے کیوں کہ اس کے بعد ہی انھوں نے کہا 'تم نوجوانوں کو چاہیے کہ آزادی کی لڑائی کے لیے تیار رہو۔ کیوں کہ جلد ہی وقت آنے والا ہے جب بہادری کی اِن باتوں کو بہادری کے کاموں سے سچ کر کے دکھانا ہوگا۔'

سبحان نے اپنی آٹو گراف بُک نکال کر اُن کے سامنے بڑھا دی اور اُس کے اوراق پلٹتے وقت انھوں نے ادھیکاری کے دستخط دیکھے۔ سبحان نے انھیں بتایا کہ وہ ابھی کچھ ہی گھنٹے پہلے کمیونسٹ قیدیوں سے مل کر آئے ہیں۔ پنڈت جی نے اِس بات میں بڑی دلچسپی دکھائی اور سبحان نے جیسے اپنے مارکسسٹ ساتھیوں کی طرف سے سوال کیا، 'پنڈت جی، یونینوں کے جو یہ لیڈر گرفتار کیے گئے ہیں اُن کے سلسلے میں آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟'

'میں کہہ نہیں سکتا۔' پنڈت جی نے صاف الفاظ میں اقرار کیا۔ 'ہمیں ابھی تک اس سوال پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمیں اُن کی پیروی کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنانی چاہیے اور انھیں پوری قانونی مدد دینی چاہیے۔'

اِس بات پر انور کو بہت تعجب ہوا کیونکہ اُس نے سُن رکھا تھا کہ کمیونسٹ کانگریس کے کٹر دشمن تھے اور اُسے رجعت پسند تنظیم سمجھتے تھے اور جواہر لال پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اِس لیے اُس نے بے جھجک پوچھا 'یہ لوگ آپ کے خلاف، گاندھی جی کے خلاف اور کانگریس کے خلاف جو پرچار کرتے ہیں کیا اس کے باوجود، آپ اُن کا ساتھ دیں گے؟'

پنڈت جی کے خوب صورت ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ 'میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں۔ کچھ کمیونسٹوں نے تو دوستوں کو بھی ناخوش کرنے کا ایک خاص طریقہ اپنا لیا ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ لوگ بہت آزمائے ہوئے لوگ ہیں اور انھیں بہت بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر چہ کہ ہم کو اُن کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے لیکن ہمیں اُن کی ہمت کی اور اُن کی قربانی کی تو تعریف کرنی ہی پڑے گی۔'

انھوں نے جلدی سے کچھ لکھ کر آٹو گراف بُک سبحان کو واپس کر دی اور پھر انور کی طرف

مُڑ کر پوچھا' تم یونی ورسٹی میں کیا پڑھ رہے ہو؟'

'ہسٹری میں ایم اے کر رہا ہوں۔'

'میرے خیال میں وہی پُرانے ڈھنگ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہوں گی۔ فلاں سن، فلاں تاریخ، بادشاہوں اور لڑائیوں کا حال، عام لوگوں کا کوئی ذکر نہیں۔ بہت اچھا اور بہت ضروری سبجکٹ ہے۔ لیکن میری رائے میں ہماری یونی ورسٹیوں میں بہت بُرے ڈھنگ سے پڑھایا جاتا ہے۔' انور نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جواہر لال نے کیمبرج میں بائیولوجی پڑھی تھی اور اُسے اِس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ہسٹری میں اتنی دلچسپی دکھا رہے تھے۔ اِس لیے اُس نے کہا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی ایک دَور کے بارے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔

'خیال تو اچھا ہے لیکن صرف کتابوں میں ہی اُلجھ کر نہ رہ جانا۔ ذرا باہر نکل کر تاریخ کی اور اپنی پُرانی تہذیب کی شاندار یادگاروں کو بھی دیکھنا، جو کنیا کماری سے لے کر ٹکسیلا تک جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اِن سب چیزوں سے بڑھ کر عوام کو دیکھنا کیوں کہ اِن میں تمھیں جیتی جاگتی تاریخ کی جھلک ملے گی۔' عظیم لیڈر نے آخر میں اُسے یہ صلاح دی۔

اُن کی باتیں سنتے ہوئے انور کو خیال آیا کہ وہ ہسٹری سوسائٹی کا سکریٹری بھی تھا، کیونکہ اب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اُسے سکریٹری کی حیثیت سے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے سارے ممبروں کو تاریخی اہمیت کی جگہیں دکھانے لے جائے گا۔ سارناتھ اور بنارس، الہ آباد اور ایودھیا، آگرہ اور دِلّی......

لیکن گاڑی اب علی گڑھ پہنچ چکی تھی اور انھیں جی نہ چاہتے ہوئے بھی وداع ہونا پڑا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ جمع تھی جن میں سے زیادہ تر طالب علم تھے۔ کسی طرح لوگوں کو بھنک پڑ گئی تھی کہ پنڈت جی اُس گاڑی سے اُدھر سے گزریں گے۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے 'پنڈت جواہر لال نہرو کی جے!' انور اور سبحان کو بھیڑ کے بیچ سے نکلنے میں کافی دِقّت ہوئی لیکن جب انھوں نے مُڑ کر دیکھا تو پنڈت جی انھیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ایک پھٹیچر اِکّے پر بیٹھ کر ہوسٹل واپس جاتے ہوئے انور نے سبحان سے جواہر لال کے آٹوگراف دکھانے کو کہا۔ انھوں نے اپنے دستخط کے اُوپر صرف یہ الفاظ لکھے تھے۔ 'جان ہتھیلی پر لے کر چلو۔'

لنگے کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ انور کے دماغ میں لگاتار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ جان ہتھیلی پر لے کر چلو! جان ہتھیلی پر لے کر چلو! اُس کے دماغ میں ابھی یہ بات بالکل صاف نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُن الفاظ نے اُس کے سامنے زندگی کا وہ راستہ کھول دیا تھا جسے وہ بہت دنوں سے کھوج رہا تھا۔

(5)

اس کے بعد کچھ دن تک انور نے جو بھی کام کیا وہ اپنے سامنے ایک خاص مقصد رکھ کر، اُس نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں ایک مضمون لکھا، اُسے پھاڑ ڈالا، پھر لکھا، کئی بار ٹھیک کیا، پھر اُسے صاف صاف نقل کیا اور اُسے بھاری بھرکم سُرخی دے کر 'نہرو ہمارے مستقبل کی اُمید' دلّی میں ہندوستان ٹائمز کے پتے پر بھیج دیا، لیکن کسی کو کانوں کان اِس کی خبر لگنے نہیں دی کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر وہ مضمون نہ چھپے تو لوگ اُس کا مذاق اڑائیں۔

اِسی دوران اُس نے ہسٹری سوسائٹی کا پچھلا حساب کتاب دیکھا تو معلوم ہوا کہ یونی ورسٹی کے خزانچی کے پاس سوسائٹی کے چھ سو ستاون روپے ساڑھے نو آنے پڑے ہوئے ہیں کیوں کہ پچھلے سال کے سکریٹری نے کوئی کام ہی نہیں کیا تھا اِس لیے کوئی خرچ بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین کو اِس دورے کی اجازت دے دینے کے لیے راضی کرنے کے کام میں جُٹ گیا۔ پروفیسر حبیب بہت ہی شریف آدمی تھے۔ اس لیے انھیں راضی کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن اسے پرووائس چانسلر سے بھی اپنی تجویز منظور کروانا تھا لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ یہ انگریز صاحب کلاس روم اور کھیل کے میدان کے باہر طالب علموں کی ہر حرکت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں ایسی ہر حرکت میں حکومت کے خلاف بغاوت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے یونی ورسٹی سوشل سروس لیگ کی مثال بھی پیش کی اور بتایا کہ اِس لیگ نے آس پاس کے گاؤں کے لوگوں کو چھوٹی موٹی ڈاکٹری مدد پہنچانے کی غرض سے لڑکوں کی کچھ ٹولیاں سائیکلوں پر وہاں بھیجی تھیں۔ کونین کی گولیاں بانٹنے کے لیے، زخموں پر ٹنکچر آیوڈین لگانے کے لیے اور دُکھتی ہوئی آنکھیں بورک سے دھونے کے لیے۔ لیکن یہ غیر نقصان وہ پلان بھی کس طرح کمیونسٹوں کی بھیانک سازش بن گیا تھا۔ ایک لڑکے نے یونین میں کھڑے ہو کر بتایا کہ سماج سیوا کے نام پر

لگائے گئے ان چکروں کے دوران اس نے گاؤں کی کیا حالت دیکھی تھی اور پھر زمینداروں اور سرکار کو گالیاں دیتے ہوئے ایک جوشیلی تقریر کر ڈالی تھی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ انور اگر یقین دلائے کہ یہ تجویز تاریخ کے بارے میں لڑکوں کی معلومات بڑھانے کے لیے ہی بڑھائی گئی ہے تو وہ......

انور نے پرووائس چانسلر صاحب کے بھی دستخط کرا لیے اور جو بیس لڑکے اس سفر کے لیے چُنے گئے تھے انھوں نے انور کے پاس خرچ بھر کے پیسے بھی جمع کر دیئے۔ ایک لاری کرائے پر لی گئی اور چھبّیس مارچ کو صبح سویرے ہی یہ ٹولی روانہ ہو گئی۔

یہ سفر سچ مچ بہت ہی دلچسپ رہا۔ متھرا اور برنداون کے دیہاتوں اور آگرہ اور فتح پور سیکری کی عالیشان عمارتوں کی اپنی اپنی الگ ہی کشش تھی۔ کچھ لڑکوں نے اپنی کاپیوں میں اِن عمارتوں کی بناوٹ اور پتھر پر کھدی ہوئی عربی کی لکھائی کی تصویریں بنا لیں، لیکن کچھ لڑکوں کو صرف سیر کرنے میں دلچسپی تھی۔

دلّی میں انور ٹھہرا اپنے گھر پر ہی تھا لیکن وہ زیادہ تر وقت دلّی گھومنے اور اپنے ساتھیوں کو تاریخی جگہیں دکھانے میں صَرف کرتا تھا۔

قُطب مینار جاتے وقت لاری برن بیسٹئین برج کے پاس سے مُڑی اور انور نے ہندوستان ٹائمز کا سائن بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ اُس نے ڈرائیور سے فوراً لاری رکوائی اور اپنے ساتھیوں سے ایک منٹ میں واپس آنے کو کہہ کر چلا گیا۔ وہ ایڈیٹر کے دفتر میں گیا اور وہاں ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر پوتھن جوزف نے اُس کا استقبال کیا۔ اُنھوں نے انور کو بتایا کہ اُس کا مضمون جلد ہی چھپے گا۔ انھوں نے انور سے یہ بھی پوچھا کہ اُس کا دلّی کس سلسلے میں آنا ہوا، اور جب انور نے انھیں بتایا کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر تاریخی مقامات کا چکر لگا رہا ہے تو انھوں نے اس سے اپنے اس سفر کے بارے میں کچھ لائنیں لکھ دینے کو کہا اور چلتے چلتے یہ بھی کہا کہ یہ خبر اگلے دن کے اخبار میں چھپے گی۔

(6)

جن دنوں انور دلّی میں تھا اُس زمانے میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ وہ ایک دن صبح سو رہا تھا کہ اُس کے ابّا نے آ کر اُسے جگایا اور کہا کہ اُس کا دوست رام لال اس سے ملنے آیا ہے۔

وہ ابھی تک نیند کے نشے میں تھا۔ بڑبڑا کر بولا 'رام لال؟ میں کسی رام لال کو نہیں جانتا۔' لیکن یہ نام دہراتے ہی جیسے کسی نے اُس کی یادداشت کے تار چھیڑ دیئے۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا 'کہاں ہے وہ؟'

رتن بیٹھک میں انتظار کر رہا تھا اور ملتے ہی اُس نے پہلی بات کہی 'مجھے بہت خوشی ہے کہ تمھارے ابّا نے مجھے پہچانا نہیں۔'

'رتن مجھے تمھاری طرف سے بڑی فکر تھی۔ تُم جس طرح علی گڑھ سے چلے آئے اُس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟'

رتن نے صبح کا لپٹا ہوا 'ہندوستان ٹائمز' اُسے کھول کر دکھایا۔ 'یہ دیکھو اس میں ہسٹری سوسائٹی اور اُس کے سکریٹری دی گریٹ مسٹر انور علی کی خبر چھپی ہے۔'

'تو اچھا ہی ہوا کہ اُس میں میں نے اپنا نام لکھ دیا تھا' کہیں پولیس تو تمھارا پیچھا نہیں کر رہی ہے؟'

'نہیں، تم فکر نہ کرو، یہاں دلّی میں مجھے کوئی نہیں جانتا۔'

انور کے ابّا نے اُن دونوں کے لیے ناشتہ بھجوا دیا اور دونوں دوستوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر انور کپڑے پہن کر تیار ہو گیا اور دونوں ساتھ باہر نکلے۔ گلیوں اور بازاروں میں چہل پہل شروع ہونے لگی اور اخبار بیچنے والے لڑکے خاص خاص خبریں چلّا چلّا کر اخبار بیچ رہے تھے۔

جب وہ دریا گنج کے چوراہے پر پہنچے تو رتن نے کہا 'انور یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم ہماری مدد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔'

'ہاں، بشرطیکہ اس میں کسی کو مارنے کا سوال نہ ہو۔ میں نے یہ بات اُس وقت بھی صاف کر دی تھی۔'

'نہیں۔' رتن نے بہت دھیرے دھیرے سوچ سوچ کر کہا، 'کوئی مارا نہیں جائے گا۔'

'تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟'

'میں تمھیں اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں، وہ وہاں اُس موٹر میں ہم لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'

(7)

رتن کا دوست اُن دونوں سے عمر میں بڑا نہیں تھا۔ اُس کا چہرہ بہت فس مکھ تھا اور اُس پر بڑی ملائمت تھی، لیکن اینٹھی ہوئی نوکیلی مونچھوں کی وجہ سے اُس پر ایک قسم کی سختی آ گئی تھی۔ وہ فوجی ڈھنگ کی خاکی قمیض اور گہرے رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے ہوئے تھا جس کی کگر سامنے کو کچھ جھکی ہوئی تھی، جس کا سایہ اُس کی آنکھوں پر پڑ رہا تھا۔

انور نے اُس سے ہاتھ ملایا اور اُسے ایسا لگا کہ اس ہاتھ کی پکڑ میں طاقت بھی تھی اور دوستی بھی۔ لیکن اُن دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف نہیں کرایا گیا۔ انور نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اُس کے بارے میں جانتا ہی ہوگا، اور کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اِس طرح کے انقلابی کتنی ہوشیاری برتتے تھے، اِس لیے اُس نے اُس کا نام پوچھا بھی نہیں۔ تینوں موٹر کی اگلی سیٹ پر گھس پل کر بیٹھ گئے اور مونچھوں والے اُس نوجوان نے اسٹارٹر دبا دیا۔ گیئر بدلتے ہی وہ بڑی سی کالی موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ تیزی سے نئی دلّی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

انور اُن دونوں انقلابیوں کے بیچ میں کچھ گھبرایا اور ڈرا ہوا بیٹھا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس اُن دونوں کی تلاش میں ہوگی۔ انور نے کنکھیوں سے موٹر چلانے والے کو دیکھا، موٹر چلانے والے کے ہاتھ بہت چکنے اور صاف تھے، اُس کی انگلیاں لمبی اور نازک تھیں جیسے آرٹسٹوں کی ہوتی ہیں، لیکن جس مضبوطی کے ساتھ وہ اسٹیرنگ وہیل پکڑے ہوئے تھا اُس سے اُن ہاتھوں کی طاقت کا بھی پتہ چلتا تھا۔

اُس کا ترچھا لگا ہوا ہیٹ اُس کی سادگی کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا اور حالانکہ اُس کی قمیض اور اُس کی مونچھوں پر فوجی پن کی چھاپ تھی پر وہ بہت ہی دھیمی آواز میں غالب کی ایک غزل گنگنا رہا تھا اور جو شعر گنگنا رہا تھا وہ بھی بہت معنی خیز تھا۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

اِس گمنام انقلابی کو اپنے مقبول شاعر غالب کا شعر گنگناتے دیکھ کر انور اُس کی طرف آپ ہی آپ کھنچ گیا۔ موٹر تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی اور انور دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ یہ غزل

صرف اِس لیے گنگنا رہا ہے کہ اُس وقت اتفاق سے وہی غزل اس کے دماغ میں آ گئی تھی یا اِس لیے کہ اُس غزل میں انقلابی کی جان کی بازی لگا دینے اور اپنے آپ کو قربان کر دینے کا جذبہ ظاہر ہوتا تھا؟

موٹر اچانک بائیں طرف گھوم کر پُرانے قلعے کی طرف بڑھی اور انور کے خیالوں کی زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔

'کدھر جا رہے ہیں ہم لوگ؟' اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

'فکر نہ کرو،' رتن نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ 'تم نئی دلّی میں جہاں بھی چاہو گے وہاں ہم تمھیں اُتار دیں گے، لیکن پہلے ہمیں تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'

کھنڈروں کے پاس پہنچ کر موٹر رک گئی۔ موٹر چلانے والے نے دروازہ کھولا اور اُن دونوں کو آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے کے لیے جگہ دے کر باہر نکل گیا۔

'کل تُم سب لوگ اسمبلی جا رہے ہو؟' رتن کے اس سوال میں انور کو کوئی تُک نہیں دکھائی دیا۔

'ہاں جا تو رہے ہیں لیکن تمھارا مطلب کیا ہے......؟'

'وہ میں ابھی تمھیں بتا دوں گا، لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھیں اپنے ساتھیوں کے لیے اکیس پاس کہاں سے ملیں گے؟'

'ہمارے پروفیسر نے اور ابّا نے اسمبلی کے کئی ممبروں کے نام خط دیے ہیں۔ ہر ممبر دو پاس دے سکتا ہے۔ اِس طرح ہمیں کافی پاس مل جائیں گے۔'

'اچھی بات ہے۔ اگر تمھیں اکیس پاس مل سکتے ہیں تو تیئس بھی مل سکتے ہیں۔' رتن نے یہ بات کچھ اِس طرح کہی جیسے حُکم دے رہا ہو۔

آخر کار انور کو اِس بات کا خوفناک مطلب سمجھ میں آیا اور اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ 'نہیں، نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ تُم لوگ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھو گے۔ ہم سب پکڑے جائیں گے......نہیں نہیں......'

'چلاؤ نہیں۔' رتن نے سختی سے کہا۔ 'میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ کسی کو جان سے نہیں مارا جائے گا۔'

انور نے اپنے دوست کو دیکھا۔ کیا یہ وہی مست شرارتی لڑکا تھا جس سے وہ امرتسر میں ملا

تھا اور جسے اُس نے اپنا دوست بنایا تھا؟ اُس کے چہرے پر ایک عجیب جانی پہچانی سختی تھی، اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی کڑواہٹ تھی اور آنکھوں میں ظالم چمک۔ اُس نے یہ شکل پہلے کہاں دیکھی تھی؟ اچانک اُسے جلیاں والہ باغ کی یاد آئی۔ گولی چلنے کے بعد وہاں موت کا سناٹا چھا گیا تھا اور ایک لڑکا جس کی زلفیں اُس کی پیلی پگڑی سے باہر نکلی ہوئی تھیں، اپنے مُردہ باپ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بھیانک لمحہ جس کا تجربہ اُن دونوں کو ایک ہی ساتھ ہوا تھا اُن دونوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے والی کڑی تھی اور انور جانتا تھا کہ رتن اس سے جو کچھ کرنے کو کہہ رہا تھا اُس سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔ مونچھوں والے اُس لمبے آدمی نے انور سے کہا اور جس دوستانہ لہجے میں اس نے انور کو 'کامریڈ' کہا تھا اُس نے انور کے دُکھی دل کے لیے مرہم کا کام کیا— 'ہم کسی دوسرے کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے لیکن یہ کام ضروری ہے' جو لوگ بہرے ہیں ہمیں اُن کے کان کھولنے ہیں اور یہ کام کل ہی ہونا ہے، صرف تم ہی ہماری مدد کر سکتے ہو۔'

وہ ہندوستانی ہلکے سے پنجابی لہجے کے ساتھ بولتا تھا اور اُس کے لفظوں میں زور بھی تھا اور ترغیب دلانے والی بات بھی، لیکن جس چیز نے انور کی ساری مشکلوں کو ختم کر دیا تھا وہ تھا اُس کی آنکھوں کا جذبہ۔ اُس کی آنکھوں میں قوتِ ارادی کی چمک تھی، ایک عجیب کشش تھی اور اُن کی گہرائی میں بے حد اُداسی کی ایک جھلک تھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا جو بہت جھیل چکا تھا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ چکا تھا۔

انور نے اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے پھیر لیں اور بولا 'پاس تو مل جائیں گے لیکن اپنا وعدہ یاد رکھیے گا، کوئی جان سے نہ مارا جائے۔'

(8)

گیلری میں سے دیکھنے پر کمان دار اسمبلی چیمبر ایک گہرا کنواں لگتا تھا اور وہاں اتنی اونچائی سے 'معزز ممبروں' کی آوازیں ایسی سنائی دیتی تھیں جیسے بہت سے مینڈک بول رہے ہوں اور اُن کے گلے بیٹھے ہوئے ہوں۔ انور کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ وہ اسمبلی کے بارے میں اپنے تجربوں پر ایک مضمون لکھے گا جس کا عنوان ہوگا 'کنویں کے مینڈک' مخالف پارٹی کے ممبر جن میں سے بہت سے سفید گاندھی ٹوپیاں لگائے ہوئے تھے، اُٹھتے تھے، جھک کر صدر کا احترام

کرتے تھے، اپنی بات کہتے تھے، پھر بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن سرکاری پارٹی کے ممبر مجسموں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے اور مخالف پارٹی کی بہت محنت کے ساتھ جتائی گئی دلیلوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔ اب تک انور اخباروں میں جو کچھ پڑھتا آیا تھا، اُس کے تجربے سے وہ جانتا تھا کہ اگلے دن قوم پرست اخبار اس عنوان سے چھاپیں گے 'تجارتی جھگڑوں کے بل کی کڑی تنقید'۔ لیکن یہاں وہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہا تھا اس میں نہ غصہ تھا نہ کڑی تنقید، صرف لفظوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور اُن ہی لفظوں کو بار بار سنتے سنتے نیند آنے لگی تھی۔ کورے الفاظ اور کچھ نہیں!...... اِس ساری بے لطف کارروائی میں اگر کہیں تھوڑی سی جان دکھائی دی تو وہ تھی مخالف پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو کی جوشیلی تقریر میں۔ کھادی کی ریشمی شیروانی پہنے اور گاندھی ٹوپی لگائے وہ بہت رُعب دار لگ رہے تھے۔ اس کے بعد جیسے ہر چیز گہری نیند میں سو گئی اور انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سرکاری پارٹی کا ایک ممبر ایک موٹا سا لال منہ والا انگریز با قاعدہ خرّاٹے لے رہا تھا اور اُس کے پاس بیٹھا ہوا ایک دوسرا انگریز 'کراس ورڈ پزل' حل کر رہا تھا اور اُن کے پیچھے ایک گروہ بند جتھے کی شکل میں اسمبلی کے نامزد کیے ہوئے ممبر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی وہ فرماں بردار لوگ تھے جو ایک کے بعد دوسرے بل پر مشین کی طرح سرکار کی طرف سے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ وہ بڑی بے چینی سے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے رہتے تھے اور اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ووٹ لینے کا وقت آئے اور وہ اُٹھ کر تائید کرنے والوں کے کمرے میں چلے جائیں اور اس طرح مزدور طبقے کی تحریک کو کچلنے کے لیے ملک پر تھوپے گئے قانون کو عوام کی منظوری کا دکھاوا ظاہر کریں اور اِس فریب کو جمہوریت کے نام پر ہونے والے اس ظلم کو روکنے کے لیے مخالف پارٹی کی طرف سے عوام کے نمائندے صرف باتیں ہی باتیں کرتے تھے، جن باتوں کو کوئی سنتا بھی نہیں تھا۔

اِس کنویں میں جھانک کر دیکھتے وقت انور کے دماغ میں کئی بار یہ خیال آیا کہ کوئی من چلا اس کنویں میں ایک پتھر پھینک دے اور اُس کے ٹھہرے ہوئے گندے پانی میں ہلچل پیدا کر دے۔ کاش...... وہ سوچ رہا تھا کہ آخر رتن کے دونوں دوست کیا کرنے والے ہیں؟ ایک جس کی مونچھ اُوپر کو اینٹھی ہوئی تھی اور دوسرا جو دیکھنے میں بنگالی لگتا تھا؟ اب تک وہ اپنے وعدے پر قائم تھے۔ اسمبلی کے اندر گھستے ہی انھوں نے کارڈ انور کو واپس کر دیے تھے اور انور نے تجویز کے

مطابق اُنھیں پھاڑ کر باتھ روم کے فلش میں بہا دیا تھا۔ اُس نے اُن کے ساتھ گلابی رنگ کے کچھ پرچے دیکھے تھے اور شاید وہ اُنھیں نیچے پھینکنے کے لیے موقع کی تاک میں تھے، سرخ انقلابی پرچوں کی بارش سے یہ لوگ سچ مچ جاگ اُٹھیں گے ان کا سارا ڈھیلا پن دور ہو جائے گا۔ انور نے نظر دوڑا کر دیکھا تو اُسے وہ دونوں نوجوان، جن کے نام ابھی تک وہ نہیں جانتا تھا، پبلک گیلری کے دوسرے سرے پر دکھائی دیے۔ وہ سرکاری ممبروں کے ٹھیک اُوپر پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔

'دیکھو، وائسرائے کے باکس میں کون ہے؟' راز نے انور کے کان میں کہا 'میرے خیال میں تو اپنے وہی دوست سر جان سائمن ہیں۔'

انور نے اُن کے سر کے چھدرے اَدھ پکے بالوں اور اُن کے ڈبل بریسٹ سوٹ سے پہچانا کہ یہی رائل کمیشن کے چیئر مین سر جان سائمن تھے جو پچھلے سال سارے ملک میں سامراجی دباؤ کی نشانی بن گئے تھے۔ نہ جانے کیوں انور کی نظریں ہی رتن کے دوستوں کی طرف اُٹھ گئیں اور اُس نے دیکھا کہ اینٹھی ہوئی مونچھوں والا نوجوان وائسرائے کے باکس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، جیسے دونوں گیلریوں کے بیچ کے فاصلے کا اندازہ لگا رہا ہو جو پورے چیمبر کی چوڑائی کے برابر تھا۔

انور کا دل دہل گیا۔ بار بار وہ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا 'لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے، انھوں نے وعدہ کیا ہے!' انھوں نے جلدی سے نیچے بیٹھے لوگوں پر نظر ڈالی۔ ایک آدمی بیٹھا ہوا 'السٹر یٹڈ ویکلی' کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ وہ موٹا لال منہ والا آدمی ابھی تک خرّاٹے لے رہا تھا۔ سرکاری ممبروں میں سے کوئی تقریر کر رہا تھا۔ پھر جب اُس کی نظر لوٹ کر گیلری پر پڑی تو اُس نے دیکھا کہ وہ مونچھوں والا نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا ہے جیسے باہر جا رہا ہو اور دوسرے ہی لمحے اُس نے پھینک دیا تھا......

بم! ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ سرکاری ممبروں کے سامنے فرش پر بم پھٹ گیا اور اس کے فوراً ہی بعد لال پرچوں کی بارش شروع ہوگئی۔ ممبروں میں خاص طور پر افسروں اور سرکاری ممبروں میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ بھاگ کر باہر پاخانوں میں جا چھپے، کچھ ریڈنگ کے میزوں کے نیچے چھپ گئے۔ ہر آدمی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے سارا چیمبر بدبودار دھوئیں سے بھر گیا۔ انور نے دیکھا کہ صرف دو آدمی ایسے تھے جو اِس گھبراہٹ کا

شکار نہیں ہوئے ___ ایک تھے وٹھل بھائی پٹیل، لمبی داڑھی والے اسپیکر اور دوسرے پنڈت موتی لال نہرو جو اپنی پارٹی کے ممبروں کو سمجھا رہے تھے 'ارے بھائی، بھاگتے کیوں ہو، یہ تو کوئی ہمارے ہی آدمی ہوں گے؟'

اِس بھاگ دوڑ اور شور غل، عورتوں کی چیخ و پکار اور پولیس کی سیٹیوں کو دبا کر ایک للکار چیمبر میں بار بار گونج رہی تھی 'انقلاب زندہ باد!' نقلاب زندہ باد!'

یہ اُس مونچھوں والے نوجوان کی آواز تھی! انور نے اُسے دیکھا اور اُس کی وہ تصویر انور کے دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہوگئی۔ وہ ایک کرسی پر نڈر کھڑا تھا ___ ایک پورے سامراج کے خلاف ایک اکیلا آدمی اور وہ نعرہ لگا رہا تھا جو جلد ہی ایک پورے ملک کے لیے جدو جہد کی للکار بن جانے والا تھا۔

پولیس اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہی تھی، اِس لیے اُس نے بڑی بے پروائی سے اپنا ریوالور اُن کے سامنے پھینک دیا اور اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ انور جب دوسرے طالب علموں کے ساتھ باہر جا رہا تھا تو اس نے پولیس کے ایک داروغا کو اُس لمبے قد والے نوجوان سے اُس کا نام پوچھتے سنا جس کی مونچھوں میں اب بھی بغاوت کا بانکپن تھا۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا 'بھگت سنگھ' اور جب وہ پاس سے ہو کر گذرا تو انور کو بہت ڈر لگا۔ اگر اُس کے چہرے سے ذرا بھی اشارہ ملا کہ وہ انور کو پہچانتا ہے تو انور کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن بھگت سنگھ پاس سے ہو کر گذر گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ ذرا بھی نہیں بدلا پھر بھی اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک تھی جیسے وہ انور سے کہہ رہا ہو 'کامریڈ' ہم اپنے وعدے پر قائم رہے نا؟'

وہ اسے گرفتار کر کے لے گئے مگر باہر برآمدے سے اُس کی گرجدار آواز پورے چیمبر کی دیواروں کو ہلاتی ہوئی گونجتی رہی ___ انقلاب زندہ باد!

اور اُس لمحہ انور نے محسوس کیا کہ ٹھہرا ہوا گندہ پانی تہہ تک ہل گیا ہے۔ بہروں کے کان کھل گئے ہیں۔ انقلاب آ گیا ہے۔ اب ہندوستان وہ پہلے والا ہندوستان نہیں رہ جائے گا۔ اُس ایک بم کا دھما کہ ہر ہندوستانی کی زندگی کو بدل دے گا۔

O

کتاب چوتھی

طوفان اور طوفان کے بعد

کھلی سازش

(1)

''......اِس لیے یہ کانگریس پچھلے سال کے کلکتہ سیشن کے ذریعے منظور کردہ تجویز کے مطابق یہ اعلان کرتی ہے کہ کانگریس کے دستور کی دفعہ نمبر ایک میں 'سوراج' لفظ کے معنی مکمل آزادی ہوں گے......''

جس وقت یہ تجویز منظور کی گئی اُس وقت صدر کی کُرسی کے پیچھے لگی ہوئی گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ بڑے سے پنڈال میں ایک لاکھ مندوبین کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، پنڈال اتنا بڑا ہوتے ہوئے بھی اُن کے لیے چھوٹا تھا لیکن انھیں اِس بات کی تسلّی تھی کہ لاہور میں دسمبر کی رات کی اُس کڑاکے کی سردی میں ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھنے کی وجہ سے اُن کے جسم میں کچھ گرمی آ رہی تھی۔ انور بھی اُن کے درمیان بیٹھا ہوا تالیاں بجا رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ تالیاں بجاتے بجاتے اُس کی ہتھیلیاں سوج گئی تھیں، اور گلا بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے گالوں پر خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جس کا وہ اور ملک کے سبھی نوجوان کئی سالوں سے انتظار کرتے آئے تھے، جس موقع کے لیے اتنے لوگوں نے مصیبتیں جھیلی تھیں اور اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی، مار کھائی تھی، دُکھ سہے تھے اور اپنی جان تک دی تھی۔

لوگوں کی بھیڑ مارے خوشی کے پاگل ہو اُٹھی تھی اور لوگ 'مہاتما گاندھی کی جے' اور 'پنڈت

جواہرلال نہرو کی جے کے نعرے لگا رہے تھے۔ اِن نعروں کی گونج میں گھڑی کی آواز بالکل ڈوب کر رہ گئی تھی۔ سب ہی نوجوانوں کے گلوں سے 'انقلاب زندہ باد' کا بہادرانہ نعرہ گونج اُٹھا جسے انور نے اسمبلی چیمبر میں بم پھٹنے کے بعد بھگت سنگھ کو لگاتے سنا تھا۔ بھیڑ اِس نعرے کو منتر کی طرح بار بار دُہرا رہی تھی اور اِس گونجتی ہوئی آواز میں اپنی آواز سن کر انور کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ یہ آزادی کا نیا منتر تھا اور انور اُس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جسے کالے پانی کی سزا ہوئی تھی اور جو اس وقت لاہور جیل میں تھا اور سینڈرس کا خون کرنے کے اس سے بھی بھیانک جرم کی سزا سنائے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس شور وغل، جے جے کار اور نعرے بازی کے غُل غپاڑے میں اُسے یکا یک بھگت سنگھ اور اس کے نوجوان بنگالی ساتھی بٹو کیشور دت کی یاد آ رہی تھی۔ نہ صرف سرکار کے پٹھو اخباروں اور اعتدال پسندوں نے بلکہ قوم پرست اخباروں اور کانگریس کے مہاتما گاندھی جیسے لیڈروں نے بھی اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اسمبلی میں بم پھینکنے کے لیے اُن کی مذمّت کی تھی۔ پھر بھی اُس دن ان دونوں نے جو بغاوت کا نعرہ لگایا تھا وہ آج سارے ملک میں کروڑوں لوگوں کی زبان پر تھا۔ اپنے چاروں طرف انور کو دُور جنوب سے آئے کالے رنگ کے تامل داسی، دُبلے پتلے پھر تیلے بنگالی، موٹے موٹے گجراتی اور گٹھے ہوئے جسم والے مراٹھے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے اور وہ سب ہی ایک آواز سے عربی فارسی کے لفظ چلّا رہے تھے—

'انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد!'

دیکھتے دیکھتے چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ اس تاریخی تجویز کے منظور کیے جانے کے موقع پر کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہرلال نہرو آزادی کا جھنڈا لہرائیں گے اور اِس خبر کے پھیلتے ہی سب لوگ باہر نکلنے کے لیے دروازوں کی طرف بھاگ پڑے۔

راوی کے مٹیالے پانی میں کانگریس کیمپ کی روشنیوں کا عکس دُھندلا دُھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو تیر کی طرح چبھتی ہوئی اُن کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھی مگر اُن کے دلوں میں آزادی کی نئی جوت جل اُٹھی تھی اور ایک بار پھر آدھی رات کے سناٹے میں اُن کے نعروں کی گونج سنائی دی حالانکہ سردی کے مارے اُن کے دانت بج رہے تھے۔ بجلی کی روشنیوں کا رُخ پنڈت جواہرلال نہرو کی طرف موڑ دیا گیا۔ جھنڈے کے نیچے کالی شیروانی

اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے پنڈت جی اپنے قد سے زیادہ لمبے لگ رہے تھے۔ انور کو ایسا لگا کہ وہ ایک شخصیت بھی ہیں اور ایک نشانی بھی۔ اُس اُمڈتی ہوئی بھیڑ کو چیر کر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے شروع کے کچھ الفاظ سنائی نہیں دیئے کیوں کہ جواہر لال نہرو دھواں دھار تقریر کرنے والوں میں سے نہیں تھے لیکن جب بھیڑ بالکل خاموش ہوگئی تو اُن کی نڈر آواز بالکل سنائی دینے لگی اور انور کو ایسا لگا کہ وہ یہ الفاظ اسی سے کہہ رہے ہیں۔

'اب ہم نے اپنے ملک کو بدیشی حکومت سے آزاد کرنے کی کھلی سازش کی ہے اور ساتھیو آپ کو ہمارے ملک کے سب بھائیوں اور بہنوں کو اِس کھلی سازش میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں آپ کو تکلیفیں اُٹھانی پڑیں گی، جیل جانا پڑے گا اور ہوسکتا ہے آپ کو اپنی جان کی بھی قربانی دینی پڑے۔ لیکن آپ کو یہ تسلی رہے گی کہ آپ ہندوستان کی خاطر جو کچھ کر سکتے تھے وہ آپ نے کیا اور آپ نے انسانوں کو اُن کی موجودہ غلامی سے چھڑانے میں کچھ تھوڑی بہت مدد کی......'

جھنڈا اُوپر چڑھ کر لہرانے لگا۔۔ لال، سفید اور ہرے رنگ کا ترنگا جھنڈا جس پر ایک چرخہ بنا ہوا تھا اور ایک پل کے لیے پُوری بھیڑ پر سناٹا چھا گیا۔ وہ اس تاریخی واقعے کی اہمیت سے اور اس بغاوت بھرے چیلنج کے سنجیدہ نتیجوں کو سوچ کر کچھ سہم سے گئے تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے تالیوں کی آواز لہر کی طرح اُٹھی اور دیکھتے دیکھتے تالیاں طوفان کی طرح گونج اٹھیں اور نعروں میں ایک نیا نعرہ جُٹ گیا۔۔ جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔'

31 دسمبر 1929......رات کے بارہ بجے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنے والا لمحہ تھا۔ ایک سال ختم ہو رہا تھا اور ایک نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ انور اپنے کیمپ میں واپس آیا تو اُسے ایسا لگا کہ اس نے تاریخ کے رُخ کو مُڑتے دیکھا ہے اور اسے موڑنے میں حصہ لیا ہے۔

(2)

اُس جھونپڑے میں چھ آدمی ٹھہرے ہوئے تھے، سب کے سب نوجوان۔ انور کے علاوہ علی گڑھ سے تین اور آدمی آئے تھے۔ عثمان، فصل بھائی، راز اور ایک بہت چھوٹا سا اسکول کا لڑکا یونس

جو شمال مغربی سرحدی صوبے کا رہنے والا تھا اور لال کُرتی والوں کے لیڈر خان عبدالغفار خاں کا کوئی بہت نزدیکی رشتہ دار تھا۔ باقی دو میں ایک تھا رائے، جو کسی بنگالی اخبار کا رپورٹر تھا اور دوسرا تھا سندرم جو جنوبی ہندوستان میں بجواڑہ کا طالب علم کارکن اور نوجوانوں کی تنظیم کا ممبر تھا۔

ایک ایک کر کے وہ واپس لوٹے اور کپڑے اتار کر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے وہ اپنی اپنی رضائیوں اور کمبلوں میں گھُس گئے۔ لیکن اُس پٹھان لڑکے کو چھوڑ کر جو دن بھر لال کُرتی والے والینٹیروں کے ساتھ پریڈ کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔ اُن میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ رائے ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ سُلگا کر لگاتار دھواں اُڑا رہا تھا اور سندرم ہر بار اُسے یاد دلاتا تھا کہ وہ سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا دیکھ بھال کر پھینکا کرے نہیں تو آگ لگ جائے گی۔ راز کوئی نظم گنگنا رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ اُس دن کے جوشیلے واقعات سے متاثر ہو کر وہ کوئی نظم کہہ رہا تھا۔ عثمان نظم پوری ہونے سے پہلے ہی سن لینا چاہتا تھا لیکن راز رائے اور سُندرم کے سامنے سنانا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اُن کی اُردو کی واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن ٹیپ کا مصرع بار بار گنگناتے ہوئے ایک بار انجانے ہی اُس نے اُسے زور سے پڑھ دیا۔ نظم کا عنوان تھا 'آدھی رات کا ستارہ' اور اُس میں راز نے اُن تاریخی واقعات اور اپنے دل پر اُن کے تاثر کو شاعرانہ ڈھنگ سے بیان کیا تھا۔

انور تو ہمیشہ سے راز کی شاعری کا دیوانہ تھا۔ وہ ہر شعر پر واہ واہ، کرنے لگا۔ اس کی تعریف سن کر رائے اور سُندرم نے انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرنے کی مانگ کی لیکن انگریزی میں بنگالی جرنلسٹ کو اس میں کچھ مزا نہیں آیا اور اُس نے ایسے خیالات ظاہر کیے جنھیں سُن کر انور دنگ رہ گیا کیوں کہ اُن میں اُسے حُبّ الوطنی کی کمی کا احساس ہوا۔ رائے نے کہا کہ گاندھی نے (وہ انھیں گاندھی جی تک نہیں کہتا تھا) دائیں بازو کی مخالف پارٹی کو نیچا دکھانے کے لیے اور کانگریس پر پھر پہلے کی طرح اپنا قبضہ جمانے کے لیے تگڑم سے پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کا صدر بنا دیا تھا۔ انور یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کے مقبول لیڈر پر اس طرح تنقید کی جائے، اس لیے اُس نے زبردست مخالفت کرتے ہوئے کہا 'ہر آدمی جانتا ہے کہ جواہر لال نہرو کا چُناؤ ترقی پسند نوجوان لوگوں کی جیت ہے۔ تم نے ابھی پریسی ڈینٹ کی حیثیت سے اُن کی تقریر سنی ہے۔

اگر تم اب بھی انھیں رجعت پسند سمجھتے ہو تو یہ تمھاری ضد ہے اور کچھ نہیں۔'

'اور تم بالکل اناڑی قسم کے جذباتی آدمی ہو جو آدمی کو ہیرو بنا کر اُسے پوجتے ہو،' رائے نے جواب دیا۔ 'اور تم نے ابھی تک آدمی کی باتوں اور اُس کے کاموں میں فرق کرنا نہیں سیکھا ہے۔'

اس پر عثمان اور سُندر رم دونوں کو غصہ آ گیا۔ وہ دونوں بھی انور کی طرح ہی نہرو کے پکّے بھگت تھے، اِس لیے وہ اُس کی طرف سے بولنے لگے۔ عثمان نے کہا کہ نہرو کی رہنمائی کو جو تسلیم نہیں کرتا وہ غدّار ہے۔ اور سُندر رم نے، جس کی یادداشت بہت اچھی تھی، پنڈت جی کے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کی گئی تقریر کے کچھ حصّے زبانی دُہرانا شروع کیا۔ وہ حصّہ، جس میں انھوں نے مکمل آزادی اور انگریزوں سے ناطہ توڑ لینے پر زور دیا تھا، کھلے عام یہ قبول کر لیا تھا کہ وہ سوشلسٹ ہیں اور ہندوستان میں سوشلزم قائم کرنے کے لیے کام کریں گے۔ انھوں نے دیسی رجواڑوں پر حملے کیے تھے، گاندھی جی کے ٹرسٹی شپ کے اُصول کی کھلی مخالفت ظاہر کی تھی اور نیشنل کانگریس اور مزدوروں کی ٹریڈ یونین کانگریس کے درمیان گہرے تعاون کی پیشین گوئی کی تھی۔ اُس سال وہ اِن دونوں ہی تنظیموں کے صدر تھے۔

'سب باتیں ہی باتیں ہیں کوری باتیں،' سنکی رائے نے دوسری سگریٹ جلاتے ہوئے کہا اور پھر ایک بار نہرو کے تینوں بھگتوں نے ایک ساتھ اُس پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔

'اچھی بات ہے،' انور نے اپنے دونوں تائید کرنے والوں کی بات کاٹ کر اُونچی آواز میں کہا 'ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ گاندھی رجعت پسند ہیں اور جواہر لال کمزور آدمی ہیں اور اُن میں بالکل دم نہیں ہے، لیکن کیا تم کسی دوسرے لیڈر کا نام بتا سکتے ہو جس سے ہم آزادی کی لڑائی کی رہنمائی کرنے کی اُمید کر سکتے ہیں؟'

اُس نے سوچا تھا کہ اِس بات سے وہ رائے کا مُنہ بند کر دے گا لیکن رائے کو اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں ایک پل بھی نہیں لگا۔ اُس نے بڑے بھروسے کے ساتھ جواب دیا۔ 'ہاں، کیوں نہیں؟ سبھاش بوس۔'

عثمان کے یہ سنتے ہی جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے جل کر کہا۔ 'تم بنگالی لوگ تو ہمیشہ کسی بنگالی ہی کو پسند کرتے ہو۔ اس لیے تمھاری ترقی کی ساری باتیں کھلی صوبہ پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔'

اس پر بحث میں پھر گرمی پیدا ہوگئی اور سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ رائے، جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، اس تہرے حملے سے اپنی حفاظت کرتا رہا۔ ایک بار تو ایسا لگا کہ وہ دُبلا پتلا بنگالی جو کسی سے کم غصے والا نہیں تھا، نہرو کے ان تینوں بھگتوں سے ہاتھا پائی کر بیٹھے گا۔ پر اتنے میں یونس کی آنکھ کھل گئی اور پوچھنے لگا کہ کیا گڑ بڑ ہے، اس لیے ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے علاوہ بغل والی جھونپڑی سے کسی نے بیچ کی دیوار کو زور سے تھپتھپاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا 'ارے رام رام۔ کیا گول مال مچا رکھا ہے؟ نیند حرام کر رکھی ہے، ہمیں صبح اٹھ کر ندی پر نہانے جانا ہے اور پوجا پاٹ کرنا ہے۔'

اُن لوگوں نے باتیں بند کر دیں اور جلدی جلدی اپنے اپنے کمبلوں میں دبک گئے لیکن رائے نے سونے سے پہلے اپنی سگریٹ بجھاتے ہوئے بھی اُن پر فقرہ کس ہی دیا 'یہ ہیں تمھارے پڑوسی، گھاس کھانے والے پوتر گاندھی وادی۔'

(3)

نہرو کے خلاف رائے کی باتوں سے انور کی وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن دل ہی دل میں اُس نے فیصلہ کیا کہ اگلے دن وہ اُس بنگالی جرنلسٹ سے کہے گا کہ وہ اُسے سبھاش سے ملا دے۔ اس طرح ایک دن میں اُسے تین آدمیوں سے ملاقات کرنی پڑے گی کیوں کہ یونس کے ذریعے اُس نے لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے پٹھان لیڈر عبدالغفار خان سے ملنے کا انتظام کیا تھا اور سُندرم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے اُس لیڈر سے ملا دے گا جس نے کانگریس کے ساتھ ہی ہونے والی شراب بندی کانفرنس کی صدارت کی تھی، اُس کا نام کچھ بہت ہی ٹیڑھا سا تھا لیکن کہا جاتا تھا کہ وہ جنوبی ہندوستان کا سب سے قابل لیڈر تھا۔

باقی لوگ تو جلد ہی سو گئے لیکن انور لیٹا لیٹا اُن تمام باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے دیکھی اور سنی تھیں۔ رائے کے جیسے سنکی چاہے جو کہیں، پر انور کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ لڑائی کا بگل بج چکا تھا اور جلد ہی سارا ملک گاندھی اور نہرو کی رہنمائی میں آزادی کی آخری لڑائی چھیڑنے والا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اس لڑائی میں وہ کیا کرے گا۔ کیا وہ الگ کھڑے رہ کر صرف تماشا دیکھے گا؟ وہ جانتا تھا کہ یہ اُس سے نہیں ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جدّ و جہد میں

کودنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے جیل جانا پڑے گا، شاید یونی ورسٹی سے اُسے نکال بھی دیا جائے، شاید اپنے ابا سے بھی رشتہ توڑنا پڑے کیوں کہ اب وہ کانگریس کے پکّے مخالف ہو گئے تھے۔ پھر بھی یہ سب خطرے تو اُسے مول لینے ہی ہوں گے، اگر وہ اپنے تیئں اور اپنے عہد کے تیئں سچّا رہنا چاہتا تھا تو اُسے اس کے لیے قیمت تو چکانی ہی ہوگی۔ راستہ صاف تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہزاروں لوگ جیل جا رہے ہیں، ہزاروں لوگ اہنسا کی لڑائی لڑنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، کوئی جوابی حملہ کیے بنا اور بھاگے بنا (جواہر لال کی طرح) لاٹھیاں کھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہنستے ہنستے پھانسی کے تختے پر بھی چڑھ رہے ہیں اور اُس نے دیکھا کہ وہ جیل میں بند ہے، وہ اپنی کھوپڑی پر لاٹھیوں کی بوچھار محسوس کرنے لگا اور کمبل کا کنارہ اُسے اپنے گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح معلوم ہونے لگا۔

اور پھر، جیسا کہ نیند آنے کے پہلے کے لمحوں میں ہمیشہ ہوتا تھا، سلمیٰ کی جادو بھری دل کو لبھانے والی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئی— ملائم گھنگھروالے بالوں میں گھرا ہوا وہ لمبوترا چہرہ، بڑی بڑی معصوم آنکھیں اور لال لال ہونٹ جن سے اُس نے محبت کے اٹوٹ بندھنوں میں انور کو باندھ لیا تھا۔ آج اس کے سامنے اس کی جو تصویر آئی اس میں اس کے چہرے کے چاروں طرف ایک سوالیہ نشان کا گھیرا تھا جیسے پورے چاند پر گرہن لگ گیا ہو۔ ابھی اس نے اپنے دماغ میں وطن کی خدمت کی تجویز تیار کی تھی، اس میں وہ کس طرح کھپ سکے گی؟ اس کے ابا سرکار کے وفادار تھے اور حالانکہ وہ جتاتی ایسا تھی کہ اُسے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ انور کے سیاسی دوستوں اور اُس کی سیاسی دلچسپیوں سے بہت جلتی تھی۔ وہ اس کے لاہور جانے پر بھی خوش نہیں تھی اور اس لیے اُسے یہ بہانہ بنانا پڑا تھا کہ وہ وہاں اپنی سیاسی دلچسپی کی وجہ سے نہیں بلکہ سیر کرنے جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہوگی کہ وہ کسی بھی خطرناک سیاسی کام میں ہاتھ ڈالے۔ لیکن کیا یہ ایک عورت کے لیے قدرتی بات نہیں تھی؟ جب مرد لڑائی پر چلے جاتے ہیں تب بھی تو اُن کی عورتیں روتی ہیں، لیکن کیا اس وجہ سے سپاہی فوج میں بھرتی ہونا بند کر دیتے ہیں؟ وہ اُس سے محبت کرتی تھی اس لیے وہ اُسے جانے تو نہیں دینا چاہے گی۔ لیکن وہ اُسے بتائے گا کہ اس کے لیے جانا کیوں ضروری ہے، یہ صرف اس کے

فرض کا ہی نہیں بلکہ اُس کی عزت کا بھی سوال ہے، اور وہ سمجھ جائے گی، وہ رو رو کر اُسے وداع کرے گی اور جب جدّ وجہد ختم ہوگی اور آزادی مل جائے گی، تب وہ لوٹ کر آئے گا اور وہ مسکرا کر اُس کا استقبال کرے گی پھر اُن کی شادی ہو جائے گی اور اُن کے دن چین سے گزریں گے......

نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور وہ اس مسرّت آمیز تصور کو سینے سے لگا کر کروٹ بدل کر سو گیا۔

(4)

انور نے دیکھا کہ کچھ باتوں میں سبھاش بوس کی شخصیت جواہر لال نہرو جیسی ہی دلکش تھی، لیکن کچھ باتوں میں وہ اُن سے بالکل مختلف تھے۔ دونوں ہی بہت خوب صورت تھے لیکن نہرو کے چہرے پر کافی نرمی تھی اور ناک نقشہ کافی اُبھرا ہوا تھا، لیکن اُس جوشیلے بنگالی کا چہرہ کچھ بھرا ہوا اور گول تھا۔ انور نے انھیں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے سنا تھا۔ انھوں نے کانگریس کو یہ رائے دی تھی کہ آزادی کی تجویز کو روبہ عمل لانے کے لیے اور سامراجیت کو چیلنج دینے کے لیے مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں کی تنظیم کی بنا پر انگریز سرکار کے متوازی ایک دوسری سرکار بنائی جائے۔ پُرانے لیڈروں کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز پاس نہیں کی گئی تھی لیکن سامعین میں جو نوجوان تھے وہ سبھاش بوس کے بہادرانہ منصوبے اور اُن کی جوشیلی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ دونوں کی تقریر سننے کے بعد انور اس سوچ میں پڑ رہا تھا کہ بوس اور نہرو میں کیا فرق ہے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حالانکہ دونوں سوشلسٹ تھے لیکن بوس آزادی اور سماجی انصاف کی طرف اپنے جوشیلے رویے کی وجہ سے دل کے جذبات کو چھو لیتے تھے، لیکن نہرو کی بات دماغ کو چھوتی تھی اور اُنیسویں صدی کے سیاسی فلسفیوں کی طرح وہ علم سے دماغوں میں تبدیلی کے ذریعے دنیا کو بدلنا چاہتے تھے۔

اسٹیج پر تقریر کرتے وقت بوس بہت جوشیلے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن جب انور نے انھیں اپنی جھونپڑی میں قریب سے دیکھا تو وہ بالکل ہی دوسری قسم کے آدمی نکلے۔ بے حد شریف، کافی نرمی سے بولنے والے اور کچھ آرام طلب، انھیں درمیان میں نہرو کی طرح غصہ بھی نہیں آتا تھا۔ رائے نے جو بنگالی لیڈر کو کافی اچھی طرح جانتا تھا، انور کا تعارف کراتے ہوئے کہا، 'یہ علی گڑھ کے بہت کٹّر نوجوان نیشنلسٹ ہیں لیکن پکّے نہرو وادی ہیں' اور یہ سن کر بوس

مسکرا دیئے۔ جرنلسٹ رائے نے پہلے ہی سے اپنے اخبار کے لیے اُن کا انٹرویو لینے کا پلان بنا رکھا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے سوال اِس طرح تیار کیے تھے کہ انور کے خیالات میں ایک نئی روشنی پیدا ہو اور شاید وہ اپنے پرانے خیالات کی طرف سے کچھ مایوس ہوں۔

'بوس بابو' اُس نے بنگالی کے عام خطاب کا استعمال کرتے ہوئے پوچھا 'لاہور کانگریس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'

بوس بابو نے دھیرے دھیرے رُک رُک کر بہت سدھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ 'ظاہر ہے مجھے تو اِس بات کی خوشی ہے کہ کانگریس نے مکمل آزادی کو اپنا مقصد مان لیا ہے، لیکن مجھے اِس بات کا بڑا افسوس ہے کہ ہم نے سرکار کے متوازی اپنی الگ سرکار بنانے کی جو عملی تجویز رکھی تھی اسے منظور نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں بتایا گیا ہے اور نہ آنے والے سال کے لیے کام کا کوئی پروگرام ہی بنایا گیا ہے۔' پھر، کچھ دیر رُک کر، جس کے دوران اپنے موٹے سے چشمے کے پیچھے سے انور کو ایک نظر دیکھا، انھوں نے زیادہ زور دے کر اور کچھ جھنجھلا کر کہا 'اِس سے زیادہ مضحکہ خیز بھی کوئی بات ہو سکتی ہے یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن سیاست میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو نہ صرف اصلیت کا احساس نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اپنی معمولی عقل بھی کھو دیتا ہے۔'

رائے نے فوراً دوسرا سوال پوچھا، 'کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو ورکنگ کمیٹی میں نہیں لیا گیا ہے؟'

اِس سوال کو سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آ کر بنگالی بولنے لگے لیکن یہ سوچ کر کہ اُن کی بات انور کی سمجھ میں نہیں آئے گی، انھوں نے پھر انگریزی میں بولنا شروع کر دیا، 'یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کیوں کہ کل رات ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ہے اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ بائیں بازو کے لگ بھگ سب ہی لوگوں کو جان بوجھ کر کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔'

انور نے ہمت کر کے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا، 'لیکن یہ تو عجیب بات ہے کیوں کہ پریسی ڈینٹ خود بائیں بازو کے ہیں اور سوشلسٹ بھی ہیں؟ آخر انھوں نے اپنی پسند کے لوگوں کو کمیٹی میں کیوں نہیں لیا؟'

'کیونکہ،' سبھاش بوس نے جواب دیا۔ 'لوگوں کو چننے کا کام مہاتما جی کرتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ کمیٹی میں کوئی ایسا آدمی ہو جو اُن کے خلاف آواز اُٹھائے۔ جواہر لال تو پریسی ڈینٹ صرف نام کے ہی ہیں،' پھر انھوں نے جرنلسٹ کو، جو اُن کی باتیں لکھتے جا رہے تھے، آگاہ کرتے ہوئے کہا، 'لیکن یہ سب کچھ ابھی اخبار میں چھاپنے کے لیے نہیں ہے۔'

(5)

انور یونس کے ساتھ جا کر خان عبدالغفار خان سے ملا۔ اُس نے اُن سے زیادہ لمبا آدمی اب تک نہیں دیکھا تھا۔ دوسرے لوگ اُن کے آگے بالکل بونے لگتے تھے، اُن کی لمبی سی جھکی ہوئی ناک اور چٹان جیسا سخت کھردرا چہرہ جس پر داڑھی اُگی ہوئی تھی شمال مغربی صوبے کے سخت پہاڑی علاقوں کی یاد دلاتا تھا جن پر کوئی قابو نہیں پا سکا تھا۔ اپنے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود اُن میں بچّوں جیسی معصومیت اور سنتوں جیسی نرمی تھی۔ وہ اتنی نرمی سے باتیں کرتے تھے کہ سننے والا شرمندہ ہو جاتا تھا۔

انور کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ پٹھان بہت خوفناک، لڑاکو لوگ ہوتے ہیں لیکن اُس وقت اُس کے سامنے ایک ایسا پٹھان تھا جو بھولی چڑیا کی طرح نرمی سے بولتا تھا اور یہ یقین کرتا تھا کہ گاندھی جی کی اہنسا کے راستے پر ہی چل کر پٹھانوں کو نجات مل سکتی ہے۔ اُن کے چاروں طرف کوئی درجن بھر دوسرے پٹھان کھڑے تھے جو کھدر کی شلواریں اور گہرے بھورے لال رنگ کے کُرتے پہنے تھے (اسی وجہ سے اُن کا نام لال کُرتی والے، پڑ گیا تھا) انھوں نے انور کو اپنے صوبے کی عجیب حالت کے بارے میں بتایا۔ جہاں انگریز باری باری سے روپے اور بندوقوں، کی مدد سے حکومت کرتے تھے جہاں بھی ممکن ہوتا تھا وہ قبائلیوں کو رشوت دے کر کام نکالتے تھے اور جب ضرورت ہوتی تھی تو اُن پر بم برساتے تھے، اور اس طرح وہ فوجی اہمیت کے اس علاقے کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔ انور آنکھیں پھاڑے ہوئے تعجب سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ انھوں نے انور کو اُن انگریز سیاسی ایجنٹوں کے بارے میں بتایا جو لاکھوں کی رقم پانی کی طرح خرچ کرتے تھے اور بہت بڑے علاقے میں وہ جسے چاہتے مروا سکتے تھے، اس نے یہ بھی سنا کہ عبدالغفار خاں اپنے

اسی صوبے میں لوگوں کو تعلیم دلانے اور سماج سُدھار کے کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انور کو یہ سن کر بھی تعجب ہوا کہ سرکار، غفار خاں کی اِن کوششوں کو ناکام کرنے کی کوشش کر رہی تھی، کیوں کہ سرکار چاہتی تھی کہ لوگ جاہل اور پچھڑے رہیں لیکن آزادی کے دیوانے قبائلی کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی بیچنے کو تیار نہیں تھے اور وہ بہت ہی بھونڈی قسم کی دیسی بندوقوں کی مدد سے انگریز سامراج کی 'آگے بڑھنے کی پالیسی' کے خلاف جان کی بازی لگا کر ٹکر لے رہے تھے۔

'اور پھر بھی، خان صاحب' انور نے ہمت کر کے پوچھا 'آپ سمجھتے ہیں کہ اِن نڈر قبائلیوں کو ہتھیار پھینک کر اہنسا کا راستہ اپنانا چاہیے؟ ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اس لیے چوڑے پٹھان نے جواب دیا: 'اہنسا کا راستہ صحیح راستہ ہے—وہی خدا کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ اِس مہم میں ہم گاندھی جی کے ساتھ ہیں اور انشاءاللہ ہم یہ دکھائیں گے کہ پٹھان آزادی کے لیے جان بھی دینا جانتا ہے۔'

انور اب تیسرے لیڈر سے ملاقات کرنے کے لیے جُدا ہوا تو وہ سوچ رہا تھا کہ یہ پٹھان بھی عجیب آدمی ہے، لیکن اس پٹھان میں ایک عجیب کشش تھی۔ سُندرم نے جنوبی ہندوستان کے جس لیڈر سے اس کا تعارف کرایا اُن کا نام تھا راج گوپال اچاریہ۔

انور کے لیے یہ نام اتنا ٹیڑھا تھا کہ اُس کا صحیح تلفظ کرنے کے لیے اُسے یہ نام لکھ لینا پڑا۔ عبدالغفار خاں کے مقابلے میں وہ ایک کالے بونے جیسے لگ رہے تھے اور اپنی گنجی چاند اور گہرے رنگ کے چشمے کی وجہ سے اُن کی شکل وصورت کچھ خاص دلکش نہیں تھی۔ انور اُن کی زود فہمی اور اُن کی حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوا اور اس نے دیکھا کہ دائیں بازو کی ہر پالیسی کو وہ سب سے اچھی طرح پیش کر سکتے تھے، لیکن ایک ایسے آدمی سے باتیں کرنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جس کی آنکھیں گہرے رنگ کے چشمے کے پیچھے چھپی رہیں۔ ایسا آدمی خود تو سب کچھ دیکھتا رہتا ہے پر اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ جب بات چیت کا رُخ سیاست سے ہٹ کر مذہب کی طرف مُڑ گیا اور وہ دُبلا پتلا چھوٹا سا مدراسی آدمی گیتا کے اشلوک سنانے لگا تو انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

سبھاش بوس، خاں عبدالغفار خاں، راج گوپال اچاریہ—ایک جوشیلا بنگالی اور ایک خاموش اور سنجیدہ پٹھان، ایک ہوشیار اور شاید چالاک مدراسی۔ انور ایک ہی دن میں اِن تینوں سے ملا تھا اور

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کانگریس کی سیاسی پالیسی کے ڈھانچے میں اِن تینوں کو ایک ساتھ کیسے بٹھایا جائے۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ کانگریس کی سیاسی پالیسی کا فیصلہ گاندھی جی کی مہاتماؤں جیسی انسان دوستی اور جواہر لال کے سوشلسٹ آئیڈلزم کی بنیاد پر ہوتا ہے! جو تحریک جلد ہی چھڑنے والی تھی، کیا اُس میں بے میل ہستیوں اور ایک دوسرے کی مخالف طاقتوں کو ایک ساتھ شامل کیا جاسکتا تھا؟ اگر اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو یہ گاندھی جی کی پالیسی کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی! اُس رات یہی سوچتے سوچتے انور کو نیند آ گئی۔

(6)

انور، راز اور یونس کے ساتھ علی گڑھ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن ابھی وہ بستر باندھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں رتن — بلکہ کہنا چاہیے رام لال، کیوں کہ اب اُس کا یہی نام تھا— وہاں آ پہنچا۔ تو وہ ابھی تک پولیس کے چنگل سے بچا ہوا تھا انور اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دونوں دوستوں نے لپک کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

'ارے بھائی، کہاں جا رہے ہو؟' رتن نے اس کے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'ابھی تو تم نے صرف کانگریس دیکھی ہے، لاہور تو گھومے ہی نہیں۔ تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے چار دن ہوگئے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمھیں اس طرح چلا جانے دوں گا؟ کم سے کم کچھ دن تو تمھیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے تمھارے دوستوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'

اور یہ کہہ کر وہ انور کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے گیا اور اس کا سوٹ کیس اور بستر تانگے میں ڈال کر اس نے تانگے والے سے کرشن نگر چلنے کو کہا۔ پھر انور سے بولا 'میں نے کرائے پر ایک گھر لے رکھا ہے جس میں میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ رہتا ہوں۔' انور کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کس طرح کے دوستوں کے ساتھ رہتا ہوگا اور جب وہ رتن کے گھر پہنچا اور اس نے اندر کے کمروں میں طرح طرح کی بوتلیں، شیشیاں، کانچ کی نلیاں اور تیزاب کی صُراحیاں، پُرانے لوہے کے ٹکڑے اور کچھ فولاد کے خول بھرے ہوئے دیکھے تو اُس کے دل میں طرح طرح کے شک پیدا ہونے لگے اور وہ سمجھ گیا کہ یہ سب چیزیں صرف بم بنانے کے ہی کام آسکتی ہیں۔

'مجھے یہاں لا کر کیا تم نے بہت بڑا خطرہ نہیں مول لیا ہے؟' انور نے بیٹھتے ہوئے کہا 'کیا تمھاری پارٹی کے لوگ اِس بات پر اعتراض نہیں کریں گے کہ تم نے ایسی خفیہ جگہ ایک اجنبی آدمی کو دکھادی؟'

'انور تُم نے دِلّی میں ہم لوگوں کے لیے جو کچھ کیا اُس کے بعد تُم اب پارٹی کے لیے اجنبی نہیں رہ گئے۔'

اس بات پر انور کو یاد آیا کہ اُس حادثے کو دس مہینے ہو گئے تھے لیکن ابھی انور کو اُس کے دوست سے ایک حساب چکتا کرنا تھا۔ اس نے شکایت کرتے ہوئے کہا 'اِس بار تم اپنے وعدے پر قائم نہ رہے۔ تمھیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا:

کوئی تشدد نہ ہونے پائے؟'

رتن یہ سُن کر ہنس پڑا اور بولا 'تمھیں بھی یاد ہے ہم نے کیا کہا تھا— کوئی جان سے نہیں مارا جائے گا۔' بھگت سنگھ، بٹوکیشور دت اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی یاد آتے ہی جن پر وہاں سے کچھ ہی میل کی دوری پر لاہور سینٹرل جیل میں قتل اور بغاوت کے سنگین جُرموں میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا، رتن کا چہرہ کچھ اُداس ہو گیا۔ اُسے شاید اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انور نے اُس کے جذبات کو تاڑ لیا ہے۔ کیوں کہ کسی کا نام لیے بغیر اس نے کہنا شروع کیا 'تمھیں یہ تو معلوم ہی ہوا ہوگا کہ اُن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے— بھوک ہڑتال کے بارے میں اور اکسٹھ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد جتین داس کی موت کے بارے میں تو تم نے سنا ہوگا۔ انور، ذرا سوچو، دو مہینے تک اُس نے اناج کا ایک دانہ بھی نہیں کھایا۔ تم نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ یوں بھی اتنا دُبلا پتلا اور اتنا نرم طبیعت کا تھا کہ ہم لوگ اُس سے کہا کرتے تھے کہ 'جتین تم تو بالکل لڑکیوں جیسے ہو،' اور ہماری اس بات پر وہ شرما کر ہنس دیتا تھا اور جب اُس کی ارتھی اُٹھی اُس وقت وہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو چکا تھا اور اُس کا وزن بچّے کے وزن سے زیادہ نہیں تھا۔'

انور نے دیکھا کہ رتن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے اور ادھر کچھ دنوں سے اُس نے سخت گیری اور سخت کلامی کا جو ایک باہری غلاف اوڑھ رکھا تھا وہ اچانک ہٹ گیا۔ اب اُس سے وہی پُرانا رتن باتیں کر رہا تھا جس سے وہ لڑکپن میں ملا تھا اور جس کی طبیعت اتنی نرم تھی۔

'اخباروں میں پورا حال چھاپا نہیں جاتا کہ پولیس ہمارے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے۔ انھیں بُری طرح پیٹا گیا ہے اور ہفتوں اندھیری کال کوٹھریوں میں بند کر کے رکھا گیا ہے، انھیں سخت تکلیفیں دی گئی ہیں اور ننگا کر کے برف کی سلوں پر لٹایا گیا ہے۔ اب ہم انھیں زیادہ دن تک یہ تکلیفیں سہنے نہیں دے سکتے۔ جلد ہی ہمیں.....'

یکا یک وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جتنی باتیں بتانا چاہتا تھا اُس سے زیادہ اُس نے بتادی ہیں۔ اتنی باتیں تو اُسے پورے بھروسے والے دوست کو بھی نہیں بتانی چاہئیں۔

'تمھارا مطلب ہے کہ تم اُن لوگوں کو چھڑانے کی کوشش کرو گے؟' انور سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اِس دلیرانہ تجویز کا تصور کر کے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

رتن نے سر ہلا کر دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں انور پہلے ہی بم کا کارخانہ، دیکھ چکا تھا۔ 'ہمارے کچھ ساتھی اس کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اصلی ذِل یہ نہیں ہے، میں تو تم سے ایک دوسری ہی چیز کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں جو کہیں زیادہ ضروری ہے لیکن جس میں تمھارے لیے خطرہ بہت کم ہے۔'

انور یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ کیا چیز تھی جس کے بارے میں رتن اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا پر رتن کو بتانے کی جلدی نہیں تھی 'پھر باتیں کریں گے لیکن یہاں نہیں، اب دوسرے لڑکے واپس آتے ہوں گے اور میں یہ بات اُن کے کانوں میں بھی پڑنے دینا چاہتا ہوں۔' پھر اُس نے ایک ایسی بات کہی کہ انور چکّر میں پڑ گیا۔ اُس نے کہا 'تم کپڑے بدل کر اپنا سب سے اچھا سوٹ پہن لو، شاید ہم کھانا کھانے کے لیے ایک بہت ہی فیشن ایبل ہوٹل میں چلیں گے۔'

(7)

وہ سنگیت سب سے پہلے افریقہ کے جنگلوں سے آیا تھا، جہاں کے قدیم جنگلی باشندے بھوت پریت بھگانے والے جادوگر کے مشورے کے مطابق ڈھول پیٹ کر، بھونپو بجا کر اور اپنے تنے ہوئے کالے پیٹ بجا بجا کر عجیب عجیب آوازیں نکال کر چلاتے تھے۔ جب غلاموں

کی تجارت کرنے والوں نے ان بیچارے حبشیوں کو چُرا کر سات سمندر پار نئی دنیا میں جا کر بسنے والے سفید فام لوگوں کے ہاتھ بیچا تو یہ اپنے ساتھ اپنا سنگیت بھی لے گئے۔ نیویارک، شگاگو اور سان فرانسسکو کے اُکتائے ہوئے شوقین لوگوں کو یہ سنگیت بھا گیا اور جنوبی امریکہ کی جذبات کو اُبھارنے والی بھیگی بھیگی ہوا میں اِس سنگیت کو نئے سانچے میں ڈھالا گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدید جذباتی ہو گیا۔ ڈالر کے دیس سے آنے والی دوسری چیزوں — ہالی ووڈ کی فلمیں، فورڈ کی موٹر گاڑیاں، لِپ اسٹک، چیونگ گم — کے ساتھ جاز سنگیت بھی ہندوستان پہنچا — یہ سنگیت لاہور میں بڑی تیزی سے پنپنے لگا کیونکہ نو دولتیے زمینداروں کے بیٹوں کو اس میں خود اپنے ملک کے جاندار لوک سنگیت کی ایک عجیب اور مسخ شدہ سی گونج سنائی دیتی تھی۔

رتن انور کو مال روڈ پر ایک نائٹ کلب میں لے گیا اور اُسے لاہور کی زندگی کے ایک ایسے پہلو سے واقف کرایا جو کانگریس کیمپ کے نرے سیاسی ماحول سے بالکل الگ تھا۔ یہ بالکل ہی دوسری دنیا تھی، کپڑے کی دُکانیں جن میں سینکڑوں قسم کا رنگ برنگا ولایتی کپڑا ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا، جگ مگ کرتی ہوئی جوہریوں کی دُکانیں، ریستوراں، شراب خانے اور نائٹ کلب، الپاکا کے ڈِنر سوٹ، کلف دار قمیض، جارجٹ اور چینی کریپ کی ساڑیاں، زری کی قمیضیں اور شلواریں، ہیرے کے بُندے اور موتیوں کے ہار، پاؤڈر اور سُرخی سے رنگے ہوئے چہرے، رسیلے ہونٹ اور دعوت دیتی ہوئی آنکھیں، بے جھجک قہقہے، گلاسوں کی کھنک، شراب کی جھلملاہٹ، گال سے گال ملا کر ناچتے ہوئے جوڑے اور کانگو کے جنگلی سنگیت کی دُھن پر تھرکتے ہوئے لچکدار جسم اور ان سب چیزوں پر چھایا ہوا سگریٹ کا دھواں اور وہسکی کی بھبک......

رتن نے اُسے بتایا کہ اُس نے یہ اُصول سا بنا لیا تھا کہ وہ ساری خُفیہ باتیں کسی نائٹ کلب میں جا کر ہی کرتا تھا — جہاں بھیڑ میں ہو کر بھی آدمی اکیلا رہتا ہے اور اُس ہُلڑ کے بیچ کھُل کر بات چیت کر سکتا ہے۔ انور کو شروع شروع میں اس میں بہت خطرہ معلوم ہوا لیکن ناچ گھر کی مدھم روشنی میں کچھ منٹ تک کونے والی میز پر بیٹھنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا کہ رتن نے یہ جگہ پسند کرنے میں کتنی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔ شراب کے دیوتا کا یہ مندر آخری جگہ تھی جہاں پولیس کسی انقلابی کی تلاش میں آ سکتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں کے ماحول سے واقف ہوگیا اِس لیے اب اُس کا دھیان اپنے چاروں طرف کی چیزوں سے ہٹ گیا اور اُس نے اپنے دوست کی بات غور سے سننا شروع کیا۔

رتن نے اُسے بتایا کہ جیل کے اندر اور باہر دونوں ہی جگہ کے انقلابیوں کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ کانگریس کوئی انقلابی قدم اٹھائے گی۔ پھر بھی وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ آزادی والی تجویز آگے کی سمت میں ایک قدم ہے اور بہت تھوڑا ہی سہی لیکن اس بات کا امکان ہے ضرور کہ جتنے دن تک جواہر لال کانگریس کے پریسی ڈینٹ ہیں تب تک کانگریس شاید کچھ بائیں بازو کی طرف جھکے۔

انور کو یہ سن کر بہت دلچسپی پیدا ہوئی کیوں کہ اُس نے محسوس کیا کہ دہشت پسند بھی اب دھیرے دھیرے اُس کے ڈھنگ سے سوچنے لگے ہیں لیکن پھر بھی اس نے پوچھا 'تو اِس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟'

'یہی میں بتانے جا رہا ہوں،' رتن نے جواب دیا اور بتایا کہ 'انقلابی یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اب اپنا کام سیاسی حلقے میں کرنا ہوگا اور بم وغیرہ پھینکنے تک ہی محدود نہیں رہنا ہوگا۔ اس کے لیے کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو دوسرے دلوں تک ہماری بات پہنچا سکے اور اُن کی بات ہمیں بتا سکے کیوں کہ اُن کا طریقہ ہمارے اب تک کے طریقے سے الگ بھلے ہی ہو پر انقلاب کے لیے اُن کے دل میں ہم سے کم لگن نہیں ہے۔'

'تمھارا مطلب۔' انور نے اُس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا 'کمیونسٹوں سے ہے۔'

'ہاں کمیونسٹوں سے بھی، اوروں سے بھی۔ شاید علی گڑھ میں میں نے تمھیں بتایا تھا کہ ہماری پارٹی کی پالیسی میں سوشلزم کی طرف ایک نیا جھکاؤ آیا ہے۔ ہمارے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال کے زمانے میں میرٹھ کے قیدیوں نے ہماری ہمدردی میں بھوک ہڑتال کر کے ہمارے ساتھ اپنے بھائی چارے کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتھ مل کر کام کرنے کی بنیاد موجود ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہماری طرف سے میرٹھ ایک پیغام پہنچا دیا جائے جس میں ہمارے ٹھوس مشورے ہوں۔'

'تو تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ.....'

'ہاں، تم ہی ایک ایسے آدمی ہو جو اس کام کو کر سکتے ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی میرٹھ کی عدالت میں جانے کی ہمت نہیں کر سکتا کیوں کہ وہاں آدھے درجن صوبوں کے سی۔آئی۔ڈی والے موجود ہوں گے۔'

اُن کے آپس کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ خیالات میں بے حد فرق ہونے کے باوجود رتن کبھی بھی انور سے یہ پوچھتا نہیں تھا کہ وہ اس کا کوئی کام کرے گا کہ نہیں۔ وہ بس سیدھے اُس سے وہ کام کرنے کو کہہ دیتا تھا۔

انور کچھ گھبرا رہا تھا لیکن رتن نے اُسے ہمت بندھاتے ہوئے کہا، 'میں نے سب نقشہ تیار کر لیا ہے۔ تمھارے لیے کوئی بھی خطرہ نہیں ہے۔ کل جب ہمارے ساتھیوں کا مقدمہ پیش ہو تو تم ایک پریس رپورٹر بن کر عدالت میں جانا— میں نے تمھارے لیے پریس کا پاس بنوا لیا ہے۔ وہاں اُن میں سے کوئی ایک چپکے سے تمھارے ہاتھ میں ایک چٹھی سرکا دے گا۔ تمھیں بس میرٹھ جا کر وہاں اُن میں سے کسی کو وہ چٹھی دے دینا ہے۔ بس اتنا ہی کام ہے۔ تمھیں اور کچھ نہیں کرنا چاہیے بہت ہی سیدھی سی بات ہے۔'

انور کو یہ بات اتنی سیدھی نہیں معلوم ہوئی کیوں کہ اُسے پہلے اس قسم کے خفیہ کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن کانگریس کی تحریک کو کچھ بائیں بازو کی طرف لے جانے کے لیے کمیونسٹوں اور دہشت پسندوں کے درمیان میل ہو جانے کا خیال اُسے جچ گیا۔ اس لیے اُس نے رضا مندی میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد دونوں دوستوں نے ناچ کی طرف توجہ دی جہاں کئی جوڑے ایک زور دار 'پھڑکتی ہوئی' دھن پر ناچ رہے تھے اور ایک لڑکی بہت کسا ہوا کالا فراک پہنے، جو ایک طرف سے اِس طرح کٹا ہوا تھا کہ اُس کی پوری ننگی ٹانگ دکھائی دیتی تھی، جھوم جھوم کر دیوانوں کی طرح گا رہی تھی۔

چکی چک چک!

'آئی لَو یو سو مچ، سو مچ!'

(8)

دوسرے دن بہت صبح ہی انور نے ایک تانگہ پکڑا اور کرشن نگر سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ وہاں اُس نے اپنا سوٹ کیس اور بستر کلوک روم میں ڈالا اور لگ بھگ ایک گھنٹے میں وٹینگ روم میں وقت کاٹنے کے بعد سینٹرل جیل کے لیے دوسرا تانگہ لیا۔ رتن نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ تانگہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ وہ پہلے والا تانگہ نہ ہو۔ جیل کا لوہے کا بھاری پھاٹک بند تھا لیکن پریس کارڈ دکھانے پر اُسے فوراً چھوٹی کھڑکی کھول کر اندر چلا جانے دیا گیا اور فوراً ہی بعد پھر کھڑکی میں تالا ٹھونک دیا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود قیدی ہو۔

عدالت کا کمرہ وکیلوں، کچہری کے کارکنوں، اخبار کے رپورٹروں اور مجرموں کے رشتے داروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ انور جا کر رپورٹروں کی میز پر بیٹھ گیا۔ انور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس بات پر اُسے بہت اطمینان ہوا کہ وہ کٹہرا جس میں مجرم لا کر بٹھائے جانے والے تھے، ٹھیک اُس کے پیچھے تھا۔

اتنے میں مجرم قطار باندھ کر کمرے میں داخل ہوئے اور سارا کمرہ 'انقلاب زندہ باد' اور دوسرے انقلابی نعروں سے گونج اُٹھا اور انور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عدالت میں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب مجرموں کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے قیدیوں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ بھوک ہڑتال کی وجہ سے وہ ابھی تک بے حد کمزور تھے۔ بھگت سنگھ کو بھی انور اُس کی نوکیلی اینٹھی ہوئی مونچھوں کی وجہ سے ہی پہچان سکا۔ وہ بہت دُبلا ہو گیا تھا اور انور نے اُس کی آنکھوں میں پہلے جو اُداسی دیکھی تھی اُس کی جگہ پر اب اُن میں ایک نرمی اور روحانی خاموشی دکھائی دیتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اب اُس کے لیے سارا ٹکراؤ اور ساری کڑواہٹ کا' ساری جد و جہد اور تشدد کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اپنا سفر ختم کرتے وقت وہ صرف اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے کسی بات کا افسوس نہیں تھا۔ اُس نے انور کو پہچانا اور ایک لمحے کے لیے اس کی نظروں نے انور کے چہرے پر رُک کر جیسے چُپ چاپ ہی اُسے سلام کیا اور پھر سارے کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ چوکنی سی آئی ڈی کو اِس بات کا شبہ تک نہیں ہو سکا کہ وہ نظریں بیچ میں کہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔

انگریز جج آکر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عدالت کے کارکنوں نے وہاں پر موجود لوگوں کو کہہ کہہ کر آنریبل ججوں کے اعزاز میں کھڑا کیا۔ لوگ کھڑے تو ہو گئے پر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اُن کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی اور سرکاری گواہوں سے جرح شروع ہوئی۔ انور چونکہ وہاں رپورٹ لکھنے نہیں آیا تھا اس لیے وہ غیر ضروری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا بلکہ اس کی بجائے مجرموں کے ردِّعمل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ لوگ عدالت کی کارروائی کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایک مقامی اخبار کے رپورٹر نے انور کو کٹہرے میں بیٹھے ہوئے خاص خاص انقلابیوں کے نام بتائے۔ بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کو انور پہلے ہی سے پہچانتا تھا، بہت دُبلا پتلا آدمی پونہ کا ایک مراٹھا تھا جس کا نام راج گرو تھا۔ اُس کے پاس سُکھ دیو بیٹھا تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ پوری پارٹی کا دماغ ہے۔ انور نے اخباروں میں اس مقدمے کی تفصیل پڑھی تھی اور وہ جانتا تھا کہ سرکاری وکیل اِس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ اُن میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پھانسی کی سزا ہو جائے۔ پھر بھی وہ سب، جن میں جوانی اور زندگی کی اُمنگ تھی وہاں بالکل خاموش بیٹھے تھے جیسے انھیں کسی بات کی فکر نہ ہو، کسی بات کا ڈر نہ ہو۔

ایک بجے عدالت لنچ کے لیے برخاست ہوگئی۔ رتن کی ہدایتوں کے مطابق اُسے اپنا کام کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ دو قدم بڑھ کر کٹہرے کے پاس آ گیا اور اس طرح وہاں کھڑا ہوا کہ اس کے کوٹ کی جیب لکڑی کے جنگلے سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے بھگت سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا 'میں ایک اخبار کا رپورٹر ہوں، کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ لوگوں کے ساتھ جیل میں کیسا سلوک ہو رہا ہے؟' یہ سوال پہچان کے لیے تھا۔

اُس انقلابی کی آنکھیں ایک پل کے لیے اِس طرح چمک اُٹھیں جیسے وہ اسے پہچانتا ہو اور اس نے جواب دیا 'آپ ہم لوگوں کی صورتوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کس طرح کا سلوک ہوتا ہے۔' اور پھر طنز بھرے انداز میں اُس نے کہا 'کیا ہماری صورت سے نہیں لگتا کہ ہمیں پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور ہم چین کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ آپ دیکھتے نہیں کہ ہم سب لوگوں کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔ آپ لوگ اپنے اخباروں میں لکھیے کہ ہماری سرکار کتنی رحم دل اور مہربان ہے۔'

جس وقت وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا انور کو کاغذ کی سرسراہٹ سنائی دی اور ایک خط چُپ چاپ اُس کی جیب میں سرک گیا۔

انور 'تھینک یو، تھینک یو' کہتا ہوا جلدی سے کٹہرے کے پاس سے کھسک آیا کیوں کہ اسی درمیان پولیس کے ایک داروغا صاحب اُس کی طرف جھپٹ پڑے اور ٹھیٹ پنجابی لہجے میں، اُس سے پوچھنے لگے، 'کیوں جی، وہاں کیا چاہیے تمھیں؟' انور نے خاموشی کے ساتھ انھیں سمجھایا کہ وہ ایک اخبار کا رپورٹر ہے اور وہ قیدیوں سے صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ جیل میں اُن کے ساتھ اچھا سلوک تو ہو رہا ہے نا، حالانکہ دل ہی دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کی تلاشی نہ لی جائے اور اُس کی جیب میں وہ کاغذ نہ پکڑا جائے۔

'وہ سب لوگ ٹھیک ہیں تم اُن کی فکر نہ کرو' داروغا صاحب نے غصّے میں جھلاّ کر کہا 'خبردار جو تُم اب اُن کے پاس گئے، میں تمھیں یہاں سے باہر نکال دوں گا ساری رپورٹری دھری رہ جائے گی'

انور نے وعدہ کیا کہ وہ اب ایسا نہیں کرے گا اور پھر اُس نے اونچی آواز میں پولیس والوں کو سنانے کے لیے دوسرے رپورٹروں سے کہا کہ وہ باہر کھانا کھانے جا رہا ہے اور یہ کہہ کر وہ جیل سے باہر نکل گیا۔ اسٹیشن پہنچ کر اُس نے پریس کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور جو بند لفافہ اُسے دیا گیا تھا اُسے اپنے بٹوے میں حفاظت سے رکھ کر اُس نے میرٹھ کا ٹکٹ خریدا۔

(9)

میرٹھ میں کمیونسٹوں پر سازش کے مقدمے سے ساری دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور کمیونسٹ سازشیوں کے اس مقدمے کی خبر بھیجنے کے لیے نہ صرف دلّی اور لاہور سے، بمبئی اور کلکتے اور مدراس سے بلکہ انگلستان اور امریکہ سے بھی نامہ نگار میرٹھ آرہے تھے۔ اِس لیے انور کو 'بمبئی کرانیکل' کے خاص نامہ نگار کی حیثیت سے اس مقدمے کی رپورٹ بھیجنے کے لیے پریس کارڈ بنوا لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس اخبار نے اپنا کوئی نامہ نگار میرٹھ نہیں بھیجا ہے۔

جس خاص عدالت میں اس مقدمے کی پیشی ہو رہی تھی وہ ایک معمولی گھر کے بڑے سے کمرے میں قائم کی گئی تھی جسے 'جرنیل صاحب کی کوٹھی' کہتے تھے۔ کسی زمانے میں جنرل گارڈن

جنھوں نے برٹش سامراج کو بڑھانے میں بہت کچھ کیا تھا، یہیں رہتے تھے اور یہ مناسب ہی تھا کہ سامراج کے دشمنوں پر اُن ہی کے گھر میں مقدمہ چلایا جائے جہاں شاید اُن کا بھوت اب بھی رہتا ہو۔

انور پولیس کے کئی سنتریوں کو پار کرتا ہوا کمرے میں گھسا۔ عدالت کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ انور دیکھ رہا تھا کہ اخبار کے رپورٹر کہاں بیٹھے ہیں۔ اُس نے اُس لمبے سے سفیدی کیے ہوئے کمرے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا، بیچ میں ایک لکڑی کا بڑا سا چبوترا جیسا بنایا گیا تھا جس پر مجسٹریٹ صاحب کی میز لگی ہوئی تھی۔ چبوترے کے سامنے ایک اور میز تھی جس پر قانون کی موٹی موٹی کتابوں کا بڑا سا ڈھیر لگا ہوا تھا اور میز کے دونوں طرف کالے گاؤن پہنے ہوئے سرکاری اور صفائی کے وکیل بیٹھے ہوئے تھے۔ مسٹر ملز وھائٹ مجسٹریٹ، جن کے سامنے یہ مقدمہ پیش تھا، بہت ہی چھوٹے ڈیل ڈول کے نرم طبیعت کے انگریز تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ایک ایسے خطرناک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے جس کی جڑیں میرٹھ سے ماسکو تک پھیلی ہوئی تھیں، بہت ہی غلط آدمی کو چُنا گیا تھا۔ سرکاری وکیل کی دھواں دھار تقریر کو درج کرنے کے لیے ٹائپ رائٹر پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے مجسٹریٹ صاحب انور کو قابل رحم لگے۔ اِس عجیب اور بے تکی تصویر کا ایک پہلو اور بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ مجسٹریٹ صاحب کی بیوی جو اُن کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، بُنائی کر رہی تھیں، انھیں عدالت کی کارروائی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن اِس ڈرامے میں اہم پارٹ نہ تو اُن چھوٹے سے شریف صورت مجسٹریٹ صاحب کا تھا اور نہ کٹہرے میں کھڑے ہوئے اُن تیس قیدیوں کا بلکہ اس ڈرامے کا اہم اداکار وہ دُبلا پتلا لمبا سا سرکاری وکیل تھا جو اس وقت عدالت کے سامنے اپنا بیان پیش کر رہا تھا۔ وہ بولتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ انگارے اُگل رہا ہے۔ اس کا نام کچھ امریکنوں جیسا تھا— جے۔ لانگ فورڈ جیمس— لیکن ایک آنکھ پر بنا کمانی کا چشمہ، چھدرے چھدرے کھچڑی جیسے بال، اُس کی کڑواہٹ بھری ہنسی اور طنز اُس کے ٹھیٹ انگریز ہونے کے ثبوت تھے۔ وہ کسی وقت کلکتے کی یوروپین ایسوسی ایشن کا پریسی ڈینٹ رہ چکا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ 'پنچ' رسالے میں کسی برٹش سامراج کے ستون کا کوئی کارٹون زندہ ہو اُٹھا ہو۔ اِس مقدمے میں ایک وکیل کی حیثیت سے دلچسپی ہونے کے علاوہ

اُسے کمیونسٹوں پر حملہ کرنے میں خوشی ہو رہی تھی۔ وہ خود کو کمیونزم کے خلاف مجاہد تصور کرنے لگا تھا۔ روزانہ چودہ سو روپے فیس (جس میں چھٹیاں بھی شامل تھیں) اس کی کمیونسٹ دشمنی کا معمولی سا انعام تھا!

دوسرے نامہ نگاروں سے، جن میں سے کچھ شروع سے ہی مقدمے کی رپورٹ کر رہے تھے، انور کو اس مقدمے کے بارے میں چند دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں جس سے مسٹر جیمس کے حالیہ عدالتی کارناموں کے پس منظر پر روشنی پڑتی تھی۔ مقدمہ نو مہینے سے چل رہا تھا اور تین سو سے زیادہ استغاثہ کے گواہوں کو پیش کیا گیا تھا۔ اور مقدمہ ختم ہونے تک اُس پر کُل خرچ دس لاکھ روپے یا اس سے بھی زیادہ آنے کا امکان تھا اور لانگ فورڈ جیمس استغاثہ کے گواہوں پر مزید پانچ دن لگائے گا یا کچھ اس سے بھی زیادہ — اور انور کے خیال میں یہ زوردار تقریر جو کمیونزم کے نظریاتی اُصولوں پر ایک حملے سے زیادہ نہ تھی (نہ کہ کسی مجرم کے خلاف فردِ جرم) اور جو لگتا تھا کبھی ختم نہ ہو گی۔

اُونچے قد کا وکیل جو اپنے ہاتھ میں کارل مارکس کی کتاب 'کیپٹیل' (سرمایہ) کی ضخیم جلد تھامے ہوئے تھا اور جو خوفناک کمیونسٹوں کی رُوس میں خبیث حرکتوں کے بارے میں زوردار بحث کر رہا تھا۔ خود کو دیانت دار سمجھ کر برہمی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

'یہ — یہ — مارکس کے خطرناک نظریات —'

ڈرامائی انداز میں کچھ وقفے کے بعد اُس نے کتاب کو میز پر رکھ دیا اور لڑکھڑاتا ہوا کٹہرے تک گیا اور قیدیوں کی طرف گھور کر دیکھنے لگا جیسے وہ اُن سب کو ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھ رہا ہو۔ 'یہ ہے' اور اِن لفظوں پر زور دیتے ہوئے اُس نے مجرموں کو ایک بار پھر اس طرح گھور کر دیکھا جیسے وہ اُن سب کو اس اجتماعی شیطانیت میں شامل کر رہا ہو۔ 'یہ ہے وہ سنہری جنّت جس کے لیے اِن قاتلوں کے اشارے پر روس کی خفیہ پولیس نے پچیس لاکھ مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اُتار دیے'

وہ ایک بار پھر رُکا تا کہ اُس کے الفاظ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائیں اور مجسٹریٹ صاحب کو اپنے چھوٹے سے ٹائپ رائٹر پر انھیں ٹائپ کرنے کا موقع مل جائے اور وہ مجرموں کو اس طرح گھور کر دیکھنے لگا جیسے اُسے اُن میں سے ہر ایک سے کوئی ذاتی شکایت ہو اور وہ اُن کی

جس پر چوٹ کر کے اپنے طنز کے چاقو سے کُرید کر مزا اُٹھا رہا ہو۔ لیکن اِس بار تقریر کے دوران رُکنا اُس کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ اُس دبلے پتلے انگریز کی ایک آنکھ پر لگے ہوئے بنا کمانی کے چشمے کا سارا رُعب مٹی میں مل گیا۔ ہوا یہ کہ جیمس صاحب کے رُکتے ہی قیدیوں نے اپنی اُکتاہٹ ظاہر کرنے کے لیے بڑے زور سے جمائی لی۔ اِس پر سب لوگ ہنس پڑے یہاں تک کہ خود جیمس صاحب کے نیچے کام کرنے والے ایک ہندوستانی وکیل صاحب بھی جن کے موٹاپے کی وجہ سے ٹھوڑی کے نیچے کھال لٹک آئی تھی، اپنی ہنسی نہیں روک سکے۔ اور تو اور مجسٹریٹ صاحب بھی اس مضحکہ خیز حالت پر اپنی ہنسی لاکھ روکنے پر بھی مسکرا ہی دیئے۔

جب جیمس صاحب نے کیمونسٹ قیدیوں کی اِس گستاخی پر جھنجھلا کر تیزی سے مُڑ کر انھیں گھورا تو اُن کا چشمہ نیچے گر کر کالی ڈوری سے جھولنے لگا۔ اِس پر سب لوگ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

'یور آنر، آئی پروٹسٹ۔ میں آپ کی توجہ اِس بات کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ......'

مجسٹریٹ صاحب نے اپنی ہنسی چھپانے کے لیے ایک فائل اپنے مُنہ کے سامنے کر لی اور جیمس صاحب کو اپنا اعتراض پورا کرنے کا موقع دیے بغیر ہی انھوں نے کہا 'اچھا اب عدالت لنچ کے لیے برخاست ہوتی ہے۔'

قیدیوں کو کھانا کھلانے کے لیے بنگلے کے پیچھے لے جایا گیا۔ اُن کا کھانا ایک لمبی سی میز پر لگا ہوا تھا۔ بہت سے نامہ نگار قیدیوں کو نزدیک سے دیکھنے کے لیے ٹہلتے ہوئے اسی طرف بڑھے۔ اُن میں ایک موٹا سا لال منہ والا امریکن بھی تھا جو دھوپ سے بچنے کے لیے اتنی بڑی ہیٹ لگائے تھا کہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ انور نے کچھ قیدیوں کو تو پہچان لیا کیونکہ انھیں دِلّی کے اسٹیشن پر دیکھ چکا تھا۔ باقی کا مقامی نامہ نگاروں نے تعارف کرایا۔ اسپریٹ SPRATT اور بریڈلے BRADLEY کے علاوہ اب اُن میں ایک تیسرا انگریز بھی تھا، ہچن سن HUTCHINSON نام کا ایک نوجوان جرنلسٹ۔ قیدیوں میں سب سے بوڑھے ڈی۔ آٹھینگری نام کے ایک بزرگ تھے جن کی عمر اس وقت پینسٹھ سال کی تھی اور جو ٹریڈ یونین کانگریس کے پریسی ڈینٹ رہ چکے تھے۔ گورکھپور کے ایک موٹے سے ہومیو پیتھ ڈاکٹر مُکر جی کی سج دھج نرالی ہی تھی، انھوں نے لینن کے ڈھنگ کی ایک چھوٹی سی کالی داڑھی رکھ چھوڑی تھی۔ پنجاب کے ایک تگڑے سکھ سردار جی

کے بارے میں، جو اپنی اُلجھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے بہت خوفناک دکھائی دیتے تھے، انور کو بتایا گیا کہ وہ مشہور انقلابی سوہن سنگھ جوش تھے جو بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا کے پریسی ڈینٹ رہ چکے تھے۔ اُس کے بعد انور نے ایک دُبلے پتلے گورے نوجوان کے بارے میں پوچھا جو سر سے پاؤں تک کالے کپڑے پہنے تھا، اُس کے رپورٹر دوست نے بتایا 'یہ ہیں لاہور کے کیدار ناتھ سہگل، جنھوں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک مُلک غلام رہے گا تب تک کالے کپڑے ہی پہنیں گے۔' ان اکتیس قیدیوں میں ہر طرح کے لوگ تھے اور انور کو ایسا لگا کہ سچے مارکسیوں کے ساتھ بہت سے انقلابی آدرش وادی اور سنکی لوگوں کو بھی پکڑ لیا گیا تھا، اُن میں سے کچھ ظاہر ہے طالب علم تھے جو ابھی حال ہی میں کالج سے نکلے تھے۔ انور اُن میں سے ایک کے پاس گیا جو لگ بھگ اُسی کی عمر کا لڑکا تھا۔ بھرا ہوا گول مٹول چہرہ اور آنکھوں پر عینک لگی ہوئی۔ انور نے بات چیت شروع کرنے کے لیے کہا کہ میرٹھ میں اتنی سردی نہیں ہے جتنی لاہور میں تھی۔

'کیا تم لاہور سے آ رہے ہو؟' اُس لڑکے میں نوجوانی کا شور اُمڈا پڑ رہا تھا اور وہ بولتے وقت کچھ ہکلاتا تھا۔

'ہاں' انور نے جواب دیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ کوئی اُس کی بات تو سُن نہیں رہا ہے۔ 'میں آپ لوگوں کے لیے دہشت پسند قیدیوں کا ایک خط لایا ہوں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟'

'پورن چند جوشی، تم وہ خط مجھے دے دو۔'

انور نے چھوٹا سا پتلا سا لفافہ جوشی کی طرف سرکایا ہی تھا کہ اتنے میں ایک پولیس سب انسپکٹر کو اپنی طرف جھپٹ کر آتے ہوئے دیکھ کر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ جوشی کھانا کھانے میں جُٹے رہے۔ 'کچھ تم بھی کھاؤ، داروغا صاحب کے وہاں پر پہنچتے ہی جوشی نے انور کو کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔

'میں نے تمھیں ابھی ایک چٹھی انھیں دیتے ہوئے دیکھا ہے۔' داروغا صاحب نے انور پر الزام لگایا اور پھر جوشی سے بولے، 'لاؤ، نکالو، کدھر ہے وہ خط؟'

جوشی نے چپ چاپ روٹی کا ایک بڑا سا نوالہ منہ میں رکھا اور جواب دیا، 'کیسا خط؟' جس وقت جوشی کی تلاشی لی جا رہی تھی انور کے ہوش و حواس گم تھے، لیکن تلاشی میں کچھ بھی ہاتھ نہیں

آیا۔ داروغا صاحب کھسیا کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے' خیر، لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے کوئی چیز دی ضرور تھی۔'

داروغا صاحب کافی دُور پہنچ گئے۔ انور نے اُس نوجوان کمیونسٹ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ 'تم فکر نہ کرو' جوشی نے ایک اور نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا' میں نے سب ہضم کرلیا ہے۔'

انور کی ساری محنت بے کار گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِس بات پر خوش ہو کہ پولیس نے اُسے پکڑا نہیں تھا یا اِس بات پر مایوس ہو کہ جو خط وہ لایا تھا وہ برباد ہوگیا تھا لیکن جب وہ باقی لوگوں کے ساتھ وہاں سے چلنے لگا تو جوشی نے چپکے سے اُس سے کہا' تم فکر نہ کرو، اِس بار ہم لوگ خود اُن کے پاس خط بھیجیں گے۔'

انور کا کام پورا ہوگیا تھا، پھر بھی وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُس نے غازی آباد کی گاڑی پکڑی جہاں سے اُسے علی گڑھ کے لیے گاڑی بدلنی تھی۔ اُسی ڈبے میں ایک امریکن نامہ نگار بھی سفر کر رہا تھا۔ ایک گنجا سا، ادھیڑ عمر کا بہت ہی چست آدمی جو ناک کے سر میں بولتا تھا، اُس نے بغیر کسی تکلف کے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا، 'میں امریکن نیوز فیچرز کا نامہ نگار رابرٹ ملس ہوں۔'

'آپ صرف اس مقدمے کی رپورٹ بھیجنے کے لیے اتنی دور میرٹھ تک آئے تھے؟'

'ہاں لیکن میں ابھی کچھ دن ہندوستان میں رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اب چونکہ گاندھی جی نے آزادی کا عہد کرلیا ہے، تم نے آج کا اخبار پڑھا؟'

انور کو اُس دن اخبار پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اِس لیے اس نے ملس سے اخبار لے کر موٹی موٹی خبریں پڑھ ڈالیں۔ مرکزی اور صوبہ داری قانون ساز مجلسوں کے سب ہی کانگریسی ممبروں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ کانگریس کی نئی ورکنگ کمیٹی نے ہر سال چھبیس جنوری کو سارے ملک میں مکمل آزادی کا دن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس دن ہر جگہ میٹنگوں میں کھلے عام آزادی کا اعلان پڑھا جائے۔

'او بوائے، او بوائے'، وہ امریکی نامہ نگار کہہ رہا تھا' یہاں بھی ہمارے یہاں کے جیفرسن اور ٹام پین والا قصہ دہرایا جانے والا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمھارے اس قدیم ملک میں جلد ہی بہت

بڑے بڑے حادثے ہونے والے ہیں، کبھی دِلّی آؤ تو مجھ سے ملنا، میں سیسل ہوٹل میں ہوں۔'
انور اُس کی بات نہیں سُن رہا تھا۔ وہ لاہور کی ایک خبر بڑے غور سے پڑھ رہا تھا۔ خبر کا عنوان تھا۔ 'کئی دہشت پسند پکڑے گئے۔ کرشن نگر میں بم فیکٹری پر پولیس کا چھاپہ' گرفتار کیے گئے لوگوں کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ اُن میں 'رتن سنگھ عرف رام لال بھی شامل ہے جسے بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد منظم کیے گئے دہشت پسندوں کے گروہ کا لیڈر بتایا جاتا ہے۔'

(10)

علی گڑھ واپس پہنچ کر انور کی زندگی پرانے ڈھرّے پر چلنے لگی۔ صبح کلاس میں جانا، تیسرے پہر راز، سبحان اور عثمان کے ساتھ سیاست پر کبھی نہ ختم ہونے والی بحثیں، لیکن شام ہوتے ہی اُس کے پاؤں اپنے آپ میرس روڈ کی طرف اُسے اِس طرح کھینچ لے جاتے تھے جیسے سورج ڈھلے شرابی شراب خانے کی طرف کھنچتا ہے۔ سلمٰی سے روز ملنا اُس کے لیے ایک نشہ سا ہو گیا تھا— اُس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سلمٰی کی طرف اُس کا بڑھتا ہوا لگاؤ ایک 'درد لا دوا' ہو گیا تھا۔
انور ایک دُہری زندگی بسر کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی ہی اُسے خیال آتا تھا کہ اُس میں کتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں۔ اپنے کمرے میں اپنے دوستوں کے درمیان پہنچ کر وہ سیاسی شعور رکھنے والا نوجوان بن جاتا تھا جو اُس ڈرامے میں جو جلد ہی سارے ملک میں کھیلا جانے والا تھا، اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا۔ راز اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کا ممبر بن گیا اور کھدّر پہننا شروع کر دیا تھا حالانکہ جیل جانے کی تیاری میں اُس نے راز کی طرح پلنگ اور بستر چھوڑ کر فرش پر سونا نہیں شروع کیا تھا، لیکن شام کو پروفیسر سلیم کے گھر پر وہ سیاست پر کوئی بات چیت نہیں کرتا تھا مگر کبھی کوئی سیاست کا موضوع نکل بھی جاتا تھا تو وہ بات چیت کا رُخ دوسری طرف موڑ دینے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلمٰی اور اُس کے ابّا دونوں ہی کو اُس کے خیالات پسند نہیں آئیں گے اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بحث چھڑے جس سے بدمزگی پیدا ہو۔ سلمٰی سے وہ دوسری ہی طرح کی باتیں کرتا تھا پھر اُسے یہ بتاتا تھا، عُنّابی رنگ کا سوئیٹر پہن کر وہ کتنی خوب صورت لگتی تھی یا پھر وہ کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا۔

چُپ چاپ اُس کے پاس بیٹھا ہوا اُس کی قربت کا مزا لیتا رہتا تھا۔ سلمیٰ کی موجودگی سے سارا ماحول مہک اُٹھتا تھا اور انور کی آنکھیں اُس کی خوب صورتی کا رس پیا کرتی تھیں۔ اُس وقت سیاست اور انقلاب اُسے بہت دور کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اُس وقت تو اُن کے لیے صرف اُن کی محبت کا وجود ہوتا تھا۔

پھر بھی روز سلمیٰ کے گھر کے لیے روانہ ہوتے وقت وہ ارادہ کرتا تھا کہ وہ اپنے سارے خیالات اُس کے سامنے رکھ دے گا، وہ اُسے اپنی دوسری زندگی کی بھی ایک جھلک دکھائے گا۔ وہ مستقبل کے اپنے سارے تصورات کے بارے میں اُسے بتائے گا۔ وہ بار بار اپنے دل میں اِس ڈائیلاگ کا ریہرسل کرتا تھا 'سلمیٰ، میں تمھارے بنا زندہ نہیں رہ سکتا لیکن میں قوم کے لیے اپنے فرض کو بھی نہیں بھول سکتا۔ میرے دل میں جو طوفانی کشمکش ہے اُسے تم ہی ختم کر سکتی ہو۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی قبول کر کے، یہ جانتے ہوئے کہ میں آگے چل کر باغی بننے والا ہوں۔' اُس نے کئی بار اپنے دل میں کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ بے رُخی کے پردے کے پیچھے سلمیٰ خود بھی ایک باغی ہو اور اُسے بغاوت کی راہ پر لے آنے کے لیے شاید ایک ہلکے سے اشارے کی، محبت کے ساتھ سمجھانے بُجھانے کی ضرورت ہو۔ شاید......؟ مگر ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ بھی ہو۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

(11)

یومِ آزادی سے دو دن پہلے راز نے انور سے کہا کہ اگر اُن کی یونی ورسٹی میں آزادی کا اعلان نہ پڑھا گیا تو یہ اُن سب کے لیے بہت ہی شرم کی بات ہوگی۔ اُس کا خیال تھا کہ یونین پر اِس بات کے لیے زور ڈالنا چاہیے کہ اِس کام کے لیے ایک میٹنگ کرے۔ لیکن یونین کا وائس پریسی ڈینٹ افسروں سے ڈرتا تھا اور وہ اس بات کے لیے بھی تیار نہیں کہ افسروں کی اجازت کے بغیر یونین کی عمارت میں کوئی میٹنگ ہو، لیکن آہستہ آہستہ ہر طرف اِس بات کا چرچا پھیل گیا اور طالب علموں کے مختلف گروہ جن میں سبحان کے 'روی' بھی شامل تھے، اُن کے کمرے میں آ کر انھیں یقین دلانے لگے کہ وہ اِس طرح کی میٹنگ کرنے میں اُن کے ساتھ ہیں۔ نوجوان ولوں میں جوش تھا اور جب پچیس جنوری کو انھیں معلوم ہوا کہ انگریز پرو وائس چانسلر نے یہ کہا تھا کہ وہ

اس طرح کی کوئی میٹنگ نہیں ہونے دے گا تو اُن کا غصہ حد پر پہنچ گیا۔

'آزادی کی لڑائی کے سپاہی کی حیثیت سے یہ میری پہلی آزمائش ہے۔' انور ہر وقت دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہی کہتا رہتا تھا۔ 'مجھے اِس آزمائش میں پورا اترنا ہے، مجھے قدم پیچھے نہیں ہٹانا ہے۔'

اُس دن شام کو جب سلمیٰ کے گھر پہنچا تو وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان تھا کیوں کہ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ سلمیٰ کو بتا دے گا کہ کل وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ 'کاش وہ ہمارا ساتھ دے سکے۔' یہ خیال اُس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارتا رہا۔ اگر وہ ہمارا ساتھ دے تو پھر مجھے دنیا میں کسی بات کی فکر نہیں ہے۔' وہ اُسے سب کچھ بتا دے گا۔ اپنے سارے خیالات، اپنی ساری خواہشات، اپنے سارے پلان اور اپنے سارے خواب کیونکہ وہ اُس کی زندگی کی ساجھے دار بننے والی تھی۔ اُس کی ساری زندگی کی، اُس کے سارے پیار کی۔ کل کچھ بھی ہو سکتا ہے!

اُس نے سوچا تھا کہ سلمیٰ گھر پر اکیلی ہوگی کیوں کہ یہ اُس کے ابا کا کلب جانے کا وقت تھا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو نہ صرف پروفیسر وہاں موجود تھے بلکہ اُن کے علاوہ ایک لمبا چوڑا گورا چٹا کسرتی بدن کا نوجوان بھی وہاں موجود تھا جس کا سر اتنی کم عمر ہی میں گنجا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے انور نے اُسے وہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ بڑی بے تکلفی سے صوفے پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا اور سلمیٰ اُسے چائے بنا کر دے رہی تھی۔ انور خود کو اتنا سمجھ دار مانتا تھا کہ سلمیٰ کو کسی دوسرے نوجوان آدمی سے باتیں کرتے دیکھ کر اُسے جلن نہیں ہوگی لیکن نہ جانے کیوں اُس کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا ہوگئی۔

'ہیلو انور'، پروفیسر صاحب نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا، 'یہ ہیں منظور ان کے والد صاحب ہمارے بہت پُرانے دوست ہیں۔'

انور جب منظور سے ہاتھ ملا رہا تھا اُسی وقت سلمیٰ بول اُٹھی 'پاپا' صرف منظور کیوں کہتے ہیں آپ انھیں، کہیے مسٹر منظور عالم ڈی۔ ایس پی، کیوں کہ یہ کسی بھی وقت کسی کو بھی پکڑ کر جیل میں بند کروا سکتے ہیں۔'

انور نے یوں ہی رسمی طور پر 'ہیلو' آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' کہنے کے بعد اُس نے

سلمٰی کی چوٹ کا جواب دیتے ہوئے بڑی بے شرمی سے کہا۔ 'سلمٰی تمھیں گرفتار کر کے کون پولیس افسر خوش نہیں ہوگا۔'

انور کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ سلمٰی اُس کی اِس بات کا بُرا ماننے کی بجائے اسے اپنی تعریف سمجھ کر بہت خوش ہوئی۔

اِس بےفکرے، گھمنڈی اور لمبے ڈیل ڈول والے پولیس افسر کے سامنے انور کو ایسا لگا کہ اُس کی پرانی خود اعتمادی کی کمی اور جھجک پھر اس میں واپس آ گئی ہے۔ ایم۔اے میں پڑھنے والے ایک اہم طالب علم سے جو ساری یونی ورسٹیوں کے طالب علموں کی کئی ڈیبیٹ میں انعام حاصل کر چکا تھا جو بڑے بڑے انقلابیوں اور سیاست دانوں سے مل چکا تھا، وہ اچانک اسکول میں پڑھنے والے اُس شرمیلے اور جھینپولڑ کے جیسا ہوگیا جو بڑے لوگوں کے درمیان آ کر کھویا کھویا بنا رہتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ منظور نہ صرف اُن کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے بلکہ کھانا کھانے کے بعد وہ اُن لوگوں کے ساتھ سنیما دیکھنے بھی جانے والا ہے تو انور کی سلمٰی کے ساتھ باتیں کرنے کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

گھوم پھر کر سیاست کا چرچا چل پڑا اور اگلے دن کے لیے کانگریس نے آزادی کے جس پروگرام کا اعلان کیا تھا اس کے بارے میں پروفیسر سلیم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

'پروفیسر صاحب، آپ فکر نہ کیجیے' منظور ایک دم بول پڑا 'ہم ان کانگریسیوں سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں، آپ دیکھتے جایے کہ ہم مسٹر گاندھی کی اِس سول نافرمانی کی تحریک کو کس طرح چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کچل کر رکھ دیں گے۔ ہر چیز کا فیصلہ کر لیا گیا ہے بلکہ ہم دو چار ریہرسل بھی کر چکے ہیں۔'

پھر وہ کسی بات کو یاد کر کے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور ہنسنے لگا۔ 'میں آپ کو ایک واقعہ کے بارے میں بتاتا ہوں جو خود میرے ضلع میں ہوا تھا۔ جواہر لال نے ضلع کے گاؤں کا دورہ کیا تھا اور لوگوں میں بغاوت پھیلانے والی تقریریں کی تھیں۔ میں چاہتا تو انھیں وہیں گرفتار کر لیتا لیکن ہم لوگوں کو آرڈر ملے ہوئے ہیں کہ ہم ابھی کچھ دن صبر سے کام لیں، خیر اُن کے چلے جانے کے بعد زمینداروں نے شکایت کی کہ کچھ کسان جنھیں جواہر لال کانگریس کا والنٹیئر بنا

گئے تھے، بہت اکڑنے لگے تھے اور گستاخی سے پیش آتے تھے..... وہ بیگار کرنے سے انکار کرتے تھے، پلٹ کر جواب دینے لگے تھے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنے آدمیوں کو بھیج کر اُن میں سے بارہ آدمیوں کو بدامنی پھیلانے کے جرم میں گرفتار کروالیا۔ اُن میں سے نو معمولی کسان تھے، انھیں تو میں نے دس دس کوڑے لگوا کر چھوڑ دیا لیکن اُن میں سے تین الہ آباد کے پڑھے ہوئے لڑکے تھے جنھیں یہاں ہنگامہ کھڑا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اِس لیے اُن سے نمٹنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔'

منظور سگریٹ جلانے کے لیے اور اپنے اِس قصّے میں سننے والوں کی دلچسپی بڑھانے کے لیے بیچ میں رُکا تو انور کے گال غصّے سے تمتما اُٹھے۔ 'منظور، اُن کے ساتھ تم نے کیا کیا؟' سلمیٰ نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ انھیں تو شاید کوڑے نہیں لگوائے ہوں گے۔'

'نہیں نہیں، اُن کے ساتھ ایسا بھونڈا طریقہ استعمال کرنے کا سوال ہی نہیں تھا' منظور نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا 'میں نے بہت ہی بڑھیا ترکیب استعمال کی جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں نے شہر کے پانچ چھ چھٹے ہوئے بدمعاش بُلوائے اور اُن کو ایک ایک بوتل ٹھرّا پلوا دیا۔ پروفیسر صاحب یہ ٹھرّا بھی بہت ہی ظالم چیز ہوتی ہے، جب وہ نشے میں چور ہو گئے تو میں نے انھیں اُن تین کانگریسی والینٹیروں کے ساتھ ایک ہی کوٹھری میں بند کروا دیا۔ صبح تک میرے بدمعاشوں نے اُن تین نوجوان ستیہ گرہیوں کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اُن کی حالت یہ ہو گئی کہ اُن کے منہ سے بولی نہیں نکلتی تھی اور لُطف تو یہ تھا کہ ہمارے کسی آدمی نے انھیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اگر قیدی آپس میں لڑیں اور اُن میں سے کسی کو چوٹ آجائے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟'

پھر وہ اپنے اس بے رحمی کے مذاق پر زور سے ہنسا اور انور کو اس سے نفرت ہونے لگی کہ کوئی آدمی اپنے بے رحم ہونے پر اتنا فخر کرے۔

تو پروفیسر صاحب اگر آپ کو کل یونی ورسٹی میں کسی ہنگامے کا خطرہ ہو تو مجھے بتایئے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے یہاں اِس طرح کے سر پھرے باغی نہیں ہوں گے ـــ یا ہیں؟'

اِس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب کوئی جواب دیتے انور اپنی جگہ سے اُٹھا اور جا کر منظور

کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایسا کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے ایسا کرنے سے ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ 'مسٹر منظور'، اُس کی آواز جوش میں کانپ رہی تھی لیکن وہ رُک رُک کر ایک ایک لفظ تول تول کر کہہ رہا تھا، 'میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ کل صبح گیارہ بجے یونین ہال میں ہم لوگ انڈیپنڈنس ڈے کی جو میٹنگ کر رہے ہیں اُس میں آپ بھی تشریف لائیے۔ آپ وہاں تشریف لائیے تا کہ ہم بھی دیکھیں کہ پولیس افسر میں کتنا دم ہوتا ہے۔'

'انور!' سلمیٰ کے مُنہ سے ایک چیخ سی نکلی 'تم منظور کی توہین کر رہے ہو۔'

اُس کی آواز سن کر انور کو ایسا لگا کہ کسی نے اُس کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ مار دیا ہے، لیکن جو قدم وہ اُٹھا چکا تھا اُس سے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ 'ظاہر ہے میں توہین کر رہا ہوں۔' اُس نے کہا اور وہاں سے چل دینے کے لیے مُڑا۔

'انور!' پروفیسر سلیم نے کڑک کر کہا۔

'انور!' سلمیٰ نے اُسے پکار کر کہا 'پلیز کم ہیئر۔' لیکن وہ اُن کی آواز کو اَن سنا کر کے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے بہت خوفناک بات کی ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس نے بہت شاندار کام کیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سلمیٰ نے اُسے پکارا تھا اور وہ کُتّے کی طرح دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاس نہیں گیا تھا!

(12)

'دوستو اور ساتھیو۔' انجانے میں ہی اُس نے اپنی تقریر اُن ہی الفاظ سے شروع کی تھی جو اُس نے جواہر لال نہرو کو بولتے سنا تھا۔ 'مجھے اِس بات کا بہت افسوس ہے کہ ہمیں زبردستی اِس ہال میں گھسنا پڑا جسے استعمال کرنے کا ہمیں پورا حق ہے لیکن ہمارا یہ حق ہمیں دینے سے انکار کیا گیا تھا.....'

انور نے سوچا آج میری آواز لڑکھڑا کیوں رہی ہے، میرا گلا رُندھا کیوں جا رہا ہے۔ وہی یونین ہال ہے جہاں میں پہلے بھی کئی بار بول چکا ہوں۔ کہیں میں اس بات سے ڈر تو نہیں رہا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لیکن میں نے تو یوں بھی یونی ورسٹی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور پھر میں اکیلا بھی تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ راز ہے، سبحان ہے، عثمان فضل بھائی ہے، انھیں تو ڈر

نہیں لگ رہا، ڈٹے رہو انور، تم بھی ڈٹے رہو۔'

'میں آپ کے سامنے اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ بات دہراؤں گا جو انھوں نے اس یادگار رات کو راوی کے کنارے آزادی کا پرچم لہراتے وقت کہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا، 'اب ہم نے اپنے ملک کو بدیسی حکومت سے آزاد کرنے کی کھلی سازش کی ہے اور، ساتھیو آپ کو، ہمارے ملک کے سب بھائیوں اور بہنوں کو، اس کھلی سازش میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، لیکن اس کے بدلے میں آپ کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، جیل جانا پڑے گا اور ہوسکتا ہے آپ کو اپنی جان کی بھی قربانی دینی پڑے.....' اب میں آزادی کا عہد نامہ پڑھتا ہوں، آپ سب لوگ میرے ساتھ دُہرایئے.....'

'ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ کسی بھی دوسری قوم کی طرح ہندوستانیوں کا بھی یہ پیدائشی حق ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اپنی محنت کے پھل کھائیں اور ہماری زندگی کی تمام ضرورتیں پوری ہوں تاکہ ہمیں بڑھنے پھلنے پھولنے کا پورا موقع مل سکے۔ ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم سے یہ حق چھینے اور اس پر ظلم کرے تو عوام کو اس بات کا بھی حق ہے کہ وہ اُس حکومت کو بدل دیں یا ختم کردیں۔

'ہندوستان میں برٹش حکومت نے ہندوستان کے عوام سے نہ صرف اُن کی آزادی چھین لی ہے بلکہ اُس نے اپنی بنیاد عوام کا خون چوسنے پر رکھی ہے اور معاشی، سیاسی، تہذیبی اور روحانی طور پر ہماری قوم کو تباہ کردیا ہے۔ اس لیے ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان کو انگریزوں سے اپنا ناطہ توڑ کر، پُورن سُوراج، یعنی مکمل آزادی حاصل کرنی چاہیے.....

'.....ہندوستان کو معاشی طور پر تباہ کردیا گیا ہے۔ ہمارے عوام سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ ہماری آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہے، ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے اور ہم جو بھاری ٹیکس ادا کرتے ہیں اُس کا بیس فیصدی حصہ لگان کی شکل میں لیا جاتا ہے اور تین فیصدی نمک پر ٹیکس کی شکل

میں، جس کا سب سے زیادہ بوجھ غریبوں پر پڑتا ہے.....'

'.....دیہی صنعتیں جیسے ہاتھ سے سوت کاتنے کی صنعت کو تباہ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کسان سال میں کم سے کم چار مہینے خالی بیٹھے رہتے ہیں، اُن کا ہنر تباہ ہو گیا ہے اور اِس کے بدلے میں انھیں کوئی دوسرا ہنر بھی نہیں سکھایا گیا ہے جیسا کہ دوسرے ملکوں میں کیا گیا ہے۔ باہر سے آنے والے مال پر ٹیکس کا بندوبست اس چالاکی سے کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے کسانوں پر بوجھ اور بڑھتا ہے۔ باہر سے جو مال آتا ہے اُس میں زیادہ تر مال برطانیہ کے کارخانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ کسٹم ڈیوٹی کے معاملے میں برطانیہ کے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے ساتھ صاف طرفداری کی جاتی ہے اور اُس سے جو آمدنی ہوتی ہے اُسے عوام کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نہیں بلکہ حکومت کی فضول خرچی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی روپے اور برٹش پاؤنڈ میں جو رشتہ قائم کیا گیا ہے اُس میں اور بھی من مانی دھاندلی کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک سے کروڑوں روپیہ کھنچ کر باہر چلا جاتا ہے.....'

وہ ایک لمحے کے لیے رُکا۔ ہال میں لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازوں کے درمیان اُسے پرووائس چانسلر کی موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ اچھا ہے یہ انگریز بھی چار سو ہندوستانیوں کو آزادی کی قسم کھاتے ہوئے سن لے!

'.....سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت اتنی پست کبھی نہیں رہی ہے جتنی کہ انگریزوں کی حکومت میں۔ کوئی بھی سُدھار ایسا نہیں ہوا ہے جس سے عوام کو سچی سیاسی طاقت ملی ہو۔ ہم میں سے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بدیشی حکومت کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے بہت سے ہم وطنوں کو مجبور ہو کر اپنے ملک سے باہر رہنا پڑ رہا ہے اور وہ اپنے ملک واپس نہیں آ سکتے۔ ہمارے لوگوں میں سرکار کا کام چلانے کی جو قابلیت ہے اُسے کچل دیا

جاتا ہے اور انھیں گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری نوکریوں اور دفتروں میں کلر کی پر ہی صبر کرنا پڑتا ہے.....'

انور نے دیکھا کہ پروفیسر سلیم باہر برآمدے میں انتظار کر رہے تھے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اجنبی آدمی نے اُن سے آکر کچھ پوچھا..... وہ ضرور کوئی سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی کے علاوہ اور کون سرکار کی مدد کرسکتا ہے؟

'تہذیبی اعتبار سے، تعلیمی نظام نے ہمیں جڑوں سے الگ کر دیا ہے اور ہمیں جو کچھ سکھایا جاتا ہے اس کی وجہ سے ہم اُن ہی زنجیروں کو سینے سے لگائے رہتے ہیں جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں.....

'روحانی اعتبار سے، زبردستی ہم سے ہتھیار چھین لیے جانے کی وجہ سے ہم ڈرپوک ہوگئے ہیں اور ہمارے ملک پر قبضہ جمائے رکھنے والی بدیسی فوج کے موجود رہنے سے، جسے ہماری آزادی کے جذبے کو کچلنے کے لیے بڑی بے رحمی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے.....'

اُسے اچانک امرتسر کی سڑک پر جاتی ہوئی گھوڑ سواروں کی وہ فوج یاد آ گئی.....اور وہ لال منہ والا افسر جس نے 'فائر' کا حکم دیا تھا اور جیسیوں بندوقیں جو موت کی گولیاں اگلنے لگی تھیں۔ جلیان والا باغ..... کیا ابھی اِس طرح کے اور قتل عام ہوں گے.....؟ وہ رُکا اور پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس نے زور دے کر پڑھنا شروع کیا۔

'..... ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم اپنی دیکھ بھال خود نہیں کر سکتے اور بدیسیوں کے حملے سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے یا چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے اپنے گھر اور اپنے خاندانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے.....

'ہم اور زیادہ دن تک ایسی حکومت کے غلام بنے رہنے کو جس نے اِن چار طریقوں سے ہمیں تباہ کر دیا ہے، انسان اور خدا کے خلاف ایک گناہ سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ اپنی آزادی حاصل کرنے کا سب سے کارگر طریقہ تشدد کا طریقہ نہیں ہے.....

'اس لیے ہم جہاں تک ہو سکے گا اپنی مرضی سے برٹش حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھ کر اپنے آپ کو تیار کریں گے، ہم سول نافرمانی کی تیاری کریں گے جس میں ٹیکس ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ہم کسی بھی طرح کا اُسکاوا دیئے جانے پر بھی کسی طرح کا تشدد کیے بغیر اپنی طرف سے کوئی تعاون نہ کریں اور ٹیکس ادا کرنا بند کر دیں تو اِس بے رحم حکومت کا خاتمہ یقینی ہے۔ اِس لیے ہم قسم کھاتے ہیں کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے کانگریس وقتاً فوقتاً جو بھی ہدایتیں دے گی ہم انھیں پورا کریں گے.....'

اور پھر اُس نے اُن سب طالب علموں کی طرف دیکھا جو ہال میں بھرے ہوئے تھے۔ اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سب کے چہروں پر آزادی کی چمک تھی۔ اُس نے دیکھا کہ راز کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ سبحان جیسا سخت دل آدمی بھی اِس موقع کی اہمیت سے متاثر ہو گیا تھا اور اُس کی آنکھیں نم تھیں، لیکن خود انور کے گالوں پر یہ کیا بہہ رہا تھا؟ پسینہ — جنوری میں؟ ممکن ہے اس نے اپنے دل میں کہا، نہیں، مجھے فوراً اُسے پونچھ ڈالنا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ آرہے ہیں — پرو وائس چانسلر، پروفیسر سلیم، پروفیسر نبی بخش، پراکٹر، وارڈن، یونین کے وائس پریسی ڈینٹ صاحب اور اُن سب کے پیچھے اینڈتا ہوا پولیس افسر منظور۔ انور نے سوچا 'میں مر جاؤں گا لیکن اُسے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنے دوں گا.....'

(13)

لیکن اِس قصّے کا خاتمہ اچانک ہو گیا۔ انور کو جس جوش و خروش کی اُمید تھی، وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ راز، سبحان اور عثمان فضل بھائی کے ساتھ اُسے بھی یہ نوٹس دے گیا کہ اُسے یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ اُن چاروں سے کہا گیا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوسٹل خالی کر دیں۔ جن چار سو لڑکوں نے وہ غیر قانونی میٹنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اُن میں سے مشکل سے درجن بھر ایسے رہے ہوں گے، جو کھلے طور پر اِن چار مجرموں کا ساتھ دے کر یونی ورسٹی سے نکالے جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ حُب الوطنی کے جوش کی لہر پیچھے ہٹ گئی تھی، ایک بار

پھر نوجوانی کا جوش ڈر، دبّو پن اور بیدلی میں دب گیا۔

انور کو یونی ورسٹی سے نکالے کا کوئی غم نہ تھا— اُس نے بی۔اے پاس کر ہی لیا تھا اور سرکاری نوکری کرنے کا اُس کا ارادہ کبھی بھی نہیں تھا۔ لیکن اُسے اس بات کی فکر ضرور تھی کہ سلیم صاحب پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ کیا سلمیٰ عمر بھر کے لیے ایک باغی کا ساتھ دینے کو تیار ہوگی؟ کیوں نہیں ہوگی! مانا کہ اُسے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ اُس سے محبت کرتی ہے اور جب اُسے معلوم ہوگا کہ اس نے انقلاب کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اُس کی محبت سلمیٰ کے قدموں کو بھی اُسی راستے کی طرف موڑ دے گی۔ سلیم صاحب ضرور رُکاوٹ ڈالیں گے کیوں کہ انھوں نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ اُن کا داماد آئی سی ایس ہو۔ اس لیے انور کے اس طرح گمراہ ہوجانے سے انھیں مایوسی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اِس بات کی بھی کوشش کریں کہ اُن کی بیٹی انور کو چھوڑ کر منظور جیسے کسی آدمی کو اپنا لے حالانکہ سلمیٰ سے اُسے اِس بات کا ڈر نہیں تھا کہ وہ اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے سے محبت کرسکتی ہے۔

پروفیسر سلیم کا نوکر سلمیٰ کا خط لے کر آیا۔ اس نے بہت جلدی میں صرف اتنا لکھا تھا 'مجھے ابھی سب کچھ معلوم ہوا لیکن تم فکر نہ کرنا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم مجھ سے ملنے کب آ رہے ہو، میں تمھارا انتظار کروں گی۔' سلمیٰ کو اُس کا کتنا خیال تھا۔ قسمت کے تھپیڑوں سے اُسے بچانے کے لیے اور اسے تسلی دینے کے لیے وہ اُس کے پاس موجود تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد انور سائیکل تیزی سے بھگاتا ہوا میرس روڈ پر چلا جارہا تھا۔

سلمیٰ اُس کی راہ دیکھ رہی تھی اور وہ اُسے سیدھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ دیکھ کر انور کا دل بھر آیا کہ اُس کی آنکھیں لال تھیں جس سے ظاہر تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ جیسے ہی سلمیٰ نے دروازے کی چٹخنی لگائی انور نے اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور اُس کی گرم اور سوجی ہوئی پلکوں کو چومنے لگا۔ بیچاری سلمیٰ! اُس کی ہر بات کتنی پیاری تھی!' اُس کے دل میں سلمیٰ کے لیے نرم و نازک جذبات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور سلمیٰ اُس کی بانہوں میں سسک سسک کر رونے لگی۔

کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ انور اپنے بوسوں سے اس کے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس نے اُس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو، اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو، اُس کی گردن کو اور اس کے کانوں کی ملائم لوؤں کو چوما اور ہر بوسے کے ساتھ نرم جذبات آگ

میں تپنے لگے۔ سلمیٰ نے اپنے جسم کو، اُس کی بانہوں کی گرفت میں ڈھیلا چھوڑ دیا اور انور نے اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے کو کس کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کے سینے میں جذبات کی لہر اُٹھ رہی تھی۔ انور سلمیٰ کے لیے اپنے دل کی اس پیاس سے ہمیشہ سے واقف تھا جو اندر ہی اندر ایک آگ کی طرح سُلگ رہی تھی۔ اُس لمحہ انور کو احساس ہوا کہ سلمیٰ اُس سے کتنا پیار کرتی ہے اور وہ یہ بھی سمجھنے لگا کہ وہ اُس کی کسی بات کو، کسی بھی بات کو نہیں ٹال سکتی......

انور کو ایسا لگ رہا تھا کہ اُس کے جذبات نے اُسے ڈھکیل کر ایک گہری کھائی کے کنارے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ 'ڈارلنگ انور، تم مجھ سے پیار کرتے ہونا؟' سلمیٰ نے گہری سانس لے کر کہا۔

'میری جان، تمھیں اِس میں کوئی شک ہے کیا؟' اور یہ کہہ کر اُس نے زور سے سلمیٰ کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

سلمیٰ نے اپنی بوجھل پلکیں اُٹھائیں تو انور نے دیکھا کہ وہ جذبات کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں، لیکن اتنے میں سلمیٰ بولی 'تو تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے، تم معافی مانگ لو گے، مانگ لو گے نا سویٹ ہارٹ؟'

اُس کے اِن الفاظ کے اصلی معنوں کا اظہار ہوتے ہی انور کا شعور جیسے جاگ اُٹھا اور پھر اُس کے جذبات کا یہ طوفان ٹھنڈا پڑ گیا اور اُسے ایسا لگا کہ دھیرے دھیرے اُس کا سارا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا اُس نے سلمیٰ کی بات ٹھیک سے سنی ہی نہ ہو؟

'سلمیٰ کیا کہہ رہی ہو تم؟' انور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ 'کیا تم چاہتی ہو کہ میں غدّاری کروں؟'

'اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو' اُس نے روٹھ کر کہا اور پھر اُس کے چاروں طرف چاہت کا جال بننے لگی 'ورنہ تمھیں معافی کے کچھ لفظوں پر دستخط کر دینے میں کیا اعتراض ہے؟ پاپا نے پرو وائس چانسلر صاحب سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ ڈارلنگ ضد نہ کرو، تم مجھے چھوڑ کر کیسے چلے جاؤ گے؟'

انور نے محسوس کیا کہ اُسے کھو دینے کے ڈر اور اپنی محبت کی وجہ سے ہی سلمیٰ ایسی ناسمجھی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا 'لیکن میری جان، تم جانتی ہو کہ میں کہیں بھی رہوں، میں جیل میں

رہوں یا پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوں، میرا دل ہمیشہ تمھارا رہے گا۔ میں جو کچھ ہوں اور آگے جو کچھ بھی بنوں گا، میں جو کچھ بھی کروں گا، تم ہمیشہ میرے ساتھ رہوگی — کیوں کہ تمھارے بغیر میں ہمیشہ کسی چیز کی کمی محسوس کروں گا، یہ ستیہ گرہ ہمیشہ تو نہیں چلے گا۔ جب میں جیل سے واپس آؤں گا تب ہم لوگ شادی کرلیں گے.....'

'نہیں نہیں،' سلمیٰ نے بیچ میں بات کاٹ کر کہا 'میں اتنے دن تک انتظار نہیں کرسکتی۔'

'اچھی بات ہے۔' انور نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا 'تو پھر ہم ابھی شادی کرلیں — آج ہی، اِسی وقت۔' انور جانتا تھا کہ اُس کے ابا سلمیٰ جیسی نئے خیالات کی لڑکی کو اپنا بہو بنانا پسند نہیں کریں گے، لیکن انھیں وہ کسی طرح سمجھا بُجھا کر راضی کرلے گا۔ 'میں تمھیں زیادہ کچھ تو نہیں دے سکتا، لیکن جو کچھ بھی میرا ہے، جو کچھ بھی میں اِس وقت ہوں اور آگے چل کر بنوں گا — وہ سب تمھارا ہے۔ سلمیٰ، آؤ ہم لوگ شادی کرکے دنیا کا مقابلہ کریں۔'

تھوڑی دیر تک سلمیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ہر لفظ کو تول تول کر اِس طرح بولی جو اُس کے لیے بہت ہی غیر فطری بات تھی اور اِسی لیے انور کو اُس کا اس طرح بولنا بہت بُرا لگا۔ سلمیٰ نے کہا 'اچھی بات ہے، لیکن تم وعدہ کرو کہ تم یہ سیاست کی ساری بکواس چھوڑ دوگے، میرے ابا جو کچھ کہیں گے وہ کروگے۔ آئی سی۔ ایس کی تیاری کروگے اور.....'

'نہیں۔' انور کے اس ایک تیکھے لفظ نے سلمیٰ کو چپ کردیا جو اِس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے جذبات کو طاق پر رکھ کر کوئی سودا چُکا رہی ہو۔ انور گہری مایوسی کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔

'تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے، تمھارے لیے، تمھاری سیاست اور گاندھی اور جواہر لال اور آزادی کی یہ ساری بکواس ہی سب کچھ ہے، میری محبت کچھ بھی نہیں ہے۔' اور اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ 'مجھے پہلے ہی یہ سمجھ لینا چاہیے تھا، سب نے مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر میں یقین نہیں کرتی تھی، میں یہی سمجھتی تھی کہ تم سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہو، لیکن اُن کا کہنا صحیح تھا اور میں جو کچھ سمجھتی تھی وہ غلط تھا۔'

'اُن کا!' انور کو جمع کے صیغے کا یہ استعمال کچھ کھٹکا 'اُن کا، کن کا؟'

سلمیٰ نے کچھ دھیان دیئے بغیر ہی کہہ دیا 'سب ہی کا' پاپا کا، منظور کا.....' اور اس کے بعد

اچانک وہ رُک گئی۔

انور کو ایسا لگا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ تو یہ بات تھی جب تک اُسے یہ اُمید تھی کہ وہ آگے چل کر آئی سی ایس بنے گا تب وہ اُسے ایک عاشق اور شوہر کے طور پر اپنا لینے کو تیار تھی۔ لیکن خود اس کی اپنی کوئی قدر نہیں تھی تو کیا اُسے وہ لوگ محبت، لگاؤ اور عزّت سمجھتے تھے پروفیسر سلیم، منظور اور خود سلمیٰ بھی؟

پھر بھی اُس نے ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا 'سلمیٰ، کیا تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ طے کر لیا ہے کہ تمھیں میری ضرورت نہیں ہے یا صرف منظور کی خاکی وردی کے رُعب میں آکر تم......'

'شٹ اپ!' سلمیٰ نے چلاّ کر کہا اور انور نے سلمیٰ کو ایک نئے روپ میں دیکھا، بدمزاج اور جھگڑالو سلمیٰ کے روپ میں، جو کہہ رہی تھی 'تمھیں منظور کا نام بیچ میں لانے کا کوئی حق نہیں ہے، وہ کم سے کم شریف آدمی تو ہے لیکن تُم...... تُم...... محبت کے جھوٹے دعوے کرنے کے بعد اِس طرح ٹھکرا دیا ہے تم نے...... مجھے تم سے نفرت ہے...... ہاں میں تم سے نفرت کرتی ہوں......'

انور سمجھ گیا کہ اب اور کچھ کہنا بیکار ہے۔ ایسی چڑچڑی اور بدمزاج لڑکی سے کوئی کیسے بحث کر سکتا تھا۔

اپنے جذبات کی ساری کڑواہٹ کو دباتے ہوئے کہا 'اچھا سلمیٰ، میں جاتا ہوں۔ جب تمھارا غصّہ ٹھنڈا ہو تو میرے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش کرنا۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں ہمیشہ تمھارا احسان مند رہوں گا اور میرے دل میں تمھارے لیے محبت رہے گی۔'

وہ کہنا تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی اُس نے کہہ ہی دیا 'ایک دن تمھیں اندازہ ہوگا کہ میں کتنے سچے دل سے تم سے محبت کرتا تھا۔'

انور دروازہ کھلا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پر سلمیٰ نے نہ تو اُس کی بات کا کوئی جواب دیا نہ اُسے بُلایا ہی، لیکن جب وہ خیالوں میں اُلجھا ہوا اور اُداس اُداس بیٹھک سے باہر نکلا تو اُس نے سنا کہ سلمیٰ نے بہت غصّے کے ساتھ دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا لی۔

(14)

ریل گاڑی اُسے علی گڑھ سے دور لیے جا رہی تھی۔ یونی ورسٹی کے چھوٹے چھوٹے چوکور لان، گھنٹہ گھر، مسجد کے گنبد اور مینار یں ریل گاڑی کی کھڑکی میں سے پیچھے بھاگتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ صرف یونی ورسٹی بستی ہی نہیں بلکہ اُس کی جوانی اُس سے دور بھاگ کر دھند لے اُفق میں سمائی جا رہی تھی۔ جب گھنٹہ گھر کی چوٹی آم کے پیڑ کے پیچھے چھپ گئی اور آنکھ سے بالکل اوجھل ہوگئی تو انور کو ایسا لگا کہ اس کے اندر ایک عجیب اور دُکھ بھرا خلا پیدا ہوگیا ہے۔

جب موسم سرما کے آسمان پر اندھیرا چھانے لگا تو اُس کی اُداسی اور گہری ہونے لگی۔ ڈیوڑھے درجے کے چھوٹے سے گھٹے ہوئے ڈبّے میں بجلی کی بتیوں سے بجھی بجھی سی روشنی آرہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی انور کی طرح ہی اُداس ہیں۔ ریل گاڑی کے پہیّوں سے لگاتار ایک آواز آرہی تھی جو انور کے دماغ پر جیسے ہتھوڑے مار رہی تھی— سلمٰی! سلمٰی! سلمٰی! سلمٰی! اُس کے دل میں نا اُمیدی چھائی ہوئی تھی اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نا اُمیدی اُس کا گلا گھونٹ دے گی۔ جنوری کی سرد ہوا سے بچنے کے لیے لوگوں نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں اور انور کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مر جائے گا۔

اُس نے گھبرا کر ایک کھڑکی کھول دی اور برف جیسی ٹھنڈی ہوا نے اُس کے منہ پر ایک تھپڑ سا مارا۔ تیز ہوا اُس کی آنکھوں میں تیر کی طرح چُبھنے لگی اور اُس کے اوور کوٹ کے کالر میں سے جب یہ ہوا اندر گھُسی تو وہ سردی سے کانپ اُٹھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اُسے یہ سردی اچھی لگ رہی تھی جیسے اُس میں پھر سے جان آگئی۔ اندھیرا آسمان، ٹھنڈی ہوا اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ...... سب اُسے للکار رہے تھے، جس سے اُس کے دماغ کی اُلجھن دور ہوگئی تھی اور اس میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا تھا۔ بہت دور دہلی کی سمت میں اندھیرے اُفق پر بجلی چمک رہی تھی۔ کہیں پانی برس رہا تھا۔ موسم سرما کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ ریل گاڑی طوفان اور بارش کو چیرتی ہوئی دلّی کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی اور دلّی کی جھپکتی ہوئی روشنیاں جیسے اشارہ کر کے اُسے اپنی طرف بُلا رہی تھیں۔

O

انوکھا سفر

(1)

وہ ایک اُڑنے والے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کسی بیمار کے چہرے کی طرح پیلے آسمان کی طرف اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھوڑا بہت عجیب تھا لیکن پھر بھی جانا پہچانا لگ رہا تھا، جیسے بچپن کی کوئی بھولی ہوئی یاد ہو۔ یہ خوشگوار خوابوں کی مسلسل اُڑان نہیں تھی بلکہ وہ بڑی محنت سے اُوپر چڑھ رہا تھا اور اُسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت وہ اپنا توازن کھو بیٹھے گا اور نیچے ایک گہری کھائی میں گر جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑا غائب ہو گیا اور وہ ہوا میں لٹکا رہ گیا۔ اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ آسمان پر اُڑ جائے اور زمین کی طرف گرتے ہوئے اُسے ڈر لگتا تھا۔ اُفق اُسے دھیرے دھیرے اپنے گھیرے میں جکڑے لے رہا تھا۔ اُفق کا رنگ گہرا پیلا تھا، بالکل سلمیٰ کے کسے ہوئے سوئیٹر کی طرح پیلا اور سلمیٰ کے سوئیٹر کی یاد آتے ہی اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے دل میں خنجر اُتار دیا ہو۔ اُسے آسمان یا اُفق اپنے شکنجے میں نہیں جکڑ رہا تھا بلکہ وہ خود سلمیٰ تھی، اُس کا نازک جسم اُس کے جسم سے چپکا ہوا تھا اور اُسے گرمی پہنچا رہا تھا اور خود اس کا چہرہ اُس کے جسم سے اتنا قریب تھا کہ اُسے صرف اُس کے پیلے سوئیٹر کی بُنائی دکھائی دے رہی تھی جس میں اُس کے سینے کی گولائیاں جوں کی توں اُبھر آئی تھیں۔ وہ

اُسے دکھائی تو نہیں دے رہی تھی مگر وہ اُسے محسوس کر سکتا تھا۔ اُس کے جوان جسم کی مست خوشبو اُس کے انگ انگ میں بسی جا رہی تھی اور وہ اُس کی گرم چاہت بھری سانس کو اپنے گالوں پر محسوس کر رہا تھا۔ یکا یک سینکڑوں پُرانی نازک یادوں نے جاگ کر اُس کے دل کے جذبات کو جگا دیا اور اُس کی گود میں اپنا منہ چھپا کر وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح سِسک سسک کر رونے لگا۔

جب اُس کا خواب ٹوٹا تو بخار سے تپتے ہوئے اُس کے گالوں کو بھیگے ہوئے تکیے کا لمس بہت خوشگوار لگا لیکن وہ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پسینہ تھا کہ آنسو۔

ہو سکتا ہے دونوں ہی رہے ہوں۔

اُسے وقت کا کوئی احساس نہیں رہ گیا تھا۔ شاید وہ کئی ہفتے سے بستر پر لیٹا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ شاید اُسے ٹرین میں سردی لگ گئی تھی جس کی وجہ سے پہلے اُسے انفلوائنزا ہو گیا تھا اور پھر ٹائیفائڈ۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یونی ورسٹی سے نکالے جانے پر اس کے دل کو جو دھکا لگا تھا اور سلمیٰ سے بچھڑ جانے پر اُس کے دل پر جو اور بھی گہری چوٹ لگی تھی اُس کی وجہ سے اُس کا جسم جواب دے گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ علی گڑھ میں وہ اتنا خاموش تھا— اپنی خودداری کی وجہ سے وہ اپنے درد کا خود بھی اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا، دوسروں سے اُس کا چرچا کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جب ریل گاڑی طوفان کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تب اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس میں پھر سے جان پڑ گئی ہے۔ لیکن اندرونی چوٹ کی طرح یہ اُسے اندر ہی اندر کھوکھلا کیے دے رہی تھی۔ اُسے اپنے ابا کو یہ بتانے کا بھی موقع نہیں ملا کہ وہ یونی ورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا تھا کہ بخار نے اُسے آدبوچا۔

(2)

اکبر علی یہ خبر سن کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے۔ انور جانتا تھا کہ حال ہی میں آغا خاں کی رہنمائی میں جو مسلم لیگ کانفرنس قائم ہوئی تھی اُس میں اُس کے ابا بھی شامل تھے۔ آغا خاں بھی ایک پہیلی تھے— وہ خدا، پیغمبر، فیشن ایبل رئیس اور انگریزوں کے وفادار دوست سب ہی کچھ تھے اور اُن کی رہنمائی میں مسلم کانفرنس کانگریس کی، گاندھی جی کی اور ستیہ گرہ تحریک کی زبردست

مخالفت کر رہی تھی۔ اکبر علی ایسے لوگوں کی صحبت میں رہ کر کچھ خوش نہیں تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ بالاک ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف الرائے مسلمانوں کو ایک ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ ہندو صرف مسلمانوں کو دبانے کے لیے ہی آزادی چاہتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں اُن کے اور علی برادران کی طرح جو انگریز مخالف عنصر تھے وہ آغا خاں کی مسلم کانفرنس کو انگریزوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا دینے سے روک دیں گے۔

انور کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے اور اُس کے ابا کے سیاسی خیالات اور جذبات میں بہت فرق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ جب اُس نے اپنے یونی ورسٹی سے نکالے جانے کی خبر سنائی تو اُسے ڈر تھا کہ بہت طوفان مچے گا۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کے ابا بہت ناراض ہوں گے اور اُسے گھر سے نکال دیں گے، اُسے جائیداد سے بے دخل کر دیں گے۔ وہ دل ہی دل میں خود اپنے آپ پر ترس کھانے لگا تھا اور اپنے آپ کو شہید سمجھنے لگا تھا اور اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مصیبتیں اُٹھا کر اور اپنے آپ کو ہر سُکھ سے محروم کر کے اور قوم کی خدمت میں اپنی زندگی صَرف کر دے گا۔ لیکن اُس کے ابا نے صرف اتنا کہا 'اب تم بڑے ہو گئے ہو، ماشاء اللہ سمجھ دار ہو، اپنا بھلا بُرا خود سمجھتے ہو۔ تُم جانتے ہو کہ میرے سیاسی خیالات تم سے مختلف ہیں لیکن میں اپنے خیالات تمھارے اوپر تھوپنا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف ایک بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنی جان بچانے کے لیے معافی نہیں مانگی — شاباش!' اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے کی پیٹھ بھی تھپکی تھی۔ ابا کے اِس پیار نے انور کے شعور کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ کاش اُس کے ابا اُس پر برس پڑے ہوتے، کاش انھوں نے اُسے دھمکایا ہوتا، بُرا بھلا کہا ہوتا تو اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے اُس نے اپنی طاقت کو قائم رکھا ہوتا۔ لیکن اِس دریا دلی اور ہمدردی کے آگے وہ بالکل لاچار ہو گیا تھا، وہ کمزور اور ڈھیلا ہو گیا۔ پچھلے کچھ دنوں کی ساری تھکان اُمڈ آئی اور اُس کا سر چکرانے لگا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا 'ابا، ذرا میری نبض تو دیکھیے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے بُخار ہے۔'

اکبر علی نے دل و جان سے بیٹے کی خدمت کی۔ تیز بُخار کی بے ہوشی میں بیچ بیچ میں جب اُسے ہوش آتا تو انور دیکھتا کہ اُس کے ابا اُس کے ماتھے پر گیلا کپڑا رکھ رہے ہیں، اُس کا بخار دیکھ رہے ہیں، اُسے دوا دے رہے ہیں۔ جب درد سے اس کا سر پھٹنے لگتا تو وہ اُس کا سر بھی دباتے

تھے اور اپنے بیٹے کے اچھا ہونے کے لیے وہ پانچ وقت نماز پڑھ کر دُعا بھی مانگتے تھے۔ انھیں اپنے کاروبار کے لیے یا اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھنے کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت ملتا تھا۔ حکیم بیدل جن کے سارے بال اب سفید ہو چکے تھے۔ اور بُڑھاپے سے دُہرے ہو گئے تھے، بیمار انور کو قصے اور شعر سنا کر اُس کا دل بہلاتے تھے۔ ایک دن جب انور تیز بخار کی وجہ سے کچھ بے ہوش تھا تو رامیشور کا کا بھی اس کی طبیعت پوچھنے آئے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ شُدھی اور سنگٹھن کے لیے پیسہ دیتے تھے جس کا مقصد نچلے طبقے کے غریب مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ یہ کام آریہ سماج کے ذریعے ہو رہا تھا جس نے ہندو مذہب کو مضبوط بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اکبر علی کا تعلق تبلیغی تحریک سے تھا جو مسلمانوں کی طرف سے شُدھی کا جواب تھا۔

انور نے آنکھیں کھولیں اور ابّا کے پاس بیٹھے ہوئے رامیسور کا کا کو اس نے پہچانا لیکن اُس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی۔ مسکرا کر وہ سوچنے لگا 'سیاست کے اس سارے جھگڑے کے پیچھے دونوں میں اب بھی کافی دوستی ہے۔' اس نے رامیشور کا کا کو کہتے سنا 'اکبر، تمھیں لڑکے کو اتنی ڈھیل نہیں دینی چاہیے نہیں تو وہ اِس ستیہ گرہ کے چکر میں پھنس جائے گا اور کسی دن اُسے پھانسی ہو جائے گی۔' اکبر علی نے کہا 'اُس کی سیاست مجھے بھی اتنی ہی ناپسند ہے جتنی تمھیں، لیکن جس چیز کو وہ صحیح سمجھتا ہے اُس کے لیے جان دینے کی اگر اُس میں ہمت ہو، تو ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔' ہمارے لیے؟ اُس کے ابّا نے بدیشی کپڑا بیچنے والے اُس بُزدل بیوپاری کے ساتھ اپنا نام کیوں جوڑا تھا، جس کی دُکان پر کانگریس والینٹیر کسی دن دھرنا دینے والے تھے۔ انور کے دماغ میں یہ دھندلا سا سوال اُٹھا ہی تھا کہ اپنے ابّا کا جواب سن کر اُس کا شک دور ہو گیا 'نہیں رامیشور، اگر وہ گاندھی جی کی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے تو میں اُسے روکوں گا نہیں مجھے تو بس اُس کی صحت کی طرف سے بڑی فکر ہے۔'

انور اتنا جوش میں تھا کہ اُس کے سارے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ اچانک اُسے ایسا لگا کہ اُس کا جی ہلکا ہو گیا ہے اور وہ اچھا ہو گیا ہے۔ وہ بار بار اپنے دل میں یہی ایک بات منتر کی طرح رٹنے لگا...... میں اچھا ہو جاؤں گا! میں اچھا ہو جاؤں گا! میں اچھا ہو جاؤں گا!!!

(3)

انور اچھا ہوگیا۔ اُس کا بُخار اُتر گیا لیکن وہ کمزور بہت ہوگیا تھا، چلتا تھا تو اُس کے پیر لڑکھڑاتے تھے۔ اُس نے سوچا کہ یہ مناسب ہی ہوگا کہ وہ اپنے ابّا کو بتا دے کہ وہ جلد ہی ستیہ گرہ کے لیے کانگریس کے والنیٹیروں میں اپنا نام لکھا لے گا۔ اکبر علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا 'سو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر تم جیل جانا ہی چاہتے ہو تو کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہوگا کہ پہلے تم بالکل اچھے ہو جاؤ اور تمھارے جسم میں کچھ طاقت آ جائے؟ میری رائے میں تو تم جا کر ڈاکٹر صاحب سے مل لو۔' اُن کا مطلب ڈاکٹر انصاری سے تھا اِس لیے انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا 'ظاہر ہے تمھیں اُن سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا وہ تمھاری اِس بیماری کے علاوہ تمھاری اُس سیاسی بیماری کا بھی علاج بتا دیں گے۔'

انور تانگا لے کر فصیل کے پاس جمنا کے کنارے دریا گنج والی سڑک پر ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لیے روانہ ہوا تو اُسے اپنے ابّا کے اِس مذاق پر ہنسی آ گئی۔ انور کو ڈاکٹر صاحب کا یہ بڑا سا بنگلہ بہت اچھا لگتا تھا۔ چوڑے چوڑے ٹھنڈے برآمدے، اُن کا چمکدار ٹائلس کا فرش، ملنے آنے والوں اور مریضوں کے لیے آرام دہ کرسیاں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بیماروں کا اور ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کیوں کہ وہ مشہور ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے قومی لیڈر بھی تھے۔ انور نے ڈاکٹر صاحب کے ہر کام کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا اور دو سال پہلے مدراس کانگریس میں صدر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی جو زوردار اپیل کی تھی اُس سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ انور اِس محب الوطن ڈاکٹر سے دوبارہ ملنے کے لیے بہت بے چین تھا۔

برآمدے میں جو لوگ اُن کا انتظار کر رہے تھے اُن میں بُجھے ہوئے چہروں والے گھبرائے ہوئے مریضوں کے علاوہ، جنھیں ڈاکٹر صاحب میں صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دلچسپی تھی، کچھ کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے کانگریسی کارکن اور لمبی لمبی داڑھیوں والے مولانا بھی تھے جو کانگریس کے طرفدار تھے لیکن انور کو وہاں نیلی آنکھوں والے ایک انگریز نوجوان کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کیوں کہ اُس کا تعلق اِن میں سے کسی سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ جو کپڑے پہنے تھا،

دیسی کپڑے انگریز عام طور پر نہیں پہنتے تھے۔ وہ کھدر کی قمیض، کھدر کی نیکر اور نیلا کھدر کا ٹینس کا بلیزر پہنے تھا جس پر کسی کالج کا نشان بھی لگا تھا۔ وہ بغیر موزوں کے پشاوری چپل پہنے تھا اور سب سے بڑی تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک سفید گاندھی ٹوپی تھی جو اُس نے اپنے سنہرے بالوں پر لگا لی۔ کوئی پکّا صاحب کبھی بھی اس طرح کے دیسی اور باغیانہ کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ وہ آخر یہاں کیا کر رہا تھا؟

انور نے میز پر رکھا ہوا صبح کا ہندوستان ٹائمز دیکھا تو یہ پہیلی حل ہوگئی۔ پہلے ہی صفحے پر موٹی موٹی خبر چھپی تھی۔— 'وائسرائے کے نام مہاتما کا خط' برطانوی حکومت کی سخت منظم طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے عدم تشدد اور سِول نافرمانی— ستیہ گرہ کے پروگرام کا اعلان— مہاتما کے نوجوان انگریز چیلے نے تاریخی چیلنج پہنچا دیا۔'

گاندھی جی کے خط کے ساتھ ہی نیلی آنکھوں والے اُسی نوجوان کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا' سابرمتی آشرم کے رہنے والے مسٹر ریج نالڈ رینالڈس جنہوں نے گاندھی جی کا تاریخی خط لارڈ اِروِن کو دیا۔'

انور نے ایک بار پھر ریج نالڈ رینالڈس کی آنکھوں کو دیکھا اور اُسے اُن میں ایک انوکھی ملائمت دکھائی دی جو انگریزوں کی آنکھوں میں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی یا شاید یہ جاننے کی وجہ سے کہ اُس نے ہندوستان کے لیے کتنا بڑا کام کیا تھا، اُسے اس کی آنکھوں میں ایک خوشگوار اور روحانی جذبہ دکھائی دینے لگا تھا؟ وہ اس عجیب انگریز نوجوان سے باتیں کرنے کی اپنی خواہش کو دبا نہ سکا۔

'مسٹر رینالڈس۔' انور اُس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر اُس سے مخاطب ہوا۔

'یس پلیز۔' اُس انگریز کی آواز میں بھی بڑی نرمی تھی، اُس میں وہ بڑے صاحبوں والی اکڑفوں نہیں تھی۔

'کیا آپ کے جیسے انگریز کے لیے یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ خود اپنے لوگوں کے خلاف، ہم لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں؟'

اُس نوجوان انگریز نے جو عمر میں انور سے کچھ ہی بڑا رہا ہوگا، اُس کی طرف دیکھ کر کہا' ہاں

میرے دوست، بدقسمتی سے یہ کچھ عجیب بات تو ہے اور اسی لیے یہ ضروری بھی ہے، ہمارے نام پر سامراج نے جو پاپ کیے ہیں اُس کا کفارہ بھی تو ہم میں سے کچھ لوگوں کو ادا کرنا ہی ہوگا۔'

ڈاکٹر انصاری کے سیکریٹری نے آ کر انور سے کہا کہ اب اس کی باری ہے اور انور نے اُٹھ کر اُس انگریز سے وداع ہوتے ہوئے کہا 'میرا نام انور علی ہے، مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی' اور اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے انور نے پھر کہا 'مسٹر رینالڈس' آپ جانتے ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی انگریز سے ہاتھ ملا رہا ہوں۔

'پھر یکا یک اُسے یونی ورسٹی کے انگریز پروفیسروں کا خیال آیا اور اُس نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔'ایک دوست کی حیثیت سے۔' رینالڈس نے مسکرا کر جواب دیا 'میں امید کرتا ہوں کہ یہ آخری موقع نہیں ہوگا۔'

جب وہ ڈاکٹر انصاری کے کمرے میں گھس رہا تھا تو وہ اُس صبح دوسری بار متعجب ہوا کیونکہ اسی وقت ڈاکٹر انصاری کے کمرے سے رابرٹ ملس نکل رہا تھا، وہی امریکی نامہ نگار جس سے وہ میرٹھ میں ملا تھا۔

'ہائی، ڈیر!' اُس نے ناک کی آواز میں اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔'گریٹ مین— دی ڈاکٹر ان دیر!'

(4)

ڈاکٹر صاحب نے انور کو اچھی طرح دیکھا اور سارا وقت وہ اُس سے اُس کی صحت کے بارے میں بلکہ اُس کے ابا اور اُن کی سیاست کے بارے میں بھی سوال کرتے رہے، انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ وہ یونی ورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا تھا اور پھر اس بات پر بڑی دیر تک چرچا کرتے رہے کہ وائسرائے کے نام گاندھی جی کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ ستیہ گرہ جلد ہی شروع ہو جائے گا۔ جب انھوں نے انور کے سینے پر آلہ لگا کر دیکھا تو اُن کی گھنی بھوؤں کے نیچے فکر کے آثار صاف دکھائی دینے لگے۔ انھوں نے انور کو اپنے پھیپھڑوں کا خیال رکھنے کے لیے آگاہ کرتے ہوئے کہا 'میاں مجھے یہ آواز کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔' اور پھر انور کو فکر مند دیکھ کر بولے 'گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن خاص طور پر اتنی لمبی ٹائیفائڈ کی بیماری کے بعد احتیاط برتنا ضروری ہے۔

میں تمھیں ایک ٹانک لکھے دیتا ہوں لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تم آرام کرو، خوب تازی ہوا میں ٹہلو اور تازی سبزیاں کھاؤ.....'

انور نے اُن کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی 'لیکن ڈاکٹر صاحب، میں تو ستیہ گرہ کرنے کے لیے اپنا نام والنٹیروں میں لکھوانے والا ہوں، پھر جیل میں تازی ہوا اور تازی سبزیاں کہاں ملیں گی؟'

'وہاں تو نہیں ملیں گی، اسی لیے تمھیں کوئی بھی ایسا کام کرنے سے منع کیا جاتا ہے جس میں جیل جانے کا خطرہ ہو۔ ہم تمھیں والنٹیر بنائیں گے ہی نہیں۔ کم سے کم چھ مہینے کے لیے جیل جانے کی بات بھول جاؤ۔'

شہید بننے کے خواب دیکھنے والا یہ سن کر بہت مایوس ہوا 'آپ مجھے یہ حکم ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دے رہے ہیں یا کانگریس کے لیڈر کی حیثیت سے؟'

'دونوں ہی حیثیت سے' ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا اور اس پر انور کو اپنے ابا کی بات یاد آ گئی۔ اپنی بے حد مایوسی کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

'کس بات پر مسکرا رہے ہو؟' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

انور نے انھیں بتایا 'چلتے وقت ابا نے کہا تھا کہ ڈاکٹر انصاری تمھاری اِس بیماری کا بھی کوئی علاج بتائیں گے اور تمھاری سیاسی بیماری کا بھی۔' اس پر ڈاکٹر صاحب بھی خوب ہنسے۔ لیکن اُٹھتے اُٹھتے بھی انور کو یہی خیال ستا رہا تھا کہ ایسے وقت پر جب کہ سب ہی دیش بھگتوں کے قدم جیل کی طرف اُٹھ رہے ہوں گے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا۔ اُس نے کہا 'ڈاکٹر صاحب میں آپ کا کہنا تو نہیں ٹال سکتا لیکن اگر میں اِس تحریک میں حصّہ نہ لے سکا تو مجھے دُکھ ہوگا۔ آپ جانتے ہیں میں نے اسی لیے یونی ورسٹی چھوڑی ہے۔' وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اسی کے لیے اُس نے سلمیٰ کو چھوڑا تھا اور اپنے محبت کے سب خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔

'تم فکر نہ کرو' رحم دل ڈاکٹر صاحب نے اُسے دِلاسا دیتے ہوئے کہا 'میری یہ پابندی صرف کچھ مہینوں کے لیے ہی ہے تاکہ تمھاری تندرستی ٹھیک ہو جائے اور پھر ملک کی خدمت کرنے کا اکیلا یہی طریقہ تو نہیں ہے کہ آدمی جیل چلا جائے۔'

انور نے بڑی بے قراری سے پوچھا 'کیا میں کسی اور طریقے سے بھی خدمت کر سکتا ہوں

ڈاکٹر صاحب؟ اگر کوئی طریقہ ہو تو مجھے بتایئے۔'

'ہاں، ہے کیوں نہیں۔' ڈاکٹر صاحب نے میز پر سے ایک کارڈ اٹھاتے ہوئے کہا اور کارڈ کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے انھیں کوئی بہت اچھی ترکیب سوجھ گئی ہو۔ 'رابرٹ ملس کے ساتھ سارے ملک کا چکر لگانے اور اُن کے ترجمان اور گائیڈ کی حیثیت سے کام کرنے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟'

انور تو کسی بھی قسم کے سفر کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور ملس کو اُس نے جتنا دیکھا تھا، اُسے تو وہ بہت ہی ملنسار اور دوست قسم کا آدمی معلوم ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ رہ کر شاید وہ تھوڑا بہت جرنلسٹ بھی بن جائے لیکن اس سے ملک کی کیا خدمت ہوگی؟

ڈاکٹر صاحب نے اُس کو اطمینان کے ساتھ سمجھایا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کی آزادی کی جدّ و جہد جلد ہی شروع ہونے والی تھی، اُس کے بارے میں دنیا کو بتایا جائے۔ برطانیہ کے اخبار ظاہر ہے اُس کی طرف کوئی دھیان نہ دیں گے یا اُس کی اہمیت کو کم کر کے پیش کریں گے لیکن امریکی غیر جانبدار ہیں اور اگر امریکیوں کو سچائی بتائی جائے تو وہ ہمارے دوست ہو سکتے ہیں۔ اس لیے رابرٹ ملس جیسے ایماندار امریکی نامہ نگار کی مدد کرنے سے فائدہ ہو سکتا ہے جو ستیہ گرہ کی تحریک کی خبریں اپنے اخباروں کے لیے جمع کرنے ہی خاص طور پر ہندوستان آیا ہے۔ اُسے اس تحریک کے ہر پہلو کو دیکھنے اور اپنے اخباروں میں اُن کی پوری خبر دینے میں ہر طرح کی سہولت دی جانی چاہیے۔ ملس کے ترجمان کی حیثیت سے کام کر کے ایک سمجھدار محبّ الوطن نوجوان اپنے مُلک کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ 'تم ہندوستان اور اس کے عوام کے ارمانوں کو امریکیوں تک پہنچاؤ گے جو اپنی تاریخ اور اپنی جمہوری روایات کی وجہ سے ہمارے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ ستیہ گرہ سے گاندھی جی مٹھی بھر انگریزوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ ساری دنیا کو انصاف کے لیے للکارنا چاہتے ہیں۔'

انور کو اور زیادہ لالچ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے فوراً ڈاکٹر صاحب کا حکم ماننے کا وعدہ کر لیا اُس نے چلتے ہوئے کہا 'خدا حافظ ڈاکٹر صاحب، میں اپنی طرف سے پوری کوشش

کروں گا اور آپ کو یا مسٹر ملس کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔'

اُس کے چلے آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے سیکریٹری کو بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ سیسل ہوٹل میں ملس صاحب کو خبر کر دے کہ اُن کے لیے ترجمان کا انتظام ہو گیا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور انھوں نے ٹیلی فون اٹھالیا۔

'ہیلو...... میں انصاری بول رہا ہوں..... کون، اکبر صاحب؟...... جی ہاں، سب ٹھیک ہے۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، اُسے صرف آرام اور تازی ہوا کی ضرورت ہے...... آپ فکر نہ کیجیے وہ جیل نہیں جائے گا، کم سے کم ابھی کچھ دن تک تو نہیں۔ میں نے اُسے دوسرا علاج بتا دیا ہے۔'

(5)

کئی مہینے تک انور اُس امریکی جرنلسٹ کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ کہنے کو تو ایک ہی امریکی اس کے ساتھ تھا لیکن حقیقت میں دو تھے۔ایک تو تھا ہٹا کٹا، لال چہرے والا، خبروں کا دیوانہ رابرٹ ملس، جو پچھلے پچیس برس سے خبروں کی تلاش میں لڑائیاں، خانہ جنگیاں اور انقلاب دیکھ چکا تھا اور وہ اب نئے قسم کی لڑائی کی، ایک نئے طرح کے انقلاب کی خبریں جمع کرنے آیا تھا۔ رابرٹ ملس نے جس دوسرے امریکی سے انور کا تعارف کرایا وہ کوئی جگہ گھیرے ہوئے نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک بھوت یا ایک یاد کی طرح تھا، پھر بھی وہ ہر دم اُن کے ساتھ تھا اور دلّی سے احمد آباد جاتے وقت راجپوتانہ کے ریگستانوں کو پار کرتے ہوئے انور اس نیک دل اور عقلمند بوڑھے امریکی سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی لمبی سفید داڑھی، سر پر ایک پُرانا ہیٹ اور ہاتھ میں ایک پرانی لاٹھی لیے ہوئے وہ اُس لگن کے ساتھ انسان کے گیت گاتا تھا جیسے خُدا کے پرستار اُس کی شان میں قصیدے گاتے ہیں۔ انور نے اُس سے پہلے کبھی ابراہم لنکن کے ہم عصر شاعر والٹ وِھٹ مین کا نام نہیں سنا تھا کیوں کہ بی۔اے کے انگریزی ادب کے کورس میں کسی بھی امریکی شاعر کی تخلیقات شامل نہیں تھیں اور اُس کا تو خیال تھا کہ اس کے پروفیسروں نے اس امریکی شاعر کا کبھی نام بھی نہ سنا ہوگا۔ اور انور کو یقین تھا کہ اگر انھوں نے نام سنا بھی ہوگا تو وہ اس انقلابی کی تخلیقات کو پڑھانا کبھی منظور نہ کرتے جس کی شاعری زندگی اور ادب کے کسی بندھے

نکے اصولوں کو نہیں اپناتی تھی اور جس میں اس باغی خیال کا پرچار کیا گیا تھا کہ سب ہی انسان بھائی بھائی ہیں۔

لمبے سفر کے لیے ملس سے اچھا ساتھی ملنا مشکل تھا۔ اُس نے دنیا کے کونے کونے سے علم کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور بہت سے تاریخی حادثات سے خود گذرا تھا۔ انقلاب کے کچھ ہی وقت بعد وہ روس میں تھا اور بالشویکوں نے جو کچھ کر دکھایا تھا اُس کی وہ بہت تعریف کرتا تھا لیکن پکّا کویکر QUAKER ہونے کی وجہ سے وہ اُن کی دہریت اور تشدد کو ناپسند کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے گاندھی جی کے اُصولوں میں اتنی دلچسپی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا 'ہندوستان میں تم لوگ تشدد کے بغیر انقلاب لا کر لینن کے اصولوں کی برائیاں دور کر سکتے ہو اور جب یہ ہو جائے گا تو عیسیٰ کے بعد ہونے والے تمام انقلابیوں کا کام پورا ہو جائے گا۔' پھر وہ عیسیٰ مسیح کی باتیں کرنے لگتا۔ 'وہ عیسیٰ نہیں جو مالداروں کا ولی ہے جسے گرجا گھروں میں کانچ پر بنی ہوئی تصویروں میں ریشمی کپڑے پہنے ہوئے دکھایا جاتا ہے بلکہ اصلی عیسیٰ مسیح جو محنت کرنے والا بڑھئی تھا، جس نے حرام کے پیسے بنانے والوں کو اُسی طرح مقدر سے مار بھگایا تھا جیسے لینن نے تجوریاں بھرنے والے سرمایہ داروں کو روس سے بھگایا تھا۔' اور پھر وہ بتاتا کہ عیسیٰ مسیح کی انقلابی تعلیمات کو کس طرح بگاڑا گیا تھا۔ وہ گاندھی جی کا ماخذ عیسیٰ کی تعلیمات اور اُس سے بھی پہلے مہاتما بُدھ کی تعلیمات میں بتاتا تھا 'لیکن یہ مت بھولو کہ تمھارے گاندھی کے خیالات کو ڈھالنے میں ہم امریکیوں کا بھی کچھ ہاتھ رہا ہے، انھوں نے خود ایمرسن کا اتنا ہی احسان مانا ہے جتنا ٹالسٹائی کا۔' لیکن وہ گاندھی کو ہمیشہ 'گینڈی' کہتا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ مزا اُسے انور کو والٹ وِھٹ مین کی نظمیں پڑھ کر سنانے میں آتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ بائبل کی ایک کاپی کے علاوہ اس کی نظموں کا "LEAVES OF THE GRASS" (گھاس کی پتّیاں)' نامی مجموعہ بھی رکھتا تھا۔ جب وہ اِن بے قافیہ نظموں کو پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو وہ اُسے شاعر کی زندگی کی بارے میں بتانے لگتا۔ انور کے لیے یہ ایک نیا ادبی تجربہ تھا لیکن ان بے قافیہ نظموں کو سن کر اُس میں ایک عجیب جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ اُس نے انور کو بتایا کہ یہ شاعر اپنی زندگی میں باری باری سے بڑھئی، کلرک، ملاح اور سپاہی سب ہی کچھ رہ چکا تھا اور سب

سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی بھر ایک آوارہ گرد رہا اور اُس زمانے میں جب کہ غلامی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور عورتوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انھیں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا، وہ کھلے عام عورتوں اور مردوں کی برابری اور ہر ذات اور نسل کے لوگوں کی برابری کی باتیں کرتا تھا۔ وِھٹ مین کی 'پیسج ٹو انڈیا' (ہندوستان میری منزل) نام کی نظم پڑھ کر سنانے میں اُسے سب سے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ اس نظم میں اُس نے سویز نہر کے کھلنے پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'یہ برّ اعظموں، سمندروں اور مختلف آب و ہواؤں کا اتحاد ہے' اور اسی موقع پر اُس نے ہندوستان کی پُرانی تہذیبوں اور فلسفوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

'آتما کی دور تک جاتی ہوئی کرنیں،
سپنے جو ابھی کھلے نہیں،
گہرائی میں اترنے والے صحیفے اور داستانیں،
شاعروں کی بلند خیالی،
اور بزرگ مذاہب'

اور جب وہ 'جے پور کے گلابی شہر' سے ہو کر گزرے اور انھوں نے وہاں کے محلوں اور مندروں کو سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھا تب اُسے فوراً وِھٹ مین کی یہ سطریں یاد آ گئیں۔

'اے مندر جو چمپا کے پھولوں کی طرح سفید ہیں'
جن پر سورج کی کرنیں برس رہی ہوں'
اے اونچے چمکتے ہوئے کلسو'
گلاب کی طرح سرخ سورج کی طرح دمکتے ہوئے'

'اور تمھارا تاج محل۔ چاندنی میں تاج محل جتنا خوب صورت لگتا ہے، اُتنی خوب صورت چیز میں نے اِس دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ وِھٹ مین نے اس کا بیان بہت ہی خوب صورت الفاظ میں اِس طرح کیا ہے کہ فانی خوابوں سے ڈھالی گئی لافانی داستانوں کی مینا ریں، کہ اُس کا اس سے خوب صورت کوئی بیان ممکن ہے؟'

چاندنی میں تاج محل! یادوں کے پنکھوں کے سہارے انور کا اپنا فانی خواب، پھر اُسے دُکھی

کرنے کے لیے لوٹ آیا اور اُس دن رات کو جب وہ ہوٹل کے کمرے میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اُسے نیند نہیں آئی۔ چھت پر ٹنگا ہوا بجلی کا پنکھا ساری رات ایک ہی لفظ دُہراتا رہا۔ سلمٰی! سلمٰی!! سلمٰی!!!

(6)

وہ گیارہ مارچ کو صبح احمد آباد پہنچے۔ احمد آباد بے ڈھنگے طریقے سے دور تک پھیلا ہوا ایک پُرانا شہر تھا جس میں جگہ جگہ ملوں کی چمنیاں آسمان کی طرف چلی گئی تھیں' یہ ایک طرف جاگیرداریت کے زوال اور دوسری طرف کارخانہ واریت کا انوکھا میل ہے۔' باب ملس نے شہر کو دیکھ کر کہا' روس کے انقلاب سے پہلے پیٹرو گراڈ بھی کچھ ایسا ہی شہر تھا۔'

ڈاک خانے جا کر انھوں نے اپنی ڈاک لی۔ ملس کے اخباروں نے اُسے تار بھیجا تھا کہ وہ 'گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا' کے بارے میں مفصل اور بھرپور رپورٹیں بھیجے، ایسا لگتا تھا کہ امریکہ میں لوگوں کو اس خبر میں بہت دلچسپی تھی۔ انور کے نام اُس کے ابا نے ایک موٹا سا لفافہ بھیجا تھا جس میں انھوں نے اُس کے پیچھے اُس کے نام آئے ہوئے سارے خط بھیجے تھے۔ ایک خط سبحان کا تھا جو کانپور کی کسی ٹریڈ یونین میں کام کر رہا تھا۔ اُس نے لکھا تھا' محنت کش لوگ نئے ہندوستان کی اِن ملوں اور فیکٹریوں میں انقلاب لائیں گے' انقلاب اُس آشرم میں نہیں ہوگا جہاں ایک سنت بیٹھا ہوا برٹش سامراج کے شیر کی دُم پر ایک چٹکی گھر کا بنا ہوا نمک رکھ کر اُسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔' سبحانو سکی' بالکل نہیں بدلا تھا۔ انور اپنے دوست کی اس انوکھی مثال پر مسکرا دیا۔ پھر اس نے اُس پوسٹ کارڈ پر نظر ڈالی جس پر لکھنؤ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس پر شاعر کی بہت خوب صورت زنانی لکھائی میں غالب کا صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا لیکن اُس سے اُس کا یہ مطلب بالکل صاف تھا کہ اُس نے ستیہ گرہ میں شامل ہونے اور جیل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

وہ لوگ وہاں ٹھیک وقت سے پہنچے تھے کیوں کہ گاندھی جی اسی دن رات کو اپنی یاترا شروع کرنے والے تھے اور سارے شہر میں ایک ہلچل تھی۔ پروگرام پہلے ہی سے ظاہر کر کے 'دشمن' کو

اُس کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پولیس کو یہ معلوم تھا کہ گاندھی سینا میں کتنے ستیہ گرہی ہوں گے، اُن کے نام کیا ہیں، وہ کس راستے سے ہوکر دو سومیل کے سفر کے بعد سمندر کے کنارے ڈانڈی نام کے مقام پر پہنچیں گے اور راستے میں کن کن گاؤں میں ٹھہریں گے۔ یہ ایک نئے ڈھنگ کی فوج تھی جو ایک نئے ڈھنگ کی لڑائی لڑ رہی تھی اور فوجی تاریخ میں اس لڑائی کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی تھی۔ اس لیے اس کو ایک نیا نام دیا گیا تھا— ستیہ گرہ! سچ مچ یہ 'حق کی لڑائی' تھی۔

انھوں نے ہوٹل سے ایک ٹیکسی اور سابرمتی ندی کا پتلا سا پُل پار کر کے ایک دھول بھری سڑک سے ہوکر آشرم کی طرف چلے۔ آشرم نیم کے پیڑوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی سفید جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ آشرم کے خاموش ماحول میں ایک ہلچل چھپی ہوئی تھی۔ جن پچھتر لوگوں کو اس یاترا کے لیے چنا گیا تھا وہ آخری تیاریاں کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی اپنے اصول کے مطابق تیسرے پہر سو رہے تھے لیکن اُن کے ایک سیکریٹری سے اُن لوگوں نے ساری باتیں معلوم کرلیں۔ گاندھی جی نے خود بہت غور کر کے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے چنا تھا جو اہنسا میں پورا یقین رکھتے تھے۔ ان میں مسلمان اور ہریجن بھی شامل تھے اور اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بالکل ہی ضروری چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہ لے جائیں۔

سیکریٹری کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر ملس نے کہا 'وہ اپنے ساتھ ایک لاٹھی کے علاوہ اور کچھ نہ لیں' نہ کوئی ہتھیار نہ روٹی اور نہ پیسہ— اُن کے پیروں میں صرف ایک جوڑا جوتا اور جسم پر صرف ایک کپڑا ہو۔'

'جی ہاں، جی ہاں۔' سیکریٹری کو بڑا تعجب ہوا' آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'

'یہ تو بہت پرانی کہانی ہے— اب سے کوئی انیس سو تیس برس پرانی!'

امریکی اخبار نویس نے گاندھی جی کے سیکریٹری کے چہرے پر حیرت کا اظہار دیکھ کر کہا 'میں تو آپ کو بائبل میں لکھی ہوئی بات سنا رہا تھا۔ عیسیٰ نے اپنے بارہ چیلوں کو یہی ہدایت دی تھی۔'

'میرا خیال ہے کہ گاندھی جی کو اس مقدس مثال کا پتہ نہیں ہے لیکن انھیں یہ سن کر بہت خوشی ہوگی، جب وہ سوکر اُٹھیں گے تو میں انھیں آپ کی یہ بات بتاؤں گا۔'

'ضرور ضرور' اور اُن سے میرا اسلام کہہ دیجیے گا۔ میں آج انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا، آج

انھیں بہت سی باتوں کے بارے میں سوچنا ہوگا لیکن راستے میں کہیں پر میں اُن سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔'

شہر واپس پہنچ کر ملس نے ڈانڈی یاترا کا ذکر کرتے ہوئے ایک تار بھیجا۔ اُس ہوٹل میں دوسرے انگریز اور امریکی نامہ نگار بھی ٹھہرے ہوئے تھے اس لیے ملس اُن سے پیچھے رہ جانے کے لیے کسی بھی حالت میں تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی 'کہانی' ٹائپ کرتا جا رہا تھا اور جب ایک صفحہ پورا ہو جاتا تھا تو وہ انور کو اُسے تار سے بھیج دینے کے لیے ٹیکسی سے ڈاک خانے بھیج دیتا تھا۔ یہ طوفان کی رفتار سے کام کرنے والی امریکی اخبار نویسی تھی، اس میں خرچ کی کوئی فکر نہیں کی جاتی تھی۔

کھانا کھا کر وہ پھر ٹیکسی سے آشرم جا پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہزاروں لوگوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ اپنے چہیتے مہاتما کو وداع کرنے آئے تھے۔ آس پاس دور تک پھیلے ہوئے میدان پر اندھیرا چھاتا جا رہا تھا اور تقریباً بالکل ہی سوکھی ہوئی ندی کے اُس پار اَن گنت مشعلوں کی روشنی ہو رہی تھی جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں۔ یہ لوگ شہر اور آس پاس کے گاؤں سے سابرمتی کے کنارے پر بسے ہوئے آشرم کی طرف آ رہے تھے۔ جب اُن کی موٹر بھیڑ کو چیرتی ہوئی آشرم کے قریب پہنچی اُس وقت آدھی رات ہو چکی تھی اور آس پاس کی کھلی جگہ میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ لوگ گاندھی جی کے سکریٹری کے پاس پہنچے اور اُس نے انھیں بتایا کہ بائبل میں ایسے ہی واقعے کے ذکر کی بات سُن کر گاندھی جی بہت متاثر ہوئے تھے لیکن انھوں نے امریکی اخبار نویس سے التجا کی تھی کہ وہ اس بات کا کہیں ذکر نہ کرے کیونکہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ عیسیٰ جیسے پیغمبر کے ساتھ اپنا مقابلہ کرنا بہت بڑی گستاخی اور عیسائی مذہب کی بے ادبی ہوگی۔

'جو آدمی خود ولی اور پیغمبر ہو اُس میں اتنی انکساری ہو سکتی ہے۔' امریکی اخبار نویس نے کہا۔

صبح ہو رہی تھی۔ گاندھی جی ایک لنگوٹی پہنے اپنی جھونپڑی میں سے نکلے اور انھیں دیکھتے ہی دس ہزار آدمیوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا 'مہاتما گاندھی جی کی جے!' برآمدے میں کھڑے ہو کر گاندھی جی نے اپنے خاص ڈھنگ سے پوپلے منہ مسکرا کر اس نعرے کا جواب دیا اور ہاتھ اُٹھا کر لوگوں سے خاموش ہو جانے کو کہا۔ والینٹیروں نے جلدی سے اُن کے چاروں طرف ایک گھیرا بنا

لیا اور انھیں ندی کے کنارے کی طرف لے چلے جہاں یاترا شروع کرنے سے پہلے پرارتھنا ہونے والی تھی۔ ایک دبلا پتلا اَدھ ننگا چھوٹے قد کا آدمی چبوترے پر آنکھیں بند کیے ہوئے دھیان میں مصروف بیٹھا تھا۔ پیچھے سے آتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں اُس کے دُبلے پتلے اور جھریوں سے بھرے جسم کا صرف ایک کالا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گیتا کے اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ اس کے بعد سفید داڑھی والے ایک مولوی صاحب نے آکر بھاری گونجتی ہوئی آواز میں قرآن کی آیتیں پڑھیں، پھر پارسیوں کی مذہبی کتاب سے ایک حصّہ پڑھا گیا اور آخر میں عیسائیوں کی "LEAD KINDLY LIGHT!" پڑھی گئی۔ ملس بھی انجانے ہی اس کورس میں شامل ہو گیا اور ناک کے سُر سے گاتے ہوئے اُس امریکی اخبار نویس کی بھاری آواز شرمیلی ہندوستانی آوازوں پر چھا گئی۔ انور نے دیکھا کہ گاندھی جی نے اس انجانی آواز پر کچھ تعجب کے ساتھ ایک پل کو اپنی آنکھیں کھولیں اور اُس لمبے چوڑے امریکی کو وہی دُعا پڑھتے دیکھ کر انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کے پچکے ہوئے گالوں پر اور عینک کے پیچھے اُن کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پرارتھنا ختم ہونے پر گاندھی جی نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور اندھیرے کو چیرتے ہوئے یاترا پر چل پڑے۔ اُن کے پیچھے پیچھے سچائی کی اِس لڑائی میں لڑنے والے اُن کے پچھتر سپاہی دو قطاروں میں چلے جا رہے تھے۔ لوگوں کے ہجوم نے ایک بار پھر نعرہ لگایا 'مہاتما گاندھی کی جے!' مہاتما گاندھی نے اپنی پد یاترا شروع کر دی تھی!

ملس بھاگ کر اپنے ہوٹل پہنچا اور ٹائپ رائٹر پر جلدی سے ایک چھوٹی سی خبر ٹائپ کر لی، اُس کے بعد اِس خبر کو تفصیلی ٹائپ کرنے سے پہلے اُس نے انور کو اُس مختصر خبر کے ساتھ ڈاک خانے دوڑا دیا تاکہ وہ تیسرے پہر نکلنے والے اخباروں میں چھپنے کے لیے ٹھیک وقت پر نیو یارک پہنچ جائے۔ کھڑکی پر تار دیتے وقت انور نے اُن الفاظ کو پڑھا اور اُس کے سارے بدن میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خبر کچھ اِس طرح تھی۔

ورلڈ نیوز۔ نیو یارک

ہندوستان کے دیہاتوں میں ایک نئے عیسیٰ کی پد یاترا۔ اس ناقابلِ فتح روحانی طاقت کے

آ گئے نئی دلّی کے محلوں میں ظالم حکمراں گھبرا اُٹھے۔ آج صبح سویرے دھیمی رفتار سے بہنے والی سابرمتی کے کنارے سے مہاتما گاندھی نے اپنے ۷۸ پیروؤں کے ساتھ عیسائیوں کی دعا "LEAD KINDLY LIGHT" پڑھتے ہوئے اپنی تاریخی پدیاترا شروع کی۔ اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے لیے یہ دُبلا پتلا آدمی گہرے اندھیرے میں اُمید کی کرن کے مانند ہے۔ نمک بنا کر انگریزوں کا قانون توڑنے کے لیے گاندھی نے سمندر کے کنارے کی طرف اپنی یاترا شروع کر دی۔ یہی اُن کے ہم وطنوں کا آزادی کا سفر ہے۔ تفصیلی خبر بعد میں بھیج رہا ہوں۔

(7)

کچھ دن تک تو گاندھی جی جدھر جاتے تھے اُدھر ہی وہ بھی موٹر سے پہنچ جاتے۔ انور نے ایسا محسوس کیا کہ شروع شروع میں اُسے جتنا جوش تھا وہ گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے مذہبی پہلو کو دیکھ کر کافی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ یہ آزادی کی فوج میدان جنگ کے لیے کوچ نہیں کر رہی تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ ایک مقدس روح کے ساتھ کچھ یاتری کسی تیرتھ یاترا پر جا رہے ہیں۔ جہاں بھی وہ جاتے ہزاروں کی تعداد میں گاؤں والے وہاں آ کر جمع ہو جاتے اور مہاتما کے پیر چھونے کے لیے، یا جہاں پر انھوں نے قدم رکھا تھا کم سے کم وہاں کی دھول ہی لے جانے کے لیے دھینگا مستی کرنے لگتے۔ انور جانتا تھا کہ مہاتما گاندھی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ اِس طرح کی اندھی بُت پرستی کو کیوں برداشت کرتے تھے؟ وہ ایسا ماحول ہی کیوں پیدا کرتے تھے جو لوگوں کو جس سرکار سے نفرت ہے اُس کے خلاف لڑنے کی بجائے اُن کی اپنی پاکیزگی کی طرف کھینچتا تھا؟ جن گاؤں سے ہو کر وہ گزر رہے وہاں کے کسان بہت غریب تھے۔ آخر مہاتما جی اُن کسانوں کو نہ صرف بدیسی سرکار کے خلاف بلکہ اُن کا خون چوسنے والے زمینداروں اور مہاجنوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے کیوں نہیں اُکساتے تھے؟ آخر کیوں نہیں......؟ کیوں نہیں؟

انور نے ایک بار جب گاندھی جی کو کسانوں کی ایک بھیڑ کے سامنے تقریر کرتے سنا تو اُس کے کچھ شک دور ہو گئے اور اُسے اپنے کچھ سوالوں کا جواب بھی مل گیا۔ وہ گجراتی بول رہے تھے اور ایک والنٹیر اُن کی تقریر کا ترجمہ ہندوستانی میں کرتا جاتا تھا، جس کا ترجمہ انور کو ملس کے لیے

انگریزی میں کرنا پڑتا تھا۔ یہ بہت ہی لمبا سلسلہ تھا اور اِس دہرے ترجمے میں درمیان میں کچھ لفظ رہ بھی جاتے تھے لیکن انور کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ سنتوں کی طرح ہمت رکھنے کی نصیحت نہیں کر رہے تھے بلکہ اُن کی تقریر ظلم کی مخالفت کرنے کے لیے ایک انقلابی پیغام تھی۔

انہوں نے کہا 'ہندوستان میں انگریز حکومت نے اِس عظیم ملک کو اخلاقی مادّی، تہذیبی اور روحانی طور سے تباہ کر دیا ہے۔ میں ایسی حکومت کو ایک لعنت سمجھتا ہوں، میں نے اِس حکومت کے انتظام کو ختم کر دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ میں نے ایک زمانے میں GOD SAVE THE KING کا گیت گایا ہے اور دوسروں کو یہ گیت گانا سکھایا بھی ہے۔ میں ورخواستوں، وفد اور دوستانہ بات چیت کے ماحول میں بھروسہ رکھتا تھا۔ لیکن یہ سب طریقے بیکار ثابت ہو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سرکار اِن طریقوں سے صحیح راستے پر نہیں آئے گی۔ اب بغاوت میرا مذہب ہے۔ ہماری لڑائی اہنسا کی لڑائی ہے۔ ہم کسی کو جان سے مارنے کے لیے نہیں نکلے ہیں۔ لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ اس سرکار کے ظلم کا نام ونشان مٹا دیں۔'

انور سوچنے لگا کہ اگر مہاتما جی جیسا نرم طبیعت کا آدمی اس طرح کی باتیں کر سکتا ہے تو وہ انقلاب جس کا نعرہ بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد لگایا تھا سچ مچ ہی آ گیا ہے۔ کسانوں کا جوش بھی نعرے لگانے تک ہی محدود نہیں تھا۔ اِس جلسے میں گاندھی جی کی تقریر ختم ہوتے ہی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہوئے آدھے درجن آدمی کود کر اسٹیج پر پہنچ گئے۔ وہ سرکار کے ذریعے مقرر کیے ہوئے گاؤں کے پٹیل تھے اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر اُنہوں نے اپنے استعفوں کا اعلان کیا۔ اُن میں سے ایک نے چلّا کر کہا 'ہمیں مہاتما کا حکم مل گیا ہے، اب ہم اِس ظالم سرکار کی سیوا نہیں کریں گے۔' تالیوں کی آواز سے آسمان گونج اُٹھا اور پتہ لگانے پر اُن اخبار نویس کو یہ معلوم ہوا کہ اِن چھ پٹیلوں کو لے کر گجرات میں استعفیٰ دینے والے پٹیلوں کی تعداد دو سو تک پہنچ چکی ہے۔ سرکار کو دھیرے دھیرے عوام کے عدم تعاون کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار ملس کو مہاتما گاندھی سے انٹرویو کا وہ موقع مل ہی گیا جس کی تاک میں وہ کئی دنوں سے تھی۔ لیکن جب تک غیر ملکی اخبار نویس ستیہ گرہیوں کی اس ٹولی کے ساتھ لگے ہوئے تھے تب تک وہ اِس انٹرویو کو ٹالے ہوئے تھا۔ لیکن کچھ دن بعد انگریز اور امریکی اخبار نویس روز تیز

دھوپ اور گرد میں پندرہ پندرہ میل چلتے چلتے اُکتا گئے اور اِس لیے وہ احمد آباد لوٹ گئے۔ اُسی دن شام کو جمبوسار نام کے گاؤں میں انور ملس گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی آم کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ انور نے انھیں یاد دلایا کہ وہ ایک بار پہلے بھی اُن سے مل چکا تھا اور گاندھی جی نے کہا 'ارے ہاں، مجھے یاد ہے لیکن اُس وقت سے تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔' اس کے بعد انور نے انھیں ملس کے بارے میں اور ہندوستان کی آزادی کے مقصد کے لیے اُس کی ہمدردی کے بارے میں بتایا کہ ڈاکٹر انصاری نے اُسے اس امریکی اخبار نویس کے ساتھ ایک ترجمان کی حیثیت سے سارے ملک کا چکّر لگانے کے لیے متعین کیا تھا۔ انور نے دیکھا کہ مہاتما جی اِس بات سے بہت خوش ہوئے کیوں کہ انھوں نے مسکرا کر کہا 'اچھا! اچھا!' گاندھی جی کے سیکریٹری نے بتایا کہ ملس ہندوستان کی طرف دوستی کا جذبہ رکھنے والا وہی امریکی نامہ نگار تھا جس نے عیسیٰ مسیح کی زندگی کے ایک واقعہ کے ساتھ ستیہ گرہیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ سن کر گاندھی جی عیسیٰ مسیح کی باتیں کرنے لگے جن کے لیے اُن کے دل میں بہت عقیدت تھی۔ اس کے بعد وہ ٹالسٹائی اور ایمرسن کی باتیں کرتے رہے جن کے دونوں ہی بہت مداح تھے۔ باتوں کے دوران ملس نے والٹ وِھٹ مین کا بھی ذکر کیا مگر گاندھی جی نے اس شاعر کی کسی تخلیق کو نہیں پڑھا تھا۔ پھر بھی جب انھیں بتایا گیا کہ لنکن کے اعلان سے بہت پہلے ہی اس شاعر نے غلامی کو اُکھاڑ پھینکنے کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا اور اس کے لیے بہت کام کیا تھا تو گاندھی جی کو اس شاعر میں بڑی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ملس نے جب دیکھا کہ اُسے انٹرویو کے لیے جو ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا اُس کا زیادہ تر حصہ تو سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھنے والی اِدھر اُدھر کی باتوں میں نکل گیا تو اُس نے آخری کچھ منٹوں میں جلدی جلدی مسائل حاضرہ کے متعلق سوال پوچھنے شروع کیے۔

'مہاتما گینڈی' وہ گاندھی، کو اب بھی 'گینڈی' کہتا تھا لیکن دوسرے اخبار نویسوں کی طرح وہ اُس کے پہلے 'مسٹر' کا لفظ نہیں لگاتا تھا 'انگریزوں سے آپ کو کیا شکایت ہے؟'

گاندھی جی نے چرخہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ 'ایک لفظ میں میری شکایت کی بنیاد اُن کا استحصال ہے۔ وہ ہندوستان کا خون چوس رہے ہیں۔ وائسرائے کی تنخواہ ہی کو لے لیجیے جس کا ذکر میں نے لارڈ اِروِن کے نام اپنے خط میں کیا تھا۔ اُسے ہر مہینے اکیس ہزار روپے سے زیادہ

ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے روزانہ سات سو روپے سے زیادہ ملتے ہیں جب کہ اوسط ہندوستانی کی آمدنی دو آنے روز سے بھی کم ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اوسط ہندوستانی کے مقابلے میں پانچ ہزار گنا سے بھی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، لیکن اوسط انگریز کی آمدنی دو روپے روز ہے، پھر بھی وہاں کے وزیرِاعظم کو صرف ایک سو اسّی روپے روز ملتے ہیں۔ کیا یہ استحصال نہیں ہے؟ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ نظام کا پورا طریقہ غلط اور جابرانہ ہے۔'

'انگریزوں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ نے نمک قانون جیسے چھوٹے قانون کو توڑنے کے لیے کیوں چنا؟'

'کیوں کہ غریبوں کی نظر سے دیکھا جائے تو اس قانون کو میں سب سے زیادہ ناجائز قانون سمجھتا ہوں۔ چونکہ آزادی کی تحریک بنیادی طور پر سب سے غریب لوگوں کے لیے ہے، اس لیے میں نے سب سے پہلے اُس برائی کو ہی دور کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔'

'اگر آپ گرفتار ہو گئے تو کیا ہوگا؟'

'میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں جان سے مار دیا جاؤں لیکن مجھے اِس بات کی پوری اُمید ہے کہ میرے بعد اِس کام کو تربیت یافتہ ڈھنگ سے پورا کرنے کے لیے ہزاروں لوگ تیار ہوں گے۔'

'تھیوڈور پارکر نے بھی بالکل ایسی ہی بات کہی تھی۔

'میں ایک لاعلم آدمی ہوں' گاندھی جی نے کہا 'تھیوڈور پارکر کون تھے؟'

ملّس نے انھیں تھیوڈور پارکر کا قصہ سنایا۔ وہ لنکن اور وھٹ مین کے زمانے میں ایک بہت بڑا ناصح گذرا تھا اور غلامی کے خاتمے کا پرچار کرنے والے شروع کے کچھ لوگوں میں سے تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ غلامی کا رواج عیسائی مذہب کے خلاف ہے۔ جو اخلاقیات کے ماہر اس ناانصافی کی حالت کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے تھے اُنہوں نے اُسے کھلے عام بحث کرنے کے لیے للکارا۔ اُس کے دوستوں نے اُسے صلاح دی کہ وہ اس میٹنگ میں نہ جائے کیوں کہ یہ اُسے مار ڈالنے کی سازش تھی، لیکن وہ جانے پر تلا ہوا تھا۔ اس لیے انھوں نے اُسے اُس کے گھر میں بند کر دیا۔ میٹنگ میں اس کے دشمنوں نے اُسے بُزدل ٹھہرایا۔ یکا یک پارکر وہاں آ پہنچا اور کود کر

اسٹیج پر جا کھڑا ہوا اور زور زور سے چلّا کر کہنے لگا 'اگر چاہو تو مجھے جان سے مار ڈالو! لیکن تم میرا جو خون بہاؤ گے اُس کی ایک ایک بوند سے ہزاروں پارکر پیدا ہوں گے اور غلامی کا خاتمہ کر دیں گے۔' اس کے دشمن شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے۔

ظاہر تھا کہ گاندھی جی پارکر کی مثال سے بہت متاثر ہوئے اور کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد بولے ''یہ اہنسا کی طاقت کی ایک روشن مثال ہے۔'' مگر ملس پھر تازہ سیاسی مسائل پر باتیں کرنے لگا۔

''لارڈ اروِن نے آپ کے خط کا جو جواب دیا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''گھٹنے ٹیک کر میں نے روٹی مانگی تھی اور جواب میں مجھے پتھر ملا۔ پھر بھی مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ انگریز قوم صرف طاقت کے آگے سر جھکاتی ہے۔''

گاندھی جی کے سیکریٹری خطوں کا ایک بڑا سا ڈھیر لیے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اس لیے ملس نے جلدی سے ایک سوال اور پوچھا ''انگریزوں کی اس دلیل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ ان کی حکومت سے ہندوستان کو فائدہ ہی پہنچا ہے کیونکہ انھوں نے اس ملک میں امن قائم کیا ہے؟''

''انگریزوں کی حکومت میں ہمارے ملک کا جو امن نصیب ہوا ہے وہ جیل خانے یا قبرستان کا ہی امن ہے۔ انھوں نے پورے ہندوستان کو ایک بہت بڑا جیل خانہ بنا رکھا ہے۔''

اتنے میں گاندھی جی جو سوت کات رہے تھے وہ ٹوٹ گیا اور ایسا ظاہر ہوا کہ سوت کا ٹوٹنا بات چیت کا سلسلہ ختم ہونے کا اعلان تھا۔ گاندھی جی نے اپنی کمر میں ایک زنجیر سے لٹکتی ہوئی گول جیسی گھڑی ہاتھ میں لے کر امریکی اخبار نویس کو دکھاتے ہوئے کہا ''آپ پانچ منٹ زیادہ وقت لے چکے ہیں'' اور یہ کہہ کر وہ بچّوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وہاں سے باہر نکلتے وقت انور نے ملس سے پوچھا ''ہمارے مہاتما کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں چاہتا تھا کہ میں اور کچھ دیر ان سے باتیں کر سکتا تھا۔ ابھی بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں، مثلاً یہ بات کہ وہ چرخے پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں؟ مجھے تو ایسا

لگتا ہے کہ یہ ترقی کے سلسلے کو پیچھے موڑ دینے کے برابر ہے۔ لیکن اس بات چیت کے بعد مجھے ایک بات کا پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے۔ وہ ہے ان کی ایمانداری اور نیکی۔ اتنی نیکی خطرناک ہو سکتی ہے۔''

''کس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ہو سکتا ہے خود ان کے لیے۔''

انور اس بات کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکا، اس لیے اس نے پوچھا'' آپ کا مطلب میں سمجھ نہیں پایا؟''

''یہ تو میں بھی نہیں بتا سکتا۔'' اس امریکی اخبار نویس نے سوچتے ہوئے کہا'' میں پھر عیسیٰ مسیح کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

(8)

جب وہ احمد آباد واپس پہنچے اس وقت کل ہند کانگریس کمیٹی کے سینکڑوں ممبر جسے قوم پرست اخبار ''قومی پارلیمنٹ'' کہنے لگے تھے۔ سِول نافرمانی کی تحریک کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ ان تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر جو جیل میں ان کے ساتھ ہی رکھے جائیں، باقی لوگوں سے کئی برس تک ان کا ملنا نہ ہو سکے۔ جب وہ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر وداع ہو رہے تھے اس وقت ان کے چہرے پر ایک اداسی کی جھلک تھی، ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ آخری قدم اٹھانے جا رہے ہیں، لڑائی کے لیے دونوں طرف کے مورچے جم چکے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں ایک چمک بھی تھی؛ دشمن کو اپنا کس بل دکھانے کا عزمِ مصمم بھی تھا۔ فضا میں فکر کا جو جذبہ سمایا ہوا تھا اسے جیسے دور کرنے کے لیے بیچ بیچ میں لوگ ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ سروجنی نائیڈو جو شاعر تھیں اور سیاست داں بھی، جو بات بات میں لوگوں کو ہنساتی تھیں اور کئی بار بہادری کے ساتھ لڑ بھی چکی تھیں؛ جن میں اپنے بھاری بھر کم جسم اور ادھیڑ عمر کے باوجود لڑکیوں جیسی چستی تھی۔ وہ اپنی خاص آواز میں کہہ رہی تھیں ''اچھا جواہر،

رخصت۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم سب لوگوں کو جیل کی تیرتھ یاترا کی تیاریاں کر لینی چاہئیں۔"

اب سیاسی واقعات کا رخ احمد آباد سے ہٹ کر کہیں اور مڑ رہا تھا' اس لیے رات کی گاڑی سے انور اور ملس بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

(9)

بمبئی!

انور کے لیے تو اس نام میں ہی ایک جادو سا تھا۔ شہر کی فضاء ایک نشیلی اور طاقت وردوا کی طرح تھی۔ بڑی بڑی عمارتیں، سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ، ٹرامیں، بسیں اور بجلی کی ریل گاڑیاں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں طرح طرح کے لوگوں کی چہل پہل، جگمگاتی ہوئی دکانیں ہر چیز جدیدیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہر چیز اسے لبھا رہی تھی اور ساتھ ہی اس کی پہنچ سے باہر بھی معلوم ہوتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اس شہر میں تابناک مستقبل کے امکانات بھی ہیں اور ایک للکار بھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس شہر کو فتح کر کے ہی دم لے گا۔

وہ لوگ تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے۔ اپنے سیدھے سادے طالب علموں والے لباس میں انور کو ایسا لگا۔ کہ وہ اس جگہ کے لائق نہیں ہے اور اس کے علاوہ وہ اس کی بھی کوئی وجہ نہیں سمجھتا تھا کہ جب وہ آسانی سے اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹھہر سکتا ہے تو پھر ملس اس کے لیے اتنا پیسہ کیوں خرچ کرے۔ اس لیے اس نے عثمان فضل بھائی کو اس کے ابا کے عطر کے کارخانے میں ٹیلیفون کیا اور اسے فوراً ٹیلیفون پر ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ عثمان کو اس کی آواز سن کر کتنا تعجب ہوا تھا اور ساتھ ہی کتنی خوشی ہوئی تھی۔ گھنٹے بھر کے اندر ہی عثمان انور کو اپنے گھر لے جانے کے لیے ہوٹل آ پہنچا۔ انور کے ساتھ ہی عثمان کو بھی کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ ملس نہیں چاہتا تھا کہ انور اسے چھوڑ کر جائے۔ وہ اپنے ترجمان کو سچ مچ بہت چاہنے لگا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی پوری ذمہ داری اس کے اوپر ہے، لیکن جب عثمان نے بہت زور دیا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے علاوہ انور نے ملس کو یہ بھی بتایا کہ تاج محل ہوٹل میں رہ کر بمبئی کے عوام کی زندگی سے اس کا تعلق نہیں رہ پائے گا اور چونکہ عثمان مقامی کانگریس کی سرگرمیوں میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہا تھا

اس لیے اس کے ذریعے وہ اپنے دوست کے لیے خبریں حاصل کر سکے گا۔

چھ اپریل کو خبر آئی کہ گاندھی جی ڈانڈی پہنچ گئے اور انھوں نے سمندر کے کنارے سے نمک اٹھا کر نمک قانون توڑ کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ یہ سارے ملک میں قانون توڑنے کی تحریک شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ ہر جگہ جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا دیا گیا اور کھلے عام نمک بنایا گیا۔ سرکار نے اس بغاوت کو بھڑکانے والے اہم لیڈروں کو تو ہاتھ نہیں لگایا مگر ان کے ساتھیوں کے ساتھ بے انتہا تشدد کا سلوک کیا۔

عثمان کا ایک دوست بمبئی کرانیکل، میں سب ایڈیٹر تھا اور انور اپنا بہت سارا وقت وہیں گذارتا تھا اور دیکھتا رہتا تھا کہ اخبار کے دفتر میں خبریں کس طرح لگاتار آتی رہتی تھیں۔ کراچی میں ایک عدالت کے سامنے جہاں کچھ ستیہ گرہیوں پر مقدمہ چل رہا تھا۔ ایک نہتی بھیڑ پر گولی چلائی گئی۔ دو نوجوان مارے گئے اور سات کو گہری چوٹ آئی جن میں گٹھے ہوئے جسم والے سندھی لیڈر جے رام داس دولت رام بھی تھے جنھیں انور نے ابھی کچھ ہی دن پہلے احمد آباد میں دیکھا تھا۔ پٹنہ، کلکتہ، مدراس، رتنا گیری اور لاہور سے بھی گولی چلنے کی خبریں آئی تھیں۔ پشاور میں کئی لوگ فوج اور پولیس کی گولیوں سے مارے گئے تھے جن میں ایک عورت اور اس کا بچہ بھی تھا' جسے ماں کی چھاتی سے دودھ پیتے ہوئے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک سب ایڈیٹر نے انور کو بتایا ''شروع شروع میں تو جب کہیں بھی پولیس گولی چلاتی تھی تو وہ خبر اتنی سنسنی خیز سمجھی جاتی تھی کہ اسے پہلے صفحے پر سات کالم کی نمایاں سرخی لگا کر چھاپا جاتا تھا لیکن اب تو روز اتنی جگہوں سے گولی چلنے کی خبریں آتی ہیں کہ ہم انھیں ایک کالم میں سے زیادہ کی سرخی نہیں دے سکتے۔ لاٹھی چارج کی خبریں تو یوں ہی کسی کونے میں چھاپ کر ٹال دی جاتی ہیں۔''

سارے ملک میں بغاوت کی آگ دہک رہی تھی۔ بمبئی میں بھی یہی حال تھا۔ انور کو ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی دن یہ آگ بھڑک اٹھے گی۔ اس شہر میں کانگریس کی تنظیم دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی اور اس لیے یہاں وہ زیادہ طاقتور بھی تھی۔ عثمان نے اسے بتایا کہ بمبئی میں انگریز سرکار سے الگ ایک دوسری سرکار کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ کانگریس کے ہزاروں والنٹیر تھے جن کی اپنی الگ وردی تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی' زخمیوں کو لے جانے کے لیے

ایمبولنس گاڑیوں، طبی امداد اور اسپتال کا پورا انتظام تھا۔ کانگریس ہاؤس کے حکم پر کروڑوں روپے کے بدیسی کپڑے سے بھرے ہوئے گوداموں میں تالا لگا دیا گیا تھا اور کانگریس کے والنٹیئر دن رات ان پر پہرہ دیتے تھے۔ شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا جارہا تھا اور شراب کا کاروبار لگ بھگ بالکل ٹھپ پڑ گیا تھا۔ چونکہ اخباروں پر روک لگانے کے لیے ان کے ایڈیٹروں کے خلاف کئی سرکاری حکم جاری کردیے گئے تھے اس لیے سائکلو اسٹائل کر کے غیر قانونی کانگریس بلیٹن صبح اور شام کو نکالے جاتے تھے اور کھلے عام سڑکوں پر بیچے جاتے تھے۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ پولیس کی نظروں سے چھپا کر کانگریس کا ایک ریڈیو اسٹیشن بھی کام کررہا تھا جو بغاوت کا پیغام براڈکاسٹ کرتا تھا اور چائے کی دکانوں میں ہزاروں لوگ کھلے عام پولیس کے سامنے اس ریڈیو کا پروگرام سنتے تھے۔

ایک رات جب انور، ملس کے ساتھ تاج میں کھانا کھا رہا تھا تو اس نے بغاوت کے اس جذبے کا ایک عجیب اظہار دیکھا۔ کھانا کھانے والے زیادہ تر لوگ انگریز یا امریکی تھے۔ مرد کالے رنگ کے ڈنر سوٹ اور عورتیں ایوننگ گاؤن پہنے تھیں۔ ان میں کچھ پارسی، اینگلو انڈین اور اکا دکا ایسے ہندوستانی بھی تھے جو اپنے رہن سہن میں بالکل انگریز جیسے تھے۔ اتنے میں ان کے درمیان سے ایک لمبا تگڑا خوب صورت سا نوجوان سفید کھدر کی دھوتی، کرتہ اور گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے گذرا۔ وہ چپ چاپ ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ ہیڈ ویٹر اس کھدر پوش نوجوان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور سینکڑوں آنکھیں اس نوجوان پر آکر جم گئیں جس کے کھدر کے کپڑے کالے کوٹوں کے سمندر میں ایک سفید جزیرے کی طرح چمک رہے تھے۔ انور اپنی پھٹیچر کالی شیروانی کی وجہ سے یوں ہی کچھ گھبرایا ہوا بیٹھا تھا، جب اس نے منیجر کو غصے سے اس نوجوان کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا تو انور نے سمجھا کہ اب وہ کھدر پوش بہت بے عزتی کے ساتھ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن منیجر میز کے پاس پہنچا تو اس کا پورا رویہ ہی بدل گیا۔ وہ بہت جھک کر اور مسکرا کر کہنے لگا، ''ڈنر سر، یس سر، انڈیڈ سر۔'' بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، اور وہ مڑے بغیر ہی قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پاس کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے بتایا ''آپ جانتے ہیں، یہ نوجوان آدمی موہن شاہ ہے۔ اس کے باپ کوئی ایک درجن ملوں کے مالک ہوں گے اور اگر وہ چاہے تو اس ہوٹل کو خرید سکتے ہیں۔''

کھانا کھا کر اس کھدر پوش نوجوان نے بل پر دستخط کیے، ویٹر کو ٹپ دیا، اور ایک سونے کے سگریٹ کیس کا کھٹکا دبا کر اس میں سے بیڑی نکالی اور پلاٹینم کے لائٹر سے اسے جلا کر چل دینے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے دیکھا کہ وہ اپنے بغل میں کاغذوں کا ایک بنڈل لیے ہوئے تھا اور ان کی میز کے پاس سے گذرتے وقت اس نے ایک کاغذ اس طرح گرا دیا جیسے اپنے آپ گر گیا ہو، انور نے جلدی سے وہ کاغذ اٹھالیا۔ وہ سائکلو اسٹائل کیا ہوا کانگریس بلیٹن تھا اور اس کے سامنے والے صفحے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

''پنڈت جواہر لال گرفتار

کل شہر میں زبردست احتجاج اور جلوس''

(10)

انور کو یاد نہیں تھا کہ پہلے اس نے اس لڑکی کو دیکھا یا اس جھنڈے کو جو وہ اٹھائے ہوئے تھی لیکن جلوس میں وہ ہی دونوں سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آ رہے تھے یا شاید وہ دونوں ایک ہی تھے کیونکہ دونوں ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بالکل جھنڈے کی مانند تھی — بہادر اور سیدھی تنی ہوئی۔ ہرے رنگ کا بلاؤز اور گیروے رنگ کے کنارے کی سفید ساڑی پہنے ہوئے وہ خود ایک ترنگا جھنڈا لگ رہی تھی اور وہ اتنی نازک تھی کہ ہوا کے جھونکے سے اس کا بدن ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور جھنڈا بالکل اس کے جیسا تھا — رنگین، لہریئے دار، جاندار چیز، سربلند اور چنچل۔

جھنڈا جلوس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دو والنٹیر اسے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے — ان میں سے ایک داڑھی والا سکھ نوجوان تھا جو سر پر اکالیوں والی پگڑی باندھے تھا (اسے دیکھتے ہی انور کو رتن کی یاد آ گئی جو اس وقت کسی جیل میں پڑا سڑ رہا تھا اور سزائے موت کا انتظار کر رہا تھا) اور دوسرا ایک نوجوان پٹھان تھا جو سلیٹی رنگ کی کھدر کی شلوار اور لال کھدر کی قمیض پہنے تھا۔ اس کے ٹھیک پیچھے جھنڈے کے نیچے خاتون والنٹیرس کی ایک پلٹن چل رہی تھی اور اس پلٹن کی سب سے اگلی قطار میں ''وہ'' تھی۔ ان کے بعد ہزاروں دوسرے

والنٹیرس کی قطاریں تھیں جنھیں فوج کے ڈھنگ سے الگ الگ جتھوں میں بانٹ دیا گیا تھا، ان میں پنجاب کے اکالی اور سرحدی علاقے کے پٹھان 'لال کرتی والے' سب سے زیادہ چمک رہے تھے۔

ہر چیز خاموش تھی۔ سڑکوں پر آمدورفت بند تھی اور صرف دولاکھ پیروں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو ایک لَے پر فوجی انداز سے چل رہے تھے۔ انور کو ایسا لگا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت اور پر اثر نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ سامراج کی طاقت کو جس نے ان کے مقبول لیڈر جواہر لال پر ہاتھ ڈالا تھا، ہندوستانیوں کا جواب تھا۔ یہ بغاوت کے راستے پر بڑھتا ہوا ہندوستان تھا۔ اور اس جلوس کا سارا مقصد جلوس کی اگلی قطار میں چلنے والی اس لڑکی کے چہرے پر جھلکنے والے بغاوت کے پاک جذبے میں سمٹ آیا تھا۔

جلوس کی سب سے پچھلی قطاروں سے طوفان کی گھن گرج کی طرح ایک آواز گونج اٹھی۔ انقلاب زندہ باد! جلوس کے بیچ میں کسی نے اس نعرے کو اٹھالیا اور پھر اسے واپس پیچھے لوٹا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کھیل میں گیند اِدھر سے اُدھر پھینکی جا رہی ہو۔ یہ آواز کرافورڈ مارکٹ کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی اوپر کو اٹھی اور ٹرام کے بجلی کے تاروں کو پار کرتی ہوئی بادلوں سے گھرے آسمان پر چھا گئی۔

ان۔قی۔لاب زندہ باد! سرحدی صوبے کے پٹھان لڑکے 'ق' کی آواز گلے کی گہرائی میں سے اتنی صاف نکالتے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے ہوں۔

اِن۔کِی۔لاب جندہ باد! گجراتی عورتوں نے جن کے بالوں میں چاند کی شکل کے پھولوں کے گجرے لگے ہوئے تھے، باریک آواز میں ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

''اِن ن۔قلاب......'' والنیٹروں کی ایک ٹولی کے کپتان نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نوجوان آوازوں نے ایک ساتھ جواب دیا ''زندہ باد!''

درجنوں طرح کے الگ الگ تلفظ میں موٹی اور پتلی، تیز اور دھیمی آوازوں میں منتر کی طرح پڑھے ہوئے یا میدان جنگ میں لگائے ہوئے نعرے کی طرح ان دو لفظوں نے اس وسیع ہجوم کو جکڑ رکھا تھا۔ جس میں ہندو اور مسلمان، سکھ اور پارسی سب ہی تھے، ان میں گجراتی سیٹھ

بھی تھے اور ملوں کے مراٹھے مزدور بھی، سرحدی علاقے کے گورے پٹھان بھی اور جنوب کے کالے مدراسی بھی۔ انور سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ ''انقلاب'' عربی کا تلفظ تھا اور ''زندہ باد'' فارسی کا۔ لیکن ان دونوں لفظوں نے مل کر ہندوستانیوں کو وہ نعرہ دیا تھا جو ساری دنیا کے مزدوروں کی جدوجہد کا نعرہ تھا— انقلاب زندہ باد! اسے اداس آنکھوں والے نرم دل انقلابی بھگت سنگھ کی یاد آگئی جس نے ملک کو یہ نعرہ دیا تھا اور جو جلد ہی ملک کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے والا تھا۔ اسے میرٹھ کے ان تیس قیدیوں کا خیال آیا جن پر اسی ''انقلاب'' کو لانے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔ جن کا اعلان ان کے لاکھوں ہم وطن کھلے عام کسی بھی سرکاری سزا کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے گاندھی جی کا دبلا پتلا جسم اُبھر آیا جنھوں نے سمندر کے کنارے سے نمک اٹھا کر جو دیکھنے میں بہت ہی چھوٹی بات معلوم ہوتی تھی، سارے ملک میں بغاوت کی لہر پیدا کر دی تھی۔ اسے وہ بات یاد آئی جو جواہر لال نہرو نے سجان کی آٹوگراف بک میں لکھی تھی اور اسے اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سارا ملک ہی ''جان ہتھیلی پر رکھ کر'' نکل پڑا تھا۔ ہر آدمی ''انقلاب'' کو اپنے ڈھنگ سے سمجھتا تھا— گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہر آدمی چرخا چلائے، کمیونسٹ چاہتے تھے کہ اجتماعی کھیت قائم کیے جائیں اور ہزاروں فیکٹریاں کھولی جائیں تاکہ ملک کو صنعتی بنایا جاسکے— لیکن انقلاب تک پہنچنے کے لیے پہلے قدم کے بارے میں سب کی رائے ایک ہی تھی کہ بدیسی سرکار کو نکال باہر کیا جائے۔

(11)

جب جلوس وکٹوریا ٹرمینس کے پاس پہنچا تو کم سے کم ایک ہزار پولیس والوں نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پولیس والے نیلی وردیاں پہنے ہوئے تھے اور ان کے سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیوں کی شکل کی ٹوپیاں تھیں جیسے کان میلیوں کی ہوتی ہیں۔ کچھ کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور کچھ کے رائفلیں، افسروں کے پاس ریوالور تھے۔ ملس نے انور کے کان میں بھاری آواز میں کہا ''اب تماشا دیکھنا'' انور کا دل دھک سے ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر کہیں کچھ ہوگیا تو ''وہ'' تو آگے سب سے پہلی قطار میں ہے، پہلا وار اسی پر پڑے گا۔

ایک پولیس افسر سیدھا عورتوں کے پاس گیا اور اس نے ان سے کہا کہ جلوس غیر قانونی ہے اس لیے سب لوگ فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ عورتوں نے اسے جواب دیا کہ وہ چوراہے کے اس پار آزاد میدان میں میٹنگ کرنے جا رہی ہیں اور کوئی بھی طاقت انھیں واپس نہیں لوٹا سکتی۔ افسر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا کہ وہ انھیں پانچ منٹ کا وقت دے سکتا ہے، اس کے جواب میں عورتیں سڑک پر دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔ کانگریس کے افسر اور جلوس کی رہنمائی کرنے والی عورتوں کے درمیان جن میں 'وہ' بھی شامل تھی، کچھ صلاح مشورہ ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف عورتیں ستیہ گرہ کریں گی اور باقی لوگ خاموشی کے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔ صرف وہ دو لوگ جو جھنڈا لیے ہوئے تھے اور اکالی اور پٹھان والنٹیر باقی رہ گئے اور انھوں نے زمین پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی حفاظت کرنے کے لیے ان کے چاروں طرف ایک گھیرا بنالیا۔

یہ کوئی شام کے چار بجے کی بات ہوگی اور جب سورج ڈوبا اور سڑک کی بتیاں جلیں اس وقت بھی عورتیں وہیں بیٹھی تھیں۔ آس پاس کی چائے کی دکانوں کے مالک ستیہ گرہیوں کے لیے کیتلیوں میں بھر بھر کر چائے اور مٹھائی کے ڈبے بھیج رہے تھے انور کو یہ دیکھ کر ہنسی آگئی کہ کچھ عورتوں نے گھر سے اپنے بچّوں کو منگوالیا اور وہ انھیں وہیں سڑک پر بیٹھ کر دودھ پلا رہی تھیں۔ لیکن پولیس افسروں کو اس میں خوش ہونے کی کوئی بات دکھائی نہیں دی کیونکہ انھیں ابھی تک کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

جب وکٹوریا ٹرمینس کے ریلوے اسٹیشن کے گھنٹہ گھر نے رات کے بارہ بجائے اس وقت عورتیں بہت جوش کے ساتھ گانے گا رہی تھیں۔ ''یہ لوگ آٹھ گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں۔'' رابرٹ ملس نے کہا ''میں سوچتا ہوں دنیا کو اس کی خبر کر دینی چاہیے۔ اور وہ سڑک کی بتّی کے نیچے بیٹھ کر پریس کا تار لکھنے لگا۔ انور نے اس کے کندھے پر سے جھانک کر تار پڑھا اور اس کے پہلے ہی الفاظ پڑھ کر اس کے جذبات میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات کے بارہ بجے بمبئی کی پانچ ہزار عورتیں پچھلے آٹھ گھنٹوں سے سڑک پر دھرنا دیے بیٹھی ہیں۔ وہ نہ صرف ایک ہزار پولیس والوں کا مقابلہ کر رہی ہیں بلکہ ہندوستانی عوام کی طرف سے برٹش سامراج کی عدم تشدد

مخالفت کی نشانی ہیں.....''

بمبئی میں صبح ہو رہی تھی لیکن وہ عورتیں اب بھی وہیں موجود تھیں۔ چودہ گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی ان کے چہروں پر نہ تھکاوٹ تھی اور نہ مایوسی۔ پولیس کے افسروں کی آنکھیں رات بھر نہ سونے کی وجہ سے لال ہو رہی تھیں اور وہ جھنجھلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک افسر نے ایک بار پھر ان عورتوں کے پاس جا کر انھیں تاکید کی کہ وہاں سے ہٹ جائیں نہیں تو.....عورتوں نے اس کے جواب میں ایک بغاوت بھرا گیت گانا شروع کر دیا۔

نہیں رکھنی، نہیں رکھنی

سرکار ظالم نہیں رکھنی!

صبح آٹھ بجے جب انور دوسرا تار دینے تار گھر گیا تو وہاں سے ایک تار لایا بھی۔ جو پہلے تار کے جواب میں آیا تھا۔ اس تار میں لکھا تھا:

''مبارک ہو! بمبئی کی عورتوں والی خبر نے سنسنی پیدا کر دی ہے۔ سب اخباروں میں پہلے صفحے پر چھپی۔ اگر مظاہرہ جاری رہے تو دو دو گھنٹے بعد تار بھیجنا۔''

ایک اینگلو انڈین سارجنٹ جو دیکھنے سے ہی جھنجھلایا ہوا معلوم ہوتا تھا، ان کے پاس آ کر زور سے بولا ''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' جواب میں ملس نے اسے نیویارک سے آیا ہوا وہ تار تھما دیا جسے دیکھ کر سارجنٹ کا منہ فوراً اتر گیا۔ وہ ان کے پاس سے چلا گیا اور جا کر سڑک پر جمع ہوتی ہوئی بھیڑ پر چلانے لگا۔ وہ ان پر چلاتا، انھیں گالیاں دیتا اور ڈنڈے سے انھیں دھمکاتا، پر بھیڑ اس کی ان حرکتوں پر ہنس دیتی جس سے اسے اور غصہ آتا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ملس نے تار پر لکھا ''دیویو، دنیا کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔'' اور ایک والنٹیر کے ہاتھ وہ تار سڑک پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس بھیج دیا۔ ان دونوں نے دیکھا کہ آن کی آن میں خبر ساری عورتوں کے پاس پہنچ گئی اور ان کے چہرے خوشی اور قوت ارادی سے چمک اٹھے۔ انور نے کہا ''اب اس کے سہارے وہ کم سے کم کچھ گھنٹے اور جمی رہیں گی۔''

لیکن اتنے میں پانی برسنا شروع ہو گیا۔ مانسون کا پہلا چھینٹا اور ایسا لگا کہ پانی کا چھینٹا پڑتے ہی پولیس والوں کی پست ہمتی اور جھنجھلاہٹ دور ہو گئی اور ان میں نیا جوش آ گیا۔ اپنی

برساتیاں پہنے یا چھتریاں لگائے وہ عورتوں کو موسلادھار بارش میں بھیگتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ امید لگائے ہوئے تھے کہ کسی بھی وقت عورتیں گھبرا کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑک پر کئی کئی انچ پانی بھر گیا لیکن عورتیں اسی پانی میں بیٹھی رہیں۔ ساری عورتیں سر سے پاؤں تک بھیگ چکی تھیں اور ان کی گیلی ساڑیاں بدن سے چپکی جا رہی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ انور اس بات پر بہت شرمندہ ہوا کہ ایسے وقت میں وہ گیلی قطاروں والی اس لڑکی کے سڈول جسم کو اپنی ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پانی پھٹ پھٹ کر برستا رہا، یہاں تک کہ بادل کا سارا پانی ختم ہو گیا۔ اتنے عرصے میں پولیس والوں کی ہمت بھی ٹوٹ چکی تھی۔ موسلا دھار بارش کم ہوتی گئی۔ اب صرف پھوار پڑ رہی تھی اور جب شام کے چار بجے اور آسمان پر سے بادل چھٹ گئے اس وقت بھی عورتیں سڑک پر بیٹھی تھیں۔ ''چوبیس گھنٹے!'' ملس نے کہا ''ان لوگوں نے تو ریکارڈ توڑ دیا۔ میں جا کر ایک اور تار دے دوں، انور، تم یہیں ٹھہرنا اور دیکھتے رہنا کہ کیا ہوتا ہے میں ایک گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔''

جب ساڑھے چار بجے تو پولیس کے افسر قابو سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے آخری بار وارننگ دی کہ اگر عورتیں پانچ منٹ کے اندر وہاں سے نہیں ہٹیں تو انھیں ''مجبور ہو کر'' لاٹھی چارج کرنا پڑے گا۔ سیٹیاں بجیں اور پولیس والے اپنی اپنی جگہوں پر لاٹھیاں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سڑک پر لاٹھیاں پٹک پٹک کر دیکھ رہے تھے کہ وہ کتنی مضبوط ہیں۔ اکالی اور پٹھان والنیٹروں نے عورتوں کے چاروں طرف گھیرا بنا لیا۔ جھنڈا پکڑنے والوں نے پھر آگے بڑھ کر جھنڈا لہرا دیا جو بارش سے بچانے کے لیے لپیٹ لیا گیا تھا۔ پانچ منٹ گذرتے ہی ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے گونجتے ہوئے نعرے نے خاموشی کو کانچ کی طرح توڑ دیا۔

(12)

اور پھر لاٹھیاں برسنے لگیں۔

انور نے لاٹھی چارجوں کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا لیکن اس کے لیے وہ دوسرے حادثوں کی طرح ہی ایک حادثہ تھے — انھیں وہ برا ضرور سمجھتا تھا لیکن ان کے ساتھ اس کا کبھی

کوئی براہ راست تعلق نہیں رہا تھا۔لیکن اس وقت اس نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے بارے میں وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔لاٹھی کی ہر مار کسی سر پر یا سینے پر یا پیٹھ پر یا ٹانگ پر پڑتا تھا اور یہ کوئی انسان ہوتا تھا۔گوشت پوشت کے بدن والا انسان جس کی ہڈیاں ٹوٹ سکتی تھیں، جس کا خون بہہ سکتا تھا۔ان میں سے ہر ایک کسی کا بیٹا یا بھائی، کسی کا دوست یا ساتھی، کسی کا شوہر یا عاشق تھا۔لاٹھی کے ہر وار کے پیچھے ایک کہانی تھی— مصیبتیں جھیلنے اور بہادری کے ساتھ لڑنے کی کہانی۔یہ والنٹیئر — یہ اکالی اور پٹھان، گجراتی اور مراٹھے— آخر کس چیز کے بنے تھے کہ وہ بے رحمی سے چلائی جانے والی لاٹھیوں کی مار کھاتے رہتے تھے پر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، وہ ذرا بھی نہیں ہچکتے تھے، وہ اپنا منہ بھی نہیں پھیرتے تھے؟ وہ سیدھے سادے معمولی لوگ تھے— کلرک، طالب علم، دکاندار اور مزدور— لیکن وہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ بھی ہیرو بن سکتے ہیں......

بیسیوں زخمی اور بے ہوش ہوکر گر رہے تھے اور انھیں فوراً اسٹریچروں پر اٹھا کر پاس ہی کھڑی ایمبولنسوں پر پہنچا دیا جاتا تھا۔یہ سچ مچ کی لڑائی تھی— لیکن عجب لڑائی تھی جس میں مارنے کا سارا کام ایک طرف والے کرتے تھے اور دوسری طرف کے لوگ صبر کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے جاتے تھے۔انور نے دیکھا کہ ایک تگڑے پٹھان کے سینے پر لگاتار لاٹھیاں پڑ رہی تھیں اور ہر وار پڑتے ہی وہ زور سے نعرہ لگاتا تھا، یہاں تک کہ پولیس والے نے جھنجھلا کر اس کی کھوپڑی پر وار کیا۔پٹھان چکر کھا کر گر پڑا۔اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر اس کے گرتے ہی اس کی جگہ ایک سکھ نے لے لی اور اس بار پولیس والے نے چھوٹتے ہی اس کے سر پر وار کیا۔ایک گجراتی والنٹیئر اسٹریچر لے کر اس کی طرف لپکا لیکن پولیس والے کے سر پر تو خون سوار تھا، اس نے ایک لاٹھی اس کے بھی رسید کردی۔کچھ دیر بعد دوسرے اسٹریچر پر انھیں وہاں سے لے جایا گیا تو انور نے دیکھا کہ جہاں وہ تینوں گرے تھے وہاں خون کا ایک بہت بڑا دھبہ تھا......

والنٹیئروں کی تعداد کم ہوتی گئی اور جو تھوڑے بہت بچ گئے تھے انھیں کبھی بھی مار گرایا جاسکتا تھا۔ایسی حالت میں عورتوں نے آگے بڑھ کر ان نوجوان لڑکوں کی حفاظت کرنے کے لیے ان کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔ادھیڑ عمر کی ایک گجراتی عورت خون دیکھ کر بالکل پاگل ہو اٹھی تھی

اور وہ لگاتار چیخ چیخ کر یہی کہہ رہی تھی ''مارو اور مارو، مجھے مار ڈالو۔'' ایک پل کے لیے تو پولیس والوں نے شرمندہ ہو کر اپنے ہاتھ روک لیے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ عورتیں پکے ارادے کے ساتھ میدان کی طرف بڑھ رہی ہیں تو وہ ان پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑے۔ وہ عورت جو پہلے چلا رہی تھی اس کی ٹانگ پر ایک لاٹھی پڑی اور وہ ٹرام کی پٹری پر گر پڑی، لیکن وہ اب بھی یہی چلا رہی تھی ''مارو، مار ڈالو مجھے۔'' اتنے میں کچھ زیادہ جوشیلی لڑکیاں اور وہ دونوں والنٹیر جو جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا، پولیس کا گھیرا توڑ کر میدان میں جا پہنچے تھے۔ انور لپک کر وہاں پہنچا اور اس نے دیکھا کہ عورتیں جھنڈے کے چاروں طرف زمین پر بیٹھی تھیں اور وہ دبلی پتلی لڑکی ان کے سامنے تقریر کر رہی تھی۔ اس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ بغاوت کے جذبے سے بھر پور معلوم ہوتی تھی۔ تو انھوں نے آخر کار پولیس کو نیچا دکھا کر اپنی میٹنگ کر ہی لی تھی۔

یہ دیکھ کر پولیس پاگل ہو اٹھی اور بھاگ کر وہاں جا پہنچی اور ان دونوں والنٹیروں پر ٹوٹ پڑی جو جھنڈا لیے ہوئے تھے۔ وہ پٹھان اور اکالی بہادری سے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور مضبوطی سے جھنڈا اونچا کیے رہے لیکن پولیس نے بھی بڑی چالاکی سے پہلے تو ان کی ٹانگوں پر لاٹھیاں ماریں اور جب انھوں نے گر پڑنے کے بعد بھی جھنڈے کو نیچا نہ ہونے دیا تو پولیس والوں نے ان کے ہاتھوں پر لاٹھیاں مارنی شروع کیں۔ اتنے میں ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ لاٹھی نے کسی کی کلائی توڑ دی تھی۔ جھنڈا ڈگمگا کر زمین پر گرنے لگا۔ گورے سارجنٹ کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

لیکن جھنڈے کو گرنے نہیں دیا گیا۔ جو لڑکی تقریر کر رہی تھی اس نے لپک کر جھنڈے کو تھام لیا اور اسے اتنی مضبوطی سے کس کر پکڑ لیا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں کی انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے۔ وہ پولیس والوں کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ پلک مارتے میں ہو گیا۔ ایک سپاہی نے اپنی لاٹھی اٹھا کر ہوا میں ہی روک لی۔ ایک لڑکی پر وار کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ ایک گورے سارجنٹ نے گرج کر کہا ''جھنڈا چھوڑ دو'' لیکن جب اس کے جواب میں لڑکی نے ''مہاتما گاندھی کی جے'' کا نعرہ لگایا تو وہ سارجنٹ آپے سے باہر ہو گیا اور پولیس والے کی لاٹھی چھین کر اس کی طرف جھپٹا، اس کا چہرہ غصے کے مارے مسخ ہو گیا تھا۔ اس

پل میں انور کو کچھ ہو گیا۔ اس نے اپنی فطری بزدلی، اہنسا میں اپنا عقیدہ اور اپنے آپ پر قابو سب کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے سانپ اپنی کینچلی اتار دیتا ہے۔ اس کے دماغ پر بس ایک ہی خیال چھایا ہوا تھا۔ اس لڑکی کو کوئی ہاتھ نہ لگانے پائے، کیونکہ اس وقت اس کی نظروں میں وہ صرف ایک لڑکی نہیں تھی بلکہ جھنڈے کی عزت تھی، ہندوستان کی روح تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے لال پیلے دھبے ناچنے لگے اور دیوانوں کی طرح وہ سارجنٹ پر ٹوٹ پڑا۔

اس کی پیٹھ پر لاٹھی کا جو پہلا وار پڑا وہ سب سے خطرناک تھا۔ اس کے سارے جسم میں درد کی لہریں دوڑ گئیں اور جب اس کے کندھے پر دوسرا وار پڑا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ لیکن اس نے اپنے دانت بھینچ کر آنسو روک لیے۔ ''نہیں، ہرگز نہیں، میں ان لوگوں کے سامنے اور اس کے سامنے بزدلی کا ثبوت نہیں دوں گا۔ میں ان سارجنٹوں اور پولیس والوں کو اپنا مذاق نہیں اڑانے دوں گا۔'' اس نے اپنے دانت ہونٹوں میں گڑا لیے اور جب اس کی پیٹھ پر، ٹانگوں پر اور بانہوں پر لگاتار لاٹھیاں پڑنے لگیں تو اسے خود اپنے خون کا مزا معلوم ہوا لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اسے اب اتنا درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ لوگ اگر مجھے مارتے مارتے اپنی لاٹھیاں بھی توڑ دیں تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مارنے دو، مارنے دو۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ وہی سارجنٹ اس کی طرف وہی لاٹھی لیے ہوئے جھپٹا چلا آ رہا ہے جس سے اس نے اس لڑکی کو مارنے کی کوشش کی تھی اور جیسے ہی لاٹھی ہوا میں گھومی اسے ایک لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور اس نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا تو اسے لڑکی کی آنکھوں میں ایک خوف دکھائی دیا، لیکن وہ ابھی ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین آ کر اس کے ماتھے سے ٹکرائی اور اس کی آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے اور پھر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

○

شیر جب بھوکا ہوتا ہے

(1)

ہلکے ہلکے درد کی بے ہوشی میں انور نے اَدھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ چار دن تک اسپتال کے نظارے دیکھنے، اسپتال کی آوازیں سننے اور اسپتال کی بدبوئیں سونگھنے کے بعد — وہی سفید دیواریں کبھی نہ ختم ہونے والی پلنگوں کی دوہری قطاریں، زخمی لوگوں کی آہیں اور کراہیں اور ہر طرف فینائل کی تیز بو — ان تمام چیزوں کے درمیان اسے بس ایک نظر دیکھ لینا ہی انور کے لیے "ٹانک" ثابت ہوا۔

انور کو بے ہوشی کی حالت میں لوگوں نے اسٹریچر پر کانگریس اسپتال پہنچا دیا تھا۔ لاٹھی چارج کے بعد اسے اس میدان میں اسی حالت میں پڑا پایا گیا تھا۔ جب اس کی بے ہوشی ٹوٹی، اس وقت تک اس کے سر کے زخم میں ٹانکے لگ چکے تھے اور پٹی باندھی جا چکی تھی اور یہ سمجھنے میں اسے کچھ نہ دیر لگی کہ اس کے سر میں جو سخت درد ہو رہا تھا اس کا پچھلی شام کے واقعات کے ساتھ بھی کچھ تعلق تھا۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہر بار جب وہ گہری سانس لیتا تھا تو اس کے سینے میں درد کیوں ہوتا تھا۔ اس نے نوجوان کھدر پوش ڈاکٹر سے جب یہ بات کہی تو اس نے یہ بتایا کہ شاید بے ہوش ہونے کے بعد اسے ایک لاٹھی اور جڑ دی گئی ہو لیکن اس وقت اسے

آتا دیکھ کر اس کا سارا درد دور ہو گیا۔

چوٹ کے درد سے زیادہ وہ اکیلے پن کا درد محسوس کر رہا تھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے اسپتال کا وہ عجب اکیلا پن جہاں زیادہ تر بیمار یا تو بے ہوش تھے یا انھیں اتنی سخت تکلیف تھی کہ وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے ہی وہ چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کے لائق ہوتے تھے وہ ''مورچے'' پر سے زخمی ہو کر آنے والے دوسرے لوگوں کے لیے جگہ خالی کر کے اسپتال سے چلے جاتے تھے۔ لڑائی اب بھی پورے زور پر جاری تھی۔ انور کے داہنی طرف والے پلنگ پر ایک بہت دبلا پتلا گجراتی لڑکا تھا جس کا رنگ بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ جب والینٹرا سے اٹھا کر لائے اس وقت تک اس کے سر کی چوٹ سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ ڈاکٹروں نے اس کے بچنے کی امید چھوڑ دی تھی لیکن قوت ارادی کا معجزہ کہیے کہ وہ بچ گیا حالانکہ اس کا چہرہ بالکل مردوں جیسا ہو گیا تھا۔ اور اسپتال آنے کے بعد سے اس نے ابھی تک آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ انور کے پلنگ کی دوسری طرف ایک لمبا تگڑا کالی داڑھی والا سکھ تھا اور اسے دیکھ کر انور کو رتن کی پھر یاد آئی جس پر لاہور میں مقدمہ چل رہا تھا۔ انور کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس سے باتیں کرے لیکن اس سکھ کے جسم کے ہر حصے پر چوٹ لگی تھی اور اسے بہت تیز بخار تھا اور وہ لگاتار بے ہوشی میں بڑبڑاتا رہتا تھا۔ وہ گالیاں دیتا تھا، نعرے لگاتا اور کبھی کبھی پنجابی میں چلانے لگتا اور انور اس کی باتوں کا کچھ بھی مطلب سمجھ نہیں پاتا۔ ''مارو اور مارو، سُور دے پتر دا'' وہ کبھی کبھی بڑبڑاتا اور کبھی کبھی چلا پڑتا ''سُور و، میں تمھارے سر توڑ دیتا لیکن میں مہاتما جی کو وچن دے چکا ہوں، میں وچن دے چکا ہوں کہ میں پلٹ کر نہیں ماروں گا، میں وچن دے چکا ہوں.....'' اس کی آواز دھیرے دھیرے بالکل ڈوب جاتی اور انور اپنا درد بھول کر یہ سوچنے لگتا کہ سکھوں اور پٹھانوں جیسے جوشیلے اور لڑاکو لوگوں کے لیے یہ کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ مارتے مارتے ان کی ہڈی پسلی ایک کر دی جائے پھر بھی وہ اہنسا پر ڈٹے رہیں جب کہ خود اس کے جیسا فطرتاً ڈرپوک آدمی بھی پلٹ کر مارنے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔

ملاقات کے گھنٹوں میں رابرٹ ملس اسے دیکھنے آیا تھا — بے چارہ انور کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ پولیس والوں نے انور کو جو چوٹ پہنچائی تھی اس کے

لیے ذاتی طور پر وہ خود ذمہ دار ہے۔ وہ خبر لایا تھا کہ ولایتی کپڑے کے گودام پر دھرنا دینے کے لیے والینٹروں کی ایک ٹولی کو لے جاتے ہوئے عثمان کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اکیلے رہ جانے کی وجہ سے اب ملس کو اس انوکھی لڑائی کے مختلف ''مورچوں'' کی خبریں جمع کرنے کے لیے زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی اور یہ لڑائی بھی روزانہ زور پکڑتی جارہی تھی۔ انور ملس کے کام کی اہمیت سمجھتا تھا اور اس لیے اس نے منع کر دیا کہ وہ بار بار اسپتال آنے کی فکر نہ کیا کرے۔

انور اسی طرح اسپتال میں لیٹا لیٹا چھت کے ٹائل گنتا رہتا تھا یا کھڑکی میں سے سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا اور رات کے وقت چوروں کی طرح سلمٰی کی یاد اس کے دل میں آتی تھی اسے تسلی دینے کے لیے نہیں بلکہ اسے ستانے کے لیے۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ اس کے دل کا خالی پن اس کے سر کے زخم یا اس کے سینے کی چھپی ہوئی چوٹ سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔

اتنے میں وہ آئی۔ کیروے رنگ کی گوٹ لگی ہوئی کھدر کی سفید ساڑی اور ہرا بلاؤز پہنے ہوئے وہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ انور کو دل ہی دل میں اس آدمی سے حسد ہو رہا تھا جس سے ملنے وہ آئی تھی لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اسے ہی کھوج رہی تھی۔ انور کو یقین نہیں آیا۔

''ہیلو'' اس نے کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ انور کا استقبال کیا، جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میری جان نہ بچتی۔''

انور خوشی کے مارے بالکل دیوانہ ہو گیا۔ اس نے دبی زبان میں کچھ اس طرح کی بات کہی کہ یہ تو اس کا فرض تھا۔

''اچھا، اب آپ کیسے ہیں؟ چوٹ تو بہت بری آئی تھی لیکن اب تو آپ ٹھیک ہیں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے اس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی پر اتنی نرمی سے پیار کے ساتھ ہاتھ پھیرا کہ انور کو نہ جانے کیوں درد کم معلوم ہونے لگا۔ وہ اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی، اور اس کے بالوں کی خوشبو انور کو مدہوش کرنے لگی۔

''کس بات پر مسکرا رہے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں، بس یوں ہی غالب کا ایک شعر یاد آ گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے وہ شعر پڑھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

''غالب؟''

''ہاں، ایک شاعر تھے جو مجھے بہت پسند ہیں۔''

''کیا کہا ہے انھوں نے؟''

اس کے اس بیباک دوستانہ رویے کو دیکھ کر انور کی ساری ہچکچاہٹ دور ہو گئی اور اس نے شعر پڑھ کر سنایا۔

''ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے''

اور پھر اس کا مطلب سمجھاتے ہوئے کہا ''اس کا مطلب ہے کہ تمھیں دیکھ کر کوئی بھی بیمار اپنے آپ کو بھلا چنگا محسوس کرے گا۔''

انور کا خیال تھا کہ اس طرح کھلی تعریف پر وہ جھینپ جائے گی لیکن وہ ہنس دی۔

''مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کو اپنے گھر لے جانے کے لیے آئی تھی۔''

(2)

انور اس بڑی پیلی موٹر میں اس اجنبی لڑکی کی بغل میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا جس نے بنا کسی تکلف کے اس سے دوستی کر لی تھی۔ لڑکی خود موٹر چلا رہی تھی۔ جلوس میں تو وہ جھنڈے کی طرح ہی ایک نشانی تھی۔ اب جا کر انور نے پہلی بار اسے ایک شخصیت کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم دبلا پتلا تھا۔ اس نے اپنے کالے چمکدار بالوں کو بیچ سے مانگ نکال کر پیچھے کس کر ایک جوڑا باندھ رکھا تھا جس میں اس نے چنبیلی کے پھولوں کا گجرا لگا رکھا تھا۔ اس کی ناک پر بچّوں کی طرح چتیاں پڑی ہوئی تھیں اور جب بھی وہ مسکراتی تھی تو اس کے دونوں گالوں میں گڈھے بن جاتے تھے۔ بمبئی میں ہر آدمی کی طرح اس کا رنگ بھی پیلا اور پھیکا تھا اور انور کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ پاؤڈر، سرخی یا لپ اسٹک نہیں استعمال کرتی تھی۔ وہ کسی بھی اعتبار

سے بہت خوب صورت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں جنسی کشش تھی جیسے کہ سلمٰی کا سارا جسم جنسی کشش رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کے صاف ستھرے، دبلے پتلے، جوان جسم میں، اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک میں، اس کے بات کرنے کے خوش مزاج، بے جھجک اور سیدھے سادے ڈھنگ میں اور جس خود اعتمادی کے ساتھ اور موٹر چلا رہی تھی اس میں، کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کی وجہ سے اس کی شخصیت دل کو ایک دم اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

''آپ جانتی ہیں میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتا؟'' انور نے کہا جب کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور کی طرح اپنی کار کو کرافورڈ مارکٹ کی بھیڑ میں سے نکال لے جا رہی تھی۔

''ہاں، میں جانتی ہوں'' اس نے جواب دیا اور اس کے گالوں میں گڈھے پڑ گئے۔ اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''نام تو میں بھی نہیں جانتی آپ کا۔ چلیے دونوں برابر ہو گئے۔''

پھر مضبوطی سے اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر اس نے مڑ کر انور کی طرف دیکھا۔ موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے چھوٹے دانتوں کی جھلک دکھاتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام آشا ہے، آشا شاہ، اور آپ کا؟''

''انور علی''۔

اس کا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر ذرا سا سرک گیا اور انور کو اس کی آواز میں تعجب کے ساتھ ہی کچھ مایوسی کا بھی احساس ہوا، جب اس نے کہا ''تو آپ مسلمان ہیں!''۔

اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں تھی پھر بھی انور نے کچھ چڑ کر کہا۔ ''جی ہاں، میں مسلمان ہوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

ایک پل کے لیے وہ جھجکی پھر سنبھل کر موٹر چلانے لگی اور چوراہے پر بڑے اطمینان کے ساتھ موٹر گھماتے ہوئے اس نے ہنس کر کہا ''جی نہیں، مجھے کیوں اعتراض ہوگا؟ میرے کچھ بہت اچھے دوست مسلمان ہیں۔ مجھے کچھ تعجب ضرور ہوا کیونکہ دیکھنے میں آپ مسلمان لگتے نہیں۔''

انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کوئی تعریف کی بات ہے یا نہیں، اس لیے اس نے بات چیت کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ''ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' کیونکہ موٹر فورٹ کے علاقے میں بازار کی طرف جا رہی تھی۔

''پہلے تو میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔'' اس نے سیدھا سادہ جواب دیا۔ ''کانگریس اسپتال کے ڈاکٹر ابھی نئے نئے ہیں اور انھیں زیادہ تجربہ بھی نہیں ہے۔ پھر انھیں اتنے بہت سے لوگوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے کہ وہ کسی کا خاص خیال نہیں رکھ سکتے۔ ان لوگوں نے آپ کے زخم کو تو ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے لیکن ہاؤس سرجن نے مجھے بتایا کہ اسے آپ کے سینے کی چوٹ کے بارے میں اطمینان نہیں ہے، اس لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی اسپیشلسٹ کو دکھاؤں۔''

وہ اسپیشلسٹ ایک بہت ہی خوش مزاج بوڑھا پارسی ڈاکٹر تھا۔ انور نے دیکھا کہ وہ بھی کھدّر کے کپڑے پہنے تھا۔ ڈاکٹر نے انور کا سینہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پسلیوں پر آلہ رکھ کر بڑے غور سے اس کے دل کی دھڑکن سنی اور یکایک اس کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہوئے۔

''خاصی بری طرح پٹائی ہوئی ہے تمھاری'' ڈاکٹر نے جانچ کرنے کے بعد کہا۔ ''لیکن پھر بھی تمھارے سینے کی جو بری حالت ہے وہ پٹائی کی وجہ سے نہیں ہوسکتی۔'' اور پھر اچانک اس نے پوچھا ''تمھارے باپ کو سینے یا پھیپھڑوں کی کوئی بیماری نہیں تھی — بران کائٹس، دمہ، نمونیہ، ٹی۔ بی وغیرہ؟''۔

جہاں تک انور کو یاد تھا اس نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے ابا کی کسی بیماری کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں بھی وہ سیدھے تن کر چلتے تھے اور ان کے گالوں پر ابھی بھی لالی تھی جو اچھی تندرستی کی نشانی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ بچپن میں اچھا گھی کھانے اور خالص دودھ پینے سے ہی ان کی اتنی اچھی صحت تھی۔ انور نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ابا کی تندرستی کے بارے میں بتایا اور بوڑھے ڈاکٹر صاحب کو اس بات پر سچ مچ بہت تعجب ہوا۔ پھر انھوں نے انور سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا اور انور کو یہ بتانا پڑا کہ اسے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ وہ تو اس کے پیدا ہوتے ہی مرگئی تھیں۔

''ممکن ہے ان ہی کے خون کا اثر ہو۔'' ڈاکٹر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ عام طور پر یہ باپ کے ہی خون کا اثر ہوتا ہے......'' یہ کہہ کر وہ میز پر بیٹھ گئے اور انور کے لیے طاقت کی کچھ دوائیاں لکھنے لگے۔ ''ان سے تم ہفتے بھر میں ٹھیک ہوجاؤ گے لیکن تمھیں بہت خیال

رکھنا چاہیے، تمھارا دل اور سینہ بہت کمزور ہیں، سردی سے بچو اور اچھا اور طاقت دینے والا کھانا کھاؤ۔ انڈے، دودھ اور ہری سبزیاں اور صبح اٹھ کر روز کھلی ہوا میں گہری سانس لیا کرو۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ عام طور پر تمھارا علاج کون ڈاکٹر کرتا ہے؟ کیا تمھارے گھر کا کوئی بندھا ہوا ڈاکٹر ہے؟''

انور نے ڈاکٹر انصاری کا نام بتایا۔

''اوہ، انصاری! بہت ہی عمدہ ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت اچھے ہیں، میرے ساتھ انڈیا میں پڑھتے تھے، ان سے اچھا ڈاکٹر ملنا مشکل ہے لیکن جب تک وہ جیل ہیں تب تک اپنی صحت کا خیال رکھنا۔''

انور نے ہمت کر کے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی جیل جانا چاہتا ہے مگر ڈاکٹر اسے اس بات کی اجازت دینے کو بالکل تیار نہیں تھے''بیکار کی باتیں نہ کرو۔'' انھوں نے بگڑ کر کہا۔ ''انصاری بھی تمھیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتے'' پھر وہ آشا سے مخاطب ہو کر بولے۔'' آشا، اپنے دوست کا خیال رکھنا اور اسے کسی ہنگامے میں نہ پھنسنے دینا۔ اچھا اب تم لوگ جاؤ۔ باہر بہت سے مریض انتظار کر رہے ہیں۔ اور اپنے پاپا اور ممی سے میرا اسلام کہنا نہ بھولنا، آشا''۔

''ڈاکٹر جمشید جی بہت ہی پیارے آدمی ہیں، ہے نا؟'' آشا نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ٹھیک ہی ہیں'' انور نے کچھ چڑ کر کہا۔ ''لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا کہ مجھے بیمار سمجھا جائے۔'' پھر یکا یک اسے احساس ہوا کہ آشا نے اتنے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اس پر جو احسان کیا تھا اس کا وہ شکریہ ادا نہیں کر رہا ہے، اس لیے اس نے کہا ''میری بات کا برا نہ ماننا جب سے ڈاکٹر انصاری نے مجھے جیل جانے سے منع کیا ہے تب سے مجھے ڈاکٹروں سے چڑ ہو گئی ہے''۔

(3)

''میں اپنی ماں کو لے لوں، تمھیں کوئی جلدی تو نہیں ہے؟'' آشا نے موٹر کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ''جب سے انھوں نے سنا ہے کہ تم نے کس طرح پولیس کی لاٹھیوں سے مجھے بچایا ہے، اس دن سے وہ تم سے ملنے کو بہت بے چین ہے۔ اصل میں اس نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھیں گھر لے آؤں۔ تمھیں میری ماں بہت اچھی لگے گی۔''

انور نے حامی بھری۔

''ہاں، تمھیں میری ماں تو اچھی لگے گی لیکن شاید پاپا اچھے نہ لگیں'' آشا کی آواز میں کچھ کھسیانا پن تھا۔

انور نے پوچھا کہ اس کے پاپا میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ اچھے نہ لگیں۔

''معلوم نہیں'' آشا نے بھیڑ میں سے موٹر نکالتے ہوئے جواب دیا'' کہہ نہیں سکتی۔ ایک بات تو یہ کہ وہ کانگریسی نہیں ہیں اور اس تحریک سے خوش نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ پونجی پتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ تم سرمایہ داری کو پسند نہیں کرتے، میں بھی نہیں کرتی خیر چھوڑو، کچھ اور باتیں کریں، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

انور نے کہا کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ تو کیا بتا سکتا ہے، علاوہ اس کے کہ وہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا اور اسے اس ایک میٹنگ میں آزادی کی قسم پڑھ کر سنانے کے جرم میں یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا تھا اور پھر کچھ دن بیمار رہنے کے بعد وہ امریکی جرنلسٹ رابرٹ ملس کے ترجمان کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ پھر انور نے آشا سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بی۔ اے کے پہلے سال میں پڑھتی تھی جب گاندھی جی نے آزادی کی تحریک کے لیے سارے ملک کو للکارا تو وہ بھی پڑھائی چھوڑ کر والینٹر بن گئی۔ ''ہزاروں لڑکیاں والینٹروں میں بھرتی ہوئی ہیں لیکن ان میں سب سے بہادر صفیہ سوم جی ہے جو آج کل جیل میں ہے۔ جیسا کہ تمھیں اس کے نام ہی سے پتہ چلتا ہوگا وہ مسلمان ہے۔ وہ میری بہت گہری دوست ہے۔'' انور نے دیکھا کہ آشا نے آخری بات بہت زور دے کر کہی تھی۔

موٹر بھنڈی بازار کی مسلم بستی سے ہوکر بائیکلہ برج پار کر کے لال باغ کی طرف چلی جارہی تھی۔ ان کے سامنے ملوں کی اونچی چمنیاں سر اونچا کیے کھڑی تھیں اور ان سے دھواں نکل کر آسمان پر پھیل رہا تھا۔ سڑک پہلے سے بہت خراب تھی۔ فٹ پاتھ بھی بہت میلے اور گندے تھے اور لوگ بھی میلے کچیلے دکھائی پڑتے تھے۔ وہ چھ سات منزلہ عمارتوں کے بیچ سے ہوکر گذر رہے تھے جن میں لوگ شہد کی مکھیوں کے چھتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں رہتے تھے۔ ہوا میں پٹرول، چمنیوں کے دھوئیں، ناریل کے تیل، سڑتی ہوئی کھلی نالیوں اور پسینے کی ملی جلی بوبسی

ہوئی تھی۔ آشا نے اپنا سینٹ سے مہکتا ہوا رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ پھر موٹر بائیں طرف مڑی اور ریل کا پل پار کر کے ایک پتلی سے گلی میں گھسی اور راستے کے بیچوں بیچ پڑے ہوئے کچرے کے ڈھیر کے پاس جاکر رک گئی۔ فٹ پاتھ پر جو پان کی پیک اور کیلے کے چھلکوں سے بے حد گندا تھا بہت سے بے گھر لوگ سو رہے تھے۔ یہاں کی عمارتیں تو بڑی سڑک پر بنی ہوئی چالوں کی طرح اونچی بھی نہیں تھیں، جن کے بیچ سے ہو کر وہ ابھی آئے تھے۔ دومنزلہ مکان جو پرانے ہو کر بالکل گرنے ہی والے تھے اور جن پر بننے کے بعد سے کبھی رنگ وروغن نہیں ہوا تھا، اس طرح ایک دوسرے سے لگے ہوئے تھے جیسے شرابی ایک دوسرے کا سہارا لیے کھڑے ہوں۔ اور ان مکانوں کے چاروں طرف غریبوں کے زیادہ غریب رشتہ داروں کی طرح ٹین کی چھتوں والی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کا ایک جھرمٹ تھا جو لکڑی کے پرانے صندوقوں کی لکڑی، ٹوٹے پھوٹے ٹین کے ٹکڑوں اور ٹاٹ کے چیتھڑوں سے بنائی گئی تھیں، ان میں ایک جھونپڑی ایسی بھی تھی جو ایک چھوٹے سے تنبو کی شکل کی تھی اور جس کی چھت کسی سینما کے پرانے بورڈ کے پرانے کپڑے سے بنائی گئی تھی۔ کپڑے پر تصویر کے رنگ بہت کچھ دھوپ سے اڑ گئے تھے۔ مگر اس میں مشہور ''دل کی رانی'' کی شکل اب بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔ بہت سے دبلے پتلے، سوکھی ٹانگوں والے ننگے بچے سڑک پر اور نالیوں میں کھیل رہے تھے اور سڑک کے نل کے پاس عورتوں کی بھیڑ جمع تھی کیونکہ اس پورے علاقے میں یہی ایک نل تھا اور اس میں بھی پانی بہت پتلی دھار سے آتا تھا۔

''یہ ہیں وہ گندی بستیاں جن پر ہمارے شہر کو اتنا ناز ہے'' آشا نے انور کو چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے دیکھ کر بڑے طنز اور کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں، لیکن ہم لوگ تو تمھاری ماں کو لینے جا رہے تھے؟''

''چلیں گے، لیکن میں نے تمھیں یہ دکھانے کے لیے ہی موٹر روکی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے موٹر پھر اسٹارٹ کر دی اور انور کو یہ دیکھ بہت تعجب ہوا کہ اب موٹر پہلے سے بھی پتلی اور گندی گلی میں گھس رہی تھی جو ریل کی پٹری کے کنارے تاڑ کے پیڑوں کے جھرمٹ میں جا کر ختم ہوگئی تھی۔ اتنے میں اچانک بارش شروع ہوگئی اور انھیں موٹر کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا لینے پڑے۔ انور کی سمجھ میں اب بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آشا کی ماں کو لینے ایسی گندی جگہ کیوں آئے تھے اور

اس نے یہ بات آشا سے کہہ بھی دی جواب میں آشا نے صرف ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا جو پھوس کے چھپر والی دوسری جھونپڑیوں جیسی ہی لگتی تھی۔ انور کو بھیگے ہوئے شیشوں میں سے دھندلا دھندلا دکھائی دیا کہ اس جھونپڑی کے سامنے ایک بھیڑ جمع ہے۔ آشا نے بٹن دبایا اور سامنے کا شیشہ صاف کرنے والا وائپر چلنے لگا۔ اور انور نے دیکھا کہ وہ جھونپڑی اصل میں تاڑی کی دکان تھی اور اس کے سامنے موسلا دھار بارش میں ایک چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی عورت سفید ساڑی پہنے کھڑی بھیگ رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اندر جانے والے گاہکوں سے جو دیکھنے میں ہٹے کٹے پہلوان لگتے تھے، منتیں کر رہی تھی کہ وہ دکان میں نہ جائیں۔

''تو یہ تمھاری ماں ہیں؟'' انور یہ تو جانتا تھا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور ولایتی شراب کی دکانوں کے سامنے عورتیں دھرنا دیتی تھیں لیکن اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آشا کی ماں جیسی امیر گھرانے کی بوڑھی عورت شراب بندی کے بارے میں گاندھی جی کے پیغام کا پرچار کرنے کے لیے اتنی گندی بستی میں آنے کی ہمت کرے گی۔

نوجوان لڑکیاں شہر کے ایسے حصوں میں آنے سے گھبراتی تھیں اس لیے ان گندی بستیوں میں دھرنا دینے کا کام میری ماں اور دوسری بوڑھی عورتوں نے سنبھال لیا۔ میری ماں......''

باقی جملہ پاس سے گذرتی ہوئی بجلی کی ریل گاڑی کے شور میں ڈوب گیا۔

''کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' انور نے اونچی آواز میں پوچھا۔

ریل گاڑی کا شور ختم ہوگیا تھا۔ ''میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری ماں ایک خاص وجہ سے شراب کی دکانوں پر ہی دھرنا دیتی ہیں۔ اب تم میرے پاپا سے ملو گے تو تمھیں اس کی وجہ سمجھ میں آجائے گی۔''

انور اپنے دماغ میں ایک تصویر بنانے لگا، جس میں ایک باوفا بیوی اور اس کے شرابی شوہر کے درمیان ہر دم جھگڑا رہتا تھا اور اس لیے وہ چپ ہوگیا۔ اتنے میں بارش اور تیز ہوگئی اور انور نے دیکھا کہ آشا کی بوڑھی ماں کی کھدّر کی ساڑی بالکل بھیگ چکی تھی لیکن انھوں نے زیادہ تر گاہکوں کو شرمندہ کر کے ان کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔ صرف ایک تگڑا سا آدمی، جو پہلے سے ہی نشے میں معلوم ہوتا تھا اور جس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے، بڑی بے شرمی کے ساتھ اب تک وہاں ڈٹا ہوا تھا۔

تمھارے خیال میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب ہم لوگ انھیں وہاں سے لے آئیں؟ وہ بالکل بھیگ گئی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ آج کے لیے کافی لوگوں کو اس پاپ کے گڈھے میں گرنے سے بچا چکی ہیں۔''

آشا نے اپنی گھڑی دیکھی پانچ منٹ بعد دکان بند ہو جائے گی۔ بارش تو کیا اگر برف بھی گرنے لگے تو بھی وہ دکان بند ہونے سے پہلے وہاں سے نہیں ہٹیں گی۔ میں نے تو ان سے اس معاملے میں بحث کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

آخر کار تاڑی کی دکان بند ہونے کا وقت آ گیا اور انور نے یہ انہونی بات دیکھی کہ تاڑی بیچنے والے نے اس عورت کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا جو اس کے دھندے کے خلاف لوگوں میں پرچار کر رہی تھی اور اس کے گاہکوں کو دکان میں آنے سے روک رہی تھی۔

''ماننا پڑتا ہے کہ یہ انوکھی شرافت ہے'' انور نے کہا۔

''نہیں، یہ ایک انوکھا ملک ہے'' آشا نے انور کی بات کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

وہ بوڑھی عورت چل کر موٹر تک آئی اور جب انور اس کا استقبال کرنے کے لیے گھبرا کر موٹر سے نیچے اترا تو اس نے انور سے متعارف ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی اسے بڑے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا ''تو کیوں بھیگتا ہے بیٹا؟ بیٹھ اندر'' وہ گجراتی لہجے میں ہندوستانی بولتی تھی مگر اس کی آواز میں نرمی اور مٹھاس تھی۔

انور اس بوڑھی عورت کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک سوکھے تولیے سے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ اور منہ پونچھنے لگی اور انور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا پچاس سے اوپر ہو گی لیکن اس کے چہرے پر جھریوں کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ بالوں میں ایک پٹی چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سفید بالوں کی تھی اور چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کے چاروں طرف گہرے گڈھے پڑ گئے تھے لیکن اس کی ناک بھی بیٹی کی طرح ہی ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ ہنستے وقت آشا کے گالوں میں جو گڈھے پڑتے تھے وہ بھی اسے اپنی ماں سے ہی ملے تھے۔

جب اس نے ''میری بیٹی کی جان بچانے'' کے لیے انور کا بار بار شکریہ ادا کیا تو انور کچھ کھسیا سا گیا کیونکہ وہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کا ذکر کر رہی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے پولیس

سارجنٹ پر ٹوٹ پڑنے میں اس نے غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ اس لیے جب اس نے بات چیت کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ''بیٹا تمھارا نام کیا ہے؟'' تو انور کو بہت خوشی ہوئی۔

انور نے اپنا نام بتایا اور اسے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ یہ جان کر کہ وہ مسلمان ہے اس نے کوئی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

''جگ جگ جیو بیٹا'' اس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

بیٹا! انور کو اس رحم دل بوڑھی عورت کے منہ سے یہ لفظ بہت ہی میٹھا لگا، اور اپنی عمر میں پہلی بار انور کو اپنے دل میں چھپی ہوئی ایک پیاس کا احساس ہوا۔ اپنی ماں کی تمنا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

(4)

کوئی ہفتے بھر بعد ایک دن صبح جب انور کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے باہر چڑیوں کا ایک جھنڈ شور مچا رہا ہے، انور کو ایسا لگا جیسے وہ بہت لمبا سہانا سپنا دیکھ کر اٹھا ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ اسپرنگ دار پلنگ اس کے جسم کے بوجھ سے لچک رہا تھا۔ اس نے دیوار کے پاس رکھی ہوئی بیش قیمت سنگھار میز دیکھی۔ باغ سے پھولوں کی مست خوشبو آ رہی تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ وہ سیٹھ مانک لال جی کی مالا بار ہل کی کوٹھی میں مہمان ہے۔ وہ کم گو سیٹھ جی سے ایک بار ملا تھا جن کا گنجا سر بالکل ابلے انڈے کی طرح چکنا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چالاکی اور دولت کے لالچ کی چمک تھی لیکن ان کے چاروں طرف گہرے رنگ کے گھیرے بھی پڑے ہوئے تھے۔ سارا دن وہ دلال اسٹریٹ کے اپنے دفتر میں سٹہ بازار میں شیئر خریدنے اور بیچنے میں یا پریل میں اپنی کسی مل کا معائنہ کرنے میں گزار دیتے تھے۔ اور رات کو تاج میں یا جوہو کے اپنے اس بنگلے میں شراب پیتے تھے جو خاص طور پر اسی کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ لوگ دبی زبان میں یہ بھی کہتے تھے کہ سیٹھ جی نے وہاں کوئی رکھیل رکھ چھوڑی تھی، جوہو کے بنگلے میں جوئے اور شراب کی محفل جمتی تھی اور سیٹھ جی کی تفریح کے لیے کرائے پر ناچنے والیاں لائی جاتی تھیں۔ سیٹھ جی شاید ہی کبھی دو بجے رات سے پہلے گھر لوٹتے تھے اور ان کی بیوی بیمار ہونے پر بھی کبھی ان کے لوٹنے سے پہلے سوتی نہیں تھی۔ پھر بھی

سیٹھ جی نہ جانے کیوں اپنی دبلی پتلی چھوٹی سی پتی ورتا بیوی سے ڈرتے تھے۔ انور نے کبھی بھی انھیں گھر پر اونچی آواز میں بولتے یا اپنی بیوی کی بات کو کاٹتے ہوئے نہیں سنا تھا۔

ان سے انور کی صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی اور وہ انور کے ساتھ بہت ہی شرافت کے ساتھ پیش آئے تھے۔ لیکن جس ڈھنگ سے انھوں نے بات کی تھی اس سے انور کو ایسا لگا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اونچا اور انور کو نیچا سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر جس دریا دلی کے ساتھ انھوں نے انور کو ''جب تک جی چاہے'' رہنے کی دعوت دی تھی، اس میں زور اس بات پر تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی اس طرح کی ہر سنک کو پورا کرنے کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ آشا نے اسے پہلے ہی سے اپنے پاپا کے بارے میں بتا دیا تھا پھر بھی انور کا دل کسی طرح اس بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ ایسا آدمی آشا جیسی لڑکی کا باپ اور ماں جی جیسی عورت کا شوہر ہو سکتا ہے۔

اس خاندان میں بس ایک آدمی اور تھا، آشا کا بڑا بھائی موہن۔ موہن وہی کھدر پوش نوجوان نکلا جسے انور نے تاج میں کھانا کھانے کے بعد کانگریس کا غیر قانونی بلیٹین بانٹتے دیکھا تھا۔ انور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ موہن اسے اچھا لگتا ہے یا نہیں۔ موہن کچھ تھا ہی ایسا۔ وہ ابھی کچھ سال تک پیرس میں رہنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ وہاں اس نے لمبے لمبے بال بڑھا لیے تھے اور آرٹ سیکھنے کے بہانے وہ بالکل لاابالی پن کی بوہیمین زندگی گزار رہا تھا۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد سے اس نے کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کا یہ انقلابی چولا بھی اتنا ہی بناوٹی تھا جتنا کہ اس کا پہلے والا فن کاروں کا بھیس۔ اس میں بھولے پن اور دکھاوے کی اکڑ کی ایک عجیب آمیزش تھی۔ اس میں دکھاوا ضرور تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے دل میں بالکل ہی لگن نہ رہی ہو۔ وہ ایک کھدر پوش شوقین نوجوان تھا، وہ ایسا وطن پرست تھا جو خوشی خوشی پھانسی پر چڑھ جاتا لیکن اس شرط پر کہ شہید ہوتے وقت اس کی تصویریں کھینچنے کے لیے اخباروں کے فوٹوگرافر وہاں موجود ہوں۔ وہ انور پر بہت رعب جھاڑتا تھا، لیکن اسے نیچا دکھانے کے لیے نہیں بلکہ ایک بڑے بھائی کی طرح۔ وہ انور کو ہمیشہ ''مائی بوائے'' کہتا تھا۔ جب بھی دونوں اکیلے ہوتے وہ انور سے کہتا ''مائی ڈیئر بوائے، تم نے زندگی نہیں دیکھی ہے۔ جب تک آدمی کم سے کم سال بھر تک پیرس کی رنگینی نہ دیکھے تب تک اس نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا۔'' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ

غیر قانونی پرچے چھاپنے اور بانٹنے کے بارے میں اپنی کسی انوکھی تجویز پر بحث کرنے لگتا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے انور ان عجیب حالات پر غور کر رہا تھا جنھوں نے اسے اس گھر میں پہنچا دیا تھا۔ اتنے میں اسے ماں جی کی آواز سنائی دی۔ ''اٹھ گئے بیٹا؟ چائے بھیج دوں؟''

''ہاں ماں جی، میں بالکل تیار ہوں۔'' انور نے چادر اتار پھینکی اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر بوڑھے ڈاکٹر جمشید جی کی نصیحت کے مطابق کھلی ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کے سینے کا درد تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ماتھے کا زخم بھی بھر گیا تھا، صرف ایک نشان باقی رہ گیا تھا۔ انور کے جسم میں نئی پھرتی آ گئی تھی، اس کے دل میں نئی امنگ تھی۔

چائے آئی تو اس کے ساتھ آشا اور موہن بھی آئے۔ آشا لڑکوں جیسا پاجامہ پہنے تھی اور اس کے کھلے بال اس کے کندھوں پر بکھرے تھے۔ اسے دیکھ کر انور کو ہنسی آ رہی تھی مگر ساتھ ہی وہ اچھی بھی بہت لگ رہی تھی۔ موہن کا لباس اس کی فطرت کی طرح ہی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر تھا۔ وہ کھادی کے سیلپنگ سوٹ پر چینی سلک کا ڈریسنگ گاؤن پہنے تھا اور منہ کے ایک کونے میں وہ لمبا سا سگریٹ ہولڈر دبائے تھا۔

''انور، ہم لوگ تم سے ایک کام کروانا چاہتے ہیں، کیا تمھاری طبیعت اب اتنی ٹھیک ہے کہ تم باہر جا سکو؟'' آشا نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''جائے گا کیوں نہیں، اب یہ بالکل بھلا چنگا ہو گیا ہے۔'' موہن نے آشا کو ڈانٹتے ہوئے کہا ''تم نے بھی اسے بالکل بچہ بنا رکھا ہے''۔

''بچہ تو نہیں ہے، لیکن بیمار تو تھا۔ جانتے ہو ڈاکٹر جمشید جی نے.....''

''چھوڑو اس بڈھے اناڑی ڈاکٹر کی باتیں۔ اس کی باتوں کے چکر میں جو پڑ جائے اسے عمر بھر بیساکھیوں کا سہارا لے کر ہی چلنا پڑے۔''

انور بھائی بہن کے ہر وقت کے ان جھگڑوں کا عادی ہو چکا تھا لیکن چونکہ یہ جھگڑا اس کے بارے میں ہو رہا تھا اس لیے اسے بیچ میں بولنا پڑا۔ ''اچھا، تم دونوں اپنا جھگڑا بند کر کے کچھ یہ بھی بتاؤ گے کہ آخر بات کیا ہے؟''

''انور، مائی بوائے.....'' موہن موقع کی اہمیت کو دیکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

''ذرا ٹھہرو'' آشا نے گھبرا کر اونچی آواز میں کہا۔''پہلے میں دروازہ بند کرلوں، کہیں کوئی ہماری باتیں سن نہ لے۔''

انور اس ساری کارروائی کے جاسوسی ماحول کو دیکھ کر بہت حیران رہ گیا۔

''بات یہ ہے کہ کام بہت ہی ضروری ہے'' موہن نے دوبارہ کہنا شروع کیا لیکن اس کی بے قرار بہن نے اسے پھر روک دیا۔

''بھیا، تم سارا کھیل بگاڑ دو گے، میں بتاؤں گی۔''

آخر کار انور کو ساری بات کا پتہ چل گیا اور اسے یہ جان کر کچھ تعجب ہوا کہ بات سچ مچ کچھ سنجیدہ تھی۔ ان لوگوں کو کسی خفیہ ذریعے سے پتہ چلا تھا کہ گاندھی جی اسی رات کو دھرسانا میں گرفتار کر کے پونا کے پاس یرودا جیل میں لے جائے جانے والے تھے۔

''ہم لوگ چاہتے یہ ہیں کہ تم جا کر گاندھی جی سے ملو'' موہن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا''ہم سب لوگوں پر پولیس کی نظر ہے اس لیے اگر ہم میں سے کوئی بمبئی سے باہر جائے گا تو پولیس کو شک ہوگا۔ لیکن تم آسانی سے جا سکتے ہو، کیونکہ یہاں کی سی۔آئی۔ڈی ابھی تمھیں جانتی نہیں ہے۔''

''انور'' آشا نے بڑی عاجزی سے کہا۔''تم مہاتما گاندھی کا پیغام لے آؤ، پھر ہم اسے اپنے بلیٹین میں چھاپیں گے اور اپنے کانگریس ریڈیو پر پڑھ کر سنائیں گے۔ سنسنی پھیل جائے گی، بہت بڑا''سکوپ''(SCOOP) رہے گا۔''

انور نے انھیں یقین دلایا کہ وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرے گا لیکن سوال یہ تھا کہ رات سے پہلے وہ دھرسانا پہنچے گا کیسے؟

''وہ سب انتظام ہم لوگ کر دیں گے مائی بوائے، لیکن گاندھی جی کا انٹرویو تم ان کے گرفتار ہونے کے بعد ہی لینا۔ یہ اصلی بات ہے۔ انور، بس تم ہمارا اتنا کام کر دو پھر تم جو کہو گے وہ میں کروں گا۔''

''کرو گے؟'' انور نے پوچھا۔

''ہاں ضرور کروں گا۔'' موہن نے اسے یقین دلایا۔

''اچھا تو مجھے مائی بوائے نہ کہا کرو۔''

''مان لیا مائی بوائے۔''

اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور موہن داڑھی بنانے چلا گیا اور آشا نہانے، دروازے پر سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولی ''میں تو کانگریس ہاؤس جا رہی ہوں اور شاید تمھارے جانے سے پہلے پھر تم سے ملاقات نہ ہو سکے، کام پورا کر کے آنا۔''

تو آخر کار سرکار نے گاندھی جی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا، انور نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ جب سرکار عوام کے عظیم لیڈر کو گرفتار کرلے گی تو عوام اور بھی مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف اپنے نعروں اور اپنے خوابوں کے انقلاب کی طرف بڑھیں گے۔

وہ بہت ہی تاریخی دن ہونے والا تھا اس لیے انور نے کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ چار مئی انیس سو اکتیس، ہفتے کا دن تھا۔

(5)

انور کا کام اس سے کہیں مشکل ثابت ہوا جتنا کہ اس نے سمجھا تھا۔ اس نے موہن اور آشا سے یہ بات منوالی تھی کہ وہ رابرٹ ملس کو بھی اس تجویز میں شامل کرلے گا کیونکہ بہر حال وہ اب بھی ملس ہی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ملس یہ خبر سن کر بے حد خوش ہوا اور اس نے انور کو اس 'سکوپ' کے لیے پہلے ہی سے مبارکباد دی، جس کے لیے وہ ابھی پروگرام ہی بنا رہے تھے۔ اسے اپنی کامیابی پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے اپنے نیویارک کے دفتر کو ایک اہم اسٹوری کا انتظار کرنے کے لیے تار بھی بھیج دیا۔ شام کے وقت وہ سیٹھ مانک لال کی موٹر میں بیٹھ کر سورت کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں کھانے کے لیے انھوں نے اپنے ساتھ کچھ سینڈوچ رکھ لیے تھے۔ تقریباً دو ہفتے تک پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انور کے لیے یہ بہت ہی خوشگوار تجربہ تھا اور اسے کچھ کچھ اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ تاریخ کی تعمیر میں حصہ لے رہا تھا۔

گاڑی آدھی رات کے بعد آئی لیکن اسے وقت سے زیادہ دیر تک روک رکھا گیا۔ ایک بجے تک تمام خوانچے والوں کو اور ان تمام لوگوں کو جن کے پاس اس گاڑی کے ٹکٹ نہیں تھے،

پلیٹ فارم سے ہٹا دیا گیا۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی اور لوگ بھاگ کر اپنے اپنے ڈبوں میں پہنچ گئے۔ لیکن ایک پل تک ہچکچانے کے بعد جیسے ہی انور اور ملس لپک کر ایک ڈبے میں چڑھے، ویسے ہی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور ساتھ ہی سفید کپڑوں میں گاندھی جی کا خاکہ نظر آیا۔ ان کے ساتھ پولیس افسروں کی ایک ٹولی تھی۔ دوسرے ہی پل گاڑی پھر سے چل دی......

اس طرح انور کو معلوم ہوگیا کہ وہ اس گاڑی پر سفر کر رہا ہے جس پر گاندھی جی کو جیل لے جایا جا رہا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ ان سے ملاقات کیسے کی جائے۔ جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی تو وہ دونوں یہ پتہ لگانے کے لیے اترے کہ قیدی کو کس ڈبے میں بٹھایا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر مٹی کے تیل کے کچھ لیمپوں سے جو دھندلی دھندلی روشنی ہو رہی تھی اس میں انھوں نے کچھ ہتھیار بند پولیس والوں کو ڈائننگ کار کے سامنے ٹہلتے دیکھا۔ ''یہی ہے!'' ملس نے چپکے سے کہا۔ ''اسی ڈبے میں ہیں اور کہیں ہو ہی نہیں سکتے۔'' اب سوال ان تک پہنچنے کا تھا۔ گاڑی بہت سویرے ہی بمبئی پہنچ جانے والی تھی اور یہ یقین تھا کہ بمبئی سے پہلے ہی انھیں کسی جگہ اتار لیا جائے گا۔ ملس نے آنکھ میں دھول جھونک کر ڈبے میں گھس جانے کا فیصلہ کیا اور ڈبے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پولیس والوں کی ذرا بھی پروا کیے بغیر وہ ڈائننگ کار کے دروازے کے پاس گیا اور بالکل پکے صاحبوں کی طرح ''بوائے! بوائے!'' پکارنے لگا۔

''کیا چاہیے صاب؟'' ایک پولیس والے نے اس کا راستہ روک کر کافی جھڑک کر پوچھا۔

انور وہاں سے کچھ دور پر کھڑا ملس کی حاضر جوابی پر من ہی من میں مسکرا رہا تھا۔ ''وہسکی سوڈا مانگتا— جلدی، سمجھا؟'' اور یہ کہہ کر ملس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔

''نہیں صاحب ڈائننگ کار بند ہو چکا ہے اب وہسکی سوڈا کا ٹائم نہیں ہے''۔ پولیس والے نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ ملس کی تکڑم نہیں چلے گی اور اس لیے امریکی اخبار نویس کو الٹے پاؤں واپس آنا پڑا۔

گاڑی نے سیٹی دی اور انھیں بھاگ کر اپنا ڈبہ پکڑنا پڑا لیکن جب گاڑی چل پڑی تو انور نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ ڈائننگ کار کا دروازہ کھلا اور پولیس والے چلتی گاڑی میں لپک کر چڑھ گئے۔

اگلے اسٹیشن پر ہی ان کے لیے آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد گاڑی دادر پر ہی کھڑی ہونے والی تھی اور انھیں پورا یقین تھا کہ گاڑی اس سے کچھ میل پہلے ہی روک دی جائے گی اور گاندھی جی کو چپ چاپ وہاں سے موٹر میں بٹھا کر لے جایا جائے گا۔ اس لیے انور نے ملس کو منع کردیا کہ اگلے اسٹیشن پر نہ اترے نہیں تو پولیس والوں کو شک ہوجائے گا۔ اس بار اس نے خود قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب گاڑی چھوٹے سے سنسان اسٹیشن پر رکی تو انور ایک تھرمس لے کر نیچے اترا اور پینے کا پانی ڈھونڈنے لگا۔ اس نے اسٹیشن پر پانی کا کوئی انتظام نہ ہونے کے بارے میں قلی، ٹکٹ کلکٹر اور اسٹیشن ماسٹر سب سے بحث کی۔ وہ پولیس والے کی طرف توجہ دیئے بغیر ڈائننگ کار سے آگے نکل گیا لیکن جاتے جاتے اس نے کھڑکی کے کانچ پر گاندھی جی کے جانے پہچانے چہرے کا عکس دیکھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر پو پھٹ رہی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی چلنے لگی اس وقت وہ انجن کے پاس تھا۔ وہ گھبرایا ہوا پیچھے اپنے ڈبے کی طرف بھاگا لیکن گاڑی کی رفتار کافی تیز ہوچکی تھی اور اگر اس گڑبڑ میں اس نے پولیس والوں کے گھس جانے کے بعد ڈائننگ کار کا ہینڈل پکڑلیا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ اس سے پہلے کہ پولیس والے سمجھ پاتے کہ کیا ہورہا ہے وہ اندر پہنچ چکا تھا اور اس عظیم قیدی کے سامنے کھڑا تھا۔

گاندھی جی نے اسے پہچان کر مسکرادیا۔ ''چلتی گاڑی میں چڑھ کر اپنی جان خطرے میں ڈالنا اچھی بات نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں'' انور نے اپنی نوٹ بک اور پنسل نکالتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن آپ سے ملنا ضروری تھا، آپ اپنی گرفتاری کے بعد عوام سے کیا کرنے کی امید رکھتے ہیں؟''

''ظاہر ہے میں یہی امید کرتا ہوں کہ وہ تحریک چلاتے رہیں۔'' وہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے جیسے ہر لفظ کو کہنے سے پہلے تول رہے ہوں۔ ''قربانی کے بغیر جو سوراج ملتا ہے وہ کبھی قائم نہیں رہتا اس لیے لوگوں کو بڑی قربانی دینی ہوگی۔ اصلی قربانی میں ساری تکلیفیں ایک طرف والوں کو برداشت کرنی پڑتی ہیں، دوسرے کی جان لیے بغیر خود اپنی جان دینی پڑتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اس اصول پر چل سکے۔ اس وقت ہندوستان کی عزت اور ہر چیز مٹھی بھر

نمک میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ مٹھی توڑ بھلے ہی دی جائے لیکن کھلنے نہ پائے۔''

گاڑی دھیمی ہو چلی تھی اور وہ بمبئی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ انور گاندھی جی سے کوئی قطعی اور ٹھوس پیغام چاہتا تھا اس لیے اس نے پوچھا۔ ''کیا ستیہ گرہ کی حد نمک قانون توڑنے تک ہی رہنی چاہیے یا لوگوں کو اس کے علاوہ بھی کوئی قدم اٹھانا چاہیے؟''۔

انور کو اپنے سوال کا جو جواب ملا اس سے اس کے دل میں جذبات کی ایک لہر سی اٹھی۔ وہ اہنسا سینا کے لیڈر سے باتیں کر رہا تھا جو لڑائی جاری رکھنے کے بارے میں حکم دے رہے تھے۔ ''سمندر کے کنارے سے نمک بٹورنے یا نمک بنانے میں پورے گاؤں کو حصہ لینا چاہیے۔ عورتوں کو شراب کی دکان، افیون کے ٹھیکوں اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر دھرنا دینا چاہیے، ولایتی کپڑے کی ہولیاں جلائی جانی چاہئیں، ہندوؤں کو کسی کے ساتھ چھوت چھات کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں سب ہی کو ایک دوسرے کو بھائیوں کی طرح گلے لگانا چاہیے، لڑکوں کو سرکاری اسکول چھوڑ دینا چاہیے اور سرکاری نوکروں کو سرکاری نوکریاں چھوڑ کر عوام کی خدمت کرنا چاہیے جیسا کہ گجرات کے پٹیلوں اور تلاٹیوں نے کیا ہے۔''

انور نے دیکھا جب وہ گاندھی جی کا پیغام لکھ رہا تھا اس وقت پولیس کے افسر غصے کے مارے تلملا رہے تھے مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ وہ شاید یہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ اسے وہیں گرفتار کر لیں کہ اتنے میں گاڑی کے بریک لگے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ایکسپریس رک گئی اور ڈائننگ کار ریل کی پٹری کو پار کرنے والی سڑک کے پھاٹک کے سامنے آ گئی۔ اب پولیس والے اپنے قیدی کو اتارنے میں اتنے مشغول تھے کہ انھیں کسی اور بات کا خیال ہی نہیں تھا۔

انور نے ہاتھ جوڑ کر چپ چاپ نمستے کیا اور گاندھی جی نے مسکرا کر اسے آشیرواد دیا اور اپنی کھدر کی شال اپنے کندھوں پر ڈال کر گاڑی سے نیچے اتر گئے۔

پھاٹک کے پاس کھڑے ہوئے دو بدیسی اخبار نویسوں کو انور نے پہچانا اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر مسکرانے لگا کہ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ کوئی ان سے پہلے ہی گاندھی جی سے انٹرویو لے چکا ہے تو وہ کتنا افسوس کریں گے۔

''مسٹر گاندھی، آپ کو کچھ کہنا ہے؟'' اس نے ایک اخبار نویس کو سوال کرتے سنا اور گاندھی جی

نے جواب دیا" انگلینڈ اور امریکہ کے لوگوں سے کہیے کہ آج صبح جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اس کا اصلی مطلب سمجھیں۔ کیا یہی آزادی ہے؟......"

وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پوچھ سکے کیونکہ پولیس جلدی جلدی سے گاندھی جی کو موٹر میں بٹھا کر فوراً وہاں سے لے گئی۔ جب اونگھتے ہوئے مسافروں کو اس تاریخی ڈرامے کا پتہ چلا تو وہ ہر ڈبے سے باہر جھانک کر دیکھنے لگے۔ لیکن پولیس والوں کو اور اخبار نویسوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جس ڈبے میں گاندھی جی سفر کر رہے تھے اس کی ایک کھڑکی میں سے انور باہر سر نکالے جھانک رہا تھا۔

"بھلا یہ کون ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔ اسے کچھ کچھ اس بات کا شک ہو گیا تھا کہ کسی نے اس سے بھی زیادہ پھرتی دکھا کر معرکے کی خبر پہلے ہی اڑا لی تھی۔

لیکن گاڑی چل پڑی تھی اور انور اپنا خالی تھرماس ہلا ہلا کر چلا کر کہہ رہا تھا" جانتے نہیں ہو، میں کون ہوں؟ پانی کی تلاش میں بھٹکنے والا کالا آدمی؟"

(6)

گاندھی جی کا پیغام لانے میں انور کی کامیابی پر آشا اتنی خوش تھی کہ اس نے انور کو دعوت دی کہ وہ بھی اس کے ساتھ کانگریس کے خفیہ ریڈیو اسٹیشن پر چلے جہاں سے وہ پیغام اسی دن شام کو براڈ کاسٹ کیا جانے والا تھا۔

"تمھیں یقین ہے کہ مجھے اپنا اتنا بڑا راز بتا کر تم کوئی خطرہ نہیں مول لے رہی ہو؟ مان لو اگر میں سی۔آئی۔ڈی کا بھیجا ہوا آدمی ہوا تو؟"

وہ آشا کو چھیڑ رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ اس پر کتنا بھروسہ کرتی ہے۔

"بکواس نہ کرو، ہم تمھیں اپنا ہی آدمی سمجھتے ہیں۔" جس طرح سے اس نے یہ بات کہی اس میں دوستوں جیسے بھروسے کے علاوہ بھی کچھ تھا۔" اور پھر سی۔آئی۔ڈی کا کوئی آدمی ایک والینٹر کی جان بچانے کے لیے پولیس سے اپنی کھوپڑی نہ تڑواتا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ تم کوئی معمولی والینٹر نہیں ہو اور پھر غداروں کے سینے میں بھی تو دل ہوتا

ہے۔'' وہ اپنی یہ تعریف سن کر کچھ شرما گئی مگر وہ سیدھی سادی طبیعت کی تھی، اسے نخرے دکھانا بالکل نہیں آتا تھا۔''دوسری بات یہ کہ کبھی کبھی دوسروں کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے سی۔آئی۔ڈی والوں کو اپنا سر بھی تڑوانا پڑتا ہے جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جو چوٹ لگی ہے اس کی وجہ سے مجھے ترقی مل گئی ہے۔''

وہ بہت ہی دوستانہ ڈھنگ سے لڑکوں کی طرح ہنسی۔ انور کو اس کی یہی بات اچھی لگتی تھی۔ آپ اس کے ساتھ بالکل برابری سے باتیں کر سکتے تھے، ہنسی مذاق کر سکتے تھے اور آپ کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ کسی لڑکی سے باتیں کر رہے ہیں۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ آشا کی موٹر میں بیٹھ کر اپولو بندر گئے اور وہاں سے آشا نے موٹر ڈرائیور کے ساتھ واپس بھیج دی۔ اس وقت سمندر کے کنارے پر بالکل سناٹا تھا۔ صرف گیٹ وے آف انڈیا کے ٹھنڈے فرش پر کچھ بے گھر لوگ چین سے سو رہے تھے۔ ان دونوں نے تاج ہاربر بار میں جا کر کچھ سینڈوچ اور کیک خریدے۔ پھر وہ کنارے پر جا کر ایک موٹر بوٹ میں بیٹھ گئے۔ انور نے دیکھا کہ بوٹ والا آشا کو جانتا تھا کیونکہ اس نے نہ تو پیسوں کے لیے کوئی سوال کیا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔

جب موٹر بوٹ پھٹ پھٹ کرتی ہوئی بندرگاہ سے باہر نکلی تو انور نے پوچھا ''کسی کو شک تو نہیں ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمارا پیچھا کرے؟''

''زیادہ سے زیادہ کوئی یہی تو شک کرے گا کہ میں تمھارے ساتھ رومانس کرنے کے لیے سیر کو جا رہی ہوں اور لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی باتیں کریں گے۔''

''اور تمھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے؟''

''نہیں، بالکل نہیں اگر اس سے کانگریس ریڈیو کا راز چھپائے رکھنے میں مدد ملتی ہو۔''

اب وہ کھلے سمندر میں پہنچ چکے تھے اور انور سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کسی دلکش جزیرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ بوٹ والا اسے کچھ شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور انور اسے کوئی بری بات بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جو لوگ خفیہ انقلابی کام کرتے تھے انھیں ہر طرح سے چوکنا رہنا ہی پڑتا تھا، خاص طور پر نئے لوگوں کے معاملے میں۔ بوٹ والا اپنی دلچسپی کو نہ دبا سکا اور اس

نے انور کی طرف اشارہ کر کے مراٹھی میں آشا سے کچھ کہا۔ انور کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن آشا نے اس کی بات کا جواب ہندوستانی میں دیتے ہوئے اس سے انور کا تعارف کرایا اور بتایا کہ ''یہ شمالی ہندوستان کے ایک ساتھی ہیں جو تحریک کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔'' اس نے بوٹ والے کو یہ بھی بتایا کہ انور نے کس طرح صبح گاندھی جی سے ملاقات کی تھی۔ اس پر مراٹھا بوٹ والا خوش ہو کر مسکرا دیا۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد ہی اس نے موٹر بوٹ کو ایک دوسری کشتی کی طرف موڑ دیا جو سمندر میں اکیلی تیر رہی تھی اور جس کے سفید بادبان ہوا میں تنے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مچھلیاں پکڑنے والی کوئی کشتی تھی۔

اس کشتی پر کانگریس کا خفیہ ریڈیو اسٹیشن تھا— اس کے اونچے اونچے مستول بڑی آسانی سے ایریَل کا کام دیتے تھے اور بیٹریاں، مائکروفون اور دوسری مشینیں کشتی میں بنے ہوئے ایک صندوق میں چھپا دی گئی تھیں۔ انور نے جب اپنے ہی لائے ہوئے گاندھی جی کے پیغام کو ریڈیو پر سنا تو اس کے دل میں ایک نیا طوفان پیدا ہو گیا۔ ''ہم کانگریس ریڈیو سے بول رہے ہیں! یہ کانگریس ریڈیو ہے!! ہم اب آپ کو اپنے مقبول لیڈر مہاتما گاندھی کا وہ پیغام پورا سناتے ہیں جو انھوں نے آج صبح ہمارے خاص نامہ نگار کو اپنی گرفتاری کے بعد دیا تھا......''

انور کو شک تھا کہ شاید گاندھی جی اس طرح کی خفیہ کارروائیوں کو پسند نہ کریں۔ کانگریس ریڈیو کا انتظام پوری طرح کچھ نڈر اور سوجھ بوجھ والے نوجوانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ انھوں نے اپنے ٹرانسمیٹر کی جگہ جلدی جلدی بدل کر پولیس کے جاسوسوں اور سرکار کے ریڈیو کے ماہروں کو چکر میں ڈال رکھا تھا۔ کبھی وہ شہر کے باہر کسی سنسان بنگلے میں اپنا ریڈیو اسٹیشن چلاتے تھے، تو کبھی کسی سنسان سڑک پر چلتی ہوئی موٹر پر۔ ایک بار تو ایلی فینٹا کے غاروں میں بھی اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کا انتظام سب سے آسان اور محفوظ ثابت ہوا تھا۔

جب وہ دونوں وہاں چلے گئے تو اس وقت بھی ٹرانسمیٹر پوری آواز سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ کانگریس ریڈیو ہے! ہم کانگریس ریڈیو سے بول رہے ہیں!! آپ آزادی کی آواز سن رہے ہیں۔''

(7)

جب وہ دونوں اپولو بندر واپس پہنچے تو موٹر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس بار آشا نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی اور خود موٹر چلانے لگی۔

''شہر کے باہر گھومنے چلتے ہو؟'' اس نے پوچھا اور اس سے پہلے کہ انور کوئی جواب دیتا آشا نے کہا ''میرا ایک دوست کھار میں رہتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس سے ضرور ملو۔''

یہ فیصلہ ہوتے ہی موٹر ہارنبی روڈ پر دفتر سے لوٹتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں سے ہوتی ہوئی بوری بندر اسٹیشن اور کرافورڈ مارکٹ کو پار کرتی ہوئی بھنڈی بازار، لال باغ اور پریل کی گندی بستیوں سے گذر کر دادر پہنچی، پھر بائیں طرف مڑ کر تلک برج پار کر کے ماہم پہنچی اور پھر وہاں سمندر پر بنا ہوا چھوٹا سا پل پار کر کے بمبئی کے مضافات کی طرف بڑھی۔ سارا وقت انور یہی سوچتا رہا کہ آشا کا یہ دوست کس قسم کا آدمی ہوگا۔ آشا نے جس ڈھنگ سے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس کا کوئی معمولی دوست نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا آدمی تھا جس کے لیے اس کے دل میں خاص عزت تھی۔ شاید وہ اس سے پیار کرتی تھی! یہ خیال آتے ہی اس کا دل بے چین کیوں ہوا تھا، اسے کچھ کچھ حسد کیوں ہونے لگا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ خود آشا سے تھوڑا تھوڑا پیار کرنے لگا تھا؟

یہ خیال دل میں پیدا ہوتے ہی اس نے اپنے آپ کو سمجھایا ''انور بے وقوفی کی باتیں نہیں کرتے۔'' اتنے میں موٹر ایک چھوٹے سے بنگلے کے احاطے میں رک گئی۔ ''وہ یہیں رہتا ہے'' آشا نے موٹر کا انجن بند کرتے ہوئے کہا ''اور ہاں اس کا نام یشونت ڈیسائی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ انور کو بنگلے میں نہیں بلکہ گیراج میں لے گئی جو اس احاطے میں بنگلے کے پیچھے کی طرف بنا ہوا تھا۔ انور کے چہرے پر تعجب کے آثار دیکھ کر آشا نے کہا ''بڑی عجیب بات لگتی ہے نا؟ لیکن وہ ہے ہی عجیب آدمی اور پھر آج کل گھر ملنا ہی مشکل ہے۔'' دروازہ کھٹکھٹائے بغیر وہ اندر چلے گئے اور وہاں انور نے ایک عجیب ماحول میں ایک عجیب آدمی کو دیکھا۔

یشونت بہت دنوں سے بیمار تھا اور چارپائی پر ہی پڑا رہتا تھا۔ اس کا جسم گھل کر بالکل ڈھانچہ رہ گیا تھا اور اس کی داڑھی بہت بڑھ گئی تھی، اس کے بدن میں صرف آنکھیں ہی ایسی تھیں

جن میں جان معلوم ہوتی ہے — بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں تھیں اس کی لیکن ساتھ ہی ان آنکھوں میں بھی کوئی ڈر چھپا ہوا تھا۔ مگر ان میں ایک عجیب کشش بھی تھی۔ آشا نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ یشونت کوشش کر کے مسکرایا اور اس نے کمبل کے نیچے سے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ نکال کر اپنے مہمان کی طرف بڑھا دیا۔ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر انور کو عجیب سا لگا جیسے وہ خود موت سے ہاتھ ملا رہا ہو۔

''کہیے میرا محل آپ کو کیسا لگا؟'' اس کا مذاق بھی مایوسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کی آواز بچّوں کی طرح پتلی اور بے جھجک تھی۔

انور نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ دیوار پر کارل مارکس، ٹالسٹائی اور اسٹالن کی تصویریں لگی تھیں۔ ایک ہنسیا اور ہتھوڑے والا لال جھنڈا لگا ہوا تھا، کچھ کاٹھیا ور کے پردے دیوار پر ٹنگے ہوئے تھے اور ایک کیل پر بخار کا چارٹ لٹک رہا تھا۔ ہر طرف کتابوں کے ڈھیر تھے — الماریوں میں، میز پر، پلنگ کے پاس لگی ہوئی ایک لمبی بنچ پر اور خود پلنگ پر بھی یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ مارکس وادی تھا اور اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور وہ جس نرمی کے ساتھ آشا سے کوئی کام کرنے کو کہتا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

انور نے یشونت سے کہا کہ اس کا کمرہ اسے بے حد پسند آیا تھا اور اس نے کتابوں کا اتنا اچھا ذخیرہ لائبریریوں کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ یہ سن کر بیمار خوش ہوا۔

آشا فوراً کمرہ ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ اس نے کتابیں جھاڑ کر پھر الماریوں میں رکھیں، تصویریں سیدھی کیں اور پلنگ پر بستر ٹھیک سے بچھایا۔ بڑے پیار سے سہارا دے کر اس نے یشونت کو بٹھا دیا اور اس کی پیٹھ کے پیچھے تکیے ٹھیک سے لگا دیے پھر وہ بینچ پر پڑی ہوئی جھوٹی پلیٹیں اور گلاس اٹھا کر انھیں دھونے کے لیے نل پر چلی گئی۔ انور دیکھ رہا تھا کہ یشونت آشا کے ہر کام کو ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ اپنی کسی چیز پر ناز کر رہا ہو۔ اگر اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت تھی تو اس کا یہ برتاؤ مضحکہ خیز لگتا۔ اب اس کی حرکتوں پر صرف ترس آتا تھا۔

آشا کے جاتے ہی بیمار نے انور سے ایک ایسا سوال پوچھا جسے سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ یشونت نے پوچھا ''کیا تم اس سے پیار کرتے ہو؟'' یہ سوال اس طرح اچانک پوچھا گیا تھا، اور اتنا غیر موزوں

تھا کہ ایک پل کے لیے تو انور کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دے پھر اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کچھ ٹپٹا کر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کہا ''نہیں، بالکل نہیں...... تمھیں یہ خیال ہی کیوں پیدا ہوا؟...... ہمیں ابھی ملے ہوئے مشکل سے دو ہفتے ہوئے ہیں۔''

یشونت خود یہ سوال پوچھ کر پچھتا رہا تھا اور اس نے معافی مانگتے ہوئے کہا ''میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ لیکن تم میری بات کا برا نہ ماننا۔ اس وقت میری جو حالت ہے اس میں میرے لیے اس کی محبت اتنی ضروری ہے کہ کبھی کبھی مجھے بلا وجہ دوسروں سے جلن ہونے لگتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں بیمار آدمی ہوں اور مارکس کی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی میری ہر بات سمجھ داری کی نہیں ہوتی۔ یہ کہہ کر وہ نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اب انور کے پچھتانے کی باری تھی کہ اس نے اس کی بات کا اتنا کیوں برا مانا تھا۔

آشا پلیٹیں دھو کر واپس لوٹی اور اس نے ہمیشہ کی طرح کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا ''تم دونوں کیا باتیں کر رہے تھے؟''

اس نے ہاں میں سر ہلا دیا اور جب آشا نے کہا ''تو پھر مجھے پڑھ کر سناؤ'' تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

جتنی دیر میں یشونت نے اپنے تکیے کے نیچے سے لکھے ہوئے کاغذوں کا پلندہ نکال کر انھیں سنبھالا اتنی دیر میں آشا نے انور کو بتایا کہ یشونت سال بھر سے مارکس کی عظیم کتاب ''سرمایہ'' کا گجراتی میں ترجمہ کر رہا تھا اور اب یہ کام لگ بھگ پورا ہو گیا تھا۔ مترجم نے خود اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''مجھے تو کرنا ہی تھا۔ اگر میں اچھا ہوتا تو میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتا یا کسی ٹریڈ یونین میں کام کرتا۔ اب میں یہاں لیٹے لیٹے صرف پڑھتا رہتا ہوں یا کبھی کبھار کچھ لکھ لیتا ہوں۔ موجودہ سماج بالکل بیمار اور سڑا ہوا ہے میری طرح، اسے مرنا ہوگا جتنی جلدی وہ مر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔''

اس کے بعد وہ دھیمی کمزور آواز میں اپنا ترجمہ پڑھنے لگا اور آشا اس پر اپنی نظریں جمائے سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں وہ کہیں پر تعریف میں کوئی لفظ کہہ دیتی یا اپنی طرف سے کوئی مشورہ دیتی۔ انور گجراتی نہیں سمجھ پا رہا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ یہ ترجمہ ان دونوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے والی کوئی کڑی تھی۔ ایک کا ترجمہ پڑھ کر سنانا اور دوسرے کا اسے سننا عقلی طور پر ان

کے آپس کے پیار کا اونچا روپ تھا۔

یشونت کے بدن میں بہت دیر تک پڑھنے کی طاقت نہیں تھی اس لیے جلدی ہی اس کی آواز میں تھکان پیدا ہوگئی، اس کی پلکیں کمزوری اور نیند سے بوجھل ہوگئیں۔'' آج بس کرو، یشونت، بہت اچھا ترجمہ ہوا ہے، باقی کل سنوں گی۔'' اور یہ کہہ کر آشا نے یشونت کے ڈھیلے ہاتھوں سے گرے ہوئے اوراق اٹھالیے اور انھیں سنبھال کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ پھر اس نے چپکے سے اس کے پیچھے سے گدیاں ہٹادیں اور اس کا سر تکیے پر ٹکا دیا۔ یشونت نے آنکھیں کھولے بغیر گجراتی میں کچھ کہا اور آشا اس کا ماتھا تھپک کر اس سے الگ ہوگئی۔اس نے انور کو اشارہ کیا اور دونوں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئے۔

(8)

جس وقت وہ دونوں اس گیراج میں سے نکلے اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور سڑک کی بتّیاں ایک ایک کر کے جلتی جارہی تھیں۔ آشا کیا یک کسی سوچ میں ڈوب کر بالکل چپ ہوگئی تھی اور سڑک پر پہنچ کر وہ بولی ''چلو جوہو چلتے ہیں، آج چاندنی رات ہے۔''

وہ شہر کے باہر چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی قطاروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چپ چاپ چلے جارہے تھے۔ آخرکار آشا نے کہا ''یشونت بھی کمال کا آدمی ہے، کیوں تمھارا کیا خیال ہے؟ اس کا جسم بیماری کی وجہ سے بالکل تباہ ہوگیا ہے لیکن اس کا دماغ بہت تیز ہے— سچے ہیرے کی طرح۔''

''کیا بیماری ہے اسے؟''

''ٹی۔بی''

''اچھا؟ مگر میں نے تو اسے ایک بار بھی کھانستے نہیں دیکھا۔''

''نہیں، ویسی ٹی۔بی نہیں ہے، اس سے بھی بری بیماری ہے۔ اسے ریڑھ کی ہڈی کی ٹی۔بی ہے، کوئی علاج ہی نہیں ہے اس کا۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

''کہتے ہیں کچھ مہینے اور چل جائے گا، لیکن جب تک یہ ترجمہ پورا نہیں ہو جاتا تب تک وہ مرنے والا نہیں۔ اسی کے سہارے وہ زندہ ہے......''

''اور تم! تم یہ تو جانتی ہی ہو کہ وہ تمھیں بے حد پیار کرتا ہے؟''

آشا نے اداس ہو کر سر ہلا دیا۔

''اور تم؟ کیا تم بھی اسے پیار کرتی ہو؟''

آشا چپ چاپ موٹر چلاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جواب دیا۔ ''میں ہمیشہ سے اس کی ذہنیت اور ایمانداری کی وجہ سے اس کی عزت کرتی رہی ہوں۔ وہ ہمارے کالج میں سب سے تیز لڑکا تھا۔ اپنے اصولوں کا بہت پکا۔ اس نے اپنا گھر بار اس لیے چھوڑ دیا کہ اس کے گھر والے بہت بڑا جہیز لے کر اس کا بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دن تک وہ ایک اسکول میں پڑھاتا رہا اور وہیں اسے یہ بھیانک بیماری لگ گئی۔ پچھلے سال بھر سے تو وہ چارپائی سے ہی لگا ہے۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''تمھارے سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ میں اسے بہت پسند کرتی ہوں، اس کی بڑی عزت کرتی ہوں اور مجھے اس کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں مل کر محبت بن جاتی ہیں؟ نہیں، میرا خیال ہے محبت کے لیے کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جس آدمی کی کوئی ضرورت سے زیادہ عزت کرتا ہو اسے وہ پیار نہیں کرسکتا۔ آدمی اپنے برابر والے سے پیار کرتا ہے۔ میرے اوپر تو ہمیشہ اس کی ذہانت اور دانشوری کا رعب رہا ہے۔''

''لیکن وہ تو سمجھتا ہے کہ تم اسے پیار کرتی ہو، تمھیں یہ بات تو معلوم ہے نا؟''

''ہاں، میں جانتی ہوں اور اگر اس سے اس کی امید بندھتی ہے اور اس میں زندہ رہنے کی طاقت آتی ہے تو میں اس میں کوئی برائی بھی نہیں سمجھتی۔''

آشا نے موٹر ناریل کے پیڑوں کے ایک جھرمٹ میں کھڑی کر دی اور دونوں چاندنی میں ایک ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ سمندر میں جوار آ رہا تھا اور لہروں میں پگھلی ہوئی چاندی کی چمک تھی۔ انور کو اس خاموش فضا میں درد کا احساس ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ابھی یشونت سے مل کر آیا تھا اور اس کے قابلِ رحم اور موہوم پیار پر اسے دکھ ہو رہا تھا لیکن انور کے دل میں بھی

مایوسی چھائی ہوئی تھی وہ سلمیٰ کے لیے بے چین تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آشا کا ساتھ پا کر وہ اسے بھول جائے گا۔ پر نہ جانے کیوں اس کا اثر بالکل الٹا ہی ہوا تھا۔ آشا جو کچھ بھی کرتی تھی یا کہتی تھی اس سے انور کے دل میں سلمیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

آشا نے اس سے کہا۔ ''انور، مجھے اپنے بارے میں، اپنے گھر والوں اور دوستوں کے بارے میں، اپنے بچپن اور کالج کے دونوں کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟''

انور نے اسے بتانا شروع کیا اور ایک ایک کر کے اس کی زندگی کے سارے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے — انجم کے ساتھ بچپن کے ہنسی خوشی کے دن، امرتسر کے بھیانک حادثے کی گہری چھاپ، انجم کی موت اور خدا پر سے اس کا بھروسہ اٹھ جانا، فرقہ وارانہ فسادات اور گاندھی جی سے اس کی ملاقات، یونی ورسٹی کی زندگی اور آخر میں وہاں سے نکالا جانا۔ اس نے آشا کو اپنے ابا کے بارے میں، رتن کے بارے میں، عثمان کے بارے میں اور ''سجانو سکی'' کے بارے میں بتایا — آشا یہ نام سن کر مسکرا دی۔ اور آخر میں اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ زندگی میں کیا کرنا چاہتا ہے۔ شاید وہ اخبار نویس بننا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے آپ پر اور اپنی قابلیت پر اتنا بھروسہ نہیں ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکے۔

''انور''۔ آشا کی آواز میں اتنی نرمی تھی کہ انور کو ایسا لگا جیسے کوئی اپنے نازک ہاتھوں سے بڑے پیار سے اسے سہلا رہا ہو۔ ''تمھارے اندر اتنی ہمت اور اتنی قابلیت ہے کہ تم اپنے ملک کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم ابھی یہ نہیں بتا سکتے ہو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ اس لیے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنے آپ پر بھروسہ رکھنا نہیں چھوڑو گے۔''

انور نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا اور اس کی نظریں آشا کی نظروں سے چار ہوئیں۔ وہ ریت کے ملائم ٹھنڈے تکیے میں اپنی کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی اور ہوا نے اس کے بال بکھیر دیے تھے۔ چاندنی اور سمندر کی لہریں اور ناریل کے پیڑوں کے پتوں کے جھملاتے ہوئے سائے — یہ سب اس پل آشا کی شخصیت میں سمٹ آئے تھے۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی، انور بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی گردن کو اس کے گالوں پر پڑنے والے گڑھوں کو، اس کی لجائی ہوئی پلکوں کو چوم لے لیکن اس کی نظروں کے سامنے آشا نہیں تھی، وہ

آشا کونہیں چومنا چاہتا تھا، بلکہ وہ سلمیٰ تھی۔ سلمیٰ جیسی کہ وہ تھی، اور سلمیٰ جیسی کہ وہ اسے بنانا چاہتا تھا۔ اور اگر اس وقت وہ آشا کو چوم لیتا تو یہ اس کے لیے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے برابر ہوتا۔ وہ آشا کی اتنی زیادہ عزت کرتا تھا کہ وہ اسے سلمیٰ کی جگہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس لیے اس نے ہاتھ میں کچھ ریت اٹھائی اور انگلیوں کے بیچ سے اسے گرانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کو ریت ٹھنڈی لگ رہی تھی اور اس طرح اسے اپنے مچلتے ہوئے دل کو قابو میں کرنے میں بہت مدد ملی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا، ''آشا، جانتی ہو، یشونت مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں تم سے پیار کرتا ہوں؟''۔

''پھر تم نے کیا کہا؟'' آشا نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس سے پلٹ کر کہا۔

''میں نے کہا...... میں نے کہا......'' وہ آشا کو وہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا جو اس نے کہی تھی بلکہ جو اسے کہنی چاہیے تھی۔ ''میں نے کہا کہ تم اتنی اچھی ہو کہ میں تمھارے لائق نہیں، کہ میں تمھاری اتنی عزت کرتا ہوں کہ تمھیں پیار نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک دوسری لڑکی سے محبت ہے جو تم سے آدھی بھی اچھی یا سمجھدار نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ مجھ سے پیار بھی نہیں کرتی۔ لیکن پھر بھی میں اسے پیار کرتا ہوں۔ کیا اس میں کوئی عجیب بات یا برائی ہے؟''

''نہیں، میں تو نہیں سمجھتی۔ انسان کا دل اتنا پیچیدہ ہے کہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں ہو سکتا۔''

اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہ نکل کر سمندر کی لہروں اور ناریل کے پتوں میں سے ہو کر بہتی ہوئی ہوا کے شور میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اور بولی۔ ''چلو چلیں، بہت دیر ہو گئی۔''

(9)

گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور جگہ جگہ بغاوت ہونے لگی۔ لوگوں نے اپنا غصہ ظاہر کرنے کے لیے ہڑتالیں کیں، جلوس نکالے، نمک ستیہ گرہ نے پھر زور پکڑا، بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ شروع ہوا اور سڑکوں پر ولایتی کپڑے کی ہولیاں جلائی جانے لگیں، شراب کی دکانوں پر دھرنے دیے گئے، گرفتاریاں ہوئیں، لاٹھیاں اور گولیاں چلیں۔

جب انور دوسرے دن صبح ملس سے ملا تو وہ بوڑھا امریکی اخبار نویس غصے سے پاگل ہو رہا

تھا۔اس سے پہلے دن شام کو اس نے اپنی آنکھوں سے میدان میں احتجاجی میٹنگ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ستیہ گرہیوں پر ایک وحشیانہ لاٹھی چارج دیکھا تھا۔سینکڑوں لوگ بے ہوش ہو گئے تھے۔

''مائی گاڈ، انور''۔اس نے قسم کھا کر کہا۔''میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا بھیانک منظر نہیں دیکھا ہے۔میں نے ایک آدمی کو مار کھاتے دیکھا۔ مشکل سے بیس برس کا لڑکا رہا ہوگا۔وہ بار بار چوٹ کھا کر گرتا تھا، اس کا چہرہ خون سے لت پت تھا، لیکن وہ ہر بار اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور کہتا تھا اور مارو۔یہاں تک کہ انگریز پولیس سارجنٹ بھی جو اسے پیٹ رہا تھا شرمندہ ہو گیا اور اس نے اپنا ڈنڈا پھینک دیا۔''

ملس نے اپنی رپورٹ میں اس لڑکے کی پٹائی کا ذکر کیا تھا۔اس نے ہمیشہ سے زیادہ سخت لفظوں کا استعمال کیا تھا اور اس لیے مقامی سنسر نے اس کی رپورٹ روک لی تھی۔اس پر بوڑھے کو غصہ آ گیا تھا اور وہ سب کو ٹیلیفون کر کے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس کی رپورٹ روکی گئی تو انگلینڈ اور امریکہ کے سفارتی تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔انور نے اس سے پوچھا کہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کا تار روک لیا گیا ہے۔ملس نے اسے بتایا کہ بہت سویرے ایک گمنام پرچی ملی تھی۔ جس پر لکھا تھا''آپ کی رپورٹ سنسر نے روک لی ہے، ہوم سکریٹری سے بات کر لیجیے۔''جب اس نے ہوم سکریٹری کو ٹیلیفون کیا تو سامراج کے اس بھاری بھرکم ستون نے نہ صرف یہ مان لیا کہ اس کا تار روک لیا گیا ہے بلکہ ملس سے یہ کہنے کی ہمت بھی کی کہ اس کی رپورٹ میں سچائی کو توڑ مروڑ کر اور بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

''اس کی یہ مجال کہ مجھ سے یہ کہے۔''بوڑھے نے گرج کر کہا۔''مجھ سے— رابرٹ ملس سے— میں جو کہ پانچ براعظموں میں خبروں کو بچ بچ بلکہ کچھ کم کر کے ہی بیان کرنے کے لیے مشہور ہوں۔''

انور کو اس بپھرے ہوئے امریکی اخبار نویس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کافی وقت لگا اور اس بیچ میں اسے کئی گلاس شربت بھی پلانا پڑا۔تھوڑی دیر بعد انور نے اس سے کہا،''رابرٹ' تم اسے ڈاک سے کیوں نہیں بھیج دیتے؟ اگر ڈاک ہوائی جہاز سے بھیجنے کا انتظام ہوتا تو کتنا اچھا ہوگا......''

''میری سمجھ میں آ گیا۔'' یکا یک ملس اچھل پڑا۔ ''بس اب کچھ نہ کہنا۔ تم نے مجھے ایسی ترکیب سمجھادی ہے کہ میں ان اندھے لوگوں کے دماغ ٹھکانے لگادوں گا۔ ذرا مجھے ٹیلیفون تو دینا۔''

اس نے پھر ہوم سکریٹری کا نمبر ملایا۔ ''میں پھر رابرٹ ملس بول رہا ہوں...... یس...... جی ہاں، اپنی اسی رپورٹ کے بارے میں جسے سنسر نے روک لیا ہے...... جی ہاں...... لیکن اگر میں ایک پرائیوٹ ہوائی جہاز چارٹر کر کے ایران چلا جاؤں اور وہاں سے اپنا تار بھیجوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اور اس کے بعد میں یہ بھی جوڑ دوں کہ ہندوستان میں اسے سنسر نے روک لیا تھا...... جی نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ دراصل میں ایرڈرم ہی جا رہا تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو بتادوں شاید آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو...... کیا کہا؟...... رپورٹ؟...... جی ہاں، میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور میں نے جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے وہی لکھا ہے۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو میں نے سچائی کو کچھ گھٹا کر ہی پیش کیا ہے...... تو آپ اُسے جانے دیں گے؟...... آپ کا بہت بہت شکریہ......''

''تار بھیج دیا جائے گا۔'' ملس نے بتایا۔ لیکن اس کے بعد ہوم سکریٹری بہت دیر تک ٹیلیفون پر کچھ کہتا رہا جسے سن کر ملس کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔

دوسرے دن انور کو اس کے ابا کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس کی چچازاد بہن بلقیس کی شادی سلام پور کے نواب صاحب کے بیٹے کے ساتھ ہوگئی ہے اور چونکہ وہ چھوٹے نواب کی عیاشی سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اسے یہ خبر سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ سوچنے لگا بیچاری بلقیس سونے کے پنجرے میں بند ہوگئی۔ پشاور سے یونس کا خط آیا تھا جس میں اس نے خان عبدالغفار خاں کے بارے میں لکھا تھا، جن کا نام پٹھانوں نے بڑے پیار سے بادشاہ خاں رکھ دیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

> ''بادشاہ خاں نے ہم پٹھانوں میں ایک نئی ہمت پھونک دی ہے۔ یہ ہمت کہ ہم اپنی جان دے دیں لیکن نہ تو دشمن کو پلٹ کر ماریں نہ اس سے ڈریں۔ کاش تم دیکھ پاتے کہ انھوں نے پٹھانوں کو کتنا بدل دیا ہے۔'' ییزواڑہ جیل سے سندرم کا خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے لوگوں کو سرکار کے خلاف

بھڑکانے کے جرم میں دوسال کی سزا ہوگئی تھی۔

اس نے دوسرا خط اٹھایا اور جب اس نے اس پر لکھائی دیکھی تو اس کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ سلمٰی کا خط تھا جو دلّی کے پتے پر گیا تھا اور اس کے ابّا نے اسے بمبئی بھیج دیا تھا۔ آخرکار اس نے خط لکھا۔ اس نے اس بات کی معافی مانگی ہوگی کہ وہ اسے ٹھیک سے پہچان نہ سکی اور شاید اس نے پھر اپنی محبت کا یقین دلایا ہوگا۔ لفافہ کھولتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے......

''انور۔'' ملس نے ایک موٹے کاغذ کے لیٹر ہیڈ پر چھپے ہوئے خط پر سے نظر اٹھا کر اس سے کہا، ''سارے ملک کا چکّر لگانے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ میرے اخبار والوں نے لکھا ہے کہ میں تمھاری اس انوکھی لڑائی کے ہر مورچے پر جا کر وہاں کی خبریں بھیجوں۔''

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس نے ملس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنے ہاتھ کے خط دیکھ رہا تھا۔ وہ خط نہیں تھا۔ خوب صورت کاغذ پر سنہرے حرفوں میں چھپا دعوت نامہ تھا۔ پروفیسر محمد سلیم نے اسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس مسٹر منظور احمد کے ساتھ اپنی سلمٰی کی شادی کے مبارک موقع پر 10 مئی 1931 کو اپنی کوٹھی سلیم منزل، میرس روڈ علی گڑھ پر دعوت میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔

○

دنیا کا خاتمہ؟

(1)

انور کئی مہینوں کے لیے دورے پر جانے والا تھا اس لیے وہ ماں جی اور موہن سے ملنے گیا لیکن وہ دونوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ شاید کانگریس کے کسی کام سے گئے ہوں گے۔ مایوس ہوکر وہ وہاں سے واپس آرہا تھا کہ اتنے میں ایک نوکر نے آکر اس سے کہا کہ سیٹھ جی اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ انور کو تعجب ہوا۔ پہلی بار سیٹھ مانک لال نے اس میں دلچسپی دکھائی تھی۔ آخر وہ اس سے کیا باتیں کرنا چاہتے تھے؟ وہ ڈر رہا تھا کہ سیٹھ جی اس پر اپنا رعب جھاڑیں گے اور اس سے اس طرح سے باتیں کریں گے جیسے وہ ان کے سامنے بہت ہی گھٹیا آدمی ہو۔ انور کو ان کے بات کرنے کے اس ڈھنگ سے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی مگر جانے سے انکار کرنا بھی تو بہت بدتمیزی ہوتی۔ آخر وہ ان کے گھر میں ہفتہ بھر تک مہمان رہ چکا تھا اور ان کا ''نمک کھا چکا تھا'' پھر اسے یہ جاننے کی بھی خواہش تھی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ انھوں نے صرف خوش اخلاقی سے اسے بلا لیا تھا یا انھیں اس سے کوئی ضروری بات کہنی ہے؟

وہ اس کمرے میں گیا جو ان کا ''پڑھنے کا کمرہ'' کہلاتا تھا۔ حالانکہ وہاں جو بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں وہ صرف سجاوٹ کے لیے منگائی گئی تھیں۔ وہ شاید ہی کبھی الماری میں سے نکالی جاتی

ہوں اور سیٹھ جی تو خیر کبھی کوئی کتاب چھوتے ہی نہیں تھے کیونکہ ان کی ادبی دلچسپی ''ٹائمز آف انڈیا'' کے مالی اور تجارتی صفحوں تک ہی محدود تھی۔ سیٹھ مانک لال نے جو بڑھیا چینی سلک کا کرتا اور ململ کی دھوتی پہنے تھے اور جن کی تین ہیرے کی انگوٹھیاں اور دو سونے کے دانت چمک رہے تھے، کرسی سے اٹھ کر بڑے تپاک سے انور کا استقبال کیا۔ پہلے تو انھوں نے انور سے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر یہ پوچھا کہ وہ مانک مینشن چھوڑ کر تاج میں کیوں رہنے لگا تھا، وہاں تو اس کا پیسہ بیکار ہی خرچ ہوتا ہوگا۔ انور نے انھیں بتایا کہ مسٹر ملس کو جن کے ساتھ وہ کام کرتا تھا، وہاں ہر وقت اس کی ضرورت رہتی ہے اور رہی خرچ کی بات تو وہ امریکن نیوز ایجنسی دیتی ہے۔ اس بات کا سیٹھ جی پر کافی رعب پڑا۔ کروڑ پتی سیٹھ جی کی نظروں میں انور کی عزت بڑھ گئی۔ کیونکہ وہ ہر آدمی کو پیسوں کے معیار سے جانچتے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اس امریکن جرنلسٹ کے ساتھ کام کرنے کے دوران تم بہت سے کانگریسی لوگوں سے بھی ملتے ہوگے؟ میں نے سنا ہے کہ تم گاندھی سے، میرا مطلب ہے مہاتما جی سے بھی مل چکے ہو اور ان سے باتیں کر چکے ہو۔''

انور نے اقرار کر لیا کہ ہاں اسے یہ خوش قسمتی حاصل ہو چکی ہے۔

''اور تمھیں بہت سی ایسی باتوں کا بھی پتہ ہوگا جن کی خبر بھی ہمیں نہیں ہوتی؟''

اس پر اس آدھے اخبار نویس نے (انور اپنے آپ کو اب آدھا اخبار نویس کہنے لگا تھا) جواب دیا کہ جو کچھ وہ دیکھتا یا سنتا تھا وہ سب اخباروں میں بھی چھپ جاتا تھا۔

سیٹھ جی نے سوچا کہ انور اپنی انکساری کی وجہ سے ہی ایسا کہہ رہا ہے اور انھوں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ اخبار نویسوں کو ہمیشہ اس سے زیادہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جتنی کہ وہ اخباروں میں چھاپتے ہیں۔ ''بات یہ ہے'' انھوں نے اپنا مقصد سمجھاتے ہوئے کہا، ''میں کانگریس کے بارے میں اور اس تحریک کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو کہ — میرا مطلب ہے — مہاتما جی نے شروع کر رکھی ہے۔''

انور سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سیٹھ جی کے دل میں کوئی تبدیلی آگئی ہو اور وہ دیش بھگت بنتے جا رہے ہوں۔ اس نے کہا ''آپ کے اپنے گھر میں تین پکے کانگریسی ہیں جو

شاید آپ کو ان باتوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ بتا سکتے ہیں۔"

"ارے وہ لوگ!" سیٹھ جی نے کافی حقارت آمیز لہجے میں کہا "میرے بیوی تو ہر بات کو مذہبی کام سمجھ کر کرتی ہے اور اس لیے وہ گاندھی جی کو دیوتا کی طرح پوجتی ہے۔ آشا بالکل بچی ہے اور اسے سیاست کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے حالانکہ وہ جیل بھی چلی گئی ہے اور موہن — موہن کے لیے یہ سب ایک تماشہ ہے، ایک نیا فیشن ہے۔" حالانکہ سیٹھ جی نے اپنے خاندان کے سب ہی آدمیوں کے بارے میں بہت سخت باتیں کہی تھیں لیکن ان کی سیاست کے بارے میں انھوں نے کافی سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کی تھی۔

"آپ کیا بات جاننا چاہتے ہیں؟" انور نے آخر کار پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمھاری رائے میں کیا یہ تحریک چلے گی یا سیاسی آتش بازی کی طرح کچھ دن بعد ٹھنڈی پڑ جائے گی؟ یا یوں سمجھ لو، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کانگریس کے پیچھے اتنی طاقت ہے کہ وہ سرکار پر کافی دن تک دباؤ ڈال سکے؟ "ٹائمز آف انڈیا" کا تو کہنا ہے کہ کانگریس کے ساتھ کچھ مٹھی بھر سر پھرے، کچھ ایسے لوگ جن کے پاس سیاست کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور کچھ غیر ذمہ دار نوجوان ہی ہیں۔"

انور نے انھیں بتایا کہ ٹائمز آف انڈیا جیسے اخبار سے جس کے مالک انگریز ہیں اور جو سرکار کا پٹھو ہے، یہ امید ہی کرنا بیکار ہے کہ وہ کبھی بھی اس بات کو مانے گا کہ زیادہ تر لوگ کانگریس کے ساتھ ہیں — لیکن یہ حقیقت ہے۔ چونکہ انور جانتا تھا کہ سیٹھ مانک لال جیسے لوگ غیر ملکی لوگوں کی رائے کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اس لیے اس نے کہا "اور صرف یہ میری یا مسٹر ملس کی ہی رائے نہیں ہے بلکہ اس وقت ہندوستان میں بدیسی اخباروں کے جتنے نامہ نگار ہیں — کیا انگریز کیا امریکن — ان میں سے تقریباً سب ہی کی یہ رائے ہے۔"

"اچھا!" سیٹھ جی کو سچ مچ تعجب ہوا اور ساتھ ہی ان پر اس بات کا رعب بھی پڑا۔

"ان میں سے ایک انگریز نامہ نگار نے تو، جو کئی مہینے سے ہندوستان میں ہے، اپنے اخبار میں یہاں تک لکھا ہے کہ 'جیل میں بند مہاتما گاندھی اب ہندوستان کی اصل آتما ہے، اور ایک دوسرے نامہ نگار نے امریکی اخباروں میں لکھا ہے کہ آج ہندوستان میں سرکار کے مقابلے میں

کانگریس کی بات زیادہ مانی جاتی ہے۔''

یہ بات سن کر تو ''ٹائمز آف انڈیا'' پڑھنے والے سیٹھ جی کا رہا سہا شک بھی دور ہو گیا۔ انھوں نے اپنے کاغذوں میں سے ایک چھپا ہوا فارم نکال کر پوچھا ''تو پھر تمھاری کیا رائے ہے، میں اس اقرار نامے پر دستخط کر دوں؟''

انور نے فارم لے کر دیکھا۔ اس نے اس فارم کے بارے میں سن تو رکھا تھا پر دیکھنے کا موقع پہلی بار ملا تھا۔ یہ ایک اعلان تھا جس پر کانگریس ہندوستانی کپڑا ملوں کے مالکوں سے دستخط کرانا چاہتی تھی۔ یہ اعلان ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا ''ہمیں عوام کی قومی توقعات سے پوری ہمدردی ہے۔'' اس اعلان کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس بات کا پورا انتظام کر لیا جائے کہ ملیں پوری طرح ہندوستانی کاروباروں کی شکل میں چلائی جائیں گی، ان میں صرف ہندوستانیوں کو نوکر رکھا جائے گا اور وہ صرف ہندوستانی بیمہ کمپنیوں، ہندوستانی بینکوں اور ہندوستانی جہازوں کی کمپنیوں کے ساتھ تجارتی لین دین رکھیں گی، لیکن ساتھ ہی اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی جس میں مل مالکوں سے یہ اعلان کرنے کو کہا گیا تھا کہ وہ سودیشی کے پرچار میں مدد دیں گے جس کے لیے سب سے پہلے تو مل کے بنے ہوئے کپڑے اور کھادی کی آپس کی مقابلہ بازی کو ختم کریں گے اور دوسرے کپڑے کی قیمتیں بڑھا کر یا اس کی ''کوالٹی'' گرا کر اس تحریک سے پیدا ہونے والی حالت کا فائدہ خود اپنے حق میں نہیں اٹھائیں گے۔

''بولو تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا ہم اپنے موت کے پروانے پر خود دستخط کر دیں؟''

''میرے خیال میں تو آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ جن ملوں کے مالک اس پر دستخط نہیں کریں گے ان کی فہرست تیار کی جا رہی ہے اور بدیسی کپڑے کی طرح ہی ان کے مال کا بھی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ اسی لیے زیادہ تر لوگوں نے دستخط کر دیے ہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس طرح اپنے آپ کو کسی سیاسی پارٹی کے ہاتھوں بیچ دینا مناسب ہوگا؟''

انور نے سیٹھ جی کی ہمت افزائی کے لیے کہا ''میری رائے میں تو آپ کو اس پر دستخط کر دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بہرحال گاندھی جی کچھ بھی کہیں پر ہاتھ کے بُنے ہوئے

کپڑے سے تو ملک کی کپڑے کی آدھی ضرورت بھی پوری نہیں ہوگی۔ اور جب بائیکاٹ ہوگا تو ہندوستانی ملوں کا کاروبار چمک اٹھے گا۔ رہا کسی پارٹی کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دینے کا سوال، تو میرے کچھ کمیونسٹ ساتھیوں کا تو یہ خیال ہے کہ مل مالک کانگریس کو خرید ے لے رہے ہیں۔ آپ کے لیے یہ سودا برا نہیں رہے گا۔''

''دیکھنا یہ ہے کہ کانگریس کتنے دن تک اس طرح اپنی تحریک چلا سکتی ہے۔'' سیٹھ مانک لال نے آہ بھر کر شک بھرے لہجے میں کہا'' کاش مجھے کسی طرح یہ یقین ہو جاتا کہ یہ گھوڑا جیتے گا۔''

'' آپ میری بات مانئے' اس گھوڑے پر داؤ لگائیے، آج کی سب سے اچھی ''بیٹ'' یہی ہے۔'' انور نے بھی بمبئی آنے کے بعد سے گھوڑے دوڑ کے کچھ لفظ سیکھ لیے تھے۔'' اچھا، اب میں چلوں گا۔ ماں جی سے میرا اسلام کہیے گا۔''

اپنی بیوی کے ذکر سے مانک لال سیٹھ کچھ خوش نہیں ہوئے اور انھوں نے کچھ اداس ہو کر دھیمی آواز میں کہا'' اچھا کہہ دوں گا جب ملاقات ہوگی۔'' انور جانتا تھا کہ ماں جی سے ان کی ملاقات تو اب اگلے دن صبح ہی ہوگی۔

(2)

دوپہر کو جب انور تاج محل ہوٹل پہنچا تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور ملس ڈائننگ روم میں جا چکا تھا۔ انور نے دیکھا کہ وہ وہاں سنہری بالوں والے کسی اجنبی کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے جس کے ماتھے کی چوڑائی دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت عالم فاضل ہے، اس کے داڑھی تھی جس کے بال کچھ کچھ لال تھے۔ انور اسے کوئی پروفیسر سمجھ رہا تھا لیکن تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ لندن کے اخبار ''ڈیلی ہیرالڈ'' کا خاص نامہ نگار جارج سلوکومب تھا۔ رابرٹ اور سلوکومب پرانے دوست تھے اور وہ دنیا کے کئی گڑبڑ والے علاقوں میں ساتھ رہ چکے تھے اور اس وقت وہ پیرس کی امن کانفرنس، لینن، ٹرائسکی، لائیڈ جارج اور برپاں کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو دہرا رہے تھے۔ انور جانتا تھا کہ سلوکومب کا اخبار ایک طرح سے لیبر پارٹی کا سرکاری اخبار مانا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں یہی لیبر پارٹی ہندوستان کے قوم پرستوں کی خواہشات سے گہری ہمدردی رکھتی تھی لیکن جب سے کچھ ووٹوں کی اکثریت سے اس نے اپنی سرکار بنالی تھی تب سے اس نے بھی

ہندوستان اور نو آبادیات کی طرح وہی پرانی ''ٹوری'' پالیسی اپنائی تھی اور ہندوستان کے قوم پرست اخبار ''دغاباز'' لیبر پارٹی والوں کی سخت تنقید کرتے تھے جو ایک زمانے میں سماج وادی وادا اور سبھی ملکوں کی برابری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اب اسی پرانے سامراج کے راستے پر چل رہے تھے۔ کانگریس کے ایک روزانہ اخبار نے اپنے اداریے میں لکھا تھا۔ ''ہندوستان کو آزادی دینے سے انکار کر کے لیبر پارٹی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ انگریز بھی جو سماج وادی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، دل میں سامراج وادی ہیں۔''

انور بھی جلا بیٹھا تھا۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اب جب کہ اس کی میز پر برطانیہ کی حکمران پارٹی کا ایک نمائندہ بیٹھا ہے وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن سلوکومب بہت دنیا دیکھے ہوئے تھا اور اس کے خیالات بندھنوں میں جکڑے ہوئے نہیں تھے۔ اس کا رویہ بھی سامراج وادیوں جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنے ہندوستان کے عجیب سفر کا ذکر جس شاندار طریقے سے کر رہا تھا اسے سیاسی بحث کے رخ میں موڑنا بہت مشکل تھا۔ وہ انھیں بتا رہا تھا کہ کچھ ہی گھنٹوں کی نوٹس پر وہ پیرس سے جہاں وہ نامہ نگار کی حیثیت سے مقیم تھا، بھاگ کر لندن پہنچا تھا اور وہاں سے ڈاک لے جانے والے ہوائی جہاز پر سوار ہوا تھا۔ جہاز ایک بھیانک طوفان میں پھنس گیا تھا اس لیے انھیں رات جرمنی، نورم برگ میں بتانی پڑی تھی۔ اس نے لگے ہاتھوں یہ بھی بتایا کہ ''دوسرے دن ناشتے کے وقت ہم ویانا پہنچے، دوپہر کے کھانے کے وقت بڈاپسٹ اور رات کا کھانا بلگریڈ میں۔'' ہوائی جہاز پر یونان سے ہوتا ہوا وہ قاہرہ پہنچا تھا اور وہاں سے موٹر پر پورٹ سعید جا کر اس نے ہندوستان جانے والا پانی کا جہاز پکڑا تھا۔ اس منجھے ہوئے نامہ نگار نے جس آسانی کے ساتھ ان تمام انوکھی جگہوں کے نام گنائے تھے اس سے انور میں بہت ہیجان پیدا ہوا تھا کیونکہ دل ہی دل میں وہ بھی اسی طرح صحافت کے سلسلے میں ایسے انوکھے کارنامے انجام دینا چاہتا تھا۔

اتنے میں کافی آ گئی اور کافی پیتے ہوئے سلوکومب انھیں بتانے لگا کہ اسے اس بات کا تو پورا یقین تھا کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگ گاندھی جی کے اشارے پر چلتے ہیں لیکن — یہ کہہ کر اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا — وہ پھر بھی ان سے کچھ سوال پوچھنا چاہے گا۔

اس نے پوچھا'' کیا گاندھی جی نے اس امکان کو بالکل ٹھکرادیا ہے کہ مکمل آزادی کے اس مقصد کی بجائے جو صرف ایک دور کا تصور ہے، ہندوستان کو کافی حد تک حکومت کی خود اختیاری دے دی جائے؟ مطلب یہ کہ وہ کس قیمت پر سول نافرمانی کی تحریک واپس لے سکتے ہیں؟ ستیہ گرہ کی تحریک واپس لینے کے لیے اور آنے والے موسم خزاں میں لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے وہ کیا شرطیں رکھنا چاہتے ہیں؟''

سلوکومب کے اس اشارے پر کہ گاندھی جی کانگریس کی آزادی کی بنیادی مانگ سے کم پر بھی سمجھوتہ کرنے کو راضی ہو سکتے ہیں، انور کو کچھ غصہ آگیا اور اس نے جھنجھلا کر کہا'' گاندھی جی نے اور کانگریس نے ہندوستان کے عوام کی طرف سے اپنی مانگیں رکھ دی ہیں۔ اب انگریز سرکار کو بلکہ برٹش عوام کو ہماری مانگوں کا جواب دینا ہے۔ اگر ان کے پاس پولیس کے ڈنڈوں کے علاوہ کوئی دوسرا جواب ہو۔''

سلوکومب نے انور کی اس جھنجھلاہٹ کا برا نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ اس نے پولیس کو ڈنڈے برساتے دیکھا تھا اور ایک انگریز ہونے کے ناطے وہ اس پر بہت شرمندہ تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں بہت سے اور لوگ بھی چاہتے ہیں کہ موجودہ حالت ختم ہو اور اسی لیے وہ اپنے سوالوں کے جواب جاننا چاہتا ہے۔

''ان کے جواب تو گاندھی جی ہی دے سکتے ہیں اور وہ جیل میں بند ہیں اور مجھے یقین ہے کہ سرکار ان سے یہ سوال پوچھنے کا موقع نہیں دے گی۔''

اس بات کا سلوکومب نے جو جواب دیا اس پر دوپہر کے کھانے کے وقت کی یہ گفتگو ختم ہوگئی۔ اس نے کہا'' مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے۔''

(3)

کچھ دن بعد ملس نے کہا۔ ''انور، ہم لوگ ابھی اپنا سارے ملک کا دورہ کچھ دنوں کے لیے ٹال دیں۔ جلد ہی سمجھوتے کی بات چیت شروع ہوگی اور اس سلسلے میں کچھ قدم اٹھائے جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے بمبئی ہی میں رہنا بہتر ہوگا۔ اپنا دوست جارج جیل میں

گاندھی جی سے انٹرویو کرنے جا رہا ہے۔''

''رابرٹ، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' انور اس بات پر یقین کر ہی نہیں سکتا تھا کہ سرکار ایک ایسے قیدی کو جس پر حکومت کے ساتھ بغاوت کرنے کا الزام لگایا گیا تھا جیل میں انٹرویو دینے کی اجازت دے گی جو اخباروں میں چھاپا جائے۔

''انور کسی بات کا اتنا زیادہ یقین نہ کرو، عورتوں کی طرح سرکاروں کی بھی رائے ذرا سی دیر میں بدل جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلوکومب کو اجازت مل گئی ہے اور وہ پونہ چلا گیا ہے۔''

''اگر مسٹر سلوکومب گاندھی جی سے جیل میں مل سکتے ہیں تو آپ بھی انٹرویو کے لیے عرضی کیوں نہیں دیتے؟ ایک انگریز کے مقابلے میں ایک امریکی نامہ نگار سے زیادہ کھل کر اپنی بات کہہ سکیں گے۔''

''اسی وجہ سے تو شاید سرکار میری عرضی کو اتنی آسانی سے منظور نہ کرے۔ مجھے تو یہ یقین نہیں ہے کہ سلوکومب صرف ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ان سے ملنے گیا ہے۔ اس میں شاید کوئی سیاسی چال بھی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے اخبار سے ہے جو برطانیہ کے حکمرانوں کا سرکاری اخبار ہے اور اگر وہ اپنی مرضی سے بھی آیا ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ بمبئی کی سرکار اسے برٹش سرکار کا کسی قسم کا سفیر یا نمائندہ سمجھے گی۔''

''مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی'' انور نے اقرار کیا۔''وہ شاید گاندھی جی کو اس بات کے لیے راضی کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اپنی آزادی کی مانگ کو کچھ کم کر دیں اور ڈومنین اسٹیٹس یا اسی قسم کی کسی چیز کے لیے راضی ہو جائیں۔''

''وہ اس بات کی کوشش تو کر سکتا ہے۔'' ملس نے اپنی رائے ظاہر کی، ''لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ گاندھی جی بھی اس کی بات مان ہی لیں۔''

''کہہ نہیں سکتا، گاندھی جی بہت سیدھے آدمی ہیں، سیاست کے یہ داؤ پیچ ان کے بس کے نہیں ہیں اور انگریز بہت چالاک ہیں۔''

''ابھی سے ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ملس نے صلاح دی'' دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔''

اگلے دن سلوکومب پونہ سے واپس آ گیا اور چونکہ اخباروں میں گاندھی جی سے اس کے انٹرویو کے بارے میں کچھ نہیں چھپا اس لیے انور نے یہ مان لیا کہ وہ گاندھی جی کو سمجھوتے کے لیے راضی کرنے میں ناکامیاب رہا تھا، اور یہ سوچ کر اس کے دل کو راحت ہوئی۔ اس نے ملس سے کہنا شروع کیا کہ اب وہ اپنا دورہ شروع کر دیں۔ وہ ایک اور وجہ سے بھی گھومتے رہنا چاہتا تھا۔ سلمٰی کی شادی کی خبر سے اس کے دل کو بہت صدمہ پہنچا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سفر کرتے رہنے سے نئی نئی جگہیں دیکھنے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے سے شاید اس کی یہ بے چینی کچھ کم ہو۔

ملس بمبئی سے چل دینے پر کچھ کچھ راضی ہو گیا تھا۔ لیکن اتنے میں ایک دن غیر یقینی واقعہ ہوا۔ ایک دن ''انڈین ڈیلی میل'' نامی اخبار نے گاندھی جی کے ساتھ سلوکومب کے دوسرے انٹرویو کی رپورٹ چھاپ دی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے اپنی مانگیں کافی کم کر دی تھیں، جس کا کہ انور کو ڈر تھا۔ سلوکومب کے مطابق چار شرطوں پر ''گاندھی جی کانگریس کو سول نافرمانی کی تحریک کو واپس لے لینے اور گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کی صلاح دینے کو تیار ہیں۔'' اور ان میں سے سب سے اہم شرط میں یہ کہا گیا تھا کہ ''گول میز کانفرنس میں جن مسائل پر غور کیا جائے ان میں ایک ایسا دستور بنانے کا سوال بھی شامل کیا جائے جس کے ذریعے ہندوستان کو آزادی کا بنیادی حق مل جائے۔''

''دیکھا آپ کے دوست نے کیا کیا؟'' انور نے ملس کو اخبار دکھاتے ہوئے کہا جو ابھی تک بستر سے اٹھا نہیں تھا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر گاندھی جی ان سب باتوں کے لیے راضی کیسے ہو گئے۔''

''بڈھے نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ کیا ہوگا۔'' ملس نے انور کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''وہ بھی کوئی نادان تو ہیں نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مہاتما جی اپنی انکساری سے جیت لینے کے لیے ہی جھک رہے ہیں۔''

لیکن انور نے اپنے دل کو ہمت بندھانے کا دوسرا ہی طریقہ نکال لیا تھا۔ ''اگر مہاتما جی سمجھوتہ کرنے کو تیار بھی ہیں، تب بھی انگریزوں کو ہمارے جواہر سے نبٹنا پڑے گا۔ یہ نہ بھولو کہ وہ کانگریس کے صدر ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مکمل آزادی اور انگریزوں سے بالکل ناطہ

توڑ لینے سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہیں ہوں گے۔"

ملس نے انور کے اس بھولے پن پر مسکرا کر صرف اتنا کہا۔"انور، سیاست میں کسی بات پر اتنا یقین نہیں رکھنا چاہیے۔"

(4)

موہن نے ٹیلیفون کر کے انور کو کچھ باتیں کرنے کے لیے بلایا۔ انور نے دیکھا کہ موہن کے دماغ میں طرح طرح کے غلط خیالات تھے اور ایک ایک کر کے اس کے جو دوسرے دوست آتے گئے وہ بھی سمجھوتے کے اس پلان کی کڑی تنقید کر رہے تھے جس کا ذکر سلوکومب کے انٹرویو میں کیا گیا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ بیٹھے بیٹھے کرسی توڑنے والے ان انقلابیوں کے سامنے جن میں سے زیادہ تر کافی رئیس گھرانوں کے بگڑے ہوئے لڑکے تھے جو کبھی ایک دن جیل میں نہیں رہے تھے اور جنھوں نے ایک بھی لاٹھی نہیں کھائی تھی۔ انور گاندھی جی کے خلاف ان کے جملوں کا جواب دے رہا تھا۔"آخر بڈھا کوئی نادان تو ہے نہیں۔" انجانے میں انور ملس کی ہی دلیل دہرا رہا تھا۔"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مہاتما جی جیت حاصل کرنے کے لیے ہی جھک رہے ہوں اور یہ ظاہر کر کے کہ وہ سمجھوتے کے لیے تیار ہیں، وہ ساری دنیا کے سامنے انگریز سرکار کو مجرم ٹھہرا رہے ہوں۔"

جب سب لوگ چلے گئے تو وہ گھر کی باتیں کرنے لگے۔ آشا کو چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی اور اس نے ماں جی کو لکھا تھا کہ وہ اچھی طرح ہے اور شمالی ہندوستان کی ایک دوسری والنٹیر سے ہندی پڑھنا سیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد انور نے پوچھا"تم نے سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر سنی؟ پاپا نے اس اقرار نامے پر دستخط کر دیے جس پر دستخط کرنے کے لیے کانگریس سب ہی مل مالکوں پر زور ڈال رہی ہے۔"

انور نے موہن کو بتایا کہ اس کی اس بارے میں اس کے پاپا سے بات ہوئی تھی۔"میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ ان کا دل بدلنے والا ہے۔"

"دل ول کچھ نہیں بدلا ہے۔" بیٹے نے اپنے باپ کے بارے میں بے ادبی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔"یہ سب کچھ ماں جی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

''وہ کیسے؟''

''تمھیں معلوم نہیں؟ ماں نے دھمکی دی تھی کہ اگر انھوں نے دستخط نہیں کیے تو وہ ان کی مل کے سامنے بھوک ہڑتال کر دیں گی۔ جب ان کے شوہر خود غداری کر رہے ہوں تو وہ دوسروں کی ملوں کے آگے دھرنا کیسے دے سکتی تھیں۔''

انور کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ صرف اپنی بیوی کی بھوک ہڑتال سے ڈر کر سیٹھ مانک لال جیسے کائیاں آدمی نے اپنی رائے بدل دی ہوگی۔ جب موہن نے اسے بتایا کہ انھوں نے نہ صرف دستخط کر دیے تھے، بلکہ وہ کانگریس کے ممبر بھی بن گئے ہیں اور انھوں نے کھدر پہننا بھی شروع کر دیا ہے تو اسے یقین ہو گیا کہ سیٹھ مانک لال نے اپنا مطلب دیکھ کر ہی دستخط کیے ہوں گے، حالانکہ یہ بات اس نے موہن سے کہی نہیں۔

انور نے بس اتنا کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ سودا ان کے لیے برا نہیں رہے گا۔'' جب موہن نے اس کی اس بات کا مطلب پوچھا تو اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا اشارہ اس بات چیت کی طرف تھا جو سیاسی پارٹیوں کو ''خریدنے'' کے امکانات کے بارے میں اس نے سیٹھ مانک لال سے کی تھی۔

(5)

انور اور اس کے جیسے ہزاروں دوسرے نوجوانوں کو جس سمجھوتے کا ڈر تھا، وہ ہوا نہیں، کیونکہ گاندھی جی نے جو تجویز رکھی تھی اس کا انگریز سرکار کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کچھ دن تک تو یہ لوگ انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے اور جگہ جگہ ستیہ گرہ کی تحریک بھی کچھ دیر کے لیے ٹھنڈی پڑ گئی۔ لیکن جب کچھ بھی نہیں ہوا تو تحریک پھر شروع ہو گئی۔ دھرسانا کے سمندر کے ساحل پر جہاں سے ستیہ گرہی نمک بٹورتے تھے ایک میدان جنگ بن گیا جہاں نہتے ستیہ گرہیوں اور ہتھیار بند پولیس والوں کے درمیان روز ٹکر ہوتی تھی۔ غیر ملکی نامہ نگاروں کی اب بمبئی میں کوئی کمی نہیں تھی، ان ہی کے گروپ کے ساتھ انور اور ملِس دھرسانا گئے۔ موٹر کا یہ لمبا اور تکلیف دہ سفر بیکار نہیں گیا کیونکہ وہاں پہنچ کر ان کی ملاقات شریمتی سروجنی نائیڈو کے ساتھ ہوئی جو سیاست داں ہونے کے ساتھ ہی شاعرہ بھی تھیں، اور فصیح البیان مقرر بھی۔ ستیہ گرہ کے دوسرے

لیڈروں کے ساتھ گرفتار ہونے کے آدھے گھنٹے پہلے تک وہ اپنی دلچسپ باتوں سے سب لوگوں کو ہنسا رہی تھیں۔ اس کے بعد والنٹیئروں پر بڑی بے رحمی سے لاٹھیاں برسائی جانے لگیں۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ کر کچھ نامہ نگار تو سناٹے میں آ گئے کیونکہ پولیس کے ظلم کے بارے میں جو باتیں انھوں نے اب تک سنی تھیں ان پر وہ یقین نہیں کرتے تھے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گھوڑسوار گورے افسر ستیہ گرہیوں کے بیچ سے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے گذر گئے اور بہت سی عورتوں اور بچوں کو انھوں نے روندڈالا۔ انور نے دیکھا کہ باحس امریکی اخبار نویس ویب ملر اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ بعد میں بمبئی واپس پہنچ کر انور نے ملر کو تاج کے لاؤنج میں کسی سے کہتے سنا کہ وہ اٹھارہ برس سے نامہ نگار کا کام کر رہا تھا اور اس سلسلے میں وہ درجن ملکوں میں ہو آیا تھا لیکن اس نے دھرساناجیسا خوفناک منظر آج تک نہیں دیکھا تھا۔

ایک انگریز بھی اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے بہت فکر مند ہو کر پوچھا ''لیکن ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں تم اخبار میں لکھو گے نہیں۔'' اور یہ سن کر ہمیشہ نرمی سے بولنے والا ملر گرج پڑا۔ 'لکھوں گا کیوں نہیں۔ اور میں یہاں آیا کس لیے ہوں؟''

کچھ دن بعد پنڈت موتی لال نہرو بمبئی آئے۔ ان دنوں وہ جیل میں بند اپنے بیٹے کی جگہ پر کانگریس کے صدر تھے۔ بمبئی میں پنڈت موتی لال کا جیسا شاندار استقبال ہوا ویسا کبھی بڑے بڑے راجوں مہاراجوں کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ دوسرے نامہ نگاروں کے ساتھ انور بھی موتی لال جی سے ملنے گیا۔ انھوں نے بونڈ اسٹریٹ کے سلے ہوئے سوٹ چھوڑ کر اب کھدر کے کپڑے پہننا شروع کر دیا تھا لیکن کھدر کے کپڑوں میں بھی وہ خاندانی رئیس معلوم ہوتے تھے۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور مست قسم کے آدمی تھے۔ بدیسی نامہ نگار ان سے گھل مل گئے۔ گاندھی جی کے بزرگانہ اور مقدس رویے کے مقابلے میں انھیں موتی لال جی کا رئیسانہ ٹھاٹ باٹ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتا تھا۔ اس موقع پر ضعیف وٹھل بھائی پٹیل بھی موجود تھے۔ ہوا میں اڑتی ہوئی ان کی وہ سفید نورانی داڑھی انور کو ابھی تک یاد تھی۔ اس نے انھیں اس دن جب بھگت سنگھ نے بم پھینکا تھا، لیجسلیٹیو اسمبلی میں صدارت کرتے ہوئے دیکھا تھا، انھیں دیکھ کر انور کو اس انقلابی کی یاد آ گئی جس کی آنکھوں میں شاعروں جیسی ملائمت تھی اور جس کے سر پر موت کا بھیانک سایہ

منڈلا رہا تھا۔ اس پر سازش کا جو مقدمہ اتنے دن سے چل رہا تھا وہ اب ختم ہونے والا تھا اور یہ تقریباً طے تھا کہ اسے پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

ان لیڈروں سے مل کر اخبار نویس جب باہر نکل رہے تھے اسی وقت باہر موٹر آ کر رکی اور ریشمی سوٹ پہنے ہوئے ایک شخص، جو دیکھنے میں کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا، اس میں سے اترا۔ ایک مقامی اخبار نویس نے انور کو بتایا کہ وہ اعتدال پسندوں کے لیڈر ایم۔ آر جیکر تھے جو سمجھوتے کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جارج سلوکومب بھی اس کام میں ان کے ساتھ تھا کیونکہ اور اخبار نویسوں کے چلے آنے کے بعد بھی وہ جیکر صاحب سے کچھ باتیں کرتا رہا اور ان کے ساتھ پھر موتی لال جی سے ملنے گیا۔

دو دن بعد پتہ چلا کہ موتی لال جی اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ کوئی ''تیسرا آدمی'' سمجھوتے کی کوشش کرے اور اسی تجویز کے مطابق جیکر صاحب وائسرائے سے ملنے شملہ جا رہے ہیں۔ انور کو ایک بار پھر ایسا لگا کہ سمجھوتہ ہونے والا ہے اور اسے اس بات پر تعجب بھی ہوا۔ سرکار اب بھی کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں معلوم ہوتی تھی اور جس وقت بیچارے جیکر صاحب شملہ کا لمبا سفر کر رہے تھے اسی وقت یو۔ پی سرکار کے وارنٹ پر موتی لال گرفتار کر لیے گئے۔

''اب کوئی سمجھوتہ نہیں ہونے کا۔'' انور نے فاتحانہ لہجے میں اعلان کیا۔

''تو پھر ہم لوگ اپنا بوریا بستر باندھیں۔'' ملس نے فیصلہ کیا۔ ''لڑائی لمبی چلے گی اور ہمیں کئی موروں کی خبریں لانا ہے۔''

(6)

خبر ملی تھی کہ گجرات کے گاؤں میں لگان ادا نہ کرنے کی زبردست تحریک چل رہی تھی۔ اس لیے وہ پہلی ٹرین پکڑ کر سورت پہنچے اور ایک ٹوٹی ہوئی موٹر پر، جو کچھ میل چلنے کے بعد بار بار بند پڑ جاتی تھی، انھوں نے دیہاتوں کا چکر لگایا۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی کپاس، گنا اور تمباکو کی فصل کے لیے مٹی بہت اچھی تھی۔ اب تک انور نے یو۔ پی کے جو گاؤں دیکھے تھے ان کے مقابلے میں یہاں کے گاؤں زیادہ خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ یہاں کے گاؤں میں بہت سے مکان پکے بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکان دو منزلہ بھی تھے، دروازوں کے چوکھٹ نقش دار لکڑی کے

تھے اور دیواروں پر رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی تصویریں تھیں— کرشن اور گوپیاں، رام اور سیتا اور ہنومان جی کی تصویریں۔ کچھ ماڈرن تصویریں بھی تھیں، جیسے ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کی تصویریں، ایک گھر کی دیوار پر انھوں نے ایک بہت ہی اہم تصویر بنی ہوئی دیکھی جس میں گاندھی جی کو بیچ میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ (ان کے سر کے چاروں طرف ایک گولا کھینچ کر ان کے چہرے کے نور کا ہالا دکھایا گیا تھا) اور وہ ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں، عیسائیوں کے ایک گروہ کو دعائیں دے رہے تھے۔ مجمع میں کندھے پر ہل رکھے ہوئے ایک کسان اور کالے رنگ کا ایک اچھوت بھی دکھایا گیا تھا۔ یہ مجمع ہندوستان کے سارے عوام کی نمائندگی کر رہا تھا۔

یہ سچ مچ گاندھی جی کا ملک تھا۔ وہ کئی سال تک اس علاقے میں رہے تھے، یہاں کے لوگ ان کی گجراتی زبان بولتے تھے۔ یہاں کے زیادہ تر لوگوں نے انھیں دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں اور ان کے ایک شاگرد ولبھ بھائی پٹیل نے کئی برسوں کی محنت کے بعد یہاں کے کسانوں کو متحد کیا تھا۔ کھیتی کی پیداوار کی قیمتیں گر جانے کی وجہ سے ان کی خوشحالی میں بے حد کمی آ گئی تھی اور ان کی مالی حالت بگڑتی گئی تھی۔ دو سال پہلے باردولی ضلع کے کاشتکاروں نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار لگان دینے سے انکار کیا تھا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ان کا لگان بہت زیادہ لگایا گیا تھا۔ جبر و تشدد کے باوجود انھوں نے قابل تعریف اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا اور سرکار کو مجبور ہو کر ان کا لگان کم کرنا پڑا تھا۔

اب پورے گجرات نے قابل نفرت بدیسی سرکار کو لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سرکار نے بھی ناراض ہو کر بہت ظلم کیے تھے۔ ان گاؤں میں جن کسانوں کا اثر تھا انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ باقی لوگوں کو پولیس لگاتار ستا رہی تھی۔ ان کی زمین، جائیداد، یہاں تک کہ ان کے مویشی بھی ضبط کر کے مٹی کے مول نیلام کیے جا رہے تھے اور اس طرح ان کا لگان وصول کیا جا رہا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کسان اپنے گھربار اور زمین جائیداد چھوڑ کر برطانوی ہند کی سرحد پار کر کے پاس کی بڑودہ ریاست میں جا کر بسنے لگے۔ کچھ گاؤں بالکل خالی ہو گئے تھے اور ان کی سنسان گلیوں میں گھومتے ہوئے انور کو بڑا عجیب لگا جیسے فتح پور سیکری دیکھتے وقت لگا تھا جہاں کی شاندار پرانی عمارتوں کا سونا پن کسی کا انتظار کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا— یہ گاؤں اپنے کاشتکاروں کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ نہ جانے کس وقت واپس لوٹ آئیں۔

وہ بڑودہ ریاست کی حد تک گئے اور انھوں نے دیکھا کہ سرحد کے اس پار چٹائی اور تاڑ کے بنے ہوئے چھپروں میں برطانوی ہند سے آئے ہوئے ان گنت کسانوں نے سورج کی تپتی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لیے پناہ لے رکھی ہے۔ ایک بوڑھے کسان سے جس کے سر پر بہت بڑی پگڑی بندھی ہوئی تھی اور جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں انور نے پوچھا کہ وہ کب تک اپنے گھر لوٹنے کی امید رکھتے ہیں۔ جس کے جواب میں اس بوڑھے کسان نے فوراً بڑے بھروسے کے ساتھ جواب دیا، ''جب ہمارے مہاتما جی کی سرکار بن جائے گی۔''

اس درمیان انھیں خبر ملی کہ دلبھ بھائی پٹیل چھوڑ دیے گئے ہیں اور اس لیے وہ دونوں ان کی تقریر سننے اپنی موٹر پر وہاں سے پچاس میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے۔ انور نے ''باردولی کے ہیرو'' کو پہلی بار دیکھا تھا اور وہ ان کے سخت چہرے کی گہری لکیروں میں طاقت اور استقلال دیکھ کر بہت متاثر ہوا، ایسا لگتا تھا جیسے پتھر کی چٹان کو کاٹ کر ان کا چہرہ تراشا گیا ہو۔ ان کے الفاظ میں بڑی کڑواہٹ بھری تھی اور مجمع کے سامنے ہندوستانی میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے وائسرائے کی اس تقریر کا منہ توڑ جواب دیا جس میں انھوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ستیہ گرہ کی تحریک واپس نہ لی گئی تو کانگریس کو اس کا مزا چکھا دیا جائے گا۔ پٹیل سیاست دانوں کی طرح گھما پھرا کر بات نہیں کہتے تھے وہ تو بالکل کسانوں کی طرح دوٹوک بات کہتے تھے۔ یہ صاف تھا کہ اپنے صوبے کے کسانوں پر اس وجہ سے ان کا اتنا زیادہ اثر تھا۔

میٹنگ کے بعد ملس نے کہا: ''انھوں نے کیا کہا یہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن یہ بات مجھے کچھ عجیب ضرور معلوم ہوئی کہ یہ مہاتما گاندھی کے معتقد کیسے ہیں؟''

''کیوں؟'' انور نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لیے کہ مہاتما گاندھی تو بہت نرم طبیعت کے آدمی ہیں اور پٹیل اتنے ہی سخت اور منہ پھٹ۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی چیز پر بھی بھروسہ نہیں کرتے، ہر چیز کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔''

''شاید یہ اچھا ہی ہے۔ ان کی سختی گاندھی جی کی حد سے زیادہ نرمی کے ساتھ مل کر حالت کو سنبھالے رہتی ہے اور اس لیے یہ ہندوستان کے لیے اچھا ہے۔''

''ہاں، شاید ایسا ہی ہو!۔''

(7)

گجرات کے دورے کا رابرٹ ملس پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس نے گجرات کے بہادر کسانوں کے بارے میں کئی بہت ہی جوشیلے مضامین لکھے۔ دلی جاتے ہوئے راستے میں اس نے کہا، ''انور، میں سوچتا ہوں کہ شملہ جا کر میں وائسرائے سے ملوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا انھیں پتہ ہی نہیں ہے۔ کسی کو انھیں سچائی بتانی چاہیے اور چونکہ کوئی اور نہیں بتائے گا اس لیے میں ہی جا کر بتاؤں گا۔''

انور کو یقین نہیں تھا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا اور اس نے ملس کو اس معاملے میں اپنی رائے بھی بتا دی۔

''میں تو نہیں سمجھتا کہ میرا جانا بالکل بیکار رہے گا اور بہرحال کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے سنا ہے کہ لارڈ اِروِن بہت ہی مذہبی آدمی ہیں اور میں تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جانتے بوجھتے وہ پولیس کے ان ظلموں کی اجازت دیں گے جو اس وقت ملک میں ہو رہے ہیں۔''

انور، ملس کے عیسائیوں والے اس جوش سے اتفاق نہیں رکھتا تھا اور اس نے یہ بات اس سے کہی بھی کہ اس نے جہاں تک تاریخ پڑھی ہے اس سے اسے یہی انداز ہوا ہے کہ مشرق اور مغربی ملکوں میں بھی جو سب سے ظالم بادشاہ ہوئے ہیں وہ اپنے مذہب کے بہت پکّے تھے۔ ''ارے، تم ناستکوں سے تو بحث کرنا بڑا مشکل ہے،'' ملس نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔ ''کم سے کم مجھے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے تو ملاقات کر لینے دو اور ملاقات ہونے پر اگر میں انھیں دو چار سچی باتیں بتا دوں تو تمھیں کیا اعتراض ہے؟''

ملس سیدھے شملہ چلا گیا اور انور کچھ دن بعد شملہ آنے کا وعدہ کر کے راستے میں دلّی میں اتر پڑا۔ وہ کئی مہینوں سے اپنے ابا سے نہیں ملا تھا اور اس کے ابا نے لکھا تھا کہ وہ کم سے کم کچھ دن کے لیے گھر ضرور ہو جائے۔

اس بڑے سے خالی گھر میں اکیلے رہنے کی وجہ سے اکبر علی بہت بوڑھے لگنے لگے تھے اور پہلے سے بھی زیادہ اداس رہتے تھے۔ ان کے اس اکیلے پن پر انور کو ترس آتا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھا کر جب باپ بیٹے اندر والے ٹھنڈے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تو انور نے شکایت کے لہجے میں کہا،''ابّا، آپ اپنی تندرستی کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ بہت کمزور اور بیمار لگتے ہیں۔''

''بیٹا، میں بیمار نہیں ہوں۔ بڑھاپے کا اثر ہے۔ اب دن بہ دن کوئی میں جوان تھوڑے ہی ہوتا جاؤں گا۔ ہاں، مجھے رامیشور کی ضرور فکر ہے۔''

''کیوں، رامیشور کاکا کو کیا ہوا؟''

''تم تو جانتے ہی ہو کہ ان کی صحت ویسے بھی کبھی ٹھیک نہیں رہی، کھانسی اور دمہ کی شکایت تو تھی ہی، درمیان میں بخار بھی آجاتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ مہینوں سے ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی ہے اور دن بھر ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ بلغم کے ساتھ اب خون بھی آنے لگا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انھیں کئی برس سے ٹی۔ بی ہے۔ ایک پھیپھڑا تو بالکل بیکار ہو چکا ہے۔''

انور کو بچپن سے ہی رامیشور کاکا سے بہت لگاؤ تھا اور اسی لیے اب یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا کہ وہ اتنے سخت بیمار ہیں۔

''ابّا، چل کر انھیں دیکھ آنا چاہیے۔''

''ضرور، بیٹا، میں تو ابھی کل ہی گیا تھا، تم کل جا کر مل آنا۔ وہ تمھارے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔''

رامیشور کاکا کے پھیپھڑے کی بات سن کر انور بہت دکھی تھا۔ اتنے دن سے ٹی بی کا شکار رہنے کی وجہ سے انھوں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی انور ڈر گیا۔ ڈاکٹر جمشید جی نے اس سے بھی تو کہا تھا کہ اس کے پھیپھڑے کمزور ہیں اور اگر اس نے اپنی تندرستی کا بہت خیال نہ رکھا تو آگے چل کر......

''ابّا۔'' اس نے اچانک چونک کر کہا۔ اسے ڈاکٹر صاحب کی ایک دوسری بات یاد آگئی تھی''ابّا، مجھے اماں کے بارے میں کچھ بتایئے۔''

اس طرح اچانک ان سے یہ سوال پوچھ لینا غیر مناسب تھا۔ انور نے جب اپنے ابا کی کھوئی کھوئی نظروں میں اداسی دیکھی تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت دور خلاء میں دیکھتے

ہوئے انھوں نے جواب دیا،'' کیوں، انور، ان کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ بہت نیک عورت تھیں وہ۔''

''نہیں، میں تو ان کی صحت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، کیا انھیں دق کی بیماری تھی؟ کیا ان کے پھیپھڑے کمزور تھے؟ کیا وہ ٹی۔بی میں مری تھیں؟''

''نہیں، نہیں۔'' بوڑھے اکبر علی نے بہت زور دے کر انکار کیا، جیسے اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں انھیں اس طرح کی بات بہت بری لگی ہو۔''نہیں، ان کی صحت تو ہمیشہ بہت اچھی رہی۔ تمھاری پیدائش کے وقت دائی کی غلطی سے ان کے خون میں زہر پھیل گیا تھا اور اس میں وہ مر گئی تھیں۔ لیکن یہ خیال تمھارے دماغ میں کیسے آیا؟''۔

'' کچھ نہیں ابا، بس یوں ہی۔ میں بس یہ جاننا چاہتا تھا۔''

(8)

جس وقت انور رامیشور دیال کو دیکھنے کے لیے کمرے میں گیا اس وقت ان کے چہرے پر موت کا پیلا پن چھایا ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور چاروں طرف دوا کی نہ جانے کتنی شیشیاں رکھی تھیں۔ رامیشور دیال کی بیوی لاج وتی نے انور کو کمرے میں جانے سے پہلے بتایا تھا کہ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کا علاج کرالیا گیا تھا اور ڈاکٹروں کا ہی نہیں بلکہ حکیموں، ویدوں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بھی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ لاج وتی پہلے کے مقابلے میں بہت دبلی ہوگئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کئی ہفتوں سے سوئی نہیں تھیں۔ ان کی سوجی ہوئی لال آنکھوں میں آنسو تھے اور انھوں نے سسکیاں لے کر روتے ہوئے کہا،'' اب تو بس بھگوان کا نام ہی باقی ہے۔''

'' کاکا!''۔ انور نے دھیرے سے پکارا۔'' میں ہوں انور۔'' بیمار کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی۔

'' بیٹھ جاؤ بیٹا۔'' ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی دوسری دنیا سے لوٹ کر آ رہی ہو۔'' بمبئی سے کب آئے؟''

انور نے انھیں بتایا اور اسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اپنی بیماری میں بھی رامیشور کا کایہ

معلوم کرتے رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے کاکا؟'' یہ سوال بیکار تھا لیکن رسما اسے پوچھنا ضروری تھا۔

رامیشور دیال کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک عجیب مرجھائی ہوئی مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے وہ اس بات کو سمجھ گئے ہوں کہ یہ سوال صرف رسما پوچھا گیا ہے۔ جواب میں لالہ جی نے جنھوں نے اسکول میں اکبرعلی کے ساتھ اردو اور فارسی پڑھی تھی، صرف اقبال کا یہ مصرع پڑھا ''چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔''

نہ جانے کیوں انور کو ایسا لگا کہ یہ اصلی رامیشور کاکا تھے جو موت کے بستر پر لیٹے ہوئے بھی اقبال کے شعر پڑھ رہے تھے، رامیشور کاکا وہ نہیں تھے جو گھنٹوں بیٹھے روپے آنے پائی کا حساب جوڑتے رہتے تھے۔

''اکبر کا کیا حال ہے؟'' رامیشور دیال نے پوچھا اور انور نے انھیں بتایا کہ ان کو کچھ کام پڑ گیا اس لیے وہ کل آئیں گے۔

''سچا دوست ہو تو اکبر جیسا ہو۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اگلے جنم میں بھی میں اس کا احسان نہیں چکا پاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکے، جیسے اپنے کمزور جسم کی ساری طاقت بٹور رہے ہوں۔ پھر انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو انور کو کچھ عجیب لگی۔ بیمار کا دل رکھنے کے لیے انور نے کہا، ''کاکا، آپ فکر نہ کیجیے۔ میں ابا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔''

بیمار رامیشور دیال بالکل تھک گئے تھے اور ان کی بیوی نے ان سے آرام کرنے کو کہا۔ ان کو اب تک یہ امید بندھی ہوئی تھی کہ وہ اپنی خدمت سے انھیں پھر اچھا کر دیں گی۔ ان کی اس فضول کی امید پر انور کو ترس آتا تھا۔

''کاکا، میں آپ سے پھر ملوں گا۔'' اتنا کہہ کر انور چلا آیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔''

دوسرے دن رامیشور کاکا کا انتقال ہو گیا اور جب وہ لوگ ان کا کریا کرم کر کے لوٹے تو انور کو ایسا لگا کہ اس کے ابا ایک دن میں دس برس اور بوڑھے ہو گئے ہیں۔

(9)

انور ایسے وقت اپنے ابا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا جبکہ ان کے دل پر اپنے سب سے پیارے دوست کی موت کا صدمہ تھا۔اس لیے اس نے ملس کو شملہ خط لکھ دیا تھا کہ وہ ابھی دتی میں دو ہفتے اور رکے گا اور اس کے بعد وہ شملہ میں، یا کسی بھی دوسری جگہ اس سے مل سکتا ہے۔

انور کے لیے دتی میں ٹھہرنا کچھ اچھا ثابت نہیں ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ابا کی بیٹھک میں بہت سے کٹر مذہبی لوگ جمع ہونے لگے ہیں۔ اپنے بچپن میں اس نے وہاں دتی کے ملے جلے تمدن اور معاشرت کا جو ماحول دیکھا تھا وہ اب باقی نہیں رہ گیا تھا— جب حکیم بیدل اپنے شعر سناتے تھے، رامیشور کاکا اپنی ران پر ہاتھ مار کر 'واہ، واہ' کر کے داد دیتے تھے اور کوئی اخبار سے خبریں پڑھ کر سناتا تھا اور چائے یا شربت کے دور چلتے تھے۔ان کے ساتھ ہنسی خوشی اور رواداری کے ماحول میں سیاسی سماجی اور ادبی مسئلوں پر بات چیت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ رامیشور کاکا کے مرتے ہی ایک دور ختم ہو گیا تھا، زندگی کا ایک ڈھنگ مٹ گیا تھا۔ پرانے دوستوں میں بس چودھری محمد عمر باقی رہ گئے تھے۔اور یہ پنجابی بیوپاری بھی اب خان بہادر ہو گئے تھے، سرکاری ٹھیکیدار تھے اور میونسپل کونسلر بھی۔ان کا کاروبار چمک گیا تھا اور ان کے بیٹے موٹروں میں گھومتے تھے۔ وہ بڑی بے شرمی سے سرکار کی طرفداری کرتے تھے اور کانگریس کو برا بھلا کہتے تھے اور گاندھی جی کو ستیہ گرہ شروع کرنے کی وجہ سے بہت گالیاں دیتے تھے کیونکہ ستیہ گرہ کا مطلب تھا آئے دن کی ہڑتالیں اور ہڑتال میں ان کے کاروبار کا بہت نقصان ہوتا تھا۔لیکن چونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ اکبر علی خود پہلے ستیہ گرہی رہ چکے تھے اور سرکار سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے، اس لیے چودھری محمد عمر صاحب کانگریس کے خلاف جو بھی بات کہتے اسے فرقہ واریت کی آڑ میں چھپا کر کہتے۔انور نے انھیں ایک بار یہ بھی کہتے سنا تھا کہ ''اگر میں ہندو ہوتا تو شاید میں بھی گاندھی کے ساتھ ہوتا، لیکن چونکہ میں مسلمان ہوں اس لیے اس بنیئے کے ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ اس کی ساری تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ختم کر دینا ہے۔'' اور جب بھی وہ اس طرح کی کوئی بات کہتے تھے تو ان کے ساتھ کے پانچ چھ حالی موالی ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار رہتے تھے۔

یہ سب باتیں تو تھیں ہی، اس پر بھی ایک دن تایا امجد علی ریاست کے کسی کام سے دلی آدھمکے۔ اس کے بعد تو انور کے لیے وہاں رہنا بالکل نا قابل برداشت ہوگیا۔ اب وہ صرف ریاست کے دیوان ہی نہیں تھے بلکہ چھوٹے نواب صاحب کے سسر بھی تھے۔ اس لیے ان کی اکڑ کی کوئی حد ہی نہیں رہ گئی تھی اور انور کے لیے انھیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ انور کانگریسی خیالات کا ہے، وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے گاندھی جی کے بارے میں اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کے بارے میں بری بری باتیں کہتے تھے تاکہ اسے غصہ آئے اور وہ اسے ڈانٹ پھٹکار سکیں۔ اکبر علی کو اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن اپنے بڑے بھائی کی زبان پر قابو پانا ان کے بس کے باہر تھا۔ اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ انور کے لیے وہاں رہنا بہت مشکل ہو رہا ہے تو ایک دن انھوں نے خود ہی کہا، ''میرا خیال ہے کہ مسٹر ملس بہت دن سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اب میں بھی بالکل اچھا ہوگیا ہوں اور بھائی صاحب بھی یہاں ہیں۔ تم اب شملہ کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کی آب وہوا سے بھی تمھیں بہت فائدہ ہوگا۔''

اسی دن، رات کو انور شملہ چلا گیا۔

(10)

اتنے مہینوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے ملس اپنے ترجمان مددگار کو بہت پسند کرنے لگا تھا اس لیے انور کے واپس آجانے پر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی پیٹھ پر زور کی دھپ جماتے ہوئے ملس نے کہا، ''ہیلو انور بوائے، بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ سرکاری افسروں کے اس منحوس شہر میں تمھارے جیسا انسان دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔''

خبروں کی دنیا میں واپس پہنچ کر انور بھی بہت خوش تھا۔ سیسل ہوٹل میں جہاں ملس ٹھہرا ہوا تھا، سیاست دانوں کی بھرمار تھی — ظاہر ہے یہ سارے لیڈر اعتدال پسند تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری افسر اور بدیسی مہمان اور اخباروں کے خاص نامہ نگار بھی بے شمار تھے۔

''تو رابرٹ، بھلا وائسرائے سے بھی ملاقات ہوئی؟'' انور بڑی دیر سے یہ سوال پوچھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کھانا کھاتے وقت بھی وہ بڑی مشکل سے چپ رہا۔ لیکن ملس کے کمرے میں پہنچتے

ہی اسے اکیلا پا کر اس نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

''ہاں ہاں، ملا کیوں نہیں۔'' پھر ملس نے وائسرائے کے ایک اے۔ڈی۔سی کی نقل اتارتے ہوئے کہا،''ہز ایکسلنسی دی گورنر جنرل۔ ان کونسل اینڈ وائسرائے آف انڈیا ول بھی گریشسلی پلیز ڈ ٹو گیو دی آنر آف ہیونگ یور کمپنی ایٹ لنچ ایٹ دی وائسریگل لاج، ڈائننگ روم نمبر تھری۔ٹراؤزرس کمپلسری، پن اسٹرائپلس اینڈ اسٹیپٹس آپشنل۔''

انور کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔اس نے کہا'' مطلب یہ کہ انھوں نے لنچ کے لیے بلایا تھا۔اور کون کون تھا؟''

''ایک مہاراجا صاحب تھے جنھیں تین پٹاخوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ ایک پادری صاحب تھے جنھیں یہ شکایت تھی کہ لوگ عیسائی نہیں بن رہے ہیں۔ایک آسام کے چائے کے باغوں کے انگریز مالک تھے جو بہت بڑے شکاری کی طرح یہ بتا رہے تھے کہ ہندوستان آ کر پہلے پہل شیر کیسے مارنا چاہیے۔اور ایک بوڑھی میم صاحب تھیں مسز بمبل ۔بی۔وی۔ یونیٹ جو لنگڑی لولی بلیوں کی مدد کے لیے پیسے لے کر بہت سے بوڑھے سنکی لوگوں کی دعوت کرنے کے انتظام میں تن من سے لگی ہوئی تھیں۔''ملس سچ مچ اس دن سب کا مذاق اڑانے پر تلا ہوا تھا۔

''جب آپ کے بائیں طرف مسز بمبل۔بی بیٹھی ہوں اور دائیں طرف پادری صاحب بیٹھے ہوں تو آپ ان کی بات کاٹ کر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ''یور ایکسلنسی، لولی لنگڑی بلیوں کی بات پر مجھے یاد آیا کہ ملک میں جو ستیہ گرہ کی تحریک چل رہی ہے......''

''یہی بات تھی۔ بات چیت کے دوران سیاست کا کوئی سوال اٹھانا ناممکن تھا۔ حالانکہ ایک بار چائے کے باغوں کے مالک نے ایک موقع دیا تھا۔شکار کی باتیں کرتے کرتے جوش میں آ کر انھوں نے کہا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس 'بوڑھے گاندھی' کو گولی سے اڑا دیتے۔لیکن کھانا ختم ہو جانے کے بعد وائسرائے صاحب جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک اے۔ڈی۔سی مہمانوں کو ایک ایک کر کے ان کے پاس لے جاتا تھا اور ہر آدمی کو صرف پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا تھا۔ میں پندرہ منٹ تک باتیں کرتا رہا اور وائسرائے صاحب کا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ دس منٹ زیادہ لگ گئے۔اس پر اے۔ڈی۔سی نے مجھے اتنا گھور کر دیکھا

جیسے انگریز سامراج کی بنیاد دہل گئی ہو۔''

''کیا کیا باتیں ہوئیں؟''

''وائسرائے صاحب نے پہلی ہی غلطی تو یہ کی کہ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ میں نے ہندوستان میں کیا دیکھا۔''

''اور آپ نے انھیں جو کچھ دیکھا تھا بتا دیا؟''

''ایک ایک بات کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔ لاٹھی چارج بمبئی میں عورتوں کا جلوس، گجرات کے کسانوں کی بغاوت — میں نے سارا کچا چٹھا ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ میں نے ہز اکسلنسی کو یہ بھی وارننگ دی کہ شملہ میں وہ ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں جو پہلے ہی پھٹ چکا ہے۔''

''یہ بات تو انھیں اچھی نہیں لگی ہوگی؟''۔

''میرے خیال سے تو اچھی نہیں لگی ہوگی، لیکن انور سچ کہتا ہوں مجھے اس بیچارے پر ترس آتا ہے۔ جس ملک پر وہ حکومت کرتا ہے اس کے بارے میں اسے بہت ہی تھوڑی واقفیت ہے۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ شملہ کے لوگ کتنے جاہل ہیں۔''

''اس میں کس کا قصور ہے؟''

'ظاہر ہے کہ حکومت کے اس طریقے کا جو انھیں گرمی اور دھول اور مُلک کی حقیقتوں سے بچا کر انھیں یہاں اتنی دور بٹھا کر رکھتا ہے۔ یہاں کوئی اخبار پڑھتا ہی نہیں ہے کیوں کہ یہاں اخبار دو تین دن دیر میں پہنچتے ہیں۔ ہر آدمی یہاں تک کہ وائسرائے بھی، رائٹر کی بھیجی ہوئی رپورٹ پڑھتا ہے جس میں خبروں کو بہت کاٹ چھانٹ کر یک طرفہ ڈھنگ سے اور بہت ہی اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔ ہوم ڈپارٹمنٹ صوبوں کی راجدھانیوں سے آنے والی رپورٹیں وائسرائے کے پاس بھیجتا ہے لیکن جو کچھ ہوتا ہے اُس کے موٹے موٹے خاکے کے پتہ چلنے میں بھی ایک ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔'

لیکن انور تو یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وائسرائے نے کیا کہا۔

''میں نے ان سے پوچھا کہ گاندھی جی کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ اور انھوں

نے اپنی رائے بتائی لیکن اس شرط پر کہ میں کسی سے کہوں گا نہیں۔ ہر اخبار نویس کو وائسرائے سے اسی شرط پر ملنے دیا جاتا ہے کہ لاٹ صاحب جو کچھ بھی کہیں گے اسے وہ کسی سے کہے گا نہیں لیکن تمھیں میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے ان کی بات اچھی طرح یاد ہے کیونکہ مجھے ایک وائسرائے کے لیے ایسی بات کہنا عجیب لگا تھا۔ انھوں نے بڑی چالاکی سے گول مول بات کہی تھی لیکن ان کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ انھوں نے کہا 'جب میں پہلی بار گاندھی سے ملا تو، میں ان کے تقدس سے بہت متاثر ہوا۔ میں ان سے دوبارہ ملا تو مجھ پر قانونی معاملوں میں ان کی چالاکی کا بہت اثر پڑا۔ تیسری بار ملنے پر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ جب میں نے پوچھا 'یور اکسلنسی' آپ کو ان دونوں میں کس بات کا یقین ہو گیا؟ تو انھوں نے مسکرا کر صرف اتنا کہا 'اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں'۔

وائسرائے کے اس مذاق پر انور کو کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہے اور ایک طرح سے مجھے اس بات کی خوشی ہی ہے۔''

''وائسرائے کی باتوں سے تو مجھے ایسا نہیں لگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ لاکھ معلومات نہ ہوتے ہوئے بھی انھیں اب اس بات پر الجھن ہونے لگی ہے کہ گاندھی جی کی اہنسا کو کچلنے کے لیے انھیں پولیس کے ڈنڈوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس بات کو نہ بھولو کہ وہ بھی اپنی اس شہرت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ 'عیسائی وائسرائے' ہیں۔ جب وقت آئے گا اور ولایت میں سرکار اہنسا کی طاقت محسوس کرنے لگے گی تب وہ بھی گاندھی جی سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے پر فوراً راضی ہو جائیں گے۔''

''اہنسا کی طاقت یا ولایتی مال کے بائیکاٹ کا اثر؟''

''انگریز کے لیے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔''

ملس کے ساتھ کام کرنے میں سب سے بڑا فائدہ یہی تھا کہ اس میں خیالات کے لین دین کا اور ذہنی داؤ پیچ دکھانے کا بہت موقع ملتا تھا۔ اس سے انور کا دماغ بھی تیز رہتا تھا اور زندگی اور کام کے بارے میں اس کا جوش برقرار رہتا تھا۔

شملہ میں گرمیوں میں سرکار کی راجدھانی ضرور رہتی تھی لیکن وہاں خبریں کوئی نہیں ملتی تھیں۔ اس لیے وہاں کے ٹھنڈے موسم کا کافی دن تک لطف اٹھانے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا

کہ وہ پہاڑ سے نیچے اتر کر اپنا دورہ پھر شروع کریں گے اور الگ الگ صوبوں میں ستیہ گرہ کی تحریک کا حال دیکھیں گے۔ ایک دن رات کو سیسل ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے انور نے رابرٹ کے کان میں کہا،''وہ سر تیج بہادر سپرو بیٹھے ہیں۔ان کے یہاں ہونے میں بھی کوئی سیاسی چال ضرور ہوگی۔'' انور نے بتایا کہ سپرو اور جیکر کو''سیاست کے میدان کے جڑواں بھائی'' کہا جاتا تھا اور چونکہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جیکر صاحب سرکار اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے اس لیے سپرو کا بھی اس میں شامل ہونا ضروری تھا۔

کمرے میں واپس پہنچ کر انور نے''اسٹیٹسمین'' اٹھا کر دیکھا،اس میں لکھا تھا کہ اس سے پچھلی رات کو سپرو نے وائسرائے کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ دوسرے دن انور نے ہوٹل کے دفتر میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ سر تیج اسی دن الہ آباد واپس جا رہے تھے۔

وہ الہ آباد میں ہی رہتے ہیں نا؟''ملس نے پوچھا۔

''ہاں''،انور نے جواب دیا۔''لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ وہیں نینی جیل میں جواہر لال بھی بند ہیں۔اگر سپرو صاحب کو اپنے گھر ہی واپس جانا ہوتا تو وہ صرف دو دن کے لیے شملہ نہ آتے۔''

(11)

اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ کچھ دن بعد جب الہ آباد کے پاس نینی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر ایک دن کافی رات گئے جیل کی گاڑی میں پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال اور ڈاکٹر محمود کو لایا گیا تو وہاں صرف دو ہی اخبار نویس موجود تھے۔ملس اور انور۔ جیل کی گاڑی سے اتر کر انھیں سیدھے ایک سنسان پلیٹ فارم پر لے جایا گیا۔ وہاں ایک اسپیشل ٹرین ان کے لیے کھڑی تھی۔ انجن سے دھواں نکل رہا تھا اور گاڑی پونا جانے کے لیے تیار تھی۔انور نے دیکھا کہ موتی لال جی بیمار لگ رہے تھے اور ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے موقع پا کر جواہر لال سے پوچھ ہی تو لیا،''آپ کی رائے میں کیا سمجھوتہ ہونے کی کوئی گنجائش ہے؟'' اتنے میں گاڑی چل پڑی اور انور کے سوال کے جواب میں جواہر لال نے اپنے پاس سیٹ پر رکھا ہوا اس دن کا اخبار اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی کڑواہٹ کے ساتھ پوچھا،''کیا یہ سمجھوتے کی نشانی

ہے؟'' اخبار کے پہلے ہی صفحے پر ایک خوفناک لاٹھی چارج اور کانگریس کے قائم مقام صدر ولبھ بھائی پٹیل، پنڈت مدن موہن مالویہ، تصدق شیروانی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کی گرفتاری کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ انور کو ان کے پیچھے ''بائیکلہ ہاؤس آف کرکشن'' کا بڑا سا سائن بورڈ لگا دیکھ کر بہت ہنسی آئی یہاں بگڑے ہوئے آوارہ بچوں کو سدھارنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔

جب ٹرین چلی گئی تو ملس نے کہا، ''ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر مجھے اس بند گاڑی کی یاد آ گئی جس میں لینن کو انقلاب شروع کرنے کے لیے جرمنی سے روس لے جایا گیا تھا۔

''ہمیں تو ہندوستان میں جو انقلاب آ رہا ہے اس کی خبریں جمع کرنی ہیں، چلیے ہم لوگ اپنا کام کریں۔ جواہر لال کی صورت دیکھ کر تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا۔''

اور ایک بار پھر اس پرانے اخبار نویس نے انور کو وارننگ دی، ''انور کسی بات کا اتنا زیادہ یقین نہیں رکھنا چاہیے۔''

(12)

انھوں نے یو۔ پی میں اپنا دورشروع کیا۔ کانگریس نے یہاں کے کسانوں کو منظم کر کے لگان ادا کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ کانگریس نے زمینداروں سے بھی کہا تھا کہ وہ سرکار کو مال گذاری نہ دیں۔ لیکن وہ تو سرکار کی مہربانی پر پلتے تھے، اس لیے ان میں سے تقریباً سب ہی نے مال گذاری ادا کر دی تھی۔ یہاں تک کہ ان زمینداروں نے بھی جو کانگریس کی تحریک کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا دم بھرتے تھے، چپکے سے سرکار کی مال گذاری بھر دی تھی لیکن اَن پڑھ اور غریب کسان اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور انھوں نے لگان نہیں دیا۔ ان کی غریبی نے انھیں اپنی جان کی بازی لگا دینے کی ہمت دی تھی۔ ان کے پاس کھونے کو تھا ہی کیا!

''کانگریس نے ہندوستان کے گاؤں میں سماج واد کا پیغام پہنچا دیا ہے اور کسانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔'' ملس نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا، ''لیکن ایک دن کانگریس خود پچھتائے گی، جب وہ دیکھے گی کہ سماج واد کی تحریک کے بڑھنے سے اس کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔'' انور نے یہ پڑھ کر کہا، ''رابرٹ تم بھی بلا کے بدگمان ہو۔''

گاؤں کا دورہ کرتے ہوئے بیچ بیچ میں وہ گنگا کے کنارے کے مشہور تاریخی شہروں کا دورہ

بھی کرتے تھے — الہ آباد جسے پرانے زمانے میں پریاگ کہا جاتا تھا اور جو گنگا اور جمنا کے پوتر سنگم پر بسا ہوا تھا، گومتی کے کنارے بسا ہوا لکھنؤ جہاں اودھ کے نوابوں کے خاندان والے ابھی تک وظیفہ پاتے تھے اور اپنے بیتے ہوئے عیش کے دنوں پر آنسو بہاتے تھے، کانپور کا تیزی سے بڑھتا ہوا صنعتی شہر جہاں مزدوروں میں بے چینی پیدا ہونے لگی تھی اور جہاں اب سے سات سال پہلے ہندوستانی کمیونسٹوں نے اپنی پہلی کانفرنس کی تھی۔ دن رات ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے ہوئے اور سیاسی ہلچل کی خبریں جمع کرتے ہوئے انور نے اپنے دل کے درد کو دبالیا تھا۔ لیکن ایک دن کانپور کے اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے اس نے وقت کاٹنے کے لیے ''السٹریٹیڈ ویکلی'' کا پرانا شمارا اٹھالیا۔ اچانک ایک صفحے پر جس پر نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں چھپی تھیں، اسے سلمٰی اور منظور کی تصویر دکھائی دی۔ سلمٰی کا چہرہ خوشی کے مارے پھول کی طرح کھلا ہوا چہرا دیکھ کر انور کو ایسا لگا جیسے کوئی اسے کوڑے مار رہا ہو۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

''علی گڑھ یونی ورسٹی کے پروفیسر ایم سلیم کی بیٹی سلمٰی خاتون جس کی شادی ابھی کچھ دن پہلے یو۔ پی پولیس سروس کے مسٹر منظور احمد کے ساتھ ہوئی جو آج کل کانپور میں متعین ہیں۔''

اُسی دن — بعد میں ایک کھٹیچر تانگے پر سول لائنز سے گذرتے ہوئے انور نے ایک بنگلہ دیکھا جس میں چاروں طرف مہندی کی جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں جنھیں بہت صفائی سے کاٹ رکھا گیا تھا اور گیٹ پر ایک تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا۔ منظور احمد ڈی۔ ایس۔ پی۔ تو یہاں رہتی تھی اس کی سلمٰی — ان جھاڑیوں کے پیچھے۔ اگر وہ اس کا نام لے کر پکارتا تو وہ سن لیتی۔ اگر وہ پھاٹک کے اندر چلا جاتا تو اس سے مل سکتا تھا۔ سلمٰی کے کتنا قریب تھا — پھر بھی کتنا دور!

''کیا ہوا تمھیں؟'' ملس نے پوچھا۔ تانگہ ہچکولے کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔''

انور کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''شاید بھوت ہی دیکھا ہے''۔

انور بہت خوش ہوا کہ اسی رات وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ کانپور سے دور چلا جانا چاہتا تھا — بہت دور۔

(13)

اس کے بعد چھ مہینے ان کی زندگی ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی دھن پر ہی چلتی رہی۔ وہ سارے ملک کا دورہ کرتے رہے۔ کسی پبلشر نے ملس سے ایک کتاب لکھنے کو کہا تھا اس لیے اب وہ جہاں بھی جاتا تھا وہاں زیادہ دن تک ٹھہرتا تھا اور موجودہ سیاست کی سطح کے نیچے ہندستانی زندگی کو گہرائی سے دیکھتا تھا۔ کلکتہ میں انور نے رائے کا پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ جیل میں تھا۔ ان کی ملاقات جوشیلے نوجوانوں سے ہوئی، جنھوں نے کھلے طور پر انھیں بتایا کہ وہ مہاتما گاندھی کو صرف یہ ثابت کرنے کا موقع دے رہے ہیں کہ ان کی اہنسا کارگر ہو سکتی ہے اور اگر وہ کامیاب نہ ہوئے تو وہ بم اور ریوالور کا اپنا طریقہ استعمال کریں گے۔ کچھ نوجوان تو ستیہ گرہ کی کامیابی سے مایوس بھی ہو چکے تھے اور انھوں نے مشرقی بنگال میں چٹگانگ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک فوجی چوکی پر چھاپہ مارا تھا اور انقلابی تحریک کے بہادرانہ واقعات میں ''چٹگانگ اسلحہ خانے پر دھاوا'' کا بھی ذکر کیا جانے لگا تھا۔ وہ شانتی نکیتن میں رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ملے تھے۔ وہ شاعر تھے، فلسفی تھے اور حسن شناس تھے۔ اس طرح وہ گاندھی جی سے بالکل مختلف تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔ سال بھر سے سیاست کی ہلچل میں پھنسے رہنے کے بعد انور کو شانتی نکیتن جا کر بڑا سکون ملا۔ بارش ابھی ختم ہی ہوئی تھی۔ چاروں طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی جا سکتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ پیڑ کے نیچے گھاس پر بیٹھے ہوئے کچھ لڑکے استاد کی تقریر سن رہے تھے۔ ناچ گھر میں کالی کالی آنکھوں والی دبلی پتلی بنگالی لڑکیاں منی پوری رقص کی دل کو لبھانے والے نرتیہ کی مشق کر رہی تھیں۔ ایک جگہ کوئی گائیک اپنی گونجتی ہوئی آواز میں ٹیگور کے گیت گا رہا تھا۔

بارش ختم ہو کر اب موسم خزاں شروع ہو گیا تھا اس لیے سفر کرنے میں بھی اب کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کو پار کرتے ہوئے جن پر زمینداروں کا قبضہ تھا، وہ بنگال سے بہار پہنچے۔ یہی مہاتما بدھ کا قدیم ملک تھا جنھوں نے عیسیٰ سے بھی پہلے اہنسا کا اپدیش دیا تھا۔ یہاں سے وہ یوپی اور دلی ہوتے ہوئے پنجاب کے لہلہاتے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کے درمیان پہنچے۔ انور ملس کو تاریخی جلیان والا باغ دکھانے لے گیا اور دیواروں پر

گولیوں کے نشان دیکھ کر اسے دس سال پہلے کے ان خوفناک لمحوں کی یاد آ گئی۔

اب تک پرانے زمانے سے جتنے لوگوں نے بھی ہندوستان پر حملہ کیا تھا وہ سب پشاور سے لاہور آئے تھے مگر وہ الٹے رخ میں لاہور سے پشاور جا رہے تھے۔ قسمت سے یونس جیل کے باہر تھا۔ ایک ہی سال کے اندر وہ کافی لمبا ہو گیا تھا اور بڑا لگنے لگا تھا اس نے ان دونوں کو دکھایا کہ اس کے وطن میں کیسا معجزہ ہو گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا تھا ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لیے سراہے جانے والے پٹھانوں نے اب اہنسا کا راستہ اپنا لیا تھا اور وہ موت کو نفرت سے دیکھنے لگے تھے بلکہ ان کی ایک مضبوط سیاسی اور سماجی تنظیم بھی بن گئی تھی جس میں آنے کے بعد قبیلوں اور خاندانوں کے سارے پرانے جھگڑے مٹ گئے تھے۔ اس تنظیم کا کانگریس کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور یہ لوگ اپنے آپ کو ''خدائی خدمت گار'' کہتے تھے اور وہ سیاسی شعور پھیلانے کے ساتھ ساتھ تعلیم، سماج سدھار اور یک جہتی کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ کیونکہ اس علاقے کے اس پار جہاں دو ملکوں کی سرحد بھی ٹھیک سے طے نہیں تھی، خوفناک قبائلی لوگوں کی بستیاں تھیں جن کی گولی کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا اور جو ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے اور چونکہ انگریزوں نے یہ ہوّا کھڑا کر رکھا تھا کہ روسی کسی بھی وقت افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لیے سرکار اس علاقے کو فوجی بچاؤ کے نظریے سے کافی اہمیت دیتی تھی۔ اس لیے یہاں دباؤ بھی زیادہ ہوا تھا۔ دوسری جگہوں پر جتنی لاٹھیاں چلی ہوں گی اتنی ہی بار یہاں گولیاں چلی تھیں۔

یونس نے انھیں ایک کمال کا واقعہ بتایا جس کے بارے میں اخباروں میں تقریباً کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ پشاور سے آنے والی ان خبروں کو سنسر کر دیا گیا تھا۔ ہمیشہ سے سرکار کے وفادار گڑھوالی سپاہیوں کے ایک دستے کو ان کے انگریز افسروں نے پشاور کے ایک بڑی سڑک پر آتے ہوئے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن گڑھوالیوں نے انکار کر دیا، کورٹ مارشل کی دھمکی دینے پر بھی انھوں نے گولی نہیں چلائی۔ ان سب کو لمبی سزائیں دے دی گئیں لیکن عام لوگوں پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

(14)

26 جنوری 1932 — ایک اور آزادی کا دن۔ پولیس اس موقع پر ان دونوں کو ایک گاؤں میں لے گئی جو لال کرتی والے خدائی خدمت گاروں کا گڑھ تھا اور جہاں وہ کانگریس کا جھنڈا لہرا کر آزادی کا عہد کرنے والے تھے۔

کچھ سو طاقت ور اور لمبے چوڑے پٹھانوں کے سامنے جب پشتو زبان میں آزادی کا عہد نامہ پڑھا گیا تو انور کے کانوں کو وہ کچھ عجیب سا لگا۔ ان میں سے زیادہ تر پٹھان سرخ بھورے رنگ کی کھدّر کی قمیض پہنے تھے۔ اپنے اس لباس کی وجہ سے ان کا نام 'لال کرتی والے' پڑ گیا تھا۔ ان کے پیچھے مشہور درّۂ خیبر دکھائی دے رہا تھا۔ انور سوچنے لگا کہ ان بہادر پٹھانوں نے بہت سی صلاحیتیں ان ہی سخت اور ویران پہاڑیوں سے حاصل کی ہیں جن کے درمیان وہ صدیوں سے رہتے آئے ہیں —

جب جھنڈا لہرانے کی رسم ختم ہوگئی تو انھیں خیبر درّہ کی طرف سے بار بار گولیاں چلنے کی آواز آتی ہوئی سنائی دی اور تھوڑی ہی دیر بعد دو ہوائی جہاز پہاڑیوں پر نیچے نیچے اڑتے ہوئے دکھائی دیئے اور کہیں بہت دور چٹانوں کے درمیان بم کا دھماکہ سنائی دیا۔ آر۔اے۔ایف کے ہوائی جہاز باغی سرحدی علاقوں میں باغیوں کو سزا دے رہے تھے — سامراج وادی ہندوستان میں چلنے والی تحریک سے جھنجھلا کر اب سرحد کے اس پار اپنی 'فارورڈ پالیسی' چلا رہے تھے۔

وہ جب موٹر پر واپس پشاور پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ بازار میں بڑی ہلچل ہے۔ کوئی بہت بڑا واقعہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے موٹر روک کر ایک آدمی سے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے۔ اس سیدھے سادے پٹھان نے بڑے جوش کے ساتھ پشتو میں کہا —

''گاندھی خان کو چھوڑ دیا!

''جواہر خان کو چھوڑ دیا!

''انقلاب خان کو مگر نہیں چھوڑا کیوں؟''

(15)

جب وہ دلّی پہنچے اس وقت تک ''گاندھی۔ اروِن سمجھوتے'' کی بات چیت شروع ہوگئی تھی اور ونسٹن چرچل نے بہت آگ بگولہ ہو کر کہا تھا کہ عجیب اندھیر ہے کہ ایک ننگا فقیر ہز میجسٹی کنگ

امپیرر کے نمائندے کے ساتھ برابری سے بات چیت کرنے کے لیے وائسرائے کی کوٹھی کی سیڑھیوں پر چڑھے گا۔

کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہاں انور بغیر روک ٹوک کے بھی جا سکتا تھا جس کی وجہ سے اسے دوسرے نامہ نگاروں کی طرح برآمدے میں بیٹھ کر انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جواہر لال اپنے باپ کے مرجانے کی وجہ سے بہت اداس تھے۔ بادشاہوں جیسی طبیعت رکھنے والے موتی لال جی جیل سے چھوٹنے کے کچھ ہی دن بعد مر گئے تھے۔ سروجنی نائیڈو بھی وہاں موجود تھیں۔ نوجوان انور اس بوڑھی شاعرہ سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ انھوں نے ڈرائینگ روم کے ایک کونے میں اپنا دربار لگا رکھا تھا جہاں ان کے پرانے دوستوں اور نوجوان چاہنے والوں کا جمگھٹا تھا اور انھیں وہ اپنی معلومات سے پُر باتیں سنا رہی تھیں اور درمیان میں انھیں ہنساتی بھی جاتی تھیں۔ سارے ملک کے مختلف صوبوں کے بہت سے لیڈر بھی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کے باورچیوں کو اتنے بہت سے لوگوں کو الگ الگ ان کی پسند کا کھانا کھلانے میں بہت مشکل پڑ رہی تھی۔ کچھ کانگریسی لیڈروں کا کھانا تو سب سے الگ ہوتا تھا۔ گاندھی جی تو صرف بکری کا دودھ پیتے تھے اور کھجوریں کھاتے تھے۔ ان کے ایک چیلے صرف دہی کھاتے تھے۔ ایک اور صاحب تھے جو صرف درجن بھر سنترے اور چھ سیب کھا کر زندہ رہتے تھے۔

سارا گھر ایک عجیب سیاسی سرائے بنا ہوا تھا۔ دن بھر اور رات کے وقت بھی سیاست داں، اخبار نویس، اخباروں کے فوٹو گرافر، بدیسی تماش بین اور موقع پرست لوگ وہاں منڈلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ابھی کل تک سرکار کے پٹھو تھے لیکن اب ہوا کا رخ پلٹتا ہوا دیکھ کر انھوں نے کانگریسیوں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا تھا۔ بات چیت چلتے ہوئے کئی ہفتے ہو گئے تھے پَر ابھی تک کوئی سمجھوتہ ہو نہیں پایا تھا۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا اور ہر آدمی ایک آس لگائے بیٹھا تھا۔ روز رات کو وائسرائے کی کوٹھی سے گاندھی جی کے واپس لوٹنے پر بند کمرے میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوتی تھی۔ لیکن ممبر کوئی بات باہر نہ کہنے کے لیے عہد کیے ہوئے تھے اس لیے اخبار نویسوں کو اپنے تخیل سے ہی کام لینا پڑتا تھا اور روزانہ خاص نامہ نگاروں کو کوئی نہ کوئی قابل

فہم کہانی گھڑنی پڑتی تھی۔ کوئی لکھتا سمجھوتے کی بات چیت باہمی خوش خلقی اور نیک خواہشات کے ماحول میں چل رہی تھی۔ حالات پر امید تھے۔ امید کی جاتی ہے کہ تفصیلات کی کچھ باتوں پر متفق نہ ہونے کی وجہ سے سمجھوتہ ہونے میں دیر لگ رہی ہے۔ وائسرائے نے لندن تار دے کر ہدایتیں مانگی ہیں! مہاتما گاندھی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ سوچ بچار کر کے سمجھوتے کی شرطیں طے کر رہے ہیں!

روز رات کو سب لوگ جاگتے رہتے تھے اور گاندھی جی کے وائسرائے کے یہاں سے لوٹنے کا انتظار کرتے تھے، یہ سننے کی امید میں کہ سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ کبھی کبھی گاندھی جی صبح تک لوٹ کر نہیں آتے تھے اور ان کے آنے میں لگنے والی اس دیر سے ہی لوگوں کو امید بندھنے لگتی تھی۔ اخبار والے دوڑ کر ان کی موٹر کے پاس پہنچتے تھے اور پوچھتے تھے ''ہو گیا؟'' اور وہ مسکرا کر اپنا سر ہلا دیتے تھے۔ ''نہیں، میں دو دن بعد پھر وائسرائے سے ملنے جاؤں گا۔'' پھر کوئی پوچھتا، ''کیا آپ کو اب بھی امید باقی ہے؟'' اور وہ جواب دیتے، ''میں کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا''۔ پھر کوئی لاچاری سے پوچھتا، ''گاندھی جی، کب تک سمجھوتہ ہونے کی امید ہے؟'' اور گاندھی جی آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہتے ''سب بھگوان کے ہاتھوں میں ہے۔''

(16)

بھگوان — اور سمجھوتے کی بات چیت کرنے والے دونوں اصحاب جو مقدس ارواح کی رہنمائی میں یقین رکھتے تھے — ساری دنیا کو تین ہفتے تک انتظار کراتے رہے اور لوگوں کی دلچسپی اور پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ نامہ نگار بھی دیری کے لیے نئے بہانے گڑھتے گڑھتے تنگ آ چکے تھے۔ انور، جو اس گھر میں بغیر روک ٹوک آ جا سکتا تھا، باقی لوگوں سے کچھ زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ ایک بار سمجھوتے کی بات چیت میں کچھ دن خالی چلے گئے تو لوگ سمجھنے لگے کہ بات چیت ناکامیاب رہی۔ کچھ لیڈر تو اپنا اپنا بوریا بستر بھی باندھنے لگے اور ورکنگ کمیٹی نے پھر سے جدوجہد شروع کرنے کی تجویز پر غور کرنے کے لیے ایک لمبی بیٹھک کی لیکن دوسرے ہی دن وائسرائے کا ایک پیغام رساں گاندھی کے لیے ایک مہر بند لفافہ لایا اور بعد میں یہ پتہ چلا کہ اسی رات کو دونوں پھر ملیں گے۔

شام کو گاندھی جی مکان کی ایک چھت پر پرارتھنا کرنے والے تھے۔ چھت پر سے سامنے ہی جمنا کا خوب صورت نظارہ دکھائی پڑتا تھا۔ اس موقع پر بہت سے لوگ وہاں جمع تھے۔ کچھ لوگ تو اپنی مذہبیت کی وجہ سے وہاں اکٹھا ہوئے تھے اور کچھ لوگ محض دلچسپی کی وجہ سے آ گئے تھے۔ جب پرارتھنا ختم ہوئی اور لوگ جانے لگےتو دودھ جیسے سفید کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے کسی آدمی نے انور کو نام لے کر پکارا۔ ایک پل کے لیےتو انور انھیں پہچان نہیں پایا، مگر پھر یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ سیٹھ مانک لال شاہ تھے۔ وہ یہاں کیا کرر ہے ہیں؟ اس نے سوچا۔

''ہیلو انور۔'' وہ ضرورت سے زیادہ تپاک سے انور سے ملے اور یہ بتانے کے بعد کہ وہ کسی کام سے دلّی آئے تھے اور ماں جی، آشا اور موہن کے بارے میں انور کے سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آ گئے: ''انور، تمھاری کیا رائے ہے؟ کیا سمجھوتہ ہو جائے گا؟''

انور خود ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا، پھر بھی اس نے کہا: ''وائسرائے نے پھر گاندھی جی کو بلایا ہے، اس لیے کچھ امید تو ہے۔''

''تھینک یو۔'' اتنا کہہ کر سیٹھ جی غائب ہو گئے اور انور اپنے خیالوں میں کھویا کھڑا رہا۔

(17)

اس رات سب سوالوں کا جواب مل گیا اور سارے شک دور ہو گئے۔ امیدوں کا ٹوٹ جانا بھی ہفتوں کی اس تشویش سے بہتر تھا۔

آدھی رات کے بعد اندھیرے کو چیرتی ہوئی موٹر کی تیز روشنیاں آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ سب لوگ گاندھی جی کا استقبال کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن موٹر پر صرف ایک جوشیلا اخبار نویس تھا، ایک مقامی اخبار کا چیف رپورٹر۔ ''ہو گیا''، اس نے چلا کر کہا۔ ''میں سیدھا وائسریگل لاج سے آ رہا ہوں۔ ان لوگوں نے کاغذ اور قلم منگوایا ہے۔''

گھنٹے بھر بعد گاندھی جی موٹر پر آئے۔ موٹر جو خود وائسرائے کی تھی۔ اس پر نمبر کی جگہ تاج لگا ہوا تھا۔ گاندھی جی کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ تھا۔ جواہر لال آدھی رات سے کچھ پہلے ہی جا کر سو گئے تھے۔ انھیں جگایا گیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے گاندھی جی سے ملنے آئے۔ پھر دونوں

ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کرنے اندر چلے گئے۔ میٹنگ بہت تھوڑی دیر چلی۔ سمجھوتے کی شرطیں ممبروں کو پڑھ کر سنائی گئیں اور پھر سب لوگ سونے چلے گئے۔

انور کہیں سے سمجھوتے کی ایک نقل لے آیا اور اس کی شرطیں پڑھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس میں تو شک نہیں کہ سرکار کو کچھ جھکنا پڑا تھا اور یہ سمجھوتہ خود اس بات کا ثبوت تھا کہ سرکار نے کانگریس اور گاندھی جی کی طاقت اور ساکھ کو مان لیا تھا۔ مگر انور کو لاکھ ڈھونڈنے پر بھی کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملا کہ ہندوستان کو آزادی اور آزاد ہونے کا حق دیا گیا ہے۔ ''ہندوستان کی دستوری حکومت کے منصوبے'' کا جہاں پر ذکر کیا گیا تھا وہیں پر ''مدافعت، بیرونی معاملات اقلیتوں کی حالت، ہندوستان کے مالی قرض اور معاہدوں کی انجام دہی'' کے بارے میں حقوق انگریز سرکار نے اپنے ہاتھ میں روک بھی لیے تھے۔ گاندھی جی نے اس شرط میں اتنا ضرور اضافہ کروالیا تھا کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد میں ہوں گے لیکن یہ ایک جھوٹی تسلی تھی کیونکہ اس کا مطلب ہمیشہ دو طرح سے نکالا جاسکتا تھا۔ کیا یہ سامراج واد کا دعویٰ نہیں تھا کہ ہندوستانیوں کو آزادی نہ دینا بھی ''ہندوستان کے مفاد میں'' تھا؟۔

رات بہت ہوگئی تھی۔ وہ اب گھر نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے ٹیلیفون پر ملس کو سمجھوتے کا خلاصہ بتایا اور ڈرائینگ روم میں صوفے پر لیٹ گیا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ بغل والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس نے دروازے کے شیشے سے جھانک کر دیکھا کہ جواہر لال بھی جاگ رہے ہیں۔ وہ خیالوں میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے اور سامنے رات کے اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ انور سوچنے لگا کہ شاید وہ راوی کے کنارے کی اس یادگار رات کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، عوام کے بہادرانہ کارناموں کو، لوگوں نے جو مصیبتیں جھیلی تھیں ان کو، اور ان کی قربانیوں کو یاد کر رہے ہوں گے۔ اس لمحے انور کو ایسا لگا کہ اس کے دل میں بھی وہی درد اور اداسی تھی جو اس خوب صورت چہرے پر صاف جھلک رہی تھی جسے وہ اتنی دیر سے اپنے سارے جذبات، خیالات اور امیدوں کی نشانی سمجھتا آیا تھا۔

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، ندی کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ایک کھڑکی کھل

گئی تھی اور جب وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ جواہر لال کا کمرہ خالی پڑا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ روز اس وقت وہ گاندھی جی کے ساتھ ٹہلنے جاتے تھے اس لیے وہ ہمت کر کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ بیٹھے تھے، وہاں میز پر لیمپ کے پاس ایک پیڈ رکھا تھا جس پر بار بار انھوں نے انگریزی میں ایک نظم کی دو سطریں لکھ رکھی تھیں:

THIS IS THE WAY THE WORLD ENDS.
NOT WITH A BANG BUT A WHIMPER.

(دنیا کا خاتمہ اسی طرح ہوتا ہے۔ دھماکے کے ساتھ نہیں بلکہ ایک ہلکی سی ہچکی کے ساتھ)

جب وہ نکل کر باہر برآمدے میں آیا تو اس نے گاندھی جی اور جواہر لال کو ٹہل کر واپس لوٹتے ہوئے دیکھا۔ گاندھی جی ہمیشہ کی طرح متین اور ہشاش بشاش تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھوں نے اپنے غیر مطمئن چیلے کو مطمئن نہیں تو راضی کر لیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہنے کے باوجود جواہر لال بھی زیادہ خاموش دکھائی دے رہے تھے۔ انور سوچنے لگا کہ شاید ان کے چہرے سے ظاہر ہونے والا یہ سکون اس کھلاڑی کے جیسا ہے جو ہار جانے پر بھی مایوس نہیں ہوتا۔

ندی کے پار مشرقی افق پر دھیرے دھیرے صبح کی لالی پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک نئے دن کا سویرا ہو رہا تھا۔ انور نے اپنے کوٹ کا کالر اونچا کر لیا اور ٹھنڈی ہوا میں کانپتا ہوا ایک پیالی چائے کی تلاش میں باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

○

کہاں ہے منزل تیری؟

(1)

ملس نیویارک کا جہاز پکڑنے کے لیے بمبئی جا رہا تھا۔ جب انور اسے چھوڑ کر اسٹیشن سے گھر لوٹنے لگا تو اسے ایسا لگا کہ جیسے اچانک وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ سال بھر تک اس نے ملس کے ساتھ کام کیا تھا، ہندوستان کو سمجھنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اس صاف گو اور بااصول امریکی اخبار نویس کے ساتھ کام کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ ایک سال اس کے لیے بہت واقعات سے بھرپور اور پرجوش رہا تھا اور ان دونوں نے ساتھ رہ کر بہت سے عجیب اور معرکے کے واقعات دیکھے تھے۔ وہ کانگریس کے کارکنوں سے ملے تھے اور انھوں نے پوری تحریک کو صحیح ڈھنگ سے دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی تھی، انھوں نے بڑے بڑے لوگوں کی باتوں اور ان کے کاموں کو معقول اہمیت دی تھی لیکن وہ معمولی لوگوں کو ایک پل کے لیے بھی نہیں بھولے تھے جن کے بغیر تحریک میں کبھی اتنا زور اور انقلابی جوش پیدا نہ ہوتا۔ ملس اکثر کہا کرتا تھا، ''لیڈروں کو تو چھوڑ دو۔ ان کی تقریروں کی خبر دینے کے لیے تو درجنوں نامہ نگار ہیں۔ ہمیں عام لوگوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔'' اسی طرح ایک بار اور اس نے کہا تھا، ''عوام جس لائق ہوتے ہیں انھیں ویسے ہی لیڈر بھی ملتے ہیں کیونکہ لیڈر کہیں آسمان سے نہیں ٹپکتے ہیں بلکہ عوام کے درمیان سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عوام کی شخصیت،

ان کی طاقت، ان کی کمزوریوں، ان کی آرزوؤں اور ان کی اجتماعی خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں۔''

انور نے ملس سے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں سیکھی تھیں لیکن انور اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا سفر میں اس کا ساتھ دینے کے علاوہ بھی اس نے رابرٹ کے لیے کچھ کیا تھا لیکن ملس کا خیال تھا کہ اس نے اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اسی لیے اس نے اپنی کتاب میں بھی اس کے لیے شکریہ ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب "INDIA AWAKES" (ہندوستان جاگتا ہے) پبلشر کے پاس بھیجتے وقت اسے انور کے نام منسوب کردیا تھا اور لکھا تھا۔ ''انور کے نام۔ جس نے ہندوستان میں میری آنکھوں اور میرے کانوں کا اور اکثر میری زبان کا بھی کام کیا۔''

گھر جاتے ہوئے انور اس انتساب کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ان بحثوں کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا جو سارے ملک کا دورہ کرتے وقت اس نے ملس کے ساتھ کی تھیں۔ اسے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ ملس کو واپس جانا پڑا لیکن اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ امریکہ میں بھی ہندوستان کے لیے مفید کام کرے گا۔ اس نے امریکہ میں گھوم گھوم کر مختلف جگہوں پر تقریریں کرنے کا پروگرام بنایا تھا جن میں وہ اپنے ملک والوں کو بتائے گا کہ اس نے ہندوستان میں کیا دیکھا تھا اور اس طرح کیتھرین میو جیسے مصنفوں نے امریکیوں کے سامنے ہندوستان کی جو مسخ تصویر پیش کی تھی، اس کی جگہ پر وہ ہندوستان کی سچی تصویر پیش کرے گا۔ ملس کے روپ میں ہندوستان کو ایک بہت بڑا اچھا دوست مل گیا تھا۔ اور انور کو یقین تھا کہ وہ ہمیشہ......

لیکن یکا یک اس نے اپنے خیالات کو روک لیا اور ملس کی اس نصیحت کو یاد کر کے وہ مسکرا دیا جیسے وہ وہ بار بار دہرایا کرتا تھا ''انور، کسی بات کا اتنا پکا یقین نہیں کرنا چاہیے۔''

(2)

ملس ٹھیک ہی کہتا تھا۔ انور کو بہت سی باتوں کا بالکل پکا یقین تھا۔ جیسے اس بات کا کہ مکمل آزادی کے معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ وا جب ہی تھا کہ اسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ دو تین دن تک تو وہ بالکل کھویا کھویا سا رہا۔ وہ اس نئی حالت کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی ناؤ کا لنگر ٹوٹ گیا ہے اور وہ ناامیدی کے وسیع سمندر کے تھپیڑے کھا

رہی ہے—اس کی رہنمائی کرنے کے لیے امید کی ایک کرن بھی نہیں تھی۔

''اب ہم کہاں جائیں؟'' اسے یکا یک ایک اخبار نویس کا یہ سوال یاد آیا جو اس نے سمجھوتے کے دوسرے دن صبح پوچھا تھا اور وہاں پر موجود جو پانچ چھ دوسرے اخبار نویس گاندھی جی سے ملاقات کا انتظار کر رہے تھے ان میں سے کسی نے بھی اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ چاندنی چوک پار کر کے جامع مسجد کی طرف مڑا تھا۔ ایک ٹرام کھڑ کھڑ کرتی ہوئی اس کے پاس سے گذر گئی اور اس سے تھوڑی دور پر جا کر رک گئی۔ اس نے ٹرام نہیں پکڑی۔ وہ پیدل گھر جانا چاہتا تھا تا کہ راستے میں اپنے الجھے ہوئے خیالات کو سلجھا سکے۔

''اب ہمیں کدھر جانا ہے؟ سچ سچ کدھر؟''

کچھ دن تک تناؤ کے ساتھ خاموشی رہنے کے بعد پھر ستیہ گرہ کی طرف؟

ابھی سے یہ چرچا ہونے لگی تھی کہ سمجھوتے میں جن شرطوں پر دستخط ہوئے تھے ان میں سے کچھ کو سرکار پورا نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اب ایک بار یہ ثابت ہو چکنے کے بعد کہ مکمل آزادی کے مقصد کے بارے میں بھی سودے بازی ہو سکتی ہے، کیا کانگریس کبھی عوام میں پہلے جیسا جوش پیدا کر سکے گی؟ کیا وہ پھر کبھی عوامی تائید حاصل کر سکے گی؟ وہ سوچ رہا تھا کہ آج ہزاروں معمولی کانگریسی— مرد اور عورتیں— جیل سے باہر آ کر کیا محسوس کرتے ہوں گے؟ اس سمجھوتے سے گجرات اور یو۔ پی کے کسانوں کو کیا امید بندھے گی جنھیں گول میز کانفرنس سے کوئی سروکار نہیں ہے، جو بھوکے پیٹ بھرنے کے لیے صرف کچھ روٹیاں چاہتے ہیں؟ کیا اب انقلابی عدم تشدد کو خدا حافظ کہنا تھا؟ کیا اب آزادی کی لڑائی پھر کانفرنسوں اور کونسل چیمبروں میں ہوا کرے گی— جس لڑائی میں لیڈر لوگ لفظوں سے لڑیں گے اور عوام صرف تالیاں بجائیں گی اور واہ واہ کریں گے؟ کیا وہ پھر وہیں پر پہنچ گئے تھے جہاں وہ اعتدال پسندوں اور دستور پسندوں سے کبھی علیحدہ ہوئے تھے؟

اب ہمیں کدھر جانا ہے؟ اس بڑے قومی سوال میں انور کا اپنا نجی سوال بھی شامل تھا۔ اب وہ کدھر جائے؟ پھر یونی ورسٹی واپس؟ شاید اب سمجھوتے کے اس ماحول میں اسے پھر داخل کر لیا جائے لیکن سال بھر تک باہر کی کھلی دنیا میں رہ چکنے کے بعد کلاس میں بیٹھ کر اس کا دم گھٹے گا اور یونی ورسٹی میں جو کچھ اسے پڑھایا جائے گا وہ اسے بہت ہی بیکار معلوم ہوگا۔ پھر کیا وہ سیاسی کام

شروع کر دے؟ اس نے کالج کے دنوں میں تقریر کرنے کی جو مشق کی تھی اس سے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ لیکن اس میں 'لیڈر بننے' کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا۔ اس کی عمر بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا پیٹ کیسے پالے گا؟ کیا وہ اخبار نویس بن سکتا ہے؟ لیکن نئی نئی چیزوں کے بارے میں جاننے کی دلچسپی کے علاوہ اس میں اس کام کے لیے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اس نے اپنی ساری زندگی میں بس ایک مضمون لکھا تھا اور اس ایک مضمون کی بنیاد پر اسے کون اپنے اخبار میں لے گا؟ اس کے علاوہ اسے ان باتوں کا بھی بہت تھوڑا ہی علم تھا جن کے بارے میں ایک اخبار نویس کو جاننا چاہیے— معاشیات، سیاسیات، دستوری قانون۔ کیا اسے آگے بڑھنے کے لیے انگلستان یا امریکہ جانا چاہیے؟ کیا وہ جا سکتا ہے؟ آگے بڑھنے کا تو نام تھا وہ سچ مچ دنیا دیکھنا چاہتا تھا اور اپنا نظریہ وسیع بنانا چاہتا تھا کہ اس کے ابا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ اسے باہر بھیج سکیں۔ اسے سرکاری وظیفہ بھی نہیں مل سکتا تھا!

''اب ہمیں کدھر جانا ہے؟'' اور اس وقت کے لیے تو اس نے اس سوال کا جواب ڈھونڈ لیا اور اپنے گھر کی گلی میں مڑ گیا۔

(3)

جس وقت وہ گھر پہنچا اس کے ابا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے نوکر سے پوچھا کہ کوئی خط تو نہیں آیا اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خطوں کا ایک پورا ڈھیر اس کے لیے رکھا ہوا تھا۔ آشا کی نازک لکھائی پہچان کر اس نے سب سے پہلے اس کا خط کھولا۔ وہ جیل سے چھوٹ آئی تھی لیکن وہ بہت دکھی تھی کیونکہ اس کے پیچھے یشونت کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی اور اب وہ موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ ''میں اپنا دکھ بتانے کے لیے تمھیں لکھ رہی ہوں۔ انور، یہ دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ اتنا اچھا اور اتنا ہمت والا اور قابل نوجوان موت کی گھڑیاں گن رہا ہو اور ہم اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اسے ایسی حالت میں بیمار چھوڑ کر میں نے جیل جا کر بڑا پاپ کیا ہے لیکن شاید تمھیں معلوم ہے کہ میں کیوں اتنی کائر بن گئی۔'' انور جانتا تھا اور اسی لیے اسے آشا پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

اس نے اپنا خط ختم کرنے کے بعد بھی کچھ سطریں لکھی تھیں۔ ''وہ مر گیا۔ آج صبح اس کی موت ہوگئی۔ اس وقت تک میں یہ خط ڈاک میں نہیں ڈال سکی تھی۔ لیکن ایک بات کی تسلی ہے کہ اس نے

'سرمایہ' کا ترجمہ کل رات پورا کر لیا تھا۔'' خط پر جہاں جہاں آشا کے آنسو گرے تھے وہاں سیاہی پھیل گئی تھی۔

یشونت اور اس کی بہادرانہ جدوجہد کے بارے میں سوچتے ہوئے کہ اس نے مرتے دم تک اس کام کو پورا کرنے سے ہمت نہیں ہاری جس میں وہ یقین رکھتا تھا۔ انور نے دوسرا لفافہ کھولا۔ اس پر بھی بمبئی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ موہن کا خط تھا۔ ہلکے ارغوانی رنگ کے بڑھیا کاغذ پر اتنا گھسیٹ کر لکھا تھا کہ پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے ہمیشہ کے انداز میں لکھا تھا: ''انور، مائی بوائے، اب صلح ہو گئی ہے، لڑائی کے جھنڈے لپیٹ لیے گئے ہیں اس لیے اب اس ملک میں رہنے میں کوئی مزا نہیں۔ مجھے وداع کرو۔ میں اگلے ہفتے ولایت جا رہا ہوں۔ اگر کبھی رنگین پیرس آنے کا اتفاق ہو تو امریکن ایکسپریس کے پتے پر خبر دینا۔ میں تمھیں پینٹنگ کرنا سکھاؤں گا — سارے شہر کو لال کر دینا۔'' خط کے ایک ایک لفظ پر موہن کی چھاپ تھی۔ وہی متوالا دیش بھگت جو پلاٹینم کے سگریٹ کیس میں سے نکال کر بیڑی پیتا تھا اور تاج کے ڈائننگ روم میں سرکار کے خلاف پرچے بانٹتا تھا۔

وہ اب کدھر جا رہا تھا؟ پیرس کی رنگین سڑکوں کی طرف۔ ایسا لگتا تھا کہ انور کو چھوڑ کر باقی سب ہی لوگ اپنی زندگی کے پلان رہے تھے۔ راز نے لکھنؤ سے لکھا تھا کہ اس نے جیل میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور وہ انھیں جلد ہی چھپوانے والا ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر تھا کہ اس کی نظمیں بہت جوشیلی ہوں گی۔ کتاب کا نام اس نے رکھا تھا ''آگ اور آنسو''۔ اس کے بعد اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر لوک گیت اور کسان شاعروں کی غیر مطبوعہ نظمیں اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سبحان کا بھی ایک خط تھا اور اس آگ اگلنے والے مارکسی نے لکھا تھا کہ وہ ستیہ گرہ سے تنگ آ چکا تھا اور اب وہ کانپور کے چمڑے کے کارخانوں میں مزدوروں کی تنظیم کر رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا: ''اب پولیس کی نظر میرے اوپر بھی رہنے لگی ہے اور مجھے دو بار وارننگ بھی مل چکی ہے۔ بھلا جانتے ہو یہاں کا ڈی۔ ایس۔ پی کون ہے؟ سلمیٰ کے شوہر منظور احمد۔ وہ اپنے دفتر میں مجھ سے سوال جواب کر رہے تھے کہ اتنے میں وہ بھی وہاں آ گئی۔ کافی موٹی ہو گئی ہے اور ایسی خوش نظر آتی ہے جیسے کھلا پلا کر تیار کی ہوئی موٹی تازی گائے۔'' انور اس بھدی تشبیہ پر تلملا اٹھا لیکن اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھ کر بہت ہنسی بھی آئی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہارمونز زندگی کے لیے ان

شاعروں کی ہوائی بکواس سے زیادہ ضروری ہیں جو ایک ایسی چیز کے بارے میں جو ہمارے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پینے کا پانی، زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔"

دنیا بہت چھوٹی تھی اور لاکھ کوشش کرنے پر بھی سلمٰی کی یاد اس کے دل سے نہیں جاتی تھی۔ وہ اُسے بھول کیوں نہیں جاتا؟ کاش وہ کچھ دنوں کے لیے ان سب چیزوں سے دور ولایت جاسکتا۔ شاید اس سے کچھ فائدہ ہوتا۔ حالانکہ تب بھی سجانو سکی یہ کہنے سے نہ چوکتا کہ یہ حقیقت سے دور بھاگنا ہے، جو اس کے جاگیردارانہ طور طریقے اور نظریے کا ثبوت تھا۔

سارے خط پڑھ چکنے کے بعد اس نے صبح کا اخبار اٹھایا۔ اس کی نظر پہلے ہی صفحے پر چھپی ہوئی ایک موٹی سی خبر پر پڑی— "دہشت پسند قیدی پھانسی لگنے سے پہلے ہی جیل سے بھاگ نکلا۔" جلدی جلدی اس نے پوری خبر پڑھ ڈالی۔ یہ اس کا پرانا دوست رتن ہی تھا۔ وہ ان قیدیوں میں سے ایک تھا جنھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ جب اسے بارک سے کال کوٹھری میں لے جایا جارہا تھا اس وقت وہ جیل سے بھاگ نکلا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پولیس اسے تلاش کررہی تھی لیکن انور کو یقین تھا کہ اب وہ ان کے چنگل میں آنے والا نہیں ہے۔

اس کے پاس ہی ایک دوسری خبر چھپی ہوئی تھی جس میں لکھا تھا کہ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گرو کی موت کی سزائیں رد کرانے میں گاندھی جی کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں اور چونکہ قیدیوں نے رحم کی بھیک مانگنے سے انکار کیا تھا اس لیے انھیں فوراً پھانسی پر چڑھایا جانے والا تھا۔ کم سے کم تین نوجوان ایسے تھے جن کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ "اب ہمیں کدھر جانا ہے؟" انھوں نے موت کا راستہ چنا تھا اور ان کے قدم آخر تک نہیں ڈگمگائے تھے۔

(4)

اس دن رات کو جب اکبر علی مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹے اور باپ بیٹا کھانا کھانے بیٹھے تو اکبر علی نے انور سے پوچھا "اچھا انور اب تم نے کیا کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ اگر تم ایم۔ اے پاس کرنا چاہو تو یونی ورسٹی والے تمھیں پھر واپس لے لیں گے۔"

"نہیں ابا، اب علی گڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تو دو ایک برس کے لیے ولایت جانا

چاہتا ہوں، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے پاس مجھے باہر بھیجنے کے لیے پیسے نہیں ہیں اس لیے میرا تو خیال ہے کہ میں کچھ دن یہیں رہ کر کوئی نوکری ڈھونڈوں گا۔ اگر کسی اخبار میں مل جائے تو اچھا ہے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ اخبار میں فوراً اتنی اچھی نوکری نہیں ملے گی۔ اگر ولایت سے کوئی ڈگری لے آؤ تو اچھا رہے گا۔ کچھ دنیا بھی دیکھ لوگے اور تجربہ بھی ہو جائے گا جو آگے چل کر اخبار کی نوکری میں کام آئے گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے ابا۔ لیکن اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ آپ کہیں سے قرض لیں یا کوئی چیز گروی رکھیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اکبر علی نے دھیرے دھیرے کچھ ہچکچاہٹ سے کہا۔ ''تم اپنے پیسے سے جاسکتے ہو۔ انور، بات یہ ہے کہ تمھارے رامیشور کاکا مرتے وقت دس ہزار روپے چھوڑ گئے تھے۔''

''دس ہزار!'' انور نے تعجب سے کہا۔ یہ تو بہت بڑی رقم تھی۔ ''لیکن کیوں؟''

''ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ تمھیں بہت پیار کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ تمھارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ تمھارا پیسہ ہے اور تم جس طرح چاہو اسے خرچ کر سکتے ہو۔''

بیمار اور بوڑھے رامیشور کاکا کی یاد آتے ہی انور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بہت ہی رحمدل آدمی تھے اور انور کو ابھی تک یاد تھا کہ وہ اسے سونے کے بٹن بنوا دینے کو کہا کرتے تھے اور اگر اکبر علی نے انھیں زیادہ لاڈ کر کے بیٹے کو تباہ کر دینے سے روکا نہ ہوتا تو وہ بنوا بھی دیتے۔ لیکن دس ہزار روپے! رامیشور دیال جیسے امیر آدمی کے لیے بھی یہ بہت کافی بڑی رقم تھی۔

''میں سوچتا ہوں کہ انگلینڈ چلا جاؤں''، انور نے اپنے ابا سے کہا۔ ''اور وہاں سے لندن اسکول آف اکنامکس کی ڈگری لے آؤں۔ ہو سکے تو جرنلزم کا ڈپلوما بھی لے لوں۔ لیکن بنیادی طور پر تو میں ساری دنیا گھومنا چاہتا ہوں، اگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ وقت برباد کرنا ہوگا۔''

اکبر علی پکے مسلمان تھے۔ انھوں نے انور کی ملک ملک گھومنے کی خواہش کی تائید کی کیونکہ رسولؐ نے بھی کہا تھا کہ ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ 'وہ علم حاصل کرے، چاہے اس کے لیے

اسے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔'' اس زمانے میں اب سے تیرہ سو سال پہلے عربستان والوں کے لیے چین ہی دنیا کی حد تھی۔

''میں ایک اور بات کے بارے میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ عام طور پر تو یہ ماں کے پوچھنے کی ہوتی ہے......'' اتنا کہہ کر وہ کچھ الجھن میں پڑ کر رک گئے۔ انور سمجھ گیا کہ اب اس کے ابا کیا چاہتے ہیں لیکن وہ ان کے کہنے کا انتظار کرتا رہا۔

''اب تم جوان ہوئے۔'' اکبر علی نے پھر کہنا شروع کیا ''اور اس عمر میں آدمی شادی کر کے گھر بسانے کی سوچتا ہے۔ تو اگر تم کہو تو میں تمھارے لیے کوئی لڑکی دیکھوں......''

''نہیں نہیں، ابا۔'' انور نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی جلدی کیا ہے۔''

''تم اکیس برس کے ہو۔'' اس کے ابا نے اسے یاد دلایا ''جب میری شادی ہوئی تھی اس وقت میں تو انیس ہی برس کا تھا۔''

''یہ تو سچ ہے''، بیٹے نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابا، زمانہ بدل گیا ہے۔ کم سے کم مجھے انگلینڈ تو ہو آنے دیجیے۔''

باپ نے بیٹے کی بات مان لی۔ ''میں تمھیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ تم خود اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلو۔ لیکن یہ بتادو کوئی لڑکی ہے تو نہیں''۔ بیٹے سے ایسی بات کہتے ہوئے ان کی زبان کچھ لڑکھڑا گئی۔ ''میرا مطلب ہے کوئی خاص لڑکی جسے تم جانتے ہو اور جو تمھیں پسند ہو؟''

''جی نہیں، ابا۔ ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔'' انور نے کافی یقین کے ساتھ کہا اور اس نے اپنے دل کو بھی سمجھا لیا کہ اب یہی سچ بات بھی تھی۔

(5)

گاندھی ارون سمجھوتے کی شرطیں چھپیں تو ملک میں لوگوں پر اس کا الگ الگ اثر ہوا۔ جو انقلابی نوجوان انگریز سرکار کے مقابلے میں الگ قومی انقلابی سرکار بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اعتدال پسند نے سپرو اور جیکر کی سمجھوتہ کرانے کی کوششوں کی کامیابی پر اپنے آپ کو مبارکباد دی۔ سرکار کے پرانے وفاداروں میں وائسرائے کے اس قدم پر بوکھلاہٹ پھیل گئی کہ انھوں نے ایک پرانے غدار کو برابری کا درجہ دے دیا تھا اور وہ اس میں

آگے چل کر اپنے طبقے کا خاتمہ دیکھنے لگے۔ سرکاری افسر یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ اب کھدر پوش کانگریسی لیڈر حکومت کریں گے اور ان پر حکم چلائیں گے۔ ہندو فرقہ پرستوں کا خیال تھا کہ اب وہ صرف سرکار کا سہارا نہیں لے سکتے۔ انھیں اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے کانگریس کے پاس بھی جانا پڑے گا۔ مسلمان فرقہ پرستوں نے تو اعلان کر دیا کہ یہ ان کے ساتھ سراسر دھوکہ تھا، انھیں ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا اور انھوں نے اس ''بنیے گاندھی'' سے اپنا رشتہ توڑنے اور اسے بدنام کرنے کے لیے اپنی تنظیم کرنی شروع کر دی تھی۔ انھیں شکایت تھی کہ وہ سب ہندوستانیوں کی طرف سے بولنے کا دعویٰ کیسے کرتا ہے۔ چھ سو سے اوپر دیسی رجواڑے یہ محسوس کرنے لگے کہ جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو اور ان کے تخت ڈول گئے ہوں۔ کانگریسی راج کا بھوت ان کے سر پر منڈلانے لگا۔ انھیں ایسا دکھائی دینے لگا کہ جمہوریت کا راکشس انھیں کھا جانے کے لیے منہ پھاڑے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ان میں سے کچھ تو اتنے گھبرا گئے کہ وہ بھاگے بھاگے وائسرائے کے پاس فریاد لے کر آئے کہ انھیں گاندھی سے بچایا جائے۔ کچھ نے اسی مقصد سے نئی دلّی کے خدا کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔

ان سہمے ہوئے رجواڑوں میں سلام پور کے نواب صاحب بھی تھے جنھوں نے سرکار کے سیاسی محکمے کے سامنے اپنی فریاد رکھنے کے لیے تایا امجد علی کو بھیجا تھا۔ انور کی ولایت جانے کی تیاریوں کے وقت ان کے وہاں پہنچنے سے سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ وہ اس بات سے خوش نہیں تھے اور انھوں نے اپنی اس رائے کو اپنے تک ہی نہیں رکھا۔ انھوں نے انور کے سامنے یہ بات کہی کہ نوجوان لڑکے ولایت جا کر بگڑ جاتے ہیں اور دین مذہب سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کی عمر کا لحاظ کر کے انور نے کچھ بھی نہیں کہا اور اس ڈر سے کہ کہیں جھگڑا بڑھ نہ جائے وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب انور واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ امجد علی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کسی سنجیدہ مسئلے پر باتیں کر رہے تھے۔ انور کو آتا دیکھ کر انھوں نے اپنی آواز دھیمی کر دی لیکن انور نے اپنے ابا کو کہتے سنا: ''بھائی صاحب، معاف کیجیے گا لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے۔'' انور سوچنے لگا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔

اس رات دریا گنج کے مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہونے والی تھی۔ 'ناپاک' گاندھی اروِن

سمجھوتے کی مخالفت کرنے کے لیے اور یہ اعلان کرنے کے لیے کہ گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو "کانگریس کے ہندوؤں" کے علاوہ اور کسی کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں ہے۔ دلّی کے محلّوں ہی میں نہیں بلکہ سارے ملک میں اس طرح کی میٹنگیں کی جارہی تھیں۔ انور جانتا تھا کہ ان سب ہی میٹنگوں میں ایک ہی قرار داد پاس کی جاتی تھی اور اس قرارداد کے آخر میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ انھیں ہز ہائی نس دی آغا خاں کی رہنمائی میں گول میز کانفرنس میں حصہ لینے والے مسلمان نمائندوں میں پورا یقین تھا۔

اکبر علی صاحب کو اس میٹنگ کی صدارت کرنے کے لیے راضی کر لیا گیا تھا۔ انور چاہتا تھا کہ اس کے ابا گاندھی جی کی مخالفت کرنے کی اس رجعت پسند کوشش میں نہ پھنسیں لیکن چونکہ کچھ ہی دن بعد وہ ولایت جانے والا تھا اس لیے وہ اپنے ابا کے ساتھ کوئی سیاسی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ چپ رہ گیا۔

لیکن تایا امجد علی انور کو ترغیب دینے پر تلے ہوئے تھے۔ جب وہ لوگ کھانا کھا چکے اور میٹنگ میں جانے کی تیاری کرنے لگے جو پاس ہی کی ایک مسجد میں ہونے والی تھی، تو انھوں نے انور کی طرف غور سے دیکھا، جو ایک کتاب لے کر سونے جارہا تھا، اور اس سے پوچھا "انور تم نہیں چلو گے؟"۔

اکبر علی نے فضول کے جھگڑے کو روکنے کے لیے شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا، "بھائی صاحب، اسے رہنے دیجیے، اسے ہماری میٹنگوں میں دلچسپی نہیں ہے۔"

انور نے سوچا تھا کہ تایا امجد علی اب چپ ہو جائیں گے لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ "اگر وہ کانگریسی بھی ہے" اور 'کانگریسی' لفظ کو انھوں نے بڑی نفرت کے ساتھ کہا، "تب بھی اسے کبھی کبھی یہ بھی سننا چاہیے کہ مسلمان کیا کہتے ہیں" اور پھر وہ انور سے بولے۔ "یا تمھیں اس میٹنگ میں جاتے ہوئے شرم آتی ہے، جس میں تمھارے ابا صدارت کر رہے ہوں؟"

یہ بہت ہی اوچھا اور کمینے پن کا وار تھا اور اکبر علی کو اپنے بھائی کی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن منہ سے نکلی ہوئی بات واپس تو نہیں لی جاسکتی تھی۔ انور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے تایا ابا کی وجہ سے اس کے ابا کو اس کی طرف سے کسی طرح کی غلط فہمی ہو، اس لیے اس نے اٹھ کر شیروانی پہن لی۔ امجد علی کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر اس نے اپنے ابا سے کہا۔ "ابا، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی چلوں؟"

(6)

انور ان میٹنگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھی گئیں تاکہ سننے والوں پر مذہبی فضا چھا جائے۔ اور پھر جوشیلی نظمیں پڑھی گئیں جن میں بتایا جاتا تھا کہ اسلام نے کتنے شاندار دن دیکھے تھے اور کس طرح مسلمانوں نے اسپین سے لے کر چین تک ساری دنیا کو جیت لیا تھا۔ ان نظموں سے سننے والوں میں لڑنے کا جوش پیدا کیا گیا۔ اس کے بعد اکبر علی صاحب سے میٹنگ کی صدارت کرنے کو کہا گیا۔

تجویز پیش کرتے وقت اپنی تقریر میں اکبر علی نے جتنی بھی باتیں کہی تھیں ان میں زیادہ تر سے انور اتفاق نہیں کرتا تھا لیکن اسے یہ ماننا پڑا کہ اس کے ابا بہت سنبھل کر تقریر کر رہے تھے اور انھوں نے گاندھی جی پر یا کانگریس کے دوسرے لیڈروں پر کوئی بیہودہ ذاتی حملہ نہیں کیا تھا۔ ان میں اب تک پرانا سامراجیوں کی مخالفت کا جوش کچھ کچھ باقی تھا اور انھوں نے سب سے زیادہ سخت باتیں کانگریس کے بارے میں نہیں بلکہ انگریزوں کے بارے میں کہیں۔ انھوں نے انگریزوں پر ساری دنیا میں اور ہندوستان میں بھی، مسلمانوں کو تباہ کرنے کی سازش کا الزام لگایا۔ انھوں نے مشرق متوسط کے ملکوں میں سامراجیوں کی سازشوں کا ذکر کیا لیکن نہ جانے کس طرح گاندھی ارون سمجھوتے کو بھی ان میں شامل کر دیا۔

اکبر علی کی تقریر کے بعد دوسرے لوگوں کی تقریروں کا رخ خراب ہوتا گیا۔ جن لیڈروں کی انور عزت کرتا تھا انھیں ایسی گندی گندی گالیاں دی گئیں کہ انور سن کر دنگ رہ گیا۔ کئی مقرروں کی خالص اسلامی تقریریں سن کر تو وہ حیرت میں آ گیا۔ خالص طور پر اپنے تایا ابا کی تقریر سن کر جو اس زمانے کی ڈینگ مار رہے تھے جب ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ ''ہم انگریزوں کی طرح یہاں تجارت کرنے کے بہانے سے نہیں آئے تھے۔ ہم ہاتھ میں تلوار لے کر اس ملک میں آئے تھے اور ہم نے تلوار کے زور سے اسے جیتا تھا'' اس کے بعد انھوں نے دھمکی دی کہ ایک بار پھر مسلمانوں کو 'اسلام کی تلوار' نکالنی پڑے گی اور پھر سے اسلامی سلطنت قائم کرنی ہوگی چاہے انھیں خون کی ندیاں ہی پار کیوں نہ کرنی پڑیں۔ اس کے تایا ابا نے اپنی تقریر میں جو خوفناک تصویر کھینچی تھی اس کا تصور کر کے انور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ اس کے ابا صدر

کی حیثیت سے مقرر کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ امجد علی گرج رہے تھے "ہم سرکار کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا گاندھی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ گائے کا پیشاب پینے والے ہندوؤں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم مسلمان ایک الگ قوم ہیں، ہماری الگ زبان ہے، ہماری الگ تہذیب ہے، ہم ہمیشہ الگ رہے ہیں اور ہمیشہ الگ رہیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد انور کو ایسا لگا کہ اسے یہ بھی سنائی نہیں دے رہا ہے کہ تایا امجد علی کیا کہہ رہے ہیں۔ اسے ان کی صورت بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سامنے نہ جانے کتنے امجد علی کھڑے تھے— ہندو امجد علی، مسلمان امجد علی، پارسی اور سکھ امجد علی، عیسائی اور ہریجن امجد علی، جن کے داڑھیاں تھیں، چوٹیاں تھیں۔ جن کے گلے میں جنیئو پڑے تھے اور زنجیروں سے صلیبیں لٹک رہی تھیں— اور سب چلّا رہے تھے، "ہم الگ قوم ہیں" ان کے ہاتھوں میں اسلام کی تلوار، ہندو مذہب کی تلوار، سکھ مذہب کی تلوار چمک رہی تھی اور وہ بھارت ماتا کے جسم میں تلواریں بھونک رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد انور نے دیکھا کہ ہر تلوار سے خون ٹپک رہا ہے۔

بڑا بھیانک منظر تھا۔ انور چونک پڑا اور اس کا دھیان پھر اس میٹنگ کی طرف لوٹ گیا۔ امجد علی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے اور صدر صاحب تجویز پر ووٹ لینے جا رہے تھے۔ "لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ لوگوں سے ہاتھ اٹھانے کو کہوں اگر یہاں پر کوئی اس تجویز کے خلاف ہو اور وہ یہاں آ کر بولنا چاہتا ہو تو وہ خوشی سے بول سکتا ہے۔" انور کو ایسا لگا کہ اس کے ابا کی نظریں سیدھے اسی پر جمی ہوئی تھیں اور جس طرح سے انھوں نے یہ بات کہی تھی اس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ انور کو بولنے کے لیے للکار رہے تھے۔

"انور میاں!" کسی نے اسے پیچھے سے پکارا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کی نظریں کھدر پوش رحمت چاچا پر پڑیں۔ رحمت سفید داڑھی والا جلاہا تھا جو ستیہ گرہ اور خلافت کے زمانے میں اکبر علی کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ کانگریس سے الگ نہیں ہوا تھا اور ستیہ گرہ میں جیل بھی ہو آیا تھا۔ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے بعد وہ بھی جیل سے چھوٹ کر آیا تھا۔ "انور میاں" وہ اپنے سیدھے سادے ڈھنگ سے کہہ رہا تھا "تم بولتے کیوں نہیں؟ یہ گورنمنٹ والے ہماری آواز بھی تو سنیں۔"

"ہاں رحمت چاچا، میں ضرور بولوں گا" اس نے اس سیدھے سادے دیش بھگت کو یقین

دلایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا۔ ''میں اس تجویز کے خلاف بولنا چاہتا ہوں۔''

(7)

انور جب اپنے ابا کی بغل میں جا کر کھڑا ہوا تو اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کی اس حرکت سے لوگوں میں ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔ سینکڑوں لوگوں کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور ان نظروں میں تعجب، یہ جاننے کی دلچسپی کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے، نفرت اور ڈر سب ہی کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ کسی نئے قسم کے خونخوار جانور کو دیکھ رہے ہوں۔ تایا امجد علی غصے کے مارے کھول رہے تھے اور اپنی لمبی مونچھوں کو چبا رہے تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو شاید وہ اپنے اس گستاخ بھتیجے کو وہیں کوڑے لگوا دیتے لیکن سب سے زیادہ تعجب تو اسے اکبر علی کے چہرے کو دیکھ کر ہوا۔ وہ نہ صرف مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے بلکہ عجیب بات یہ تھی کہ اپنے بیٹے کی اس ہمت کو دیکھ کر ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

انور کی یہ سوچ کر کافی تسلی ہوئی کہ کم سے کم اس کے ابا اس کی تقریر پر ناراض نہیں ہوں گے۔ انور نے بولنا شروع کیا اور چھوٹتے ہی اس نے ایسی بات کہی جس سے سننے والے دنگ رہ گئے۔ ''جتنے لوگ یہاں بولے ہیں ان سب نے گاندھی ارون سمجھوتے کی برائی کی ہے۔ میں بھی اس سمجھوتے کو اچھا نہیں سمجھتا''۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے رکا تا کہ اس کی یہ بات لوگوں کے دماغ میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔ پھر اس نے بولنا شروع کیا، ''اس لیے نہیں کہ سرکار نے مہاتما گاندھی اور کانگریس کی کچھ مانگیں مان لی ہیں، بلکہ اس لیے کہ کچھ اس سے بھی زیادہ بنیادی مانگیں نہیں مانی گئی ہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ گاندھی جی آزادی کے بنیادی مسئلے پر سمجھوتہ نہ کرتے۔''

شروع شروع میں اسے جو گھبراہٹ تھی وہ اب دور ہو گئی تھی اور اس نے ان مقرروں پر زبردست حملہ شروع کیا جنھوں نے کانگریس کو ''ہندوؤں کی جماعت'' کہہ کر اس پر حملہ کیا تھا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی یونین میں اس نے طنز کرنے کی جو مشق کی تھی اس سے اس نے اس وقت پورا فائدہ اٹھایا۔

''تو کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے، میری رائے میں تو کچھ لوگ یہ بھی کہیں گے کہ

کانگریس میں کوئی مسلمان ہے ہی نہیں۔ میرے ابا ایک زمانے میں جب خلافت کا زور تھا مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند کہا کرتے تھے۔ میرے خیال سے اب مولانا آزاد شاید ہندو ہو گئے ہیں۔ میرے خیال سے مولانا حسین احمد مدنی اور جمعیت العلماء کے دوسرے مولاناؤں کے بارے میں بھی یہی بات سچ ہے۔ جسٹس عباس طیب جی اور حسن امام صاحب کو بھی ہندو کہا جانا چاہیے کیونکہ وہ گاندھی جی کے دوست ہیں۔ اگر میں اپنے دوستوں کے نام گناؤں جیسے اصغر حسین راز، سبحان اور یونس تو آپ کہہ دیں گے کہ یہ سب دہریے ہیں۔ کیا سرحد کے خدائی خدمت گار اور ان کے لیڈر خان عبدالغفار خاں بھی دہریے ہیں؟ دلی کے، بلکہ کہنا چاہیے اپنے دریا گنج کے آصف علی صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ میں سے زیادہ تر لوگ انھیں ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہ کہیں گے کہ وہ ہندو ہو گئے ہیں؟'' انور نے دیکھا کہ وہ تڑاتڑ جو نام گنا تا جا رہا تھا انھیں سن کر وہ لوگ تلملا اٹھے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنا ترپ کا پتہ نکالا۔ سفید داڑھی والے اس بوڑھے جُلاہے کو مخاطب کر کے جو مقرر کے تیکھے طنز پر بیٹھا دل ہی دل میں ہنس رہا تھا، انور نے اونچی آواز میں پوچھا، ''رحمت چاچا، تم کب سے اسلام چھوڑ کر کافر بن گئے؟'' اب بحث اپنے گھر کی مثالوں پر آ گئی تھی اور جب رحمت نے جواب دیا، ''انور میاں، تمھیں معلوم نہیں؟ میری شدھی تو اسی مسجد میں اس میٹنگ سے پہلے ابھی عشاء کی نماز کے بعد ہوئی ہے'' سب لوگ ہنس پڑے۔ رحمت چاچا کی اس بات میں بڑا تیکھا طنز تھا کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ رحمت چاچا اس علاقے کے پکّے مسلمان تھے۔ مسجد میں آ کر پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ دیکھ کر کہ وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ اس کی بات اب غور سے سن رہے ہیں، انور نے سیاسی دلیلیں دینی شروع کیں۔ اس نے کانگریس کی تاریخ بتانی شروع کی اور یہ بتایا کہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اسے بنایا تھا۔ پھر اپنے تایا ابا کی طرف دیکھ کر اس نے بھرپور وار کیا۔ ''لیکن ظاہر ہے، ایک خاص قسم کے مسلمان اور ہندو ایسے بھی ہیں جو کبھی کانگریس میں نہیں رہے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ سرکار کے ٹکڑوں پر پلے ہیں''۔ پھر اس نے چودھری محمد عمر کی طرف دیکھ کر کہا، ''اور جو سرکاری ٹھیکے پانے کی امید لگائے رہتے ہیں''۔ اس کے بعد تو وہ برس پڑا۔ ''آپ اسلام کی تلوار پھر نکالنے کی بات کرتے ہیں۔ کیا آپ اسے صرف اپنے ہندوستانی

بھائیوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں؟ عجیب بات ہے کہ جن غیر ملکیوں نے مغلوں سے ان کا تخت چھینا تھا، آپ کے بادشاہ کو قید کر کے برما بھیج دیا تھا، آپ کے شہزادوں اور جاگیرداروں کو اس دریا گنج میں اس مسجد کے سامنے سولی پر لٹکا دیا تھا، آپ کی شہزادیوں کی بے عزتی کی تھی، ان کے خلاف یہ تلوار چلتے میں نے نہ دیکھی؟ جی نہیں، آپ اپنی اسلام کی تلوار انگریزوں کے خلاف کیسے اٹھا سکتے ہیں، کیونکہ آپ کی تجویز کے مطابق آپ کے لیڈر تو آغا خاں ہیں جو انگریزوں کے پرانے وفادار دوست ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں آپ کے آغا خاں کے مقابلے میں رحمت چاچا کو مسلمانوں کا زیادہ اچھا لیڈر سمجھتا ہوں۔''

وہ سمجھتا تھا کہ اس کی اس بات پہ تہلکہ مچ جائے گا لیکن کسی نے چوں بھی نہیں کی۔ اس نے اپنے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ صرف تایا امجد علی دانت پیس رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر انور کو ان کی زہر میں بجھی ہوئی تقریر یاد آ گئی۔

''یہاں کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے جن کا ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان کا کیا تعلق ہے''۔ اس کے بعد اس نے بڑی سنجیدہ اور بڑی دھیمی آواز میں انھیں جلیاں والا باغ کی بھیانک داستان سنائی جہاں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کا خون ایک ساتھ بہا تھا۔ ''اس خون کو الگ کرنے کی کوشش کیجیے'' اس نے کہا اور اس کا گلا بھر آیا۔ پھر اس نے بتایا کہ بمبئی میں کیا دیکھا تھا— کس طرح پٹھان اور سکھ والنٹیر وں پر ایک ساتھ لاٹھیاں برسائی گئی تھیں اور انھوں نے مل کر ان لاٹھیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ ''یہ بھی خون بہانے کا ایک طریقہ ہے لیکن یہاں کچھ لوگ یہ دیکھنا زیادہ پسند کریں گے کہ مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے چھرے بھونکیں۔''

بہت دیر ہو گئی تھی۔ انور کی تقریر ختم ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا اس لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے کہ ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان— بلکہ بٹوارہ اس طرح ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ایسا نہیں چاہتے۔ ''اور بھی کئی بٹوارے ہیں'' اس نے کہا۔ ''ایک طرف کسان ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں اور دوسری طرف زمیندار ہیں جو ذرا بھی محنت کیے بغیر موٹے

ہوتے جاتے ہیں۔ ایک طرف مزدور ہیں جو کارخانوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور دوسری طرف سرمایہ دار ہیں جو دوسروں کی محنت پر عیش کرتے ہیں۔ آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کس طرف ہیں۔ آپ میں سے کچھ لوگ سرکار کی حمایت کر کے اور کانگریس کو گالیاں دے کر اپنی دھن دولت اور اپنی طاقت بچائے رکھنا چاہیں گے۔ آپ خوشی سے ایسا کیجیے گا لیکن کم سے کم اسلام کی دہائی نہ دیجیے اور اپنے مذہب کو اپنی بزدلی اور اپنی خود غرضی کے لیے آڑ نہ بنایئے۔"

وہ بالکل تھک کر بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس کے ابّا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اٹھے اور انھوں نے بھاری دل سے بہت دھیرے دھیرے کہا، "انور نے جو کچھ کہا ہے اس کی ہر بات کو میں صحیح نہیں سمجھتا لیکن مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرے بیٹے میں اتنی ہمت تھی کہ وہ جس بات کو صحیح سمجھتا تھا وہ اس نے کھل کر سب کے سامنے کہی۔ اب جو اس تجویز کے حق میں ہوں......"

امجد علی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے بھائی کی بات کاٹ کر بولے "جو لوگ حق میں ہوں وہ اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں۔"

اللہ اکبر کے نعرے سے آسمان گونج اٹھا اور صدر صاحب نے اعلان کیا کہ تجویز منظور ہوگئی جس پر امجد علی صاحب نے چلاّ کر کہا، "اتفاق رائے سے!"

(8)

ایک پل میں سب کچھ ہوگیا جیسے گرمیوں میں صاف آسمان سے اچانک طوفان پھٹ پڑے۔

وہ تینوں چپ چاپ گھر واپس جا رہے تھے۔ ایک عجیب تناؤ تھا۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ خاموشی ذرا سی ٹھیس لگنے پر کانچ کی طرف ٹوٹ جائے گی۔ جب وہ گھر میں پہنچے اور آنگن کے دروازے کی کنڈی چڑھا دی گئی تو امجد علی نے اپنی طنزیہ ہنسی سے اس خاموشی کو توڑ دیا۔ "تو تمھارا یہ خیال تھا کہ تم اپنی لچھے دار باتوں سے اور اپنی ہمت سے سننے والوں کو اپنی طرف کر لو گے! مگر دیکھا ایک آدمی نے بھی تمھاری طرف ووٹ نہیں دیا۔"

اکبر علی کپڑے بدلنے اندر کے کمرے میں چلے گئے تھے اور امجد علی ان کے موجود نہ ہونے کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ پھر بھی انور نے سوچا کہ اس کے تایا ابا کی باتوں میں طنز اور چوٹ ضرور ہے پر یہ وقتی بات ہے، وہ شاید انور کی سخت باتوں پر ناراض ہوگئے ہوں گے اس لیے اس

نے بھی یوں ہی انھیں چھیڑنے کے لیے کہہ دیا۔ ''لیکن تایا ابا، تجویز اتفاق رائے سے نہیں پاس ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ نے اعلان کیا تھا۔'' شاید اس نے ''آپ نے'' لفظ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا اور امجد علی یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔

''تو تمھارا کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹا ہوں۔ کیوں؟'' انھوں نے چلا کر کہا۔ ''تو میں بھی تمھیں بتا دوں کہ میرا مطلب یہ تھا کہ کسی مسلمان نے خلاف ووٹ نہیں دیا تھا۔ وہ میٹنگ مسلمانوں کی تھی اور تمھارے جیسے ہندو حرامزادوں کے ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔''

اکبر علی اندر کے کمرے سے بھاگ کر باہر نکل آئے اور انھوں نے بے حد پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا، ''بھائی صاحب!''

انور کے لیے جس ہتک آمیز لفظ کا استعمال کیا گیا تھا اس کا پورا مطلب سمجھنے میں اسے کچھ پل کی دیر لگی۔ انور کو ''حرامزادہ'' لفظ ماضی کی ایک گونج جیسا لگا اور نہ جانے کیوں وہ اس دن کی یاد کرنے لگا۔ جب اس نے اپنے ابا سے اس لفظ کے معنی پوچھے تھے اور آج دس برس بعد بھی اس نے دیکھا کہ یہ لفظ سنتے ہی اکبر علی کے چہرے پر پھر وہی عجیب پریشانی چھا گئی۔

''بھائی صاحب!'' آج اپنے بڑے بھائی سے یہ الفاظ کہتے وقت ان کے چہرے پر پھر وہی جذبات تھے۔ ''آپ کو میرے بیٹے کو اس طرح کی بات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے'' اور اتنا کہہ کر وہ انور کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے دوسرے کمرے کی طرف لے جانے لگے۔

''ابا مجھے چھوڑ دیجیے،'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ پھر وہ اپنے تایا ابا کے پاس گیا اور ایک ایک لفظ کو تول کر بولا ''آپ نے ابھی جو کچھ کہا تھا ذرا پھر تو کہیے گا۔''

''انور جانے دو'' اکبر علی نے مضطرب ہو کر کہا۔ ''تم ان کی بات نہ سنو۔ ان کا تو دماغ خراب ہے'' اور پھر وہ لپک کر اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے، ''بھائی صاحب خدا کے واسطے میری خاطر میرے بیٹے کو مجھ سے نہ چھینیے۔''

لیکن امجد علی پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ انھوں نے انتہائی ظالمانہ انداز میں کہا ''وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ اس نے آج ثابت کر دیا کہ آپ کی اکیس برس کی پرورش کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آج پھر وہ اسی کوڑے پر واپس پہنچ گیا ہے، جہاں سے وہ آیا تھا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک

کافر کے بیج سے پیدا ہوا ہے کہ وہ ایک رنڈی کا ان چاہا بیٹا ہے۔'' پھر وہ انور کی طرف مڑے جو گم سم کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔'' اور کچھ جاننا چاہتے ہو؟ اپنے باپ کا نام جاننا چاہتے ہو؟ وہ وہی وق کا مارا ہوا خبیث کافر رامیشور تھا۔ وہ تو جہنم پہنچ گیا لیکن تم اپنی چھمیا کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ وہ تو بہت نامی عورت ہے۔ ہر آدمی چاوڑی بازار میں اس کا کوٹھا جانتا ہے۔''

آخر کار انور نے اپنی زبان کھولی۔ اکبر علی سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا،'' کیا یہ سچ ہے؟'' اکبر علی کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ان کی داڑھی پر گر رہے تھے۔ انھوں نے کہا'' لیکن انور سنو تو......'' وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو پر وہ ان کا بیٹا ہے۔ لیکن انور ان کی یہ بات سننے کے لیے وہاں تھا ہی نہیں۔

بغیر کچھ کہے وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

اکبر علی نے آنسو اور غصے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا اور زندگی میں پہلی بار انھوں نے ان کے بے حرمتی کرتے ہوئے کہا۔'' آپ نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ اب آپ کو تسلی ہوگئی؟ اب آپ یہاں سے تشریف لے جایئے۔''

گھر سے باہر نکل کر اور گلیوں میں بے مقصد گھومتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہتا رہا۔ نہیں! نہیں! یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طرح ایک پل میں کسی کے کچھ الفاظ کہہ دینے سے کسی کی پوری زندگی تباہ نہیں ہوسکتی۔ ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ ضرور کہیں کوئی غلطی ہوگی۔ یہ ساری باتیں اس کے تایا ابا کے گندے ذہن کی پیداوار ہوں گی یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غصے میں خود اس کے تصور نے یہ تصویر بنائی ہوگی۔

اس کے قدموں کی تال پر اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔'' نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا! یہ ناممکن ہے! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

لیکن اس کے دل کی گہرائی میں یہ ڈر بھی آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا تھا وہ سچ تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی سچ تھی! ناممکن ضرور تھی، لیکن پھر بھی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بچپن کی تصویریں گھومنے لگیں۔ اس کے کانوں میں بچپن کے سنے ہوئے الفاظ گونجنے لگے اور اب ان کا نیا مقصد ظاہر ہونے لگا اور ابھی اس کے سامنے جو راز

کھولا گیا تھا، وہ سچ لگنے لگا۔

چاؤڑی بازار کی وہ 'دوسری عورتیں!' کیا یہی وجہ تھی کہ جب سے اس نے اکبر علی سے ''چھجوں پر کھڑی ہوئی رنگی پتی عورتوں'' کے بارے میں پوچھا تھا تب سے وہ اس راستے سے کترا کر جانے لگے تھے؟

کیا یہی وجہ تھی کہ جب انور نے ان سے 'حرامزادہ' کا مطلب پوچھا تھا تو وہ اتنا پریشان ہو گئے تھے اور کھسیا گئے تھے؟

(9)

آخر کار اسے اس راز کا پتہ چل گیا تھا کہ اس کی صحت اتنی خراب کیوں تھی اور اس کی بیماری کی وجہ ڈاکٹر جمشید جی کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ اسے یہ صحت اپنے اصلی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ رامیشور کاکا اسی لیے اسے اتنا پیار کرتے تھے، اسی لیے وہ اس کے لیے دس ہزار روپے چھوڑ گئے تھے۔

دس ہزار روپے! ایک انسان کی زندگی کی قیمت؟ حرامزادہ ہونے کا معاوضہ؟ رنڈی کا بیٹا ہونے کا داغ چھپانے کے لیے رشوت؟ رنگین مزاج سیٹھ جی یہ قیمت چکا کر، یہ معاوضہ ادا کر کے، یہ رشوت دے کر چلے گئے تھے۔ نروان حاصل کرنے! انور کا دماغ اسی طرح کے کڑوے خیالات سے بھر گیا۔

انور سنسان سے سڑکوں کے خوفناک سناٹے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی خارش زدہ کتا اس کے پیچھے ہو لیتا تھا۔ انور نے یکا یک محسوس کیا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے اور دنیا اب اس کے لیے مٹ چکی ہے۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اکیلا ہے اور ننگا ہے اور اس کی پیدائش کا داغ اب سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اسے زندگی کے جن اصولوں کی عزت کرنا سکھایا گیا تھا۔ شرافت اور بھلائی، دریا دلی اور نیکی، رحم اور انسانیت۔۔۔ وہ سب مانگے ہوئے کپڑوں کی طرح اس کے بدن سے اتار لیے گئے تھے کیونکہ یہ کپڑے اس کے ٹھیک نہیں آتے تھے۔ اب صرف نفرت اس کے ساتھ رہ گئی تھی۔

اب داغدار پیدائش کی تصویر اس کے سامنے صاف طور سے آتی جا رہی تھی۔ شاعری کا شوق رکھنے والے ایک رنگین مزاج لیکن بزدل نوجوان نے چوری چھپے باپ کی گلیوں میں عیاشی کے بیج بوئے تھے اور جب اس بیج سے پھل نکلا تو وہ کڑوا تھا۔ انھوں نے یہ پھل اپنے بے اولاد دوست

کے حوالے کر دیا جو اس بچّے کو گود لینے کو تیار تھے۔ اسے اس آدمی سے اور اس عورت سے کتنی نفرت تھی جنھوں نے اسے اس دنیا میں پیدا کیا تھا اور پیدا ہوتے ہی اس کے بدنامی کا داغ لگا دیا تھا۔

وہ جلدی جلدی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس چیز سے بھاگ رہا تھا۔ کیا وہ کبھی بھی اپنی اس پچھلی زندگی سے دور بھاگ سکے گا جس نے اچانک آدبوچا تھا۔

''اب ہمیں کہاں جانا ہے؟'' اب اس سوال میں جو نیا مطلب پیدا ہو گیا تھا اور اس پر غور کرتے ہوئے اسے ہنسی آ گئی — ایک طنز بھری کڑوی ہنسی، اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے قدم اسے چاوڑی بازار تک لے آئے تھے تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا اس کا خون کا رشتہ اسے یہاں کھینچ کر لایا ہے یا وراثت میں ملی ہوئی گناہ گار فطرت؟

(10)

''نواب صاحب''، ایک چکنے چپڑے دلال نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے پکارا، ''کیسا مال چاہیے — گدرایا پکا، پنجابی، کشمیری......؟''

''کیا تم چھمیا بائی کا کوٹھا جانتے ہو؟''

''وہ تو اب بوڑھی ہو گئی ہے اور بہت دن سے اس نے دھندا بھی چھوڑ رکھا ہے لیکن کچھ پٹاخہ چھوکریاں ضرور رکھ چھوڑی ہیں۔ اگر حضور کہیں تو......''

''مجھے اسی کے یہاں لے چلو۔''

راستے میں انور کے دماغ میں اپنی ماں کی صورت کی ایک جھلک دیکھنے کی بے چینی نے ایک بھیانک پلان کی شکل اختیار کر لی۔ زندگی بھر وہ اپنے آپ کو اس چیز سے بچاتا آیا تھا جو اسے ''پاپ'' بتائی گئی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو پاک رکھا تھا، اس پر کوئی دھبہ لگنے نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو شریف باپ کا بیٹا سمجھتا تھا۔ لیکن اب اسے پتہ چلا تھا کہ وہ خود اسی ''پاپ'' سے پیدا ہوا تھا جس سے اسے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ بڑا بے رحم مذاق کیا تھا اور اس نے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی......اسی رات......اپنی ماں کے ہی گھر کی کسی لڑکی کے ساتھ......

اس کا جی چاہا کہ اس نے جو شیطانی پلان بنایا تھا اس پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

لکڑی کی سیڑھیاں رکھتے ہی چرمرا اٹھیں۔ گندی، اندھیری اور بدبودار سیڑھیاں جیسے جیسے وہ سیڑھیوں پر اوپر چڑھتا گیا، اس کی ہمت جواب دیتی گئی اور اس کے عمر بھر کے دیو پن نے پھر اسے آ دبوچا۔ اب اس کی حالت اس آدمی جیسی نہیں تھی جو کسی سے بدلہ لینے جارہا ہو بلکہ اس شرمیلے نوجوان جیسی تھی جو پہلی بار رنڈی کے کوٹھے پر جارہا ہو۔

ایک عورت، جو وقت سے پہلے بوڑھی ہوگئی تھی، فرش پر بچھی ہوئی سفید رنگ کی گندی چاندنی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی ہوئی پان لگارہی تھی۔ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ کچھ موٹی لگتی تھی۔ اس کی جلد اب بھی ملائم تھی مگر اس پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور اس کے سفید بالوں میں مہندی کی لالی تھی۔

''چھمیا بائی'' دلال نے اس عورت کو مخاطب کر کے کہا۔ ''نواب صاحب چھوکریوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

چھمیا بائی نے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا اور اتنا کم عمر گاہک دیکھ کر وہ کچھ چونک گئی۔ بیٹھیے تشریف رکھیے''۔ اس نے اپنے پیشے کی روایات کے مطابق ضرورت سے زیادہ تکلف کے ساتھ کہا۔

تو یہ تھی اس کی ماں۔ یہ سوچ کر انور نے خون کا گھونٹ پی لیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ماں اگر پچاس برس بعد بھی اپنے بچے کو دیکھے تو وہ اسے پہچان لیتی ہے لیکن اس کی ماں نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ شاید اپنے ذلیل پیشے کی وجہ سے اس میں انسانیت اتنی مرچکی تھی کہ اب انسان کی فطرت بھی اس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اتنی گری ہوئی، گندی اور قابل نفرت نہیں لگی جتنی کہ انور نے اس کی طرح کی عورتوں کے بارے میں سوچا تھا۔ پھر بھی انور کے دل میں اس کے لیے وہ پیار پیدا نہیں ہوا جو بیٹے کو ماں سے ہوتا ہے۔ اس کے دل میں صرف نفرت تھی۔ گہری نفرت جس کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

دلال اپنی دلالی لے کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا اور انور اس عورت کے پاس اکیلا رہ گیا — اپنے خیالوں میں بھی وہ اسے ماں نہیں کہنا چاہتا تھا۔

''بجلی! شاما! یہاں تو آؤ'' اس نے زور سے آواز دی اور دو لڑکیاں جو مشکل سے سولہ سولہ برس کی رہی ہوں گی شرماتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے اپنے چہروں پر اتنی سرخی پوت رکھی تھی کہ یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ ان کے چہرے اندر سے کیسے تھے۔ انور کو وہ خوب صورتی کا ایک بھونڈا مذاق معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی پسندیدگی کا انتظار کرتے ہوئے وہ اتنی قابل رحم لگ رہی تھیں جیسے

مویشیوں کے میلے میں گائے بکریاں ہوں۔ انسان کا جسم خریدنے کے خیال سے ہی انور کو متلی ہونے لگی اور پہلی بار ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد وہ آنکھ بھر کر انھیں دیکھ بھی نہیں سکا۔ ایک پل کے لیے تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ وہاں آیا کس کام سے تھا۔ جب ایک لڑکی پان لے کر اس کے پاس آئی تو اس نے پان لینے سے انکار کر دیا اور اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ اسے طشتری میں کچھ پیسے رکھ دینے چاہیے تھے۔

''ابھی شرم آتی ہے، کیوں؟'' چھمیا بائی نے اس سے پوچھا اور کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا اور بڑی دیر تک فرش پر بچھی ہوئی سفید چاندنی پر پان کے دھبوں کو دیکھتی رہی۔

لڑکیاں اپنی پائلیں چھنکاتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد انور کو دوسرے کمرے میں سے کھسیا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ انور سمجھ گیا کہ وہ اس کی نامردی کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''ایسی جگہ آنے کا...... پہلا اتفاق ہے، کیوں؟'' چھمیا بائی کی آواز میں ایک پیشہ ور عورت کی دلچسپی کے مقابلے میں ایک انسان کا تجسس زیادہ تھا۔

انور نے چپ چاپ سر ہلا کر اقرار کر لیا۔ اسے ایسا لگا کہ شرم کے مارے اس کا چہرہ لال ہو رہا ہے اور اس نے رومال نکال کر اپنے تمتمائے ہوئے چہرے پر سے پسینہ پونچھا۔

''کسی اچھے گھر کے معلوم ہوتے ہو۔'' چھمیا بائی نے یہ بات انور سے نہیں کہی تھی بلکہ شاید وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس لیے انور نے بھی کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

کچھ دیر تک وہ خیالوں میں ڈوبی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی جیسے اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر اس نے بے حد پیار سے انور سے کہا ''جاؤ بیٹا، اپنے گھر جاؤ۔ اور اب پھر کبھی یہاں نہ آنا۔''

انور کو ایسا لگا کہ یہ بات چھمیا بائی نے نہیں بلکہ کسی دوسری ہی عورت نے کہی ہو۔ وہ کچھ کہے بغیر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور جب وہ ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اس نے چھمیا بائی کی آواز سنی، ''جیتے رہو، بیٹا!''

(11)

بیٹا!

ہاں اس نے اسے یہی تو کہا تھا۔ اسے اس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے بڑے پیار سے بیٹا

کہا تھا — اکبر علی نے جو ابھی گھنٹہ بھر پہلے تک اس کے باپ تھے، رامیشور دیال نے جنھیں یہ ہمیشہ سے معلوم تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے اور بمبئی میں ماں جی نے لیکن اس لفظ میں اس سے پہلے کبھی اتنی مٹھاس، اتنی نرمی، زندگی کے سب سے بنیادی جذبے سے بھرپور پیار محسوس نہیں کیا تھا جتنا کہ اس وقت گری ہوئی عورت کے منہ سے سننے پر، گناہ کی اس بیٹی کے منہ سے — اپنی اس ماں کے منہ سے!

اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ وہ سچ مچ اس کا بیٹا ہے تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔ تب اس میں کوئی انوکھی یا اہم بات نہ ہوتی۔ ساری دنیا میں کروڑوں مائیں اپنے بیٹوں کے ساتھ پیار کا برتاؤ کرتی ہیں لیکن چھمیا بائی کی نظروں میں تو وہ اس کی چھوکریوں کا ایک کمسن گاہک تھا جسے اس چیز کا ابھی نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا! پھر بھی اس نے اپنے منافع کو بھول کر اسے پاپ کے راستے پر چلنا سکھانے کی بجائے اسے وہاں سے واپس بھیج دیا تھا۔ اس نے اسے ''بیٹا'' کہا تھا اور ماں کی طرح اسے دعا دی تھی۔ اس نے انسانیت اور دریا دلی کے اعلیٰ جذبوں کا ثبوت دیا تھا۔ اب انور کو اسے اپنی ''ماں'' سمجھنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

جتنی دیر میں انور سیڑھیوں سے نیچے اترا اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اب اس کی دنیا نفرت اور لالچ اور گندی خود غرضی سے بھری ہوئی نہیں تھی۔ چھمیا بائی نے اس کی دنیا بدل دی تھی صرف ایک لفظ سے۔

یہ جان کر کہ انسانیت اس گندے اور بدصورت ماحول میں بھی پائی جاتی ہے جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ انور کے دل سے جیسے وہ ساری کڑواہٹ دور ہو گئی جو ابھی گھنٹہ بھر پہلے تک موجود تھی۔ اس نے خود کے متعلق اس ڈرامے کے کرداروں کو ایک نئی شکل میں دیکھا اور اسے ان سب سے ہمدردی ہوئی — رامیشور دیال جو بزدل آدمی تھے لیکن جن کے دل میں رحم تھا، جنھوں نے اپنی جوانی کی لغزش کے پھل کو نفرت سے ٹھکرا نہیں دیا تھا بلکہ اس کے لیے ایک گھر میں رہنے کا انتظام کر دیا تھا اور اسے ایک خاندان کا فرد بنا دیا تھا اور مرتے وقت بھی وہ اس کے لیے مناسب انتظام کرنا نہیں بھولے تھے۔ چھمیا، جو ایک ایسی عورت تھی جسے نہ جانے کن حالات نے گناہ کی یہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر جس میں اس کی بنیادی انسانیت اور نیک دلی ابھی تک باقی تھی اور اکبر علی جو ان میں سب سے زیادہ نیک اور شریف تھے، جنھوں نے ایک دوسرے آدمی کی

''ناجائز'' اولاد کو اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا، اسے کسی دوسرے انسان سے بڑھ کر چاہا تھا، اس کی ہر خواہش کو سمجھنے اور پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن وہ خود جو بدنصیبی کی اولاد تھا، کیا اس کی پیدائش اور پرورش کے ان عجیب حالات کے پیچھے بھی کوئی بنا بنایا منصوبہ تھا؟ وہ ایک ہندو کا بیٹا تھا جو سب سے بدنصیب قابل نفرت طبقے کی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا اور اس کی پرورش ایک مسلم خاندان میں ایک مسلم کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ اتحاد کی ایک انوکھی نشانی تھی۔ انسانیت کا ایک ایسا سنگم جس میں خون اور تہذیب کی کئی دھارائیں آ کر ملی تھیں۔ وہ ملک میں ابھرتی ہوئی فرقہ وارانہ دشمنی اور نفرت کے بارے میں سوچنے لگا، اس سخت ہندو مسلم دشمنی کے بارے میں جس کی آگ پھر بھڑکائی جا رہی تھی۔ کل رات کی میٹنگ اس خطرے کی نشانی تھی اور ابھی بہت سی باتیں اسی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اگر امجد علی اسلامی سلطنت کے خواب دیکھ رہے تھے تو بہت سے دوسرے لوگ ہندو راج کے بھی خواب دیکھ رہے تھے۔ لوگوں میں نفرت تھی اور اس سے بھی بری بات یہ تھی کہ ان میں ڈر تھا۔ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کا ڈر اور مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں کا ڈر اور جب ڈر کے مارے انسان حکومت کے خواب دیکھنے لگتا ہے تو خون خرابہ لازمی ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آج خطرہ بہت بڑا نہیں لیکن آگے چل کر بڑھتے بڑھتے وہ نہ صرف آزادی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے جس کے لیے وہ سب ہی جدوجہد کرتے آئے تھے، بلکہ سماجی انصاف کے اس عظیم اور وسیع خیال کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے جس کے لیے انھیں ابھی جدوجہد کرنی تھی۔ کیا یہ سچ نہیں تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے نہ تو ہندو تھا نہ پوری طرح مسلمان ہی یا بلکہ جو دونوں ہی تھا، جو بھارت ماتا کی اولاد کی ایک انوکھی نشانی تھا اور ساتھ ہی اپنی ماں کی یاد اسے ہمیشہ بدنصیب، ٹھکرائے ہوئے اور ستم زدہ لوگوں کے حقوق کے لیے لڑنے کے لیے متحرک کر سکتی تھی؟

''اب ہمیں کہاں جانا ہے؟''

اب سڑکوں پر اتنا سناٹا نہیں تھا جب اس نے اپنے تھکے ہوئے قدم گھر کی طرف اٹھائے تو سڑکوں پر کچھ کچھ چہل دکھائی دینے لگی تھی۔

دودھ والے بہنگیوں میں پیتل کے ہنڈے لٹکائے تیز تیز بھاگے جا رہے تھے۔ کارخانوں

کے مزدور رات کی پالی پوری کر کے جلدی جلدی گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ چائے خانوں میں ہوٹلوں کے دروازے کھل رہے تھے۔ نان بائیوں کی دکانوں سے تازہ ڈبل روٹیوں کی سوندھی سوندھی گرم خوشبو آ رہی تھی۔

زندگی! زندگی! زندگی!!!

انور اپنے تھکے ہوئے جسم میں بھی زندگی کو، اس کی لے کو اور اس کی تیزی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ پڑھنے اور گھومنے کے لیے غیر ملکوں میں جائے گا، ہندوستان واپس آ کر پھر کام کرے گا اور قومی جدوجہد میں حصہ لے گا!

اس نے رات کی پالی سے گھر لوٹتے ہوئے دو مزدوروں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔

''......دس گھنٹے...... جب کہ ساری دنیا میں آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔''

''مالک کو ہماری کیا فکر؟......اوور ٹائم کا بھتہ بھی نہیں ملتا......''

''بھیا، بات بڑھتی جا رہی ہے......میری بات یاد رکھنا......ایک نہ ایک دن جلد ہی جدوجہد شروع ہونے والی ہے......''

زندگی اور جدوجہد! یہ تھا مستقبل کا پروگرام۔ اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ سب کو کہاں جانا ہے۔

دروازہ کھلا تھا جیسے اس کا کوئی انتظار کر رہا تھا۔

اکبر علی جاگ رہے تھے اور دالان میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی داڑھی پر آنسوؤں کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ پرانے زنگ کھائے ہوئے قبضوں پر کھسکتے ہوئے کواڑ کی آواز سن کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔

''آ گئے بیٹا؟'' انھوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی پوچھا۔ وہ اس کے پیروں کی آہٹ سے ہی اسے پہچان گئے تھے۔

''ہاں ابا۔'' اور یہ کہہ کر وہ دوڑ کر اپنے ابا کی کھلی ہوئی بانہوں میں سما گیا۔

○

دو بوند پانی

یہ ناول ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ، جی ٹی روڈ شاہدرا، دہلی۔32 سے شائع ہوا۔
سنہ اشاعت درج نہیں ہے

جواہرلال نہرو کی یاد کے نام......

کہ انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ میں راجستھان کی پیاسی جنتا اوران کے لیے جو راجستھان نہر بنائی جا رہی ہے اُن دونوں کے بارے میں ایک فلم بناؤں۔ فلم بن کر تیار ہوگئی ہے۔ نہر بھی ایک دن مکمل ہو جائے گی!۔ مگر افسوس کہ ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے — جواہر لال نہرو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

کردار

گوری	ہمّی گریوال
گنگا سنگھ	جمال آغا
سونکی	مدھو چندا
موہن کاوَل	کرن کمار
ہری سنگھ	بجّن
منگل سنگھ	پرکاش تھاپا
سکینہ	تانیا سراج
رحمان چاچا	یونس پرویز
یوسف	گھنشیام
سینما والا	روی کانت
بھیکو	رشید خاں
ٹریکٹر ڈرائیور	بھگوان سنہا
گدھے والا	بشن کھنہ
ڈاک ہرکارہ	پنچو کپور
چیف انجینئر	امرت اوبرائے
چور	جگدیش کمل

بہو جہیز لائی مگر پانی بھی لائی؟

جہاں تک نظر جاتی تھی ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا موجیں اٹھ رہی ہیں۔ تیز ہوا نے ریت کے ٹیلوں کو کاٹ کاٹ کر عجیب و غریب شکلوں کا بنا دیا تھا۔ دھوپ میں سنہری رنگ کی ریت جھلملا رہی تھی اور ٹیلوں کی گہرائیوں میں لمبے کالے سائے دوپہر کی بڑھتی ہوئی دھوپ میں سکڑتے جا رہے تھے۔

ہر طرف ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا لیکن پانی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ نہ کہیں پیڑ تھے، نہ پودے نہ جھاڑیاں۔ یہاں تک کہ گھاس کا ایک تنکا بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس ریت کے ٹیلے تھے۔ ریت کی گھاٹیاں تھیں۔ آندھی ریت کے لاکھوں ذرّوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جاتی تھی، جہاں کل تک ٹیلے تھے آج وہاں گھاٹیاں بن گئی تھیں۔ جہاں گڈھے تھے وہاں ریت کے ٹیلے۔

اس ریت کے سمندر میں گاؤں بھی تھے مگر ویران پڑے تھے۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ٹوٹے ہوئے پتھر کے گھروں میں ریت کے انبار لگ گئے تھے۔ کنوئیں سوکھے اور ریت سے اَٹے پڑے تھے۔ ہر چیز پر ریت کے ذرّوں نے مایوسی کی، موت کی دبیز چادر چڑھا دی تھی۔

اسی ریگستان میں اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی اور ٹانگوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز دور سے قریب آتی ہوئی سنائی دی۔۔۔ موت کے سناٹے میں زندگی کی دلفریب موسیقی۔۔۔ اور اگلے لمحے ایک ریت کے ٹیلے کے پیچھے سے قافلہ آتا دکھائی دیا۔ یہ معمولی کارواں نہیں تھا یہ کسی

کی بارات تھی۔ بھارتیہ گاؤں کے گنگا سنگھ کی بارات تھی جو دوسرے گاؤں سے لال گھونگھٹ میں لپٹی ہوئی گوری کو بیاہ کر لا رہا تھا۔ اونٹوں پر پیچھے گھونگھٹ نکالے دلہن اپنے پتی کا سہارا لیے ہوئے بیٹھی تھی۔ ایک طرف جہیز کا رنگین ٹین کا ٹرنک بندھا ہوا تھا۔ دوسری طرف دھوپ میں چمکتی ہوئی ایک پیتل کی گاگر۔ اونٹ آہستہ آہستہ چل رہے تھے مگر گنگا سنگھ کو اس کا دوست یوسف چھیڑ رہا تھا۔

''کیا ہو!، دولہا میاں؟ بس بھابی کے بوجھ سے تمھارے اونٹ کی کمر ٹوٹ گئی؟''

گنگا نے چہک کر جواب دیا: ''اے بک بک مت کر' یوسف میری گھر والی تو بگیا کے پھولوں میں تتلی ہے۔ کس بل ہے تو دوڑ لگا کر دیکھ لے۔''

گنگا نے للکارا تو یوسف نے 'تو آ جا میدان میں' کہہ کر اپنے اونٹ کو ایڑ لگا دی۔

دونوں اونٹ اپنے گلے کی گھنٹیوں کو چھنکاتے ریت کے ٹیلوں پر بھاگے۔

گنگا یوسف کو للکارتا رہا۔ یوسف گنگا کو۔

گنگا کے پیچھے بیٹھی ہوئی لال لال کپڑوں کی گٹھری بنی ہوئی دلہن نے اپنے دولہا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گنگا کو ایک نرم سے لمس کا احساس ہوا تو اس کی رگوں میں گویا جان آ گئی اور اس نے اونٹ کو ایڑ لگا لگا کر اتنا بھگایا کہ یوسف پیچھے رہ گیا۔

جب گنگا سنگھ کا اونٹ آگے نکل گیا تو یوسف نے لگام کھینچ کر اپنے ہانپتے ہوئے اونٹ کو روکا اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔

''ارے تو سمجھتا ہے تو جیت گیا'' وہ کھسیانا ہو کر چلایا۔ حالانکہ اس کی آواز اب گنگا سنگھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ''ارے یہ تو بہانہ تھا تجھے بھابی کے ساتھ اکیلے چھوڑنے کا۔''

ریت کے ایک ٹیلے کے اوپر دو پرانے پتھر کے ستون آسمان کی طرف انگلیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ دونوں پر کھدائی سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک راجپوت مرد کی — دوسری طرف ایک عورت کی۔ جس کے پتھریلے ماتھے پر سہاگ کا پتھریلا بور چمک رہا تھا اور جس کی خوب صورت آنکھیں پتھر کے پردے میں بھی شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ اس ٹیلے پر اونٹ کو بٹھا کر گنگا سنگھ بولا۔

''لے گوری۔ ہم تو بہت آگے نکل آئے۔ تھوڑا وشرام کر لیتے ہیں۔ اپنا گاؤں تو پاس ہی

ہے، اور براتی آ جائیں تو ساتھ ہی چلیں گے۔'' پھر اونٹ سے اتر کر جب وہ مڑا تو دیکھا دلہن اب بھی گھونگھٹ میں منہ چھپائے ہوئے ہے۔ پاس جا کر پیار بھرے لہجے میں بولا،'' ارے تو کس سے سرماوے (شرماوے) ہے؟ اپنے گھر والے سے؟ اٹھا گھونگھٹ۔ میں تیرا مکھڑا تو دیکھوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گھونگھٹ کا پلو الٹ دیا اور بے اختیار بول پڑا۔

''ہائے رام! تو کتنی سندر ہے!''

کچھ دیر تک تو گنگا سنگھ اپنی دلہن کی موہنی صورت دیکھ کر چکا چوند سا ہو گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اُسے پیاس لگی تھی۔ اونٹ کی کاٹھی سے چھاگل کھولی اور پینے والا ہی تھا کہ گوری کا دھیان آ گیا اس نے چھاگل پہلے اس کی طرف بڑھائی۔ مگر اس کا جواب سن کر حیرت میں رہ گیا۔

'تو پی۔'

''تو ابھی سے مجھ سے تُو تڑاخ کرنے لگی ہے؟'' اس نے پیار بھری شکایت کی اور پھر اصرار کیا۔ ''مگر نہیں۔ تو، پی۔''

مگر گوری ٹکٹکی باندھے ان پتھر کے کھمبوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''وہاں پتھر پر لکھا ہے۔ تو پی۔ تو پی۔''

اب تو گنگا سنگھ کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ ''تجھے پڑھنا بھی آتا ہے اور لکھنا بھی؟'' جب گوری نے سر ہلا کر ہاں کیا تو اس نے کہا۔ ''تو پھر یہ پڑھ اس پتھر پر کیا لکھا ہے؟''

گوری نے ایک کھمبے پر کھدے ہوئے شبدوں کو پڑھا۔

''جل تھوڑا، سنیہ بہت، لگا پریم کا بان
تو پی، تو پی کہتے کہتے دونوں نے تجے پران''

پھر دوسرے پتھر کی طرف دیکھا جس پر لمبی عبارت کھدی ہوئی تھی۔

''دو پرانی تھے۔ ایک مرد ایک عورت جو اسی بالو کے سمندر میں کھو گئے تھے۔ دونوں کے پاس پانی کی دو چار بوندیں ہی رہ گئی تھیں۔ جن سے صرف ایک کی جان بچ سکتی تھی لیکن دونوں میں سے پانی ایک نے بھی نہیں پیا یہی کہتے کہتے مر گئے۔ تو پی۔ تو پی!''

کچھ دیر دونوں اس عجیب وغریب کہانی کے بارے میں چپ چاپ سوچتے رہے۔ پھر گنگا نے اپنی نئی بیاہتا بیوی سے پوچھا۔

''بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے۔'' گوری نے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا'' کہ میرے بھی اسی طرح پران نکل جائیں۔''

اسی وقت دور سے ایک اونٹ کی گھنٹیاں سنائی دیں مگران گھنٹیوں کے آہنگ میں زندگی کا سنگیت نہیں تھا کسی خطرے کا اعلان تھا۔ گنگا اور گوری نے گھبرا کر اُدھر دیکھا تو ایک شخص منھ پر کالا ڈھاٹا باندھے ہوئے نظر آیا۔

''مجھے تو کوئی ڈاکو لگے ہے!'' گوری نے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ گنگا سنگھ نے گھبرا کر بیوی سے کہا۔ ''گھونگھٹ کاڑھ لے اے گوری۔''

مگر جب اونٹ قریب آیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''ارے یہ تو ہمارے گاؤں کا منگل سنگھ ہے۔''

'ارے منگل، گنگا نے آواز لگائی۔'' کہاں چلا گیا تھا؟ میری بارات میں کیوں نہیں آیا؟''

منگل سنگھ نے، جو اس سے ذرا زیادہ عمر کا نوجوان تھا، جواب دیا، جیسلمیر میں ضروری کام تھا۔ مگر بدھائی ہو گنگا۔ تو نے اس سوکھے کے زمانے میں ہمارے گاؤں میں شہنائیاں بجوادیں۔''

جب دور سے اونٹوں پر بارات آتی نظر آئی تو گاؤں میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ لڑکیاں گیت گا گا کر دولہا دلہن کا سواگت کر رہی تھیں۔ جب دولہا اونٹ سے اترا تو یوسف کے باپ اور گاؤں کے سرپنچ رحمٰن چاچا کی طرف پاؤں چھونے کے ارادے سے بڑھا لیکن وہ دلہن کے پلّو سے بندھا ہوا تھا اس لیے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ سب طرف سے قہقہہ بلند ہوا اور دلہن بھی گھونگھٹ کی اوٹ میں ہنسنے لگی۔ رحمٰن چاچا نے دولہا کو آشیرواد دیا۔ گنگا کی بہن سونکی نے بھائی کی بلائیں لیں، آرتی اتاری۔ نیگ مانگا۔ تب جا کر گنگا نے اپنے جھونپڑے میں قدم رکھا۔ مگر سونکی نے اسے للکارا۔

''خبردار بھیا۔ اندر پیر نہ دھرنا، پہلے تلوار نکالو اور یہ تھالیاں ہٹاؤ!!

راستے میں گھر بھر بلکہ اڑوس پڑوس کی تھالیاں لا کر سجادی گئی تھیں۔ اب گنگا سنگھ نے کمر

میں لگی ہوئی تلوار میان سے نکالی اور اس کی نوک سے تھالیوں کو ادھر ادھر سرکا دیا۔ گویا تلوار کی دھار سے اپنی دلہن کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اب گوری دروازے میں داخل ہوئی اور گھونگھٹ نکالے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ گنگا نے بہن کو اپنی بیوی سے ملایا۔

''گوری۔ یہ ہے ہماری سونکی۔ اسے ہم سونو سونو بھی کہوے ہیں۔'' اور پھر سونکی کی طرف پیار سے دیکھ کر ''یہ میری بہن بھی ہے اور ماں بھی!'' چنچل اور شریر سونکی تو اپنے بھائی کی شادی کی خوشی میں بڑی اِٹھلا رہی تھی۔ اس نے بڑے بھائی کو ڈانٹ کر کہا ''بھیا! بڑبڑ بند کرو۔ مجھے بھابی کا منہ تو دیکھنے دو۔''

گنگا نے گوری کی طرف دیکھ کر کہا ''اس کی باتوں کا برا نہ ماننا، مجھے تو مجھے، بابا کو بھی ڈانٹ دیتی ہے۔ گز بھر کی زبان ہے اس چڑیل کی۔''

سونکی نے واقعی اپنی لمبی گلابی جیبھ نکال کر بھیا کو چڑایا ''اچھا اب اپنی گھر والی کو اس چڑیل کے پاس چھوڑو۔ ابھی پڑوس والیاں آنے والی ہیں میری بھابی کو دیکھنے۔''

اس تمام عرصے گنگا کی آنکھیں اپنے باپ کی صورت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب اس نے بہن سے پوچھ ہی لیا ''اری بابا کہاں ہیں؟ کہیں دکھتے نہیں۔''

ایک لمحے کے لیے سونکی کے سندر مکھڑے سے خوشی کی لہر غائب ہوگئی، رنکھی ہو کر بولی، ''سویرے سے نہ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ وہیں اپنے سوکھے کھیت میں چپ سادھے بیٹھے ہیں جیسے ایک ہمارے گھر میں ہی سوکھا پڑا ہے۔''

سوکھی بنجر زمین، سوکھا کھیت اور اس کے کنارے بیٹھا ہوا بوڑھا ہری سنگھ سوکھی مٹی کو کرید رہا تھا جو تیز ہوا اڑا کر لے جا رہی تھی۔ ایک سوکھی مٹی کے ڈھیلے کو ہاتھوں سے مسل کر تیز ہوا میں ریت اُڑا رہا تھا اور وہ اپنے آپ سے بڑبڑائے جا رہا تھا۔ ''سب کچھ مٹی میں مل گیا۔'' اتنے میں اس نے ریتیلی زمین پر گنگا سنگھ کی پرچھائیں دیکھی اور اس کی طرف منہ کیے بغیر ہی وہ بولا۔ ''سب کچھ مٹی میں مل گیا، بیٹا۔''

''بابا'' گنگا نے کہا!! میں تمھاری بہو کو مکلاوہ کر کے لے آیا ہوں ڈھیر سا جہیز لائی ہے۔''

''ڈھیر سا جہیز لائی ہے؟'' ہری سنگھ نے دہرایا۔ ''پانی بھی ساتھ لائی ہے؟''

گنگا کو شبہ ہو چلا تھا کہ سوکھے کے غم نے اس کے باپ کو آدھا پاگل بنا دیا ہے۔ ''بابا کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ پانی کا تمھاری بہو سے کیا سمبندھ ہے؟''

''بہت گہرا سمبندھ ہے۔'' ہری سنگھ نے جواب دیا۔ ''پانی ہے تو جیون ہے۔ پانی ہے تو جان ہے۔ لا رے بیٹا۔ پانی بنا تو بدھی بھی کام نہ کرے۔ جب ہی تو میں کہوں تھا کہ سوکھے کے زمانے میں گونے کی بات مت کر، مت کر۔ پر ہماری کون سنتا ہے۔ نہیں مانا نہ تو......''

گنگا نے باپ کو سمجھایا، ''بابا میں کیا کرتا؟ تمھاری بہو کے ماں باپ تو زندہ ہیں نہیں۔ سگے والوں نے پالا ہے۔ اب وہ بھی اپنا گاؤں چھوڑ کر دلی جا رہے ہیں۔ کتنی چٹھیاں آئیں ان کی، اپنی عورت کو لے جا تو ہم اس ذمہ داری سے چھٹکارا پاویں۔ اب میں کیا جواب دیتا؟''

گنگا کو لگا کہ باپ نے آخر کار بہو کو سویکار کر لیا۔ کیونکہ ہری سنگھ نے بات بدلتے ہوئے پوچھا، ''اچھا یہ بول کہ تیری لگائی ہے کیسی؟'' گنگا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بابا تمھیں بتاتے ہوئے شرم لگے ہے۔''

''تو شرماتا شرماتا بتادے۔''

''بابا، میموں جیسی گوری چٹی ہے۔ ماسٹر نیوں جیسی باتیں کرے ہے۔ آٹھ کلاس پاس ہے۔ طوطے کی طرح ہندی بولے ہے۔''

مگر باپ نے ایک دوسرا ہی سوال کیا، ''ارے یہ بتا کہ تگڑی ہے کہ نہیں؟''

گنگا نے جھجکتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ٹھیک ہے، بابا۔'' مگر......وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ سوال باپ نے کیوں کیا تھا۔

''ارے یہ بتا کہ دو گھڑے پانی کے سر پر اٹھا کے لا سکے ہے کہ نہیں؟ ایک گھڑا ہم لوگوں کی پیاس بجھانے کے لیے اور دوسرا گھڑا'' ــــ اس نے سوکھی پیاسی دھرتی کی طرف اشارہ کیا، ''ہماری زمین کی پیاس بجھانے کے لیے۔''

بیٹے نے چڑ کر سوال کیا، ''بھلا دو بوند پانی سے کیا ہوگا؟'' باپ نے جواب دیا، ''دو بوند پانی سے اس مردہ زمین میں جان آ جاوے گی۔''

○

پیتل کی موری گاگری!

ریگستان میں گاؤں سو رہا تھا۔

ہر چیز خاموش تھی۔ صرف دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

ہری سنگھ کے جھونپڑی میں بھی سب سو رہے تھے لیکن نہیں ایک طرف کے پلنگ پر دولہا گنگا سنگھ بے چین کروٹیں بدل رہا تھا۔ دوسری طرف کے پلنگ پر اس کا بوڑھا باپ کن انکھیوں سے بیٹے کی بے چینی کو تاڑ رہا تھا۔ بیچ میں زمین پر گوری اور سونکی سو رہی تھیں۔ سونکی کی تو بچپن کی نیند تھی۔ مگر گوری کی مست آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

اتنے میں گوری نے اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ ہڑبڑا کر اٹھی تو اس کے بازو کی ساری چوڑیاں بول پڑیں۔ ہری سنگھ نے ادھر دیکھا تو گنگا دوسری طرف کی کروٹ بدل رہا تھا۔ چور پکڑا گیا اور بوڑھے کے سوکھے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی گوری کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ نے سونکی کو بھی جگا دیا تھا۔

''کیا ہوا ؟ کیا ہوا؟'' سونکی نے گھبرا کر اپنی بھابی سے پوچھا۔ ''کچھ نہیں۔'' گوری نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے بہانہ کیا۔ ''وہ وہ۔۔۔ دیکھو چوہا تھا۔''

اور گنگا سنگھ کو جھلاہٹ ہوئی کہ اس کی بیوی اس کو چوہا کہہ رہی تھی۔

اب گوری سونکی کو تھپک رہی تھی۔ ''کہو تمھیں نیند آئی؟''

''ہاں بھائی۔'' سونکی نے گوری کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''جب سے ماں مری ہے آج مزے کی نیند آئی ہے۔ جب ماں زندہ تھی تو میں اس کے پاس سویا کرتی تھی۔''

گوری نے پیار سے اس کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم میرے پاس سوجایا کرو۔ آج سے تم مجھے اپنی ماں سمجھو۔''

اور پھر دونوں سو گئیں۔ ہری سنگھ بھی سو گیا سارا گاؤں سو رہا تھا۔ صرف گنگا سنگھ کو نیند نہیں آ رہی تھی!

''پیتل کی موری گاگری
دلّی سے مول منگائی رے''

ناگن کی طرح بل کھاتی پنگھٹ پر جاتی ہوئی عورتوں کی لمبی قطار ریگستان میں سے ہو کر جا رہی تھی۔

ان کے پیر دھول میں اَٹے تھے۔ ان کے سروں پر خالی گھڑے اور گاگریں تھیں، ان کی آنکھوں میں پانی ملنے کی آشا تھی، مگر ان کے ہونٹوں پر ایک لوک گیت تھا۔ جس کو مل کر گانے سے آٹھ آٹھ دس دس میل چلنے کی تکان کا احساس کم ہو جاتا تھا۔

سب سے آگے سونکی تھی۔ اس کے پیچھے گوری۔ لمبی، پتلی کمر، چھریرے جسم کی نئی نویلی دلہن، جس کے سر پر ایک پیتل کی گاگر تھی جو وہ جہیز میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ اور اس کی بغل میں ایک اور خالی گھڑا تھا، اس کے ہاتھوں میں پہنی ہوئی انگوٹھیاں اور چوڑیاں پیتل کی گاگر پر گیت کی لے بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں۔

پیتل کی موری گاگری
دلّی سے مول منگائی رے
پاؤں میں گھونگرو باندھ کے
اب پنیا بھرن ہم جائی رے

ریت کے ٹیلے، بنجر میدان، سوکھے کھیت، ریت میں اَٹے ہوئے ویران گاؤں، ان سب

سے گزرتی اور پنگھٹ کی طرف جاتی ہوئی عورتوں کی لمبی قطار ناگن کی طرح بل کھاتی چلی جارہی تھی۔ جیسے جیسے پانی کی تلاش میں اپنے گاؤں سے دور ہوتی جارہی تھیں۔ ان کے گیتوں کی لے تھکتی جارہی تھی۔ سست ہوتی جارہی تھی۔ ایک سوکھے ہوئے کنوئیں سے دوسرے سوکھے ہوئے کنوئیں تک جاتے جاتے ان کی تھکن بڑھتی جارہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آشا کی چمک مدھم پڑتی جارہی تھی۔ آخرکار ایک کنوئیں پر رسّی اور ڈول رکھا ہوا دکھائی دیا اور سب عورتوں اور لڑکیوں کی جان میں جان آگئی، بے تحاشا وہ کنوئیں کی جانب دوڑی۔ سونکی ڈول کی رسی چھوڑتی گئی — چھوڑتی گئی — گوری اور اس کی سب سکھیاں ڈول کے پانی سے ٹکرانے کی آواز کا انتظار بے صبری سے کرتی رہیں۔ مگر وہ خوش آئند آواز نہ آئی۔ صرف بالٹی کے پتھر سے ٹکرانے کی آواز آئی جس سے امید کے سارے چراغ بجھ گئے، چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹیں سمٹ کر غائب ہوگئیں۔ یہ کنواں بھی سوکھ گیا تھا۔

ناگن کی طرح بل کھاتی گاؤں کی عورتوں کی قطار خالی گھڑے لیے چلی جارہی تھی۔ اب ان کے ہونٹوں پر گیت نہیں تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ پھر بھی پانی کی تلاش جاری تھی۔

''لو یہ کنواں بھی سوکھ گیا۔'' سونکی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنی بھابی سے کہا۔

''اب اور کتنی دور جانا ہے؟'' گوری نے سوال کیا۔

''بھابی۔ لگتا ہے آس پاس کے سب کنویں سوکھ گئے ہیں — ڈیڑھ دو کوس آگے ایک اور کنواں ہے وہاں شاید پانی مل جائے۔''

گوری نے تھکی ہوئی آواز میں کہا ''چلو۔''

کچھ دیر تک عورتیں خاموشی کے ساتھ چلتی رہیں۔ پھر سونکی نے پوچھا۔ ''بھابی تمھارے ہاں کیا حالت تھی؟''

''بس ایسی ہی سمجھو۔ پانی کا تو نام ہی نہیں۔ ہر جگہ سوکھا تھا۔'' اور پھر کچھ سوچ کر گوری نے بات کا رخ بدلا۔ ''مگر سونکی اپنے بھیا کے بارے میں کچھ بتا۔''

''کیا بتاؤں بھابی سوائے اس کے کہ چیختے چلّاتے رہتے ہیں؟'' سونکی نے بچّوں جیسے انداز میں کہا۔ مگر پھر اپنی بھاوج کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر جلدی سے مسکرا کر بولی، ''مگر سچ پوچھو تو دل کے بڑے اچھے ہیں۔''

''اچھا۔ یہ بتا کہ ان کو کیا اچھا لگے ہے؟''

سونکی کو چھیڑ خانی کا موقع ملا۔''ان کو تو ہماری بھابی اچھی لگے ہے۔''

''چل ہٹ'' گوری نے کہا۔''اچھا یہ بتا کہ ان کو کھانے میں کیا اچھا لگے ہے؟'' سونکی نے جواب دیا۔''باجرے کی روٹی اور کھاٹے کی کڑھی۔''

گرمی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سائے بھی سمٹ کر گھروں کے نیچے آ گئے تھے۔ سارا گاؤں سنسان پڑا تھا۔ آدمی، بچے، ڈھور ڈنگر سب اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔

مگر اس وقت بھی گنگا سنگھ اور اس کا باپ ہری سنگھ اپنے جھونپڑے کے سامنے لوہا کوٹ رہے تھے۔ ہری سنگھ دھونکنی سے آگ تیز کر کے اس میں لوہے کو تپا رہا تھا اور جب لوہا گرم سرخ ہو جاتا تو گنگا سنگھ اس پر ہتھوڑے برسا کر اس کو درانتی یا پھاوڑے کی شکل دیتا تھا۔ گاؤں میں سوکھے کے کارن کھیتی نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن کسان اپنے اوزاروں کو ہر وقت تیز اور تیار رکھتا ہے کہ نہ جانے کس وقت ضرورت پڑ جائے۔

پر آج گنگا سنگھ کا دھیان کام میں نہیں تھا۔ وہ برابر باہر کی طرف دیکھتا جا رہا تھا کہ شاید اس راستہ سے اسے اپنی گوری واپس آتی دکھائی دے جائے۔ نشانے پر نظر نہ ہونے سے اس کے ہتھوڑے کی مار کبھی کبھی اوچھی پڑ جاتی تھی اور پھر باپ کی ڈانٹ سنائی دیتی۔

''اے دھیان کدھر ہے تیرا؟ لگائی گھر میں آئی نہیں اور تیرا بھیجا گیا؟'' پھر بھی گنگا کا دھیان ادھر ہی رہتا جدھر سے اس کی گوری پیتل کی گاگر میں پانی لے کر آنے والی تھی۔

پھر ہری سنگھ نے کام بند کر دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوا،''لے بس کر بہت گرمی ہے۔ ذرا وشرام کر لیں۔ لے آ، تو بھی تھوڑا کھا پی لے۔''

مگر گنگا کو کھانے سے زیادہ کسی کا انتظار تھا۔''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' باپ نے چلتے چلتے فقرہ کسا۔''ارے بھوک تو ہے پر دوسری قسم کی اور یہ کہہ کر بیٹے کی کمر پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کر کمر دہری ہو گئی۔ گنگا سنگھ وہیں منڈیر پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ گرمی بھی کافی تھی اونگھ گیا۔

ایک پائل کی سریلی جھنکار نے اسے جگا دیا آنکھیں مل کر سامنے دیکھا تو ایک لمبی سی عورت

گھونگھٹ کاڑھے سر پر پیتل کی گاگر لیے آ رہی تھی۔ ارے یہ تو ضرور اس کی گوری ہوگی!

لمبے لمبے قدم بھرتے ہوئے گنگا سنگھ نے اسے گھر کے پیچھے جالیا۔ ''ارے گوری اچھا ہوا تو اوروں سے آگے آ گئی۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ ''اپنے گھر میں تو بات کرنا بھی مشکل ہے۔ کل دیکھا نا کیا ہوا۔ بابا اور سونکی اور وہ سورے چو ہے! اب گھونگھٹ اٹھا دے ادھر کوئی نہیں ہے!''

مگر اس کا خیال غلط تھا، پیچھے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو منگل سنگھ اور گاؤں کے اور نوجوان چھوکرے کھڑے ہنس رہے تھے۔ چور پکڑا گیا۔ منگل سنگھ نے ہنس کر کہا۔

''کیوں بے۔ بھابی کے لیے ایسے تڑپ رہا تھا جیسے جل بن مچھلی!''

گنگا کھسیانا ہو کے وہاں سے کھسکنے ہی والا تھا کہ ''گوری'' نے گاگر پھینک کر گھونگھٹ اٹھا دیا اور اس کے چاند جیسے مکھڑے کی بجائے یوسف کی مونچھیں نظر آئیں جن کے نیچے اس کے بتیس کے بتیس دانت چمک رہے تھے۔

''دیکھا گنگا بھیا تجھے کیسا بیوقوف بنایا؟''

مگر گنگا کب اتنی آسانی سے ہار ماننے والا تھا ''ارے جا میں تجھے پہچانتا نہیں۔ میں تو الٹا تجھے بیوقوف بنا رہا تھا!''

سب ہنسنے لگے اور یوسف اپنے مانگے ہوئے لہنگے اور چرنی میں سے باہر نکل آیا۔ منگل سنگھ نے گنگا کا بازو پکڑ کے کہا ''گنگا سے کچھ بات کرنی ہے، چل۔''

ایک جھونپڑے کے آگے کھاٹ بچھی تھی اس پر دونوں دوست بیٹھ گئے۔

''ارے گنگا تیرا تو بیاہ ہو گیا'' منگل نے کہنا شروع کیا۔ ''سنا ہے تیری گھر والی بڑی سندر ہے اور کتاباں بھی پڑھے ہے، سچ ہے نا؟ گنگا اپنی بیوی کی تعریف سن کر خوش ہو گیا؛ ''ہاں، سو تو ہے۔''

''اب تو اپنے بڑے بھائی کا بیاہ نہیں کروائے گا؟''

گنگا نے حیرت سے پوچھا۔ ''میرا بڑا بھائی؟''

''ہاں!'' منگل نے جواب دیا۔ ''میں تیرا بڑا بھائی نہیں ہوں؟

''اوہ یہ مطلب ہے تیرا۔'' گنگا نے کہا مگر منگل کا مطلب وہ اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

''ویسے سونکی کے بارے میں بھی تو تجھے بہت چنتا ہوگی۔کیوں؟''

''سونکی۔'' گنگا نے بھولے پن سے کہا۔''وہ تو ابھی بچی ہے۔''

''ارے بڑے بھائی کو چھوٹی بہن تو ہمیشہ بچی ہی لگے ہے۔اور سونکی سے تو کوئی بھی خوشی سے بیاہ کر لے گا!''

اب گنگا سنگھ کی سمجھ میں آیا کہ منگل سنگھ کیا کہنا چاہتا تھا۔اس کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہر منگل۔تو میرا دوست ہے نا؟''

''ہاں وہ تو میں ہوں ہی۔''

''تو پھر میری بہن کا نام اپنی زبان پر نہ لانا سمجھے۔''

منگل نے دیکھا کہ بات بگڑ گئی ہے تو جلدی سے بولا۔''ارے بگڑتا کیوں ہے گنگا، میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ میں تیرے سے مذاق بھی نہیں کرسکتا کیا؟''

مگر اتنی دیر میں گنگا سنگھ وہاں سے جا چکا تھا اور پائل چھنکاتی اور پانی سے بھری گاگریں چھلکاتی عورتیں اور لڑکیاں گاؤں میں آرہی تھیں۔منگل نے دیکھا کہ ان میں ہی گھونگھٹ نکالے گنگا سنگھ کی بیوی بھی ہے اور منھ کھولے سونکی بھی۔سونکی اتنی بھولی اور سندر لگ رہی تھی کہ منگل سنگھ دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کی بدمعاش نگاہوں کی تاب نہ لا کر سونکی نے بھی گھونگھٹ کر لیا۔

ہری سنگھ جھونپڑے میں کھاٹ پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی اور بہو پانی کے گھڑے لے کر اندر داخل ہو رہی ہیں۔

''آگئی، بیٹا؟'' ہری سنگھ نے سونکی کو آواز دی۔

''ہاں بابا۔'' سونکی بولی اور پھر اپنی بھاوج کی طرف دیکھ کر'' بھابی تمھاری زمین کے واسطے دو گھڑے پانی لائی ہے۔''

''شاباش بہو۔دودھوں نہاؤ۔پوتوں پھلو۔'' بڈھے نے بہو کو دعا دی اور پھر بیٹی سے کہا۔''سونکی اپنے بھیا کو تو بلا۔''

سونکی دروازے کے پاس جا کر چلائی۔''بھیا۔بھیا۔بابا بلاویں ہیں۔''

گنگا جو دروازے کے باہر ہی چھپا کھڑا تھا آواز سنتے ہی اندر آ گیا۔

''ہاں بابا کیا ہے؟''

ہری سنگھ نے حقہ کی نے کو منہ سے الگ کرتے ہوئے کہا— ''دیکھ بیٹا تیری لگائی ہمارے کھیت کے واسطے پانی لائی ہے۔ پر میں تو آج منگلوار کو سینچائی شروع نہ کروں گا۔ بڑے بزرگ کہہ گئے ہیں۔ بدھ کا سُدھ، تو میں تو کل بدھ وار کو سینچائی کروں گا۔ اب یہ بتا کہ اس ایک گھڑے پانی کا کیا کریں؟''

گنگا نے سوچ کر کہا ''بابا کوئی نہا لے۔ تم ہی نہا لو۔''

''ارے بیٹا۔'' ہری سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میرے جیسا بڈھا تو جس دن مرے گا اس دن نہاوے گا۔''

گنگا نے بہن کی طرف دیکھا۔ ''سونو تو نہا لے۔''

یہ سن کر سونکی گھبرا گئی۔ ''نہیں بھیا مجھے تو ٹھنڈی لگ جائے گی۔''

''تو اپنی بھابی سے پوچھ لے۔'' گنگا نے بیوی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا اور سونکی گوری سے کانا پھوسی کرنے لگی۔

''بھابی کہوے ہے کہ وہ مکلاوے سے ایک دن پہلے ہی نہائی تھی'' سونکی نے اعلان کیا۔

اب تو ایک ہی آدمی باقی رہ گیا تھا۔ سو ہری سنگھ نے بیٹے کو حکم دیا۔ ''تو پھر تو نہا لے سر سے پیر تک۔''

''میں نہا لوں — سر سے پیر تک؟'' گنگا نے ایسی مری ہوئی آواز میں دہرایا جیسے اسے سزائے موت سنا دی گئی ہو۔

''ہاں ہاں'' اس کے باپ نے کہا۔ ''تیرے میں سے بو آ رہی ہے بکرے جیسی۔ تیری بہو تو نہا کر آئی ہے اور تو مہینوں سے نہیں نہایا۔ چل جا نہا لے۔''

اور اپنے پتی کے چہرے پر ایسی پریشانی اور لاچاری کے آثار دیکھ کر گوری بے اختیار مسکرا پڑی۔

اور یوں گنگا سنگھ کو اپنے سب دوستوں کے سامنے اشنان کرنا پڑا۔ یہ گاؤں میں ایک انوکھا

واقعہ تھا۔ بچّے تالیاں بجا رہے تھے۔ سونکی اور سکینہ دونوں خوشی سے چلاّ رہی تھیں۔ ''بھیّا نہار رہا ہے! بھیّا نہار رہا ہے!'' یوسف گاگر میں سے پانی گنگا کے سر پر ڈال رہا تھا اور گنگا ہو ہو'' کر رہا تھا۔ ارے یوسف بڑا جاڑا لگے ہے، رے۔'' اور گوری، جھونپڑی کی کھڑکی میں سے مسکرا مسکرا کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی!

یوسف نے پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''گنگا تجھے تو بیاہ سے پہلے ہی نہانا چاہیے تھا!'' اور منگل سنگھ جو یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا بول پڑا۔ ''ارے وہ تو گونا تھا۔ اصل بیاہ تو اب ہوگا۔''

اور پانی گاگر میں سے نکل کر گنگا کے سر پر گر رہا تھا، پر اس کے سارے بدن کو بھگوتا ہوا نیچے رکھی ہوئی ایک مٹی کی تغاری میں اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔ گنگا کے اشنان کے بعد یہی پانی رحمٰن چاچا کی گائے بھینسوں کو پلا دیا جائے گا یا کپڑے دھونے کے کام آئے گا۔ جہاں دو بوند پانی اس مصیبت سے ملتا ہو وہاں اس بیش قیمت چیز کو ضائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رات کو گوری سنگھار کر کے چولھے کے پاس بیٹھی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو گنگا نہایا دھویا شادی کے کپڑے پہنے ہوئے داخل ہو رہا تھا۔ گنگا نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو گوری کے سوا کسی کو جھونپڑی میں نہ پایا۔

''اور سب کہاں ہیں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''بابا اور سونکی رحمٰن چاچا کے گھر گئے ہیں'' گوری نے جواب دیا۔ ''وہ وہیں کھانا کھائیں گے اور......'' پھر وہ شرما کر خاموش ہوگئی۔

''اور؟''

''اور وہ دونوں سوویں گے بھی وہاں۔''

''سوویں گے بھی وہاں؟'' گنگا نے حیرت سے دہرایا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج کیا ہوا؟ پر دھیرے سے جیسے اس کی سمجھ میں آتا گیا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر ہنستا ہی گیا — یہاں تک کہ گوری پریشان ہوگئی کہ یہ کسی قسم کا دورہ تو نہیں ہے۔

پھر ہنسی روک کر اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں حکم سنایا۔ 'کھانا لاؤ۔'

گوری نے تھالی میں کھانا پروس کر پتی کے سامنے رکھا اور خود پنکھا جھلنے بیٹھ گئی۔

گنگا نے مزے لے لے کر کھانا شروع کیا۔ پھر ایک نوالہ بنا کر بیوی کی طرف بڑھایا، ''لے کھا۔'' اور جب گوری نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو جھوٹ موٹ کی حاکمانہ سختی سے کہا۔ ''پتنی کو پتی کا جھوٹا کھانا ہی ہوگا!''

گوری نے شرما کر پتی کے ہاتھ سے نوالہ کھا لیا۔

اب گنگا نے پانی کی لٹیا پینے کو اٹھائی، منہ کو لگائی تھی کہ کچھ یاد آیا، گوری کی طرف بڑھائی۔ ''تو پی۔''

''تو پی۔'' گوری نے بھی شرارت بھری شرماہٹ سے کہا۔

گنگا نے پھر رعب جمایا۔ ''پتنی کو پتی کا جھوٹا پینا ہی ہوگا۔''

گوری نے چپکے سے پانی پی لیا۔

''اچھا گوری یہ بتا کہ تجھے کیسے پتہ لگا کہ مجھے باجرے کی روٹی اور کھٹے کی کڑھی بہت بھاوے ہے؟''

گوری نے مسکرا کر وہاں سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''استریاں اپنے مردوں کے بہت سے بھید جانے ہیں۔''

اب تو گنگا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی گمبھیر آواز بنا کر اس نے پوچھا۔

''تو استری ہے؟'' گوری نے پلنگ کی طرف پیچھے ہٹتے ہوئے سر ہلا کر ہاں کہا۔

گنگا اس کی طرف بڑھتا ہی آرہا تھا۔ گوری کو پیچھے ہٹنے کے لیے اب جگہ نہیں تھی۔ وہ دھڑ سے پلنگ پر گر گئی۔

گنگا اب گوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''تو استری ہونے کا ثبوت دے۔''

گوری کی نگاہوں نے خاموش سوال کیا، ''کیسے؟''

''پہلے اوڑھنی اتار'' گنگا نے حکم دیا۔

گوری نے اوڑھنی اتار دی۔ چولی میں سے نمایاں سینے کے ابھاروں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور نظریں جھکا لیں۔

''ارے تو مجھ سے شرماوے ہے؟'' گنگا نے کہا اور گوری کے پہلو میں بیٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں کھینچ لیا۔

گوری لجاتی رہی، شرماتی رہی، اپنے گنگا کی بانہوں میں پگھلتی رہی۔

گنگا کے ہاتھ کھیت کا ہل اور لہار کا بھاری ہتھوڑا چلاتے چلاتے سخت اور کھردرے ہو گئے تھے مگر جن انگلیوں سے وہ گوری کے لمبے کھلے ہوئے بالوں کو اس کی کمر سے ہٹا رہا تھا ان میں نرمی ہی نرمی تھی۔ بالوں کا کالا پردا ہٹا تو چولی کے کٹاؤ میں سے گوری کا گورا پنڈا نظر آیا۔ چولی کی گرِد میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے گھونگرو بندھے ہوئے تھے۔ بڑی نرمی سے، بڑے پیار سے، دھیرے دھیرے جب گنگا نے اس گرہ کو کھولا تو اس کے احساس میں چاندی کی سریلی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

○

جادو کا تماشہ

جیسے سپاہی بندوق اٹھا کر جنگ کرنے جاتے ہیں اسی طرح گاؤں کی عورتیں گھڑے اور گاگریں اٹھا کر پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ ایک کے پیچھے ایک، قدم سے قدم ملائے، سروں پر گھڑوں کا توازن کیے ہوئے خالی ہاتھوں کو ہلاتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔

یہ بھی ایک جنگ ہی تھی۔ ریگستان لڑائی کا میدان تھا۔ سوکھا ان کا دشمن تھا جس کا ساتھی تھا تپتا ہوا سورج جو آسمان سے کرنوں کے تیر برسا رہا تھا۔ اور عورتوں کی فوج ابھی گاؤں سے تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ سامنے سے ایک اونٹ سوار آتا ہوا دکھائی دیا۔ سب چونکی ہو گئیں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔

''دیکھ سونکی۔'' گوری نے گھبرا کر کہا۔ ''وہ کون آوے ہے؟'' اونٹ سوار خاکی کپڑے پہنے تھا۔ سر پر نارنجی رنگ کا جودھپوری صافہ تھا۔ اونٹ کے پیچھے ایک لوہے کا بکسا بندھا ہوا تھا۔ پاس آ کر بولا— ''جے رام جی کی دیویو۔ میں نے کہا بھارتیہ گاؤں کو یہی راستہ جاوے ہے؟''

سونکی جو سب سے نڈر اور طرّار تھی بولی، ''ہم وہیں سے آوے ہیں۔''

ناک کی سیدھ میں چلے جاؤ۔ وہ جو ریت کا ٹیلہ ہے نا، اس کے دوسری طرف ہے۔''

اونٹ سوار نے کہا، ''دھنیہ واد۔'' اور اپنے اونٹ کو ایڑ لگائی۔ ''چل بیٹا۔ ناک کی سیدھ میں۔''

جب تک اونٹ دور نہ چلا گیا سب عورتیں وہیں کھڑی اسی کی طرف دیکھتی رہیں۔

''یہ تھا کون؟'' گوری نے قدرے پریشانی سے پوچھا۔

''میں بتاؤں۔'' ایک عورت نے جلدی سے کہا۔''جرور ڈگدر (ضرور ڈاکٹر) ہے۔ بچوں کو سوئی چبھونے والا۔''

مگر سونکی نے ایک دوسرے خطرے کا اظہار کیا۔''ارے خاکی کپڑے پہنے تھا۔ ضرور فوج میں بھرتی کرانے آیا ہوگا!''

''ہائے رام!'' گوری نے بڑی فکر مندی سے کہا۔''کہیں تیرے بھتیا کو فوج میں بھرتی نہ کر لے۔''

ایک اور عورت نے اپنی رائے دی'' میں بتاؤں یہ لال تکون والا ہے۔ بھاشن دے گا۔ دو یا تین بچے اور بس!''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' ایک چوتھی عورت بولی''مگر اس سوکھے کے زمانے میں جب دس دس کوس سے پانی بھر کر لانا پڑے ہے، بچّوں کو جنم دینے کی کسے فرصت ہے۔''

سب ہنس پڑیں۔

اور عورتوں کی فوج ایک نئی فتح مندی کے احساس کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

سارے گاؤں پر دوپہر کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔

صرف لہار کا ہتھوڑا پڑنے کی آواز آرہی تھی۔

خاکی کپڑوں والے اونٹ سوار نے اپنے اونٹ کو اسی آواز کی سمت میں موڑ دیا۔ اونٹ سے اتر کر اس نے اپنی چھاگل کو دیکھا جو خالی بلکہ سوکھی ہو چکی تھی۔ تب وہ ہری سنگھ اور گنگا سنگھ کی طرف بڑھا۔

''جے رام جی کی۔''

''جے رام جی کی۔''

''بھارتیہ گاؤں اسی کو کہوے ہیں؟''

''ہاں بھائی اسی کو کہوے ہیں۔'' ہری سنگھ نے کام کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پینے کو کچھ پانی ملے گا؟ اپنی چھاگل میں پانی ختم ہوگیا ہے۔''

''پانی اگر ہوگا تو ضرور ملے گا۔ بیٹھو، بھائی۔'' اور پھر ہری سنگھ نے اپنے بیٹے کو اشارہ کیا۔''دیکھ بھائی پانی ہے کہیں؟''

خاکی کپڑوں والا وہیں بیٹھ گیا۔ گنگا نے ہتھوڑا رکھ کر کونے میں رکھے ہوئے گھڑے میں جھانکا بالکل سوکھا تھا۔

پھر وہ گھر کے پیچھے جہاں سب کے 'کنڈ' تھے وہاں گیا۔ بیچ میں 'جو کنڈ' تھا وہ ان کے پریوار کا تھا۔ تالا پڑا ہوا تھا کیونکہ راجستھان کے ریگستان میں اور سب چیزیں کھلی رہ سکتی ہیں مگر پانی کو تالا کنجی لگانا بہت ضروری ہے کیونکہ اس دولت کے معاملے میں کسی کا اعتبار نہیں ہے۔ مگر جب کنجی نکال کر گنگا سنگھ نے زنگ لگا تالا کھول کر دیکھا تو ان کے 'کنڈ' میں دو بوند پانی بھی نہیں تھا۔ بالکل سوکھا پڑا تھا یہاں تک کہ ایک پانی کا سانپ بھی سوکھی ریت میں مرا پڑا تھا۔

سو گنگا اپنے جھونپڑے میں واپس آیا۔ وہاں بھی سب گھڑے خالی پڑے تھے مگر چولھے پر ایک ہنڈیا میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ اس نے دودھ کو ایک پیتل کے گلاس میں انڈیلا اور اسے لے کر باہر آیا۔

''پانی تو نہیں ہے۔'' اس نے آکر اعلان کیا۔ ''گاؤں کی عورتیں ابھی تک پانی لے کر نہیں لوٹیں۔''

''تو پھر یہ کیا ہے؟'' خاکی کپڑوں والے نے گنگا سنگھ کے ہاتھ میں گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

'یہ دودھ ہے۔' اور یہ کہہ کر گنگا نے دودھ کا گلاس دیا اور خود زمین پر بیٹھ گیا۔

''دھنیہ واد'' اور اونٹ والا غٹ غٹ کر کے دودھ پی گیا۔ پھر مونچھوں پر لگے دودھ کو صاف کر کے ہری سنگھ سے پوچھا، ''کیو بھئی تم لوگ ذات کے لوہار ہو؟''

ہری سنگھ کو ایسا لگا جیسے کسی نے گالی دے دی ہو۔ ''نہیں جی ہم ذات کے لہار کیوں ہونے لگے؟ ہم تو کھیتی باڑی کریں تھے۔ قسمت اور سوکھے نے ہمیں لوہار بنا دیا ہے۔ اب تم اپنی کہو۔ تم سرکاری آدمی ہو نا؟''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔''

''تو ووٹ لینے آئے ہوں گے۔'' ہری سنگھ نے زور سے چلا کر کہا۔ جیسے کوئی چور پکڑا گیا ہو۔ ''ارے ووٹ لینے سب آجاوے ہیں۔ پانی لے کے کوئی نہیں آتا۔''

''پانی تمھیں ملے گا'' سرکاری آدمی نے کہا۔ ''ضرور ملے گا۔''

''کب ملے گا؟'' ہری سنگھ نے چمک کر سوال کیا۔

''کیسے ملے گا؟'' گنگا نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتاؤں گا'' سرکاری آدمی نے کہا۔''یہ میری سنیما کی مشین بتاوے گی۔'' اس نے ریت پر بیٹھے ہوئے اونٹ کی پیٹھ پر جو بکسا بندھا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہری سنگھ نے ایک نیا لفظ سنا۔''سنیما؟ وہ کیا ہووے ہے؟'' اس سے پہلے کہ وہ آدمی کچھ جواب دیتا گنگا نے بڑے جوش سے کہنا شروع کیا۔''بابا۔ بابا۔ یہ جادو کا تماشا میں نے دیکھا ہے۔ جیسلمیر میں دیکھا ہے۔ چھوکرا چھوکری کے پیچھے بھاگے۔ چھوکری چھوکرے پیچھے بھاگے۔ چھوکرا گاوے۔ چھوکری ناچے۔ بڑا مزا آوے بابا۔ بڑا مزا آوے۔''

اس کی آنکھیں ایسی چمک رہی تھیں جیسے وہ ابھی سے جادو کا تماشا دیکھ رہا ہو۔

اور اب رات کو گاؤں کے چوک میں ریت پر سب گاؤں والے بیٹھے تھے۔ مرد عورتیں اور بچے، سامنے ایک سفید پردہ لگا تھا۔ مگر سب پیچھے مڑ مڑ کر سنیما کی چھوٹی سی مشین کو دیکھ رہے تھے جس کے کل پرزے خاکی کپڑوں والا سرکاری آدمی ٹھیک ٹھاک کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ لوگوں سے کہتا جا رہا تھا کہ تماشا سامنے والے پردے پر ہوگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہری سنگھ، رحمن چاچا، گنگا سنگھ، یوسف، گوری، سونکی، سکینہ اور ان سب کے پیچھے منگل سنگھ جو کن انکھیوں سے سونکی کو گھور رہا تھا۔ سب لوگ سنیما کے تماشے کے لیے اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن کر آئے تھے کیونکہ آج رات بڑا غیر معمولی واقعہ ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے کوئی سنیما کا تماشا ان کے بھارتیہ گاؤں میں نہیں ہوا تھا۔

پہلے 26 جنوری کی نیوز ریل دکھائی گئی۔ مگر یہ کئی برس پرانی تھی کیونکہ اس میں راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو دکھایا گیا تھا۔ مگر پھر بھی جن گاؤں والوں نے کبھی سنیما نہیں دیکھا تھا ان کو تو چلتی پھرتی تصویروں کا یہ کھیل واقعی جادو کا تماشہ ہی لگا۔

26 جنوری کے جلوس اور فوجی پریڈ میں انھوں نے ہاتھی دیکھے، گھوڑے دیکھے، پریڈ کرتے ہوئے فوجی جوان دیکھے۔ مگر ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب انھوں نے گنگا نگر رسالے کے اونٹ سوار بھی دیکھے۔ پردے پر اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر بھارتیہ گاؤں کے اونٹوں نے بھی دلچسپی سے اپنی گردنیں اونچی کر دیں لیکن سونکی اور سکینہ کو سب سے اچھی لگیں اسکول کی لڑکیاں جو رنگ

ترنگے جھنڈے ہاتھ میں لیے فوجی جوانوں کی طرح مارچ کرتی ہوئی جا رہی تھیں۔

لیکن اس تمام عرصے ہری سنگھ ان چلتی پھرتی تصویروں کو ایسے غیر متعلق انداز سے دیکھتا رہا جیسا کہ ان کا اس کی زندگی سے کوئی نزدیکی رشتہ نہ ہو۔ مگر جب اگلی فلم میں اس نے پانی دیکھا، پانی کی دھارا دیکھی، پانی کی ریل پیل دیکھی تو وہ بھی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ پردے کے پیچھے سے کمنٹری بولنے والے کی آواز آ رہی تھی۔

''راجستھان نہر پنجاب کے دریاؤں کے فالتو پانی سے راجستھان کے ریگستانی علاقوں کی پیاس بجھائے گی، جہاں آج سوکھی بنجر دھرتی ہے وہاں کل پانی کی ریل پیل ہو گی اور پھر اس زمین میں اناج اُگے گا...... جیسا سورت گڑھ کے سرکاری فارم میں اُگ رہا ہے جہاں اتنی فصل ہوتی ہے کہ اسے مشینوں سے کاٹا جاتا ہے......

اور ہری سنگھ اور رحمٰن چاچا اور بھارتیہ گاؤں کے سب کسانوں نے سنیما کے پردے پر وہ دیکھا جسے وہ کبھی سپنے میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میلوں لمبے چوڑے کھیت جن میں فصل لہلہا رہی تھی اور بڑی بڑی مشینیں اس فصل کو کاٹ رہی تھیں اور ہری سنگھ کے کانوں میں کمنٹری بولنے والے کی آواز آئی۔

''یہ ہے راجستھان کا سنہری بھوشیہ۔ اس راجستھانی نہر کو بنانے کا کام آج کل بہت زوروں سے چل رہا ہے۔ ہزاروں مزدور اور سینکڑوں چھوٹے بڑے انجینئر مل کر کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف راجستھان بلکہ اتر پردیش، ہریانہ، پنجاب اور دور دور کے پرانتوں سے آئے ہوئے ہیں جیسے......''

اور جب کمنٹری بولنے والا یہ بول رہا تھا تو گنگا نے پردے پر دیکھا کہ سینکڑوں ہزاروں مزدور اور انجینئر اپنے ہاتھوں اور مشینوں کی مدد سے نہر کھودنے اور بنانے کا کام کر رہے ہیں اور اس کا من چاہا کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہوتا اور ان کے ساتھ مل کر ریگستان میں سے نہر نکالتا اور عین اس وقت ایک لمبا چوڑا، گورا چٹا نوجوان صاحب لوگوں جیسا کوٹ پتلون پہنے آ کر پردے پر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کہنے لگا۔

''میرا نام موہن کاؤل ہے اور میں سرینگر سے یہاں آیا ہوں۔ ہمارے کشمیر میں پانی کی کوئی کمی نہیں ہے، وہاں سوکھا نہیں پڑتا۔ اکثر باڑھ آتی ہے۔ پھر میں یہاں کیوں آیا ہوں......؟''

ہری سنگھ کو لگا یہ سوال اس سے کیا گیا ہے۔

گنگا سنگھ کو لگا یہ سوال اس سے کیا گیا ہے۔

اور سونکی (جو اس لمبے تڑنگے نوجوان کو بڑی دلچسپی اور غور سے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کی شخصیت میں — یا شاید اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی مقناطیسی کشش تھی) کو ایسا لگا کہ یہ سوال اس سے کیا گیا ہے اور اب یہی سوہن کاؤل ان سب سے کہہ رہا تھا — اور وہ سب اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔

''میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ شاید اس لیے کہ ہمارا ملک ایک ہے۔ ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں سے لے کر اس تپتے ہوئے ریگستان تک ایک ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ نہر تمھارے لیے اور ہمارے لیے ایک چنوتی ہے، ایک چیلنج ہے۔ یہ نہر وہ سرسوتی ندی بھی ہو سکتی ہے جو کبھی ان ریتیلے میدانوں میں بہتی تھی۔ یہ نہر، نہر شیریں ہے جو فرہاد نے اپنی محبوبہ کے لیے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی تھی .....'' گنگا سنگھ نے کن انکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا عین جس وقت گوری گنگا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہوں میں ایک محبت بھرا پیغام تھا — کہ ہماری محبت بھی شیریں فرہاد کی محبت سے کم نہیں ہے۔ اور اب موہن کاؤل کی آواز میں ایک تلخی کا انداز آتا جاتا تھا۔

''میں تو یہ نہر بنانے کشمیر سے یہاں آ گیا ہوں۔ مگر تم میں سے بہت سے اپنے اپنے گاؤں سے سو دو سو میل چل کر نہیں آئے۔ یہ نہر تمھارا مستقبل ہے، اسے تم نہیں بناؤ گے تو پھر کون بنائے گا۔ میں تم سے یہ سوال کر رہا ہوں۔ تم سے۔ تم سے۔ تم سے اور تم سے!''

ایک بار پھر ہری سنگھ کو، گنگا سنگھ کو، گوری کو، سونکی، ہر ایک کو یہ لگا کہ یہ سوال خاص اسے مخاطب کر کے کیا جا رہا ہے۔

سب گاؤں والوں کو ایسا لگا کہ جیسے اس جادو کے تماشے نے ان کی آرزوؤں، امنگوں، سپنوں اور خوابوں کو چلتی پھرتی تصویروں کی شکل دے دی ہے۔ جب تماشا ختم ہو گیا اور روشنی ہوئی تو ہر شخص تالیاں بجا رہا تھا — سوائے ایک کے۔ یہ تھا منگل سنگھ جو کہہ رہا تھا۔

''ہونہ! نہر بنائیں گے؟ — ارے نہر میں پانی کہاں سے لائیں گے۔ بکواس فلم ہے۔ نہ ناچ ہے نہ گانا، سرکاری پروپگنڈا ہے۔ پروپگنڈا۔''

○

ایک ایرانی پریم کہانی

اس رات کو ہری سنگھ جھونپڑے کے آگے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں گوری سونکی کو ہندی کی پہلی کتاب پڑھا رہی تھی اور گنگا سنگھ کھاٹ پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا ایک دم وہ بول پڑا۔

''ذرا ٹھہر سونو۔ بعد میں آ آ۔ اِی اِی کر لینا گوری، تو تو کتابیں پڑھے ہوئے ہے۔ یہ بتا وہ انجن ڈلیور جو......''

''انجن ڈلیور نہیں'' گوری نے اسے بتایا ''انجینئر۔''

''اچھا وہ انجینئر کیا کہے تھا کہ ایران میں دو فریاد......''

''فریاد نہیں فرہاد'' گوری نے اس کی غلطی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک لڑکی سے پریم کرتا تھا جس کا نام شیریں تھا۔''

''شیریں؟'' گنگا نے نام ایسے دہرایا جیسے اس کے منہ میں مٹھاس کا مزہ آ گیا ہو۔ ''نام تو بہت سندر اور میٹھا ہے۔''

''تھی بھی وہ بہت سندر۔'' گوری نے اسے بتایا۔ ''فرہاد اسے دل سے چاہتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' اب سونکی بول پڑی۔ پریم کہانی میں بھلا کسے دلچسپی نہیں ہوتی۔

''پھر یہ ہوا کہ فرہاد نے جب بیاہ کرنے کو کہا تو شیریں نے نا بول دیا۔

''وہ کیوں؟'' گنگا نے اپنی پڑھی لکھی بیوی سے پوچھا۔ ''کیا وہ اس سے پریم نہ کرتی تھی؟''

''فرہاد سے پریم ضرور کرتی تھی۔'' گوری نے جواب میں کہا۔ ''مگر اپنے قبیلے کے لوگوں سے اس کو زیادہ پیار تھا اور ان کے پاس پینے کا پانی نہیں تھا۔''

باہر برآمدے سے ہری سنگھ کی آواز آئی۔ ''ارے گنگا۔ ذرا پوچھ تو کیا ان کے ہاں بھی برکھا ناہیں ہووے تھی، کیا ان کی زمین بھی اپنی زمین کی طرح سوکھی ہے؟''

''ہاں بابا۔'' گنگا نے جلدی سے خود ہی جواب دے دیا۔ ''ہاں اپنے لوگوں کی طرح۔'' وہ جلدی سے گوری سے پوری کہانی سن لینا چاہتا تھا۔ ''تو پھر؟''

''سو شیریں نے کہا وہ فرہاد سے بیاہ کرے گی مگر جب وہ پہاڑوں کو کاٹ کر پانی کی نہر اس کے گاؤں تک لے آوے گا۔''

گنگا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کہانی کا اس کی اپنی زندگی سے کوئی بڑا گہرا سمبندھ ہے۔ اس نے پوچھا: ''تو کیا فرہاد نے ایسا کیا؟''

''ہاں اس نے کلہاڑا اٹھایا۔'' گوری نے جواب دیا اور اپنے پتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ''اور پہاڑ کے پتھروں کو کاٹ کر پانی کی نہر بنا دی۔''

بھولی بھالی سونکی نے بے اختیار کہا۔ ''ہمارے ہاں بھی ایسا کوئی آدمی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''

گوری نے گنگا کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ پھر جواب دیا۔

''ہمارے ہاں ہے ایک ایسا آدمی!''

سارا گاؤں گنگا کو بدا کرنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا۔ کسی نے سفر کے لیے اس کو ایک پرانا فوجی کوٹ دے دیا تھا۔ کسی نے بوٹ اور کسی نے پٹیاں جو اس نے دھوتی پر ہی باندھی ہوئی تھیں۔ سر پر پیلا جیسلمیری صافہ تھا اور ماتھے پر تلک لگا تھا۔

گوری کا پیار بھرا دل اپنے شوہر سے جدائی کے خیال سے رو رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ ایک راجپوت عورت تھی اور وہ جانتی تھی کہ جب ویر پتی رن کو جاتا ہے تو

راجپوتنی اسے کس شان سے بدا کرتی ہے۔ پھر بھی اس نے گھونگھٹ میں سے رنگین کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک پوٹلی گنگا کو پکڑا دی جس میں باجرے کی دو روٹیاں اور ساگ بندھا ہوا تھا۔ سب کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکی مگر گنگا کو معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ گنگا بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے باپ اور دوسرے گاؤں والوں کے سامنے وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا صرف بہن سے اتنا کہا۔ ''سونکی، اپنی بھابی کا خیال رکھنا۔''

مگر سونکی کا دھیان کہیں اور ہی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، ''بھیا، وہاں سے ضرور چٹھی لکھنا کہ نہر بنانے کا کام لگائیاں بھی کرے ہیں کیا؟''

سکینہ نے گنگا بھیا کو سلام کیا۔ دوست کی جدائی کے خیال سے یوسف کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ گنگا سے گلے ملتے ہوئے بولا، ''گنگا بھیا مجھے بھی ساتھ لے چل۔''

مگر گنگا نے کہا: ''ارے یوسف اگر میں تجھے ساتھ لے گیا تو تیرے بابا کے اونٹوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میرے گھر والوں کی خیر خبر کون لے گا؟''

یوسف نے چھاتی پر ہاتھ مار کر دوست کو یقین دلایا۔ ''تو فکر مت کر گنگا۔ جب تک یوسف کی جان میں جان ہے۔۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا تو میں اس کی آنکھ ہی نکال لوں گا۔''

آخر میں گنگا نے اپنے باپ کے چرن چھوئے۔ ہری سنگھ نے بیٹے کو گلے لگا کر کہا: ''جیتا رہ بیٹا مگر دیکھ تجھے میری سوگندھ ہے۔ اب نہر ساتھ لے کے ہی گاؤں میں واپس آئیو۔'' پھر اس کی پیٹھ ٹھوکتے ہوئے کہا: ''جا رحمٰن چاچا کا آشیرواد لے۔''

رحمٰن چاچا نے بھی گنگا کو گلے لگایا۔ ''جیتا رہ بیٹا جیتا رہ۔'' اور پھر اپنے اونٹ کی طرف اشارہ کر کے (کہا): ''یہ اونٹ لیتا جا۔ جیسلمیر میں میرے بھائی کے پاس چھوڑ دیجیو۔ اسٹیشن کے پاس ہی دودھ کی دکان ہے اس کی۔''

گنگا نے سب گاؤں والوں کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ سب نے اسے ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے آشیرواد دیا۔ پھر گنگا اچھل کر اونٹ پر سوار ہو گیا اور ایڑ کے اشارے سے اونٹ کھڑا ہو گیا۔

ایک اونٹ کھڑا ہوا اور ساتھ میں ہی ایک اور اونٹ بھی۔ اس پر منگل سنگھ سوار تھا۔

''کیوں منگل تو بھی چل رہا ہے؟'' گنگا نے پوچھا۔

''ہاں میں بھی جا رہا ہوں دنیا دیکھنے۔'' منگل نے جواب دیا۔
اور اس طرح بھارتیہ گاؤں کے یہ دونو جوان اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوئے۔

گوری کی آنکھیں اپنے پتی کو دور جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور اس کا دل رو رہا تھا لیکن اس کی خوب صورت آنکھوں میں جدائی کا درد تھا، کوئی آنسو نہیں تھا۔

دونوں اونٹ برابر برابر دھول اڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

'اے منگل' گنگا نے دوسرے اونٹ پر بیٹھے ہوئے، نو جوان کو آواز دی۔

'ہاں' منگل نے بغیر گرمجوشی کے جواب دیا۔ سونکی کے بارے میں جوان کی بات ہوئی تھی اس کو وہ ابھی بھولا نہیں تھا۔

''اچھا ہوا تو بھی ساتھ چل رہا ہے۔ دونوں مل کر نہر بنائیں گے۔''

''نہر بنائیں گے؟ ہاہاہا'' منگل نے اس کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

''ارے میں تیرے جیسا پاگل تھوڑا ہی ہوں جو سنیما کی پرچھائیوں کی باتوں میں آجاؤں اور اس نہر سے تو میری پرانی دشمنی ہے۔''

''نہر سے دشمنی ہے؟'' گنگا نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ ''بھلا کیوں؟''

''لمبی کتھا ہے'' منگل نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ ''پھر کبھی سناؤں گا۔''

''پتہ نہیں تجھے نہر سے کیوں بیر ہے؟'' گنگا نے منگل کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کی۔

''میں تو اتنا جانوں ہوں کہ بالو میں، بنجر دھرتی میں کبھی پھول نہ کھلیں اور بابا تو کہویں ہیں کہ دو بوند پانی میں ہماری جان ہے..... سن منگل تو چل میرے ساتھ۔''

''نا بابا میں تو اپنے راستے جاؤں گا۔'' منگل بھی بحث کرنے میں کچا نہیں تھا۔ ''پر یاد رکھ گنگا، بالو میں جو پانی دکھائی دے ہے وہ نظر کا دھوکا ہے اور یہ نہر بھی ایسا ہی ایک نظر کا دھوکا ہے اور میں جدھر جا رہا ہوں ادھر مال ہے، پیسہ ہے۔''

'پیسہ ہوگا' گنگا نے زور دے کر کہا۔ ''پر پانی نہیں ہے۔''

''ارے مورکھ پانی بھی ہے۔'' منگل سنگھ نے فوراً جواب دیا۔'' پانچ روپے میں ایک پکھال پانی کی بکے ہے۔ جس کی جیب میں پیسہ ہے، مال ہے، اسے کہیں بھی پانی کی کمی نہیں ہے۔

''بڑے بھروسے کے ساتھ گنگا کی طرف دیکھ کر اس نے کہا،'' بول چلے ہے، میرے ساتھ۔''

''نہیں بابا۔'' سیدھے سادے گنگا نے کہا'' مجھے تو تیری باتوں سے ڈر لگے ہے۔''

منگل نے چڑ کر جواب دیا۔'' تو پھر جا ریت کے ٹبّوں کو کھود کھود کر جان دے دے۔''

اب وہ ایک ایسی جگہ آ گئے تھے جہاں سے دو راستے ہو جاتے تھے۔ ایک بائیں کو جاتا تھا، ایک دائیں کو، ایک مشرق کو، ایک مغرب کو، ایک اُدھر جدھر نہر بن رہی تھی۔ دوسرا کدھر؟ یہ ابھی کم سے کم گنگا کو نہیں معلوم تھا۔

منگل سنگھ نے بائیں کو جو راستہ جاتا تھا ادھر اشارہ کر کے کہا:'' تیرا راستہ وہ ہے۔'' یہ کہہ کر کہ'' میرا راستہ یہ ہے'' اپنے اونٹ کا رخ موڑ دیا۔

زندگی کا، قسمت کا دوراہا جہاں آ کر دوست دوست سے، ساتھی ساتھی سے، بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے۔ یہ دوراستے گنگا سنگھ اور منگل سنگھ کو کہاں کہاں لے جائیں گے، کیا کیا کرائیں گے؟

ریت کے ٹیلے، پھر ریت کا میدان، پھر سخت بنجر زمین۔

ان سب سے ہوتا ہوا گنگا سنگھ اپنے اونٹ پر جیسلمیر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جہاں سے وہ ریل میں سوار ہو کر چھتر گڑھ جائے گا جو راجستھان نہر کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

دوپہر کا وقت ہو گیا تھا جب سورج کی کرنیں سپاٹ بنجر زمین کے بالوں میں پانی کی پرچھائیں پیدا کر دیتی ہیں۔ گنگا کا اونٹ ایک جگہ آ کر آپ سے آپ رک گیا۔ سامنے جہاں تک نظر جاتی تھی پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ یہ جھیل تھی، تالاب تھا یا سمندر تھا؟ یا (جیسا کہ منگل سنگھ نے کہا تھا) یہ نظر کا دھوکا تھا؟ ابھی گنگا یہ نہیں طے کر پایا تھا کہ یہ بالوں میں پانی کیسا ہے کہ اس کی نظر نے ایک اور دھوکا کھایا اور جہاں پانی جھلملا رہا تھا (یا پانی کی طرح ریت جھلملا رہی تھی) اسے ایک جانی بوجھی، پیاری پیاری شکل دکھائی دی۔ گوری! یہ گوری یہاں اس سے پہلے کیسے پہنچ

گئی؟۔اب وہ آگے آرہی تھی۔ابھی وہاں تو ابھی یہاں۔ابھی اِدھر،ابھی اُدھر،آگے آتے آتے بالکل اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔شادی کے لباس میں مگر بغیر اوڑھنی کے۔کتنی خوب صورت ہے میری یہ گوری! اس نے سوچا۔وہ اسے بلا رہی تھی—اشارے کر رہی تھی! آؤ اور میرے ہو جاؤ۔آؤ۔آؤ—

وہ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ گوری آپ سے آپ تیزی سے پیچھے ہٹتی گئی۔یہاں تک کہ نظر سے اوجھل ہوگئی اور اب وہاں سوائے اس کی یاد کے اور کچھ نہیں تھا۔صرف دور تک پھیلی ہوئی ریت تھی اور اس میں جھلملاتا ہوا پانی مگر وہ پانی نہیں تھا نظر کا دھوکا تھا۔

گنگا سنگھ نے اپنے اونٹ کا رخ گھر کی طرف واپس موڑ دیا۔

○

میرا خون تمھاری عزّت

گاؤں میں چراغ جل چکے تھے۔

اپنے اپنے جھونپڑوں میں سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

ہری سنگھ اور سونکی بھی کھانا کھانے چوکے میں بیٹھے تھے۔ گوری سسر کے سامنے گھونگھٹ نکالے کھانا پروس رہی تھی۔ لیکن ایک تھالی اس نے اپنے پتی کے لیے بھی پروس کر رکھ دی تھی کیونکہ جب راجپوت ویرن کو جاتا ہے تو اس کی یاد اسی طرح رکھی جاتی ہے۔

سونکی بھولے پن سے اپنے بھائی کی بڑائی میں ڈینگیں مار رہی تھی۔ ''سارے گاؤں میں ہمارے بھائی جیسا جگرے والا ایک بھی ماں کا لال نہیں تھا جس نے اس لمبو انجینئر کی بات سنی اور چالو ہو گیا نہر بنانے۔''

''ارے تو بیٹا کس کا ہے!'' ہری سنگھ اپنی بہادری جتانے لگا۔'' میں تو بڈھا ہو گیا ہوں، نہیں تو دکھا دیتا کون جاوے ہے سب سے پہلے! پر میں نے گنگا کو کہہ دیا ہے کہ خبردار بیٹا واپس مت آئیو جب تک گاؤں میں نہر نہ آ جاوے......''

اتنے میں دروازے کی زنجیر کسی نے ہلکے سے کھٹ کھٹائی۔

''کون ہے رے؟'' ہری سنگھ نے آواز لگائی۔'' دروازہ کھلا ہے۔'' دروازہ دھڑ سے کھلا اور چراغ کی روشنی میں انھوں نے دیکھا کہ گنگا سنگھ اپنے بستر ے سمیت داخل ہو رہا ہے، مگر چوروں کی طرح دروازے کو آہستہ سے بند کر کے۔

''بھیّا!'' سونی گنگا کو دیکھ کر بے اختیار خوشی سے چلاّئی مگر اس کے باپ نے ڈانٹ کر اسے بٹھادیا۔ اس کے بعد جھونپڑے میں ایک ایسی خاموشی طاری ہوگئی جس میں گنگا سنگھ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

اس کا باپ اس کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچّا چبا جائے گا۔ گھونگھٹ میں سے گوری کی نگاہیں اس پر غصّے اور حقارت کے تیر برسا رہی تھیں۔ صرف سونی گھبرا گھبرا کر کبھی باپ کی طرف دیکھتی تھی کبھی بھائی کی طرف۔

آخر گنگا سے یہ خاموشی برداشت نہ ہوسکی۔ اس کو ہی بولنا پڑا۔ ''سب چپ کیوں ہو؟ تم سمجھتے ہو میں میدان سے بھاگ آیا ہوں۔ میں تو بس ایک رات کے لیے واپس آیا ہوں — وہ — وہ — میں کچھ بھول گیا تھا۔''

''واپس آ کے سارے گاؤں میں ہماری ناک کٹوادی۔'' ہری سنگھ غصّے سے چلاّیا۔ ''کیا بھول گیا تھا؟''

گنگا کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ ''بابا — میں — وہ — پھر بھول گیا!......''

''کیا بھول گیا تھا؟'' ہری سنگھ نے پھر سوال کیا۔

گنگا سنگھ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر تلوار پر پڑی جو دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ ''ہاں — ہاں — یاد آ گیا بابا۔ میں اپنی تلوار بھول گیا تھا۔ راجپوت بنا تلوار کہیں جاوے ہے۔''

''تو راجپوت نہیں ہے۔'' ہری سنگھ نے غصّے سے کہا۔ ''راجپوت ہوتا تو کالا منھ لے کے واپس نہ آیا ہوتا۔ اور تلوار کس لیے چاہیے؟ نہر تلوار سے کھودے گا کہ کدال سے؟''

''یہ بھی ٹھیک ہے بابا۔'' گنگا نے ہار مان کر کہا۔ ''میں صبح سویرے ہی نکل جاؤں گا۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ مجھے کم سے کم دو روٹیاں تو کھا لینے دو بڑی بھوک لگی ہے۔'' اور پھر اس نے گوری کے سندر مکھڑے کی طرف ٹکٹکی باندھ کے دھیرے سے کہا آج مجھے بڑی بھوک لگی ہے!'' اور اس کا مطلب دو روٹیوں کی بھوک — نہیں تھا۔

اب رات اور گزر چکی تھی۔ گنگا سنگھ کھاٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا گھر بھر میں اس سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ہری سنگھ نے اپنا بستر اٹھایا اور باہر کی طرف چلا اور اپنی بیٹی سے کہا

''سونکی میں تو باہر سونے کو جاؤں ہوں۔''اور پھر گنگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''یہاں تو مجھے مرے ہوئے چوہے کی بو آوے ہے۔ چل تو بھی باہر آجا۔''

سونکی اپنا بستر سمیٹنے لگی اور گنگا سنگھ کی جان میں جان آئی۔ لگتا تھا اس کی واپسی بیکار نہ جائے گی۔ مگر گوری نے سونکی کو روک دیا۔''ٹھہر، سونکی۔ وہ کہانی تو سنتی جا جو میں تجھے سنانے والی ہوں۔''

''کہانی؟''سونکی نے بچکانہ شوق سے کہا۔''سناؤ نا بھابی۔''اور پھسکڑا مار کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

گوری نے اپنے پتی کی طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔''بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک راجپوت مہارانی تھی۔ جو بڑی سندر تھی اور اپنے پتی سے بہت پریم کرتی تھی۔''

گنگا نے سوچا بالکل جیسے گوری اور میرا پریم ہے!اور کہانی بڑے شوق سے سننے لگا۔

گوری نے کہانی جاری رکھی مگر بیچ بیچ میں وہ گنگا کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی جا رہی تھی۔

''پرانا زمانہ تھا۔ بات بات پر لڑائی ہووے تھی۔ دوسرے کسی راجا نے اپنی فوج لے کر راجدھانی پر حملہ کر دیا تب تو اپنے دیش اور راج کی رکھشا کے لیے مہاراجا کو بھی جنگ کی تیاری کرنی پڑی حالانکہ اس کا دل مہارانی کو چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔''

گنگا نے سوچا۔ جیسے میرا من نہیں چاہتا کہ میں گوری کو چھوڑ کر کہیں بھی جاؤں؟، اب اس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کہانی کے پردے میں گوری اپنے اور گنگا کے جذبات کا اظہار کر رہی ہے۔

گوری کی کہانی چلتی رہی اور اب وہ گنگا کی طرف دیکھ کر ہی بیان کر رہی تھی۔''پھر بھی مہارانی نے مہاراجا کو شرم دلا کر دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ مشکل سے راجدھانی کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کا منہ واپس شہر کی طرف موڑ دیا۔ سوچا چلو ایک رات اور اپنی مہارانی کے رنگ محل میں بتا آؤں۔''

گنگا سوچ رہا تھا، بہت بدھی وان تھا وہ مہاراجا، بالکل میرے جیسا۔

گوری کہانی سناتی رہی اور جب راجا کا نام آتا تھا تو اپنے پتی کی طرف دیکھ لیتی تھی جو اب کسی قدر پریشان سا ہو رہا تھا۔''مگر مہارانی نے اسے اپنے رنگ محل میں آنے سے روک دیا اور کہا۔ راجپوت ماں کے بیٹے ہو تو جاؤ۔ یدھ کرو، دشمنوں کا مقابلہ کرو۔ راجا کا دل تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی اسے واپس جانا پڑا۔ وہ شہر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ہرکارہ اپنی مہارانی کے پاس بھیجا۔''

گنگا نے گھبرا کر سوچا۔'اس نے ہرکارے کو کیوں بھیجا؟'
اور سونکی جو بڑی دلچسپی سے کہانی کو کہانی کی طرح ہی سن رہی تھی بولی،''پھر کیا ہوا بھابی؟''
گوری کی کہانی جاری رہی۔''ہرکارے نے رانی کے پاس آ کر کہا کہ مہاراج نے کہا ہے اپنے پریم اور وفاداری کی نشانی دے دیجیے تا کہ وہ من کی شانتی کے ساتھ دشمنوں کے ساتھ یدھ کر سکیں۔'مہاراج کو نشانی چاہیے؟'مہارانی نے ہرکارے سے کہا۔'جو میں دوں ان کی حضور میں پیش کر دینا۔''اتنا کہہ کر گوری رُک گئی اور ایک نظر گنگا سنگھ کو دیکھا۔
سونکی نے جلدی سے پوچھا۔''پھر کیا ہوا؟''
''پھر یہ ہوا۔''گوری نے گنگا سنگھ کے خاموش سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے دیوار تک گئی جہاں تلوار ٹنگی ہوئی تھی۔اس تلوار کو میان سے نکال لیا۔
''پھر یہ ہوا کہ مہارانی نے میان سے تلوار نکالی اور اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ دیا جسے ہرکارہ اپنے ساتھ مہاراجا کے پاس لے گیا۔تو یہ تھی مہارانی کے پیار کی نشانی۔''اور اس دم اس کی آنکھوں میں وہی غضب کی چمک تھی،وہی جنون تھا،جو اس غیرت مند مہارانی کی آنکھوں میں رہا ہوگا جس نے اپنے شوہر کو سبق سکھانے کے لیے اپنا سر کاٹ دیا تھا۔
ایک لمحے کے لیے گنگا سنگھ کو ایسا لگا کہ کہیں گوری بھی تلوار سے اپنا سر نہ کاٹ لے۔وہ گھبرا کے بیوی کا ہاتھ پکڑنے کو بھاگا۔
''نہیں گوری نہیں۔مجھے کچھ نہیں چاہیے۔میں بنا تلوار کے چلا جاؤں گا۔
گوری کی آنکھوں میں وہ خطرناک چمک ابھی تک موجود تھی۔اس نے گنگا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔''تم تلوار کے بنا جا سکتے ہو۔مگر تلک تو لگواتے جاؤ۔جے تلک!''یہ کہہ کر اس نے ننگی تلوار کو بلند کیا اور اس کی تیز دھار پر اپنا انگوٹھا کاٹ کر اس خون سے گنگا کی پیشانی پر تلک لگا دیا۔'یاد رکھنا یہ میرا خون ہے اور تمھاری عزت!'اور اس وقت گنگا سنگھ کی آنکھوں میں وہ جوش اور وہ عزم ابھر آیا جو راجپوت ویروں کی آنکھوں میں ہوتا تھا جب وہ مرنے یا مارنے کی نیت سے میدان جنگ میں جاتے تھے۔

○

لمبوانجینئر

ریگستان کا سینہ چیرتی ہوئی، راجستھان نہر بنتی چلی آ رہی تھی، جہاں تک نہر کھد چکی تھی وہاں اس کے دونوں کناروں کو اینٹوں سے پاٹا جا رہا تھا تاکہ جب پانی کا ریلا آئے تو سوکھی ریت ہی سارے پانی کو نہ چوس لے۔ سینکڑوں عورتیں اور مرد، مزدور، مستری اور اوورسیئر کام کر رہے تھے۔

اس نئی کھدی ہوئی آدھی پکّی آدھی کچّی نہر کے کنارے پر دور سے ایک سرخ رنگ کی جیپ آتی دکھائی دے رہی تھی۔ پیلی پیلی ریت کے پس منظر میں لال لال جیپ ایک بیر بہوٹی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں جہاں سے جیپ گزر رہی تھی مزدور اوورسیئر ٹھیکیدار وغیرہ سلام کرتے جا رہے تھے کیونکہ جیپ کو خاکی کپڑے پہنے ہوئے ایک نوجوان انجینئر چلا رہا تھا۔ قریب آنے پر دیکھا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لمبوانجینئر ہے جسے سنیما کے پردے پر دیکھا گیا تھا۔

لمبوانجینئر کی جیپ پکّی مگر خالی نہر کو پیچھے چھوڑ کر بالو کے بادل اڑاتی کچی کھدی ہوئی نہر کے کنارے چلتی رہی۔ پھر ایک طرف کو مڑ گئی جہاں راجستھان نہر کے چھتر گڑھ کے ہیڈ کوارٹر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور اب یہ جیپ چھتر گڑھ کے عجیب و غریب گاؤں میں داخل ہو رہی تھی جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ریت کے سمندر میں پکّی نئے ڈھنگ کی عمارتوں کا ایک جزیرہ تھا۔ یہاں نہ کوئی پیڑ تھا نہ پودا۔ ہریالی بالکل ہی نہیں تھی، مگر ایسا لگتا تھا کہ الہ دین کے چراغ کے

جادو سے لق ودق ریگستان کے بیچوں بیچ اکیسویں صدی کا ایک نیا شہر اُگ آیا ہے۔ جس میں دفتر ہیں، انجینئروں کے مکان ہیں، بجلی گھر ہے، ورک شاپیں ہیں، مشینیں ہیں اور بالو کے میدان میں اینٹوں سے پاٹی ہوئی سڑکیں ہیں۔ ان ہی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی لال جیپ ایک دفتر کے پاس آ کر رک گئی۔

نوجوان انجینئر موہن کاؤل جیپ سے اترا اور وہ برآمدے میں سے تیزی سے جا رہا تھا کہ ایک پیلے صافے اور سفید وردی والے چپراسی نے کھڑے ہو کر راجستھانی ڈھنگ سے سلام کیا۔

''حکم صاحب۔ اندر ایک عجیب سا آدمی بیٹھا ہے۔ کہتا ہے صاحب سے ہی مل کر جاؤں گا۔''

''اچھا دیکھتا ہوں۔'' کاؤل نے کہا اور چک اٹھا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''جے رام جی کی صاحب!'' یہ گنگا سنگھ تھا جو اچھا خاصا کارٹون لگ رہا تھا۔ کپڑوں میں راستے کی دھول پڑی تھی۔ پاؤں میں بھاری بوٹ، دھوتی پر خالی پٹیاں بندھی ہوئی، کسی مرے ہوئے گورے فوجی افسر کا سیکنڈ ہینڈ کوٹ۔ سر پر پیلا صافہ، بغل میں بستر اور جس ہاتھ سے ملیٹری سیلیوٹ کر رہا تھا اس میں ملیٹری ٹائپ کی پانی کی بوتل پکڑے ہوئے تھا۔

کاؤل نے غور سے اس عجیب وغریب نمونے کو دیکھا اور کہا۔ ''تم کون ہو بھئی؟'' اور پھر اپنی میز کی طرف لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے بولا۔ ''نوکری چاہیے تو کسی اسسٹنٹ انجینئر سے ملو۔ ٹھیکیدار کے پاس جاؤ۔''

اپنا بستر سنبھالتے ہوئے گنگا بھی اب میز کے پاس آ گیا تھا۔ انجینئر کی باتیں سن کر شکایت کے انداز میں بولا: ''بڑے آدمی ہو نا صاحب، اتنی جلد ہی ہم لوگوں کو بھول گئے۔''

''بھول گئے؟'' کاؤل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اور اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے کہا: ''کیا مطلب؟''

''کاؤل صاحب آپ نے ہمیں یہاں بلایا۔ سو صاحب میں حاضر ہو گیا۔ اب بولو کرنا کیا ہے؟''

''میں نے تمھیں بلایا تھا؟'' کاؤل نے حیرت سے سوال کیا۔ تم بھول رہے ہو یا کچھ دارو وارو پیے ہوئے ہو؟

''دارو؟'' گنگا سنگھ نے اس لفظ کو ایسے دہرایا جیسے کوئی بڑی بھیانک گالی ہو۔ ''رام رام! گنگا سنگھ دارو وارو نہ پیوے ہے، رحمٰن چاچا کی گائے کا دودھ پی وے ہے۔ ہاں!'' اور پھر بڑے

بھولے پن سے طعنہ دیا "یہ تم افسر لوگوں کی عجیب بات ہووے ہے، طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کے کہو ہو تم کون ہو؟ کیا چاہیے؟ جیسے جانتے ہی نہیں۔"

کاؤل نے چڑ کر کہا: "ارے بھئی عجیب پاگل آدمی ہو؟"

گنگا نے للکارا: "اے صاحب پاگل کی گالی مت دو۔"

کاؤل نے تنگ آکر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "سچ مانو بھائی۔ میں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"لو جی دیکھا ہی نہیں۔" گنگا نے اب پوری بات بتائی۔ ارے تمھارے سامنے ای تو بیٹھا تھا۔ آلتی پالتی مارے۔ میرے پاس میرا باپو اس کے پاس میری گھر والی گوری۔ گوری کے پاس میری بہن سونکی۔ ان سب نے کہا ہے انجن ڈلیور صاحب کو ہماری طرف سے بہت بہت جے رام جی کی بولنا۔"

"انجن ڈرائیور نہیں انجینئر!" کاؤل اب بھی بات کی تہہ کو نہیں پہنچا تھا۔ "بھائی یقین مانو میں تمھارے گاؤں کبھی نہیں گیا۔ وہ کوئی اور انجینئر ہوگا۔ اب تم جاؤ مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"واہ جی واہ" گنگا نے طعنہ مارا۔ "اس دن کیا زور زور سے کہہ رہے تھے۔ آؤ ہمارے ساتھ مل کر راجستھان کی نہر بناؤ۔ اپنا بھوشیہ بناؤ، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ تمھارا اور تمھارا! ہونہہ!"

اب جا کے کاؤل کی سمجھ میں آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ ہنسنے لگا۔ "تمھارا مطلب ہے کہ تم نے مجھے فلم میں دیکھا تھا؟"

"پھلم! پھلم! ہاں ہاں۔" گنگا نے جلدی سے کہا۔ "گئے سوموار کو ہمارے گاؤں پھلم آئی اور پھلم میں تم آئے صاحب تم نے کہا آؤ۔ آؤ۔ سو میں آ گیا صاحب۔"

اب کاؤل کا سارا رویہ ہی بدل گیا "اگر آ گئے ہو تو بیٹھو بیٹھو کھڑے کیوں ہو؟" گنگا سنگھ کو ہچکچاتے دیکھ کر اس نے کہا: "ڈرو نہیں بیٹھو بھئی۔" اور جب گنگا سنگھ گود میں بستر کو دبوچے ہوئے کرسی کے کنارے پر بے آرامی سے بیٹھ گیا (کہ نہ جانے کب ایک دم اٹھنا پڑے) تو کاؤل نے اپنا بیان جاری رکھا۔ جانتے ہو وہ فلم کب بنی تھی؟ چار برس ہوئے۔ جب میں نیا نیا انجینئر بھرتی ہوا تھا۔ اور اب پہنچی ہے وہ تمھارے گاؤں میں۔ واہ رے ہماری سرکار جس کے کام میں دیر بھی ہے اندھیر بھی ہے۔" (1)

1۔ "واہ رے ہماری سرکار جس کے کام میں دیر بھی ہے اور اندھیر بھی" یہ ڈائیلاگ سنسر کے حکم سے فلم میں سے کاٹ دیا گیا ہے۔

گنگا کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ ''کیا کہو ہو صاحب؟''

''کچھ نہیں۔'' کاوَل نے جواب دیا۔ ''جانتے ہو اس فلم میں تو میں نے ایسے ہی جوش میں آ کے کہہ دیا تھا۔ پھر بھی مجھے سن کے آج تک کوئی کام کرنے نہیں آیا۔ تم پہلے آدمی ہو جو میری وجہ سے آئے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی میری طرح بدھو ہو۔''

''اے صاحب۔'' گنگا چمک کر بولا ''بدھو کی گالی مت دو۔''

''اچھا بھئی۔ اب تو تمھیں کام دینا ہی پڑے گا۔'' کاوَل نے پنسل ہاتھ میں لی اور کاغذ کا پیڈ اٹھا کر اپنے آگے رکھا۔ کیا نام ہے تمھارا؟

''گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ ساکن بھارتیہ گاؤں۔''

اچھا تو گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ ساکن بھارتیہ گاؤں۔ کیا کام کرنا چاہتے ہو؟

''صاحب۔ میں تو وہی کروں گا جو فریاد نے — مرا مطلب ہے فرہاد نے کیا تھا۔ میری گوری کہوے ہے کہ پہاڑوں کی چھاتی چیر کے نہر نکالی تھی اس نے۔''

کاوَل نے اسے بتایا: ''یہاں پہاڑوں کو نہیں ریت کے ٹیلوں کو کاٹ کر نہر بنانی ہے۔''

اور پھر پوچھا: ''کہو ٹریکٹر چلا سکتے ہو؟''

''ٹریکٹر؟'' گنگا سنگھ نے یہ نام آج ہی سنا تھا۔ ''وہ کون سا جانور ہووے ہے جی؟ میں تو فقط گدھا ہانک سکوں ہوں۔''

''اچھا تو تم فی الحال گدھا ہی ہانکو۔'' کاوَل نے اسے جواب دیا ''وہی تمھیں سکھائے گا کہ ٹریکٹر کتنے کام کا جانور ہے۔''

بہت جلد گنگا سنگھ کو گدھے اور ٹریکٹر کا فرق معلوم ہو گیا۔ وہ دوسرے مزدوروں کے ساتھ ریت کو پھاوَڑوں سے کھودتا، پھر گدھوں کے دونوں طرف لٹکی ہوئی بوریوں میں ریت بھرتا، پھر گدھوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا ریت کے ٹیلے کے اوپر لے جاتا اور وہاں جا کر نہر کنارے ریت کا انبار لگا دیتا۔ صبح سے شام تک یہی کام کرتا رہتا۔

لیکن گدھوں کو ہانکتے ہوئے وہ دیکھتا کہ ٹریکٹر اور بل ڈوزر اور دوسری کل دار مشینیں کتنی

تیزی سے کتنا بھاری بوجھ اٹھا کر دور دور لے جاتی ہیں، کسی بھی ڈھلان پر تیزی سے چڑھ جاتی ہیں، کسی بھی ڈھلان سے اتر جاتی ہیں۔ یہ جادو کی مشینیں ہیں یا فولاد کے ہاتھی جو اپنے آہنی قدموں کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں تو زمین ہل جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں گنگا سنگھ اور اس کے گدھے کتنے کمزور اور حقیر معلوم ہوتے ہیں؟ گنگا سنگھ اپنے گدھے ہانکتا رہتا اور ٹریکٹروں بل ڈوزروں کو دیکھتا رہتا اور یہ سب سوچتا رہتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی ان فولاد کے ہاتھیوں کو ایک دن ہانک سکے۔

ایک دن دوپہر کی چھٹی کا سائرن بجا اور گنگا پسینہ پونچھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ٹھیکیدار کے ایک آدمی نے اسے پکارا: ''اے گدھے والے تیرا نام کیا ہے؟''

''گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ ساکن بھارتیہ گاؤں۔''

''تیری ایک چٹھی آئی ہے۔'' مقدم نے جیب سے نکالتے ہوئے کہا اور پوچھا 'کب سے کام کرے ہے؟'

''ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے؟''

''کسی گوری کی چٹھی ہے۔'' پیچھے پتہ پڑھتے ہوئے مقدم نے کہا اور چٹھی گنگا کو پکڑا دی، لے پڑھ لے۔''

گنگا کو لکھنا پڑھنا کب آتا تھا۔ مگر کسی دوسرے کے سامنے وہ یہ ماننے والا تھوڑا ہی تھا۔ بولا۔ ''میری گھر والی کی چٹھی ہے، تمھارے سامنے تھوڑی ہی پڑھوں گا۔'' چٹھی لے کر وہاں سے چلا تو یہ سوچتا جا رہا تھا: ''مشکل یہ ہے کہ چٹھی میں پڑھوں گا کیسے؟''

انجینئر موہن کاؤل اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سینڈوچ کھا رہا تھا کہ گنگا سنگھ کی آواز آئی ''صاحب، میں آؤں؟''

''آؤ آؤ گنگا سنگھ آؤ۔'' اور گنگا بنڈی دھوتی اور اپنے فوجی بوٹ پہنے اور انگوچھا سر کو لپیٹے داخل ہوا۔

کاؤل نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا: 'بیٹھو بیٹھو'

گنگا کو اب افسر اور مزدور کا فرق معلوم ہو گیا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا ''نہیں صاحب میں کھڑا

ہی ٹھیک ہوں۔''

''کیوں کیا ہوا؟ ارے بھئی بیٹھو نا۔'' اور کاؤل نے پھر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں صاحب آپ آفیسر ہیں۔ میں گدھا ہانکنے والا مزدور۔ آپ برہمن۔ میری جات بھی چھوٹی ہے۔ میں آپ کے برابر کیسے بیٹھ سکتا ہوں؟''

کاؤل ہنس کر بولا: ''کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہے ہو؟ ہم دونوں کی ذات برادری ایک ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ تم گدھا ہانکتے ہو اور میں ٹریکٹر ہانکتا ہوں—اور دوسروں کو ٹریکٹر چلانا سکھاتا ہوں۔ اب بیٹھو بھی!''

گنگا نے پھر ہاتھ جوڑے اور انکسار سے کہا: ''آپ حکم دیتے ہیں تو بیٹھ جاتا ہوں۔'' اور وہ کرسی کے اگلے سرے پر بیٹھ گیا۔

''کہو'' کاؤل نے اپنا پائپ جلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کام کیسا چل رہا ہے؟''

''کام تو بس گدھے کی چال سے چل رہا ہے۔''

''اب گدھے اور ٹریکٹر میں فرق معلوم ہو گیا نا؟'' کاؤل نے پوچھا۔

''ہاں صاحب'' گنگا سنگھ نے جوش سے جواب دیا۔ ''ٹریکٹر تو ٹریکٹر ہی ہے، کیا فٹافٹ چلتا ہے۔''

''اور گدھا؟''

گنگا سنگھ نے بے دلی سے کہا۔ ''گدھا تو بس گدھا ہی ہے۔''

کاؤل کو کہنا پڑا: ''تم تو بڑے سمجھدار ہوتے جا رہے ہو۔ اب تو تمھیں ٹریکٹر چلانا سکھانا ہی پڑے گا۔''

گنگا کی تو عین خواہش ہی یہ تھی۔ ''سچ سکھائیں گے، صاحب؟''

''ضرور سکھاؤں گا'' کاؤل نے پائپ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کہو کیا کام ہے؟''

گنگا نے نظریں جھکا کے کہا: ''صاحب کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''کیوں ایسی کیا بات ہے؟''

''جی۔'' گنگا نے ہچکچاتے ہوئے جیب سے بیوی کی چٹھی نکالی۔

''جی۔ میری گھر والی کی چٹھی آئی ہے، میں کسی اور سے پڑھواؤں گا تو سب مخول اڑائیں گے۔ کرپا کر کے آپ ہی پڑھ دو نا۔''

''اچھا لاؤ۔'' اور گنگا کے ہاتھ سے چٹھی لے کر اسے کھولتے ہوئے کاؤل نے کہا: ''اس بار تو پڑھ دوں گا مگر تم خود لکھنا پڑھنا کیوں نہیں سیکھ لیتے۔''

اب خط پر ایک نگاہ ڈال کے کاؤل نے پوچھا: ''یہ تمھاری گھر والی کا اپنا لکھا ہوا ہے؟''

''جی صاحب وہ تو پوری ماسٹرنی ہے۔'' گنگا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''پھر تو اور بھی شرم کی بات ہے کہ تم ان پڑھ ہو۔ اچھا سنو تمھاری گھر والی لکھتی ہے۔''

کاؤل خط پڑھتا رہا اور خط کا مضمون گنگا کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں ظاہر ہوتا رہا۔

''پوجیہ پتی جی!

جے رام جی

روز بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ تمھیں راضی خوشی رکھے
تمھارے پتا جی کشل ہیں۔ سونکی تمھیں بہت یاد کرے ہے۔ رحمن
چاچا کے ہاں بھی سب راضی خوشی ہیں۔ سارا گاؤں تمھارے گن
گائے ہے اور ہم سب بھگوان سے یہی پرارتھنا کرے ہیں کہ تم
نہر لے کر جلدی گھر لوٹو۔ ہاں ایک بات اور — اب جاڑے کا موسم
آ رہا ہے، راتیں لمبی اور سونی ہوگئی ہیں۔

تمھاری گھر والی گوری''

'صاحب' گنگا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''یہ لمبی سونی راتیں۔ یہ آپ نے من سے تو نہیں گھڑا ہے نا؟''

کاؤل نے کہا۔ ''کیا یہ جاننا تمھارے لیے بہت ضروری ہے؟''

''ہاں صاحب بہت ضروری ہے۔''

کاؤل کو موقع مل گیا۔ ''تو پھر خود پڑھنا لکھنا سیکھ لو۔ تب معلوم ہو جائے گا۔''

گنگا نے مجبوری کی ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''اب تو سیکھنا ہی پڑے گا۔''

کاوَل خط واپس کرنے ہی والا تھا کہ نیچے کچھ لکھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''ارے نیچے بچّے کی سی لکھائی میں کچھ اور لکھا ہے۔''

''وہ میری بہن سونکی نے لکھا ہوگا۔ وہ گوری سے لکھنا پڑھنا سیکھتی ہے نا۔ کیا لکھا ہے صاحب؟''

کاوَل نے بچکانہ لکھائی کو کسی قدر مشکل سے پڑھا۔ ''اگر اس لمبو انجینئر صاحب سے ملو تو کہنا ایک دن میں بھی وہاں آؤں گی۔ سونکی۔'' ''یہ لمبو انجینئر کون ہے؟ کاوَل نے پوچھا۔

کاوَل کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اس میں کیا شک ہے؟۔ بھئی خوب نام دیا ہے۔ لمبو انجینئر......'' اور پھر کھڑے ہو کر اپنے چھ فٹ ایک انچ کے قد کا اندازہ کرتے ہوئے (کہا)، ''کیا میں سچ مچ اتنا لمبا ہوں؟''

گنگا نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''نہیں صاحب۔''

''تو پھر کیا ہوں؟'' کاوَل نے پوچھا۔

اب تو گنگا کو کہنا پڑا۔ ''بس ذرا سے لمبے ہو صاحب۔''

اور پھر دونوں ہنس پڑے۔ انجینئر اور مزدور، ٹریکٹر چلانا سکھانے والا اور گدھا ہانکنے والا، مگر اس وقت وہ صرف دو انسان تھے، دو دوست تھے، راجستھان نہر کے دو معمار تھے۔ وہ دونوں خوش تھے اور اس لیے ہنس رہے تھے۔

O

فولاد کا ہاتھی

انجینئر کاؤل نے جیسے کہا تھا ویسا ہی اس نے کیا۔ گنگا سنگھ کو ٹریکٹر چلانا سیکھنے کے لیے ایک ٹریکٹر ڈرائیور کے ساتھ لگا دیا۔

اور اب نہر کے کنارے ایک بھاری ٹریکٹر پر ڈرائیور کے برابر میں بیٹھا گنگا سنگھ اپنے آپ میں ایک زبردست طاقت محسوس کر رہا تھا۔ یہ فولاد کا ہاتھی اب اس کے بس میں تھا۔ جدھر چاہتا تھا موڑ سکتا تھا۔ ایک کل دبانے سے چل پڑتا تھا، دوسری کل دبانے سے ٹھہر جاتا تھا۔ واہ رے انسان (اس نے سوچا) تو نے نہ صرف مست ہاتھیوں کو انکش مار مار کے قابو میں کیا ہوا ہے بلکہ ان فولاد کی ہاتھی جیسی مشینوں کو بھی۔

دوسری طرف سے انجینئر کاؤل ایک دوسرے ٹریکٹر پر سوار آتا دکھائی دیا۔ وہ اس ٹریکٹر کی جانچ کر رہا تھا۔ دونوں ٹریکٹر ایک دوسرے کے سامنے آ کر ٹھہر گئے تو گنگا نے بریک لگا کر ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ ''جے رام جی کی صاحب۔''

کاؤل اپنی مشین کو ایک سردار جی ٹریکٹر ڈرائیور کے سپرد کر کے اوپر سے کود پڑا۔

ریت اور گرد سے بچنے کے لیے ڈھاٹا باندھے جو ڈرائیور بیٹھا گنگا سنگھ کو ٹریکٹر چلانا سکھا رہا تھا اس سے کاؤل نے پوچھا۔

''کیوں رکھارام، گنگا سنگھ کام سیکھ رہا ہے نا؟''

''ہاں جی۔ بڑی جلدی جلدی کام سیکھ رہا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''وری گڈ۔'' کاؤل نے کہا اور جب اس نے دیکھا کہ گنگا کچھ نہیں سمجھا تو اس کا ترجمہ بھی کر دیا۔ ''بہت اچھا۔'' پھر اس کی کمر تھپتھپائی اور کہا: ''شاباش گنگا، شاباش، ٹریکٹر چلانا ہی نہیں ٹریکٹر کی صفائی اور مرمت بھی سیکھو۔ مگر اس کے لیے تمھیں یہ دھوتی اتارنی پڑے گی۔''

''جی'' گنگا سنگھ نے پریشان ہو کر کہا۔ ''کیا ٹریکٹر چلانے کے لیے ننگا ہونا ضروری ہے؟''

''ارے نہیں بھئی۔'' کاؤل نے اسے یقین دلایا۔ ''مطلب یہ ہے کہ اوورآل پہن کر جیسا یہ رکھارام پہنے بیٹھا ہے۔''

اور اب گنگا سنگھ ورکشاپ میں ــ جو بیمار ٹریکٹروں، موٹروں اور دوسری مشینوں کا اسپتال تھا ــ اپنے ٹریکٹر کا ایک ایک کل پرزہ تیل سے صاف کر رہا تھا اور دھوتی کے بجائے اوورآل پہنے ہوئے تھا۔

تھوڑی دور پر کھڑا ہوا انجینئر کاؤل اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور انجینئر نے جاتے جاتے رک کر اس سے شکایت کی ''ارے بھئی کاؤل کیا بات ہے کئی دن سے تاش کھیلنے کلب نہیں آئے؟''

''کیا کروں؟'' کاؤل نے کہا۔ ''فرصت ہی نہیں ملی۔''

''سنا ہے سارا وقت آپ اس گنگا سنگھ کو کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے ہیں۔ آخر کیا بات ہے اس آدمی میں؟''

اور اب کاؤل نے سوچ کر اور گنگا سنگھ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا: ''یہ ایک آدمی نہیں ہے، رنگا سوامی۔ مجھے اس گنگا سنگھ میں لاکھوں کروڑوں آدمی کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھو کتنے پیار سے ٹریکٹر صاف کر رہا ہے جیسے کوئی راجپوت اپنی تلوار تیز کر رہا ہو۔''

واقعی گنگا سنگھ بڑی احتیاط سے اور بڑے پیار سے ٹریکٹر کی صفائی کر رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا اپنے گاؤں، اپنی بیوی، اپنے باپ اور اپنی بہن کے بارے میں کہ نہ جانے اس وقت ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔

اس کی بہن سونکی گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ خالی گھڑا سر پر اٹھائے کنویں پر پانی بھرنے جا رہی تھی۔

اتنے میں ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سے بالو اڑتی ہوئی دکھائی دی اور پھر دو اونٹ دوڑتے ہوئے۔ ایک اونٹ پر پانی کی دو پکھالیں بندھی ہوئی تھیں اور دوسرے پر سوار تھا منگل سنگھ۔

گاؤں کے پاس آ کر جب اس نے دیکھا کہ عورتیں پانی بھرنے جا رہی ہیں تو اس نے آواز لگائی۔ ''ارے۔ دس میل کنویں پے کیوں جاؤ ہو۔ میں تمھارے واسطے پانی یہیں لے آیا ہوں۔''

عورتیں گھڑے لیے منگل سنگھ کی طرف دوڑ پڑیں۔ صرف سونکی کھڑی رہی۔

یہ دیکھ کر منگل سنگھ وہیں سے چلّایا۔ ''سونکی! چل آ تو بھی پانی لے لے نا؟''

مگر سونکی نے نفرت بھری نگاہوں سے منگل سنگھ کی طرف دیکھا اور اکیلی پانی لینے چل دی۔ اسے دس میل چلنا منظور تھا مگر منگل سنگھ کا لایا ہوا پانی لینا منظور نہیں تھا۔

عورتیں پکھالیں والے اونٹ کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ''منگل سنگھ یہ پانی کہاں سے لایا ہے؟''

'' کا کی۔'' منگل نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی نئی سنہری پٹے کی گھڑی کو دیکھتے —اور دکھاتے— ہوئے کہا۔ ''جیب میں پیسہ ہونا چاہیے۔ پانی بہت ہے دنیا میں۔''

دنیا میں پانی بہت ہو یا نہ ہو مگر نہر کے مزدوروں کی بستی میں ایک ڈرم میں پانی بھرا رہتا تھا جس میں سے پانی نکال نکال کر گنگا سنگھ نہا رہا تھا۔

پاس ہی بڈّھا اور شرابی بھیکو کھاٹ پر بیٹھا دارو خانہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر بار جب پانی گنگا کے بدن پر پڑتا تھا تو بھیکو کو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے جاڑے میں اسے اٹھا کر برفیلے پانی کے تالاب میں پھینک دیا ہے۔

گنگا نے بڈّھے کو چڑانے کے لیے کہا۔ ''بھیکو کاکا تم بھی نہا لو۔''

بھیکو نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف منھ بنایا۔

نہاتے نہاتے گنگا بولتا گیا۔ '' کاکا۔ جب میں گوری کو گونہ کر کے لایا تھا تو میرے باپو نے کہا۔ گنگا تو نہا لے —سر سے پاؤں تک نہا لے۔ تیرے میں بڑی باس آوے ہے —سو کاکا۔ اس دن میں سر سے پاؤں تک نہایا پہلے تو بڑی سردی لگی۔ مگر پھر بڑا مزا آیا......''

مگر بھیکو کو نہ پانی کے ذکر میں دل چسپی تھی۔ نہ نہانے دھونے میں وہ تو مڑمڑ کر داروخانہ کھلنے کا ہی انتظار کرتا رہا۔

نہا دھو کر گنگا کپڑے پہن کر کھاٹ پر لیٹ کر ہندی کی پہلی کتاب پڑھنا شروع ہی کر رہا تھا کہ بھیکو کی آواز آئی۔ ''ارے گنگا پوجا پاٹ کرے ہے کیا؟'' اور ساتھ ہی بھیکو اندر آ گیا۔

''ہاں بھیکو کا کا۔ پوجا پاٹ ہی سمجھو سرسوتی کی پوجا کر رہا ہوں۔'' گنگا نے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔'' کاوَل صاحب کہوے ہیں کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ تمھاری گھر والی کتابیں پڑھے ہے اور تم ایک چٹھی بھی نہ لکھ سکے ہو۔''

بھیکو زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا— ''ماں قسم تو ضرور بڑا آدمی بنے گا ایک دن۔''

جب گنگا نے کہا کہ کیوں مذاق اڑاتے ہو تو بھیکو نے کہا: ''نہیں سچ کہوں ہوں۔ تو بڑا بڈھی وان ہے۔ بڑا محنتی ہے۔ بڑا دیالو ہے۔ گریبوں (غریبوں) کی مدد کرے ہے۔''

اب گنگا کو تھوڑا سا شبہ ہوا کہ کیوں اس کی اتنی تعریف ہو رہی ہے۔

''غریبوں کی مدد؟'' گنگا نے پوچھا۔

''ہاں'' بھیکو نے کہا۔'' تجھے آج پگار ملی ہے نا۔''

''ہاں ملی تو ہے۔'' گنگا نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''اب اس میں سے دو روپے اپنے بڈھے کاکا کو نہیں دے گا؟''

گنگا کو اب تک تو بھیکو کی نیت پر شبہ ہی تھا۔ اب تو بات صاف ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ ''بڈھا پورے دو روپے مانگ رہا ہے! دن بھر میں کل تین روپے تو ملتے ہیں!'' اور اونچی آواز میں اس نے پوچھا: ''دو روپے کا کیا کرو گے؟''

''دوا دارو کروں گا، بیٹا۔''

بھولے گنگا نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا: ''تم کچھ بیمار ہو، کاکا؟''

''ارے بہت بیمار ہوں۔''

اب تو گنگا کو جیب سے دو روپے نکالنے ہی پڑے۔ ''تو یہ لو کاکا۔''

''جیتے رہو بیٹا۔'' اور پھر کھڑے ہو کر۔ ''اچھا تو میں چلا۔''

''کدھر جا رہے ہو' کا کا؟''

''دارو پینے۔ ارے سب روگوں کی ایک ہی تو دوا ہے!''

اور بھیکو خوشی خوشی لڑکھڑاتا ہوا دارو خانے کی طرف چلا گیا۔

اور گنگا بیٹھا بیٹھا سوچتا رہا۔ 'دو روپے تو یہ لے گیا۔ اب میں اپنی گوری کو کیا بھیج پاؤں گا؟''

اس وقت گوری اور سونگی اور گاؤں کی باقی سب عورتیں اور لڑکیاں سروں پر خالی گھڑے لیے ہوئے — ایک کے پیچھے ایک، لمبی قطار میں — ہاری ہوئی ایک فوج کی طرح — ریگستان میں آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔ آج بھی ان کے ہونٹوں پر ایک گیت تھا مگر اس گیت میں کوئی امنگ، کوئی آشا نہیں تھی صرف ایک تھکے ہوئے احساس کی تھکی ہوئی لے تھی۔ بڑی مایوسی تھی آج گوری اور باقی لڑکیوں کی آوازوں میں — اور ان کے گیت میں بھی:

ایک دن ایسا بھی تھا\
پانی تھا گاؤں میں\
لاتے تھے گگری بھر کے\
تاروں کی چھاؤں میں\
کہاں سے پانی لائیں\
کہاں پہ پیاس بجھائیں\
جل جل کے بیری دھوپ میں\
سنولایا رنگ دُہائی رے

آج ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی سے — اور ان کے لباس سے — سب رنگینی جاتی رہی ہے۔ ریگستان کی پیلی جلتی ہوئی دھوپ میں وہ کالی چادریں اوڑھے چلی جا رہی تھیں جو اتنی ہی میلی اور سیاہ تھیں جتنے کہ ان کے ریت پر چلتے ہوئے سائے۔

لمبے چوڑے، سوکھے ہوئے، پیاسے کھیت کے ایک چھوٹے سے کنارے پر باجرے کی

فصل ریگستانی ہوا میں لہلہا رہی تھی ۔ یہ فصل نہیں تھی ہری سنگھ کی ہمت اور محنت کا ایک جیتا جاگتا معجزہ تھا۔ ہری سنگھ بیٹھا ہوا اپنے کھیت کی ان چند کونپلوں کو دیکھ رہا تھا کہ گوری کی پرچھائیں زمین پر دکھائی دی۔

''آ گئی بیٹا؟'' ہری نے بغیر نظر اٹھائے پوچھا۔

گوری ایک گاگر سنبھالے ہوئے تھی لیکن اس کی آواز میں شکست کا احساس تھا ''بابا!''

''شاباش۔ جیتی رہو'' ہری سنگھ نے اسے دعا دی اور پھر اپنے کھیت کی طرف اشارہ کر کے ''دیکھ، یہ پانی کا گھڑا یہاں ڈال میری باجرے کی فصل تو تیار ہو گئی ہے۔ یہاں اب میں گیہوں کی فصل تیار کر سکوں ہوں۔''

گوری نے گاگر کھیت میں الٹ دی لیکن اس میں صرف گیلی مٹی کا کیچڑ نکلا۔ سوکھتے ہوئے کنویں کی آخری تلچھٹ۔ ''بابا' آج تو کنویں میں سے یہی ملا ہے!''

ہری سنگھ نے کیچڑ میں ہاتھ ڈال کر مایوسی سے کہا۔ ''یہ کنواں بھی ساتھ چھوڑ گیا!''

اور گوری نے اس سے کہا: ''سونکی کی گاگر میں بھی یہی کیچڑ ہے بابا!''

سونکی گاگر سر پر اٹھائے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی کہ ایک جھونپڑے کی منڈیر پر بیٹھا ہوا منگل سنگھ دکھائی دیا۔ سونکی نے نفرت سے منھ موڑ لیا مگر بے حیا منگل سنگھ پر کب اثر ہونے والا تھا۔ بولا: ''کیوں سونکی پانی آ گیا؟''

سونکی ٹھنک کر رک گئی۔ مگر بغیر اس کی طرف دیکھے ہی جواب دیا ''اتنے کوس چل کر بھی کیچڑ نکلا ہے کنویں میں سے۔''

منگل اب کھڑا ہو گیا۔ بڑے طنز بھرے لہجے میں بولا ''ارے میرا مطلب اس پانی سے نہیں اس نہر سے ہے جو تمھارا بھائی لینے گیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا دو مہینے میں لمبی چوڑی نہر کو اونٹنی کی طرح یوں نکیل پکڑ کر لا رہا ہوگا۔''

سونکی نے اب پلٹ کر منگل سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔

''تو پھر سن لے منگل سنگھ، میرا بھیا ایک دن نہر لے کر ضرور آئے گا۔''

منگل سنگھ کا طنز اور گہرا ہوتا گیا ''ارے اس وقت تک بھارتیہ گاؤں میں رہے گا ہی کون۔

لگتا ہے تمھارے کٹم کو ہی پتہ نہیں کہ گرام پنچایت نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں کو خالی کر دیا جائے۔''
اور پھر آنکھ مار کر منگل نے کہا۔''کیا خیال ہے سونکی یہاں سے ساتھ ہی نکل چلیں گے؟''

سونکی غصے میں بھری ہوئی بولی: ''جن کو یہ گاؤں چھوڑ کر جانا ہے وہ اپنا منہ کالا کریں!''

اور غصہ نکالا اس نے اپنی گاگر پر جسے اس نے سر سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ پکی مٹی ہی تو تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ مگر اس میں چمکتا ہوا پانی نہیں نکلا۔ صرف کالی کالی کیچڑ نکلی۔ اس کی نمی بھی سوکھے ہوئے ریت میں جذب ہوتی گئی صرف مٹی رہ گئی۔ جو بھارتیہ گاؤں کی آخری رات کی طرح اتنی سیاہ اور اندھیری تھی کہ اس میں امید کا ایک ننھا سا ستارہ بھی نہیں ٹمٹا رہا تھا۔

O

اپنے وطن میں آج......

رات اندھیری تھی۔

دور کتے بھیانک انداز میں بھونک رہے تھے کیونکہ پیاس کے مارے وہ بھی پاگل ہوئے جارہے تھے۔

ہری سنگھ کے جھونپڑے میں کھاٹ پر دونوں بڈھے جو بچپن کے دوست تھے آمنے سامنے بیٹھے تھے لیکن ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے ہوئے۔ زمین پر یوسف اور سکینہ، سونی اور گوری کے پاس بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر تک جھونپڑے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف چولھے کے پاس لگا ہوا دیا بھڑکتا رہا اور ان سب لوگوں کے کالے کالے سائے بھوتوں کی طرح دیوار پر ناچتے رہے۔

ٹھنڈی سانس بھر کر رحمٰن چاچا نے کہا: ''بول ہری تو کیا کہوے ہے؟ ہمارے ساتھ ہی تم لوگ بھی نکلو گے نا؟ ہمارے اونٹ تمھارا سامان بھی اٹھا لیں گے۔''

''نہیں رحمٰن بھائی۔'' ہری نے جواب دیا مگر اپنے دوست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا۔ ''میں یہ گاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ یہ گاؤں تو ہماری ماں ہے رحمٰن بھائی۔''

رحمٰن نے اپنے دوست کی طرف دیکھا پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔ ''ہری۔ یہ گاؤں تمھاری ماں ہے تو ہماری بھی ماں باپ یہی ہے۔ لیکن یہ گیاں اور اونٹنیاں یہ ہماری اولاد ہیں جیسے یوسف اور سکینہ۔ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ مگر میں

اپنی اولاد کو ایک ایک کر مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ سو مجھے تو جانا ہی ہوگا۔''

ہری نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔''تو بھی ٹھیک کہوے ہے بھائی۔ پر میں تو اپنی کھیتی نہیں چھوڑ سکوں ہوں۔''

''تیری کھیتی؟''رحمٰن نے ہری کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ کچھ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہو۔ ''تیری کھیتی ہے کہاں؟''

''ہاں بھائی۔ میری کھیتی ہے۔ دو ہاتھ لمبی۔ دو ہاتھ چوڑی۔ مگر میری کھیتی تو ہے نا؟ بڑی مشکل سے سینچائی کی ہے، بھائی میں نہیں رہوں گا تو سب سوکھ جاوے گا۔''اور پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا:''ہاں تم بہو اور سونکی کو لے جاؤ۔''

رحمٰن نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔''سکینہ ان دونوں کو تیار کر بیٹی۔''سکینہ نے پہلے گوری سے کہا:''بھابی تم ہمارے ساتھ چلو۔ اب تو تم ماں بننے والی ہو، تمھیں دیکھ بھال کی ضرورت ہوگی۔''

مگر گوری ایک راجپوتنی تھی جس نے اپنے پتی کو ایک قسم دی تھی۔

''نہیں سکینہ۔ سونکی کے بھیا مجھے یہاں چھوڑ گئے تھے میں یہیں ان کا انتظار کروں گی۔''

اب سکینہ نے اپنی بچپن کی سہیلی سونکی کی طرف دیکھا''اور تو کیا کہوے ہے سونکی؟''

سونکی بچی تھی لیکن وہ بھی اسی مٹی سے بنی تھی جس سے اس کا باپ اور بھائی—اور بھاوج۔ اس نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔''بابا اور بھائی جہاں رہیں گے میں بھی وہیں رہوں گی۔''

''اچھا ہری جیسے تیری مرضی۔''رحمٰن چاچا نے اٹھتے ہوئے کہا۔''یا اللہ، یوسف سکینہ چلو بیٹا۔''

سو رحمٰن چاچا اور یوسف اور سکینہ وہاں سے چلے گئے اور جھونپڑے میں دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ ہری، گوری، سونکی ہر ایک اپنے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں دروازے پر زنجیر کھٹ کھٹانے کی آواز نے ایک دم سب کو چونکا دیا۔

سونکی اٹھ ہی رہی تھی کہ ہری سنگھ نے اشارے سے اسے روک دیا۔''تو ٹھہر۔''اور پھر اپنی جھکی ہوئی کمر کو سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑا۔''یہ کون آیا آدھی رات کو؟''

دروازے کے باہر ایک آدمی کالا کمبل اوڑھے ہاتھ میں لالٹین لیے کھڑا ہوا تھا جس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ ہری نے کہا۔''کون ہے رے؟''

لالٹین والا ہاتھ اوپر اٹھا اور روشنی کا دائرہ ایک جانے بوجھے چہرے پر پڑا۔ 'منگل سنگھ۔'

ہری کو یہ چہرہ پسند نہیں تھا۔ منگل سنگھ کی آوارگی اور بدمعاشی کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ 'کیا چاہیے؟'

منگل سنگھ نے زبان سے صرف ایک لفظ نکالا۔ 'سونکی۔'

''خبردار۔'' ہری کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی ہو۔ ''میری بیٹی کا نام نہ لے بدمعاش۔''

''غصہ کیوں کرو ہو کاکا۔'' منگل سنگھ آج چاپلوسی سے بات کر رہا تھا۔ ''میں تو عزت والی بات کرنے آیا ہوں۔ تم تو اس گاؤں میں اپنا جیون مرن کرنے والے ہو۔ سونکی کی جوانی کا کیوں ستیاناس کرتے ہو؟ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا دو......۔

ابھی وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ غیر نہیں ہے۔ اس کے بیٹے گنگا سنگھ کے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ اس کا دوست ہے۔ سونکی کو بڑے عیش آرام سے رکھے گا...... مگر یہ سب باتیں ان کہی رہ گئیں۔ ہری سنگھ نے جیسے ہی اس کی بات سنی غصے میں چلا کر کہا۔ 'ہرگز نہیں' اور اپنی بوڑھی ٹانگوں سے ایک ایسی زوردار لات ماری کہ منگل سنگھ دور جا گرا اور اس کی لالٹین کی لو بھڑک اٹھی— منگل سنگھ کے غضب ناک غصے اور دفعتاً بھڑک اٹھے انتقام کے جذبے کی طرح— اور لالٹین کی چمنی دھوئیں سے کالی ہو گئی— جیسے نفرت کے دھوئیں نے منگل سنگھ کے من میں ہمیشہ کے لیے اندھیرا کر دیا ہو۔

گاؤں والے گاؤں سے رخصت ہو رہے تھے۔

آدمی۔

عورتیں، مرد، بچے۔

جانور۔

اونٹ، گائیں، بیل، بکریاں، بھیڑیں۔

گھر کا سامان اونٹوں پر لادا جا رہا تھا۔ کھاٹیں، بستر، کمبل، چرخے، پنکھے، گھڑے، گاگریں مگر یہ سب خالی تھے۔ کسی میں ایک بوند پانی نہیں تھا۔

نہ صرف گھڑوں میں پانی نہیں تھا، آس پاس کے کنویں بھی سوکھ گئے تھے۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔

آج لوگ اپنے گھروں کو، اپنے وطن کو، اپنے گاؤں کو، اپنی دھرتی کو چھوڑنے پر مجبور تھے

کیونکہ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اور زندہ رہنے کے لیے پانی ضروری ہے۔

اور ان کے اَن کہے جذبات، ان کے احساسات فضا میں ایک گیت بن کر گونج رہے تھے جسے کوئی سن نہیں سکتا تھا صرف محسوس کر سکتا تھا۔

اپنے وطن میں آج دو بوند پانی نہیں
تو یہاں زندگانی نہیں
توڑ کے سارے رشتے ناتے
جا تو رہے ہیں دھول اڑاتے
پانی جس دن آئے گا۔ لوٹ آئیں گے، ناچتے گاتے......

اور رحمٰن چاچا، یوسف اور سکینہ رشتے ناتے توڑ کر جا رہے تھے۔ ہری سنگھ، گوری اور سونکی سے گلے مل کے رخصت ہو رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر زبان پر ایک لفظ نہیں تھا۔ جب دل جذبات سے بھرے ہوں تو لفظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔

اور اب قافلے کا آخری اونٹ گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ سارے گاؤں میں صرف تین انسان رہ گئے تھے۔ ہری سنگھ، گوری اور سونکی۔ جن کے جذبات اور محسوسات کا اظہار اس ان سنے گیت میں ہو رہا تھا، جو اب بھی گاؤں کی دھول اڑاتی ہوئی ہوا میں گونج رہا تھا۔

پیاری دھرتی چھوڑیں کیسے
قسمیں اپنی توڑیں کیسے
مرنا ہوگا مر جائیں گے۔ جیتے جی منھ موڑیں کیسے......

پھر یہ تین انسان سنسان گاؤں میں اکیلے رہ گئے۔ بہت دیر تک جانے والے ساتھیوں، دوستوں، گاؤں والوں کے قدموں کی اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتے رہے، دیکھتے رہے...... یہاں تک کہ وہ دھول بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور سر جھکائے وہ آہستہ آہستہ اپنے جھونپڑے کی طرف چل دیے۔

اور اب گاؤں کا میدان سنسان پڑا تھا۔ اور سناٹے میں تیز ہوتی ہوئی ہوا کے جھکڑ ریت اور دھول کے بگولے اڑا رہے تھے اور اس سناٹے میں وہ ان سنا گیت اب بھی گونج رہا تھا۔

''اپنے وطن میں آج دو بوند پانی نہیں۔''

○

میری بیوی کے چار بچّے

گاؤں اجاڑ اور سنسان ہو چکا تھا۔

مگر سو میل دور جہاں نہر بن رہی تھی وہاں گہما گہمی تھی۔ بڑے زوروں سے کام ہو رہا تھا۔ مزدوروں کی ٹولیاں نہر کھود رہی تھیں۔ ریت گدھوں پر اور اونٹ گاڑیوں میں لاد لاد کر نہر کے اونچے کناروں پر جمائی جا رہی تھی۔ ٹریکٹر چل رہے تھے۔ بل ڈوزر ریت کو اپنے فولادی ہاتھوں سے ہٹاتے اور سمیٹتے چلے جا رہے تھے یا بھاری رولر گھسیٹ کر زمین کو ہموار کرتے جاتے تھے۔

گنگا سنگھ ایک بل ڈوزر کو اکیلا چلا رہا تھا۔ فولاد کا ہاتھی اب اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ سامنے سے لال جیپ آتی دیکھی تو بل ڈوزر روک کر سلام کیا۔ پھر اتر کر کاؤل صاحب کے پاس گیا۔ اس کے چہرے پر محنت کی دھول مٹی جمی ہوئی تھی۔

''کہو بھئی۔'' کاؤل نے جیپ میں بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔'' کیسا کام چل رہا ہے؟ گدھے کی چال سے؟''

''نہیں صاحب۔'' گنگا نے بڑے جوش سے جواب دیا'' فنافٹ ٹریکٹر کی چال سے چل رہا ہے۔''

''گنگا تمھارے لیے ایک بڑی اچھی خبر ہے۔ تھوڑے دنوں میں میرے گھر کے پاس ہی

تمھیں رہنے کا پکا کوارٹر مل جائے گا۔ جہاں دوسرے ٹریکٹر ڈرائیور اور میکانک رہتے ہیں۔''

''بڑی مہربانی ہے، صاحب'' گنگا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔''اور جی یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ اب میں ہندی لکھنا پڑھنا بھی سیکھوں ہوں۔''اور یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ ''دیکھیے یہ چٹھی لکھی ہے میں نے......''

''کس کے نام لکھ رہے ہو؟ اپنے باپ کو یا۔''

''نہیں صاحب'' گنگا سنگھ نے کسی قدر شرما کر ہچکچا کر کہا:''یہ تو اپنی گھر والی کو لکھی ہے۔''

''ہاں بھئی گھر والی کے ہوتے باپ بیچارے کو کون یاد کرتا ہے؟'' دونوں اس مذاق پر ہنس پڑے۔

پھر گنگا سنگھ کو ایک اور بات یاد آئی۔''صاحب مجھے تو چھٹی دیر میں ملے گی۔ کرپا کر کے اپنے چپراسی سے کہنا کہ یہ چٹھی لال ڈبّے میں ڈال دے۔''

یہ کہہ کر اس نے خط انجینئر کاؤل کے ہاتھ میں دے دیا۔

''میں خود ہی ڈال دوں گا'' کاؤل نے اسے یقین دلایا۔''ڈاک گھر میرے گھر کے راستے میں ہی ہے۔''

ڈاکٹ گھر کے باہر لال ڈبہ لگا ہوا تھا۔

کاؤل کی لال جیپ ڈبّے کے برابر آکر رکی۔ وہ گنگا سنگھ کی چٹھی ڈالنے ہی والا تھا کہ کچھ سوچ کر وہ مسکرایا پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا اور مسکراتے مسکراتے ہی اس نے قلم نکال کر خط کے پیچھے کچھ لکھ دیا۔ اس کو اس لمبو انجینئر لکھنے والی لڑکی کو ایک پیغام بھیجنا تھا۔ چند لفظ لکھنے کے بعد اس نے لفافہ لال ڈبّے میں ڈال دیا اور پھر گنگناتا ہوا اپنی لال جیپ کو دوڑاتا ہوا لے گیا۔

ایک سلیٹ کے دونوں طرف دو مختلف ٹریکٹروں کی چاک سے ڈرائنگ بنی ہوئی تھی۔

مزدوروں کی جھونپڑیوں کی بستی میں، جہاں گدھے اور اونٹ بھی آدمیوں کے برابر ہی بندھے رہتے تھے، کھاٹیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک کھاٹ پر گنگا سنگھ بیٹھا سلیٹ پر بنی ڈرائنگ کی

مدد سے دوسرے مزدوروں کو جن میں زیادہ تر گدھا چلانے والے تھے ٹریکٹروں کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اور وہ سب بڑی حیرت سے ان فولادی ہاتھیوں کے بارے میں سن رہے تھے۔

''دیکھا تم نے'' اس نے بڑے فخریہ لہجے میں سب سے کہا۔ جیسے کوئی بڑا فلسفہ بیان کیا ہو۔ ''گدھا گدھا ہووے ہے اور ٹریکٹر ٹریکٹر ہووے۔'' اور پھر اس نے اپنے بیان کی تصدیق کے لیے ایک اوورآل پہنے ٹریکٹر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ''کیوں کشن سنگھ جی؟''

کشن سنگھ ٹریکٹر ڈرائیور نے بڑے زور سے ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر گنگا نے سلیٹ پر بنی ڈرائنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''دس گدھوں کے برابر کام کرے ہے ایک ٹریکٹر۔''

اب ایک گدھے والے کو اپنی فکر ہوئی۔ کچھ سوچ کر وہ بولا: ''پر سارا کام مشینیں کرنے لگیں تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہمارے گدھوں کا کیا ہوگا؟''

بوڑھا بھیکو جو ایک دوسری کھاٹ پر نشے کی حالت میں بیٹھا تھا۔۔ اس نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا مگر بیچ میں بول پڑا۔ ''ارے گنگا یہ تو سوچ کہ جب تو کچے گھر چھوڑ چھاڑ کے پکے کوائٹر میں چلا جائے گا تو میرا کیا ہوگا؟''

گنگا کو وہ سب روپے یاد آئے جو اسے بھیکو کی دارو کے لیے دینے پڑے تھے۔ ''دیکھو بھیکو کاکا، اب میں کہیں بھی رہوں تمھیں دارو پینے کو اب ایک پیسہ نہیں دوں گا۔''

اس سے پہلے کہ بھیکو کچھ کہہ پاتا ڈاکیے کی آواز آئی۔ ''گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ۔'' اور اگلے لمحے ڈاکیہ خود تھیلا لٹکائے، چٹھیوں کی گڈی ہاتھ میں لیے وہاں آگیا۔ اب تو گنگا کے علاوہ اوروں کو بھی گھر کی یاد آئی۔ گنگا تو اپنی چٹھی لے کر ایک طرف اسے پڑھنے کے لیے کھسک گیا۔ باقی سب نے ڈاکیے کو گھیر لیا۔

''کیوں جی ہماری بھی کوئی چٹھی ہے۔ اودے سنگھ ولد مادھو سنگھ۔'' ڈاکیے نے اپنے پلندے کو الٹ پلٹ کر جواب دیا۔ ''کوئی چٹھی نہیں۔'' اودے سنگھ کا منھ اتر گیا۔ وہ بیچارہ کب سے گھر والی کی چٹھی کی آس لگائے بیٹھا تھا۔

''اور ہماری بھی کوئی چٹھی ہو تو دے دو۔''

''نام؟'' ڈاکیے نے سوال کیا۔

''ارے نام تو چٹھی کے اوپر ہی لکھا ہوگا!'' بھولے بھالے رُلدو گدھے والے نے کہا۔ اور جب سب ہنس پڑے تب بتایا: ''ویسے مجھے رُلدو۔ رُلدو سنگھ کہووے ہیں۔''

ڈاکیے نے تاش کے پتوں کی طرح چٹھیوں کو الٹ پلٹ کیا اور رُلدو کا خط اسے دے دیا۔

کشن سنگھ ٹریکٹر ڈرائیور نے بوڑھے بھیکو سے مذاق کیا جس کے نام کی چٹھی آج تک نہیں آئی تھی۔ ''بھیکو کاکا، تم بھی پوچھ لو۔ شاید تمھاری بھی کوئی چٹھی آئی ہو۔''

بھیکو نے ہنس کر کہا۔ مگر اس ہنسی میں مایوسی کا زہر گھلا ہوا تھا۔ ''ارے نہ چٹھی آوے گی نہ چٹھی جاوے گی۔ اب تو ایک دن بھیکو خود ہی بیرنگ چلا جاوے گا۔''

اتنے میں گنگا سنگھ اپنی چٹھی پڑھ کر اتنے زور سے چیخا کہ سب چونک گئے۔ مگر یہ خوشی کی چیخ تھی۔ گنگا پاگلوں کی طرح اچھل کود رہا تھا بلکہ کھائوں پر سے پھلانگتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔

ایک مزدور نے حیران ہو کر پوچھا: ''ارے گنگا کیا ہوا؟''

گنگا بھاگتے بھاگتے رک کر پلٹا اور بولا: ''ارے ہوا نہیں۔ ہووے گا۔ لیکن میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ پہلے کاؤل صاحب کو بتاؤں گا۔''

وہ پھر خوشی کے مارے بھاگنے ہی والا تھا کہ بھیکو کاکا نے بڑی عاجزی سے کہا: ''ارے گنگا! ایک اٹھنّی تو دیتا جا۔''

''کاکا!'' گنگا نے خوشی سے جواب دیا۔ ''اٹھنّی کیوں۔ روپیہ لو روپیہ۔''

اور پھر اس نے ایک خوشی کا نعرہ لگایا اور وہاں سے بھاگتا ہوا چلا گیا اور بھیکو کاکا اس روپے کے نوٹ کو دیکھتا ہوا رہ گیا جو گنگا اس کے ہاتھ میں تھما گیا تھا اور سوچتا رہا کہ وہ کون سی خوشی ہے جس نے گنگا کو اتنا پاگل بنا دیا ہے۔

چھتر گڈھ پر دھندلکا چھا گیا تھا۔ سڑکوں پر بجلی کی روشنیاں جلتی جا رہی تھیں۔

موہن کاؤل اپنے چھوٹے سے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا کہ ''کاؤل صاحب۔ کاؤل صاحب۔'' چلاتا ہو گنگا سنگھ سڑک پر دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ خوشی سے ہانپتا کانپتا جب وہ برآمدے میں داخل ہوا تو کاؤل نے پوچھا۔ ''کیا ہوا بھئی۔ کیا ہوا؟''

''بڑی بڑھیا خبر ہے، صاحب،، گنگا نے کہا۔'' آپ سنیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔''

''بیٹھو۔بیٹھو۔'' اور جب گنگا بیٹھ گیا۔'' کیوں کیا ہوا؟''

''میری گھر والی کے چار بچے ہونے والے ہیں، صاحب۔'' کاؤل نے مبارکباد دی اور کہا۔'' مگر اکٹھے چار بچے! جانتے ہو ملک کی آبادی خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔اور پھر تمھیں کیسے معلوم ہو گیا کہ چار بچے ہوں گے؟''

''صاحب حساب لگا لیجیے'' گنگا نے اطمینان سے جواب دیا۔ میرا بیٹا، میری گھر والی کا بیٹا، میرے باپ کا پوتا اور میری بہن سونکی کا بھتیجہ —یا شاید بھتیجی بھی ہو سکے ہے۔''

اس بھولے پن کے مذاق پر کاؤل کو ہنس پڑنا چاہیے تھا، مگر اس کے دماغ پر کوئی پریشانی سوار تھی۔'' وہ تو ٹھیک ہے، گنگا۔ مجھے تم سے کچھ اور ہی بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے صاحب؟'' گنگا نے پوچھا۔

''تم گھر چلے جاؤ، گنگا'' کاؤل نے کہا۔'' میں تمھاری چھٹی کا انتظام کر دوں گا۔''

''میں کیسے جا سکوں ہوں، صاحب۔ ابھی دو مہینے تو میری نوکری کو ہوئے ہیں۔'' گنگا کو اب جا کر محسوس ہوا کہ انجینئر کچھ پریشان ہے۔'' کوئی بری خبر ہے کیا؟''

کاؤل نے سامنے رکھے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔'' اس میں لکھا ہے کہ سوکھے کے کارن جن گیارہ گاؤں کے لوگ گھربار چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ان میں تمہارا بھارتیہ بھی ہے۔فی الحال سب لوگ جیسلمیر چلے گئے ہیں اور ممکن ہے ایک دو ہفتے میں اور کہیں دور چلے جائیں۔'' پھر بڑی نرمی سے اس نے سوال کیا۔'' تم گھر جاؤ گے نا گنگا؟'' گنگا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ نہ جانے اس کے باپ پر کیا بیتی ہوگی؟ اس کی گوری پر؟ اس کی سونکی پر؟ بوڑھے باپ نے کیسے گاؤں چھوڑنے کی تیاری کی ہوگی؟ وہ تو آج تک اپنے سوکھے کھیت سے جدا نہیں ہوا تھا! ایسے موقع پر ہی تو جوان بیٹا اپنے باپ اور اپنے خاندان کے کام آ سکتا ہے۔

کچھ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے افسر سے زیادہ اپنے آپ سے بولا:'' میں جاؤں گا۔ میں ضرور جاؤں گا۔''

لیکن عین اسی وقت اس کے من کی آنکھوں کے سامنے —جیسا سنیما کے پردے پر ہوتا

ہے — ایک سین گھوم گیا۔ اس کی پتنی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی جھونپڑے کی دیوار تک گئی اور وہاں لٹکی ہوئی تلوار کو ہاتھ میں لے کر اسے میان سے باہر نکال لیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے تلوار کی دھار پر اپنا انگوٹھا کاٹا اور اس کے خون سے گنگا کے ماتھے پر تلک لگا دیا — اور اب ایک آواز گنگا کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''یاد رکھنا یہ میرا خون ہے اور تمھاری عزّت!'' یہ وہ قسم تھی جو راجپوتیاں اپنے ویروں کو رن میں بھیجتے ہوئے دیتی تھیں۔ پھر راج پوت یا تو دشمن کو ہرا کر گھر لوٹتے تھے یا پھر ان کی لاش ہی گھر آتی تھی۔ اس کا دشمن تو یہ ریگستان تھا۔ اس کی لڑائی تو اس دن ختم ہوگی جب یہ نہر بھارتیہ گاؤں پہنچ جائے گی۔

اس نے کہا۔ نہیں صاحب۔ میں نہیں جا سکتا۔ گوری نے مجھے وچن دیا تھا کہ گھر آنا تو نہر ساتھ لے کر ہی آنا۔ میں کائروں کی طرح لوٹ گیا تو وہ اپنا سر کاٹ لے گی، صاحب۔ آپ اسے نہیں جانتے وہ سچ مچ کی راجپوتنی ہے!''

اور اب کاؤل نے گنگا کی آنکھوں میں ایک نئی چمک دیکھی۔ عمل اور عزم کی چمک۔ سو اس نے کہا۔ ''شاباش۔ گنگا۔ مگر اب ہمیں کام تیزی سے کرنا ہوگا۔ اگر یہ نہر اس رفتار سے بنتی رہی تو جب تک تم اپنے چار بیٹوں کو دیکھ پاؤ گے تب تک وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔''

اور اب ایسا لگتا تھا جیسے کاؤل اور گنگا کا یہ جلد کام ختم کرنے کا فیصلہ اور حوصلہ نہر پر سب کام کرنے والوں، ان کی مشینوں بلکہ ان کے اونٹوں اور گدھوں تک میں سرایت کر گیا۔

مزدور پھاوڑے لے کر اس طرح زمین کھود رہے تھے جیسے دشمن پر تلوار چلا رہے ہوں۔

گدھے کمر پر ریت کی بوریاں لے کر اس طرح چل رہے تھے جیسے فوجی خچر پہاڑی علاقوں میں سامان جنگ لے کر چلتے ہیں۔

اونٹ گاڑیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے اونٹ سواروں کا جیسلمیر ہزاروں کا دستہ ہو جو ریگستانی علاقے میں ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کرتا ہے۔

ٹریکٹر اور بل ڈوزر ریت کے ٹیلوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے اور آگے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی ٹینک فولادی ہاتھیوں کی طرح دشمنوں کی فوجوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

انجینئر کاؤل کبھی رات رات بھر اپنے دفتر میں لائٹ جلا کر تیزی سے کام کرنے کے نقشے

اور پلان تیار کرتا، کبھی اس کی لال جیپ ریت کا غبار اڑاتی ہوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی۔ جیسے کوئی جرنیل اپنی فوجوں کی تیاری اور مستعدی کا معائنہ کر رہا ہو۔

اور اس تمام وقت نہر آگے بڑھ رہی تھی۔ دشمن پیچھے ہٹتا جا رہا تھا!

مگر نہر سے دور گاؤں میں وقت ٹھہرا ہوا تھا۔

''توپی۔توپی'' کھمبوں کے سامنے سے ریگستان میں سے ہوتا ہوا ایک ڈاک کے ہرکارے کا اونٹ آہستہ آہستہ اپنی گھنٹیاں چھنکاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

'ہری سنگھ!' ہو! ارے ہری سنگھ! ہو! داڑھی والا ڈاک کا ہرکارہ سنسان اور اجاڑ گاؤں میں آواز دیتا ہوا پھر رہا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سارے گاؤں میں کوئی آدمی ہے بھی یا نہیں۔

آخر کار ایک دروازے کے کھلنے کی آواز آئی اور ہرکارے نے ادھر مڑ کر دیکھا تو لڑکی اس کی طرف آ رہی تھی۔

سونکی نے قریب آ کر اسے بتایا۔ ''بابا تو بیمار پڑے ہیں۔ بڑا تیز بخار ہے۔''

''یہ گوری دیوی کون ہیں؟'' ہرکارے نے تھیلے سے ایک چٹھی نکالتے ہوئے کہا۔

''وہ میری بھابی ہیں۔ میں سونکی ہوں۔''

''اچھا۔ یہ گوری دیوی کے نام چٹھی ہے۔ ایک مہینے سے ڈاک گھر میں پڑی تھی۔ آج فوجی چوکی پر ڈاک دینے جا رہا تھا۔ سوچا ادھر سے نکل جاؤں۔ دیکھوں گاؤں میں کوئی ہے یا نہیں۔''

سونکی نے لفافہ سنبھالتے ہوئے کہا: ''یہ چٹھی میرے بھیا کی ہوگی۔ وہ نہر بنانے گیا ہوا ہے۔''

''اچھا اچھا!'' ڈاکیے نے ادھر ادھر خالی اور اجاڑ گاؤں کو دیکھتے ہوئے کہا: ''ادھر پانی وانی ہے؟''

''پانی ہے کہاں؟'' سونکی نے جواب دیا۔ ''دوسرے تیسرے دن میں یا بھابی دس بارہ کوس چل کر ایک دو گھڑے لاوے ہیں۔''

''پانی نہیں؟'' ڈاکیے نے حیرت سے پوچھا: ''پھر بھی تم نے گاؤں نہیں چھوڑا؟''

سونکی نے ٹھنڈے سانس بھر کے بتایا: ''بابا کہوے ہیں کہ میرا مرنا جینا تو یہیں ہے۔ اور بھابی کہے ہے کہ ضرورت پڑی تو عمر بھر اپنے پتی کا انتظار یہیں کروں گی۔''

''جیسی تمھاری اچھا ہو۔'' ڈاکیے نے اپنا ڈاک کا تھیلا سنبھالتے ہوئے کہا۔'' مجھے تو اب جانا ہے۔شہر سے کچھ منگوانا ہو تو مجھ سے کہہ دینا میں لا دیا کروں گا۔''

سونکی نے جھجکتے ہوئے کہا:''تو کرپا کر کے ایک ڈاکٹر کو بھیج دیں۔شاید بابا اچھے ہو جاویں۔''

''ڈاکٹر!'' ڈاکیے نے یہ لفظ ایسے دہرایا جیسے لڑکی نے دنیا کی بہت بڑی اور نایاب چیز کی فرمائش کر دی ہو۔''کون ڈاکٹر اتنی دور آئے گا؟ ___ پھر بھی کوشش کروں گا۔اللہ مالک ہے۔خدا حافظ۔''

اور اپنے اونٹ کی مہار پکڑ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل گیا۔

جھونپڑے کے اندر ہری سنگھ پلنگ پر بیمار پڑا تھا۔دھوپ میں پکی ہوئی رنگت کے باوجود بخار اور کمزوری کی پیلاہٹ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔بہو پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔

سونکی واپس آئی تو گوری نے دھیرے سے پوچھا۔کون تھا؟

''ڈاکیہ تھا۔تمھارے نام چٹھی لایا ہے۔''

اور جب گوری بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس گئی اور اپنا خط لے کر کھولا تو سونکی نے پوچھا۔

''کس کی چٹھی ہے!بھیا کی؟''

گوری نے سر کے اشارے سے ہاں کی اور خط کا مضمون پڑھ کر مسکرانے لگی۔یہ زندگی میں پہلا خط لکھا تھا گنگا سنگھ نے۔

ہری سنگھ آدھا بے ہوش تھا۔پھر بھی وہ بڑبڑایا۔''اس بھوتوں کی بستی میں کون آیا؟''

''ڈاکیہ آیا تھا، بابا'' سونکی نے گوری کی جگہ لیتے ہوئے کہا۔''دیکھ سونکی۔لمبو انجینئر نے تمھارے لیے کچھ لکھا ہے!''

''سچ!'' اور سونکی نے اپنی بھابی سے خط جھپٹ لیا۔

گوری مسکرا کر وہاں سے چل پڑی۔مگر جب ہری سنگھ کو بے ہوش پڑا دیکھا تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اور اب سونکی نے وہ پیغام پڑھا جو موہن کاؤل نے اس کے نام لکھا تھا۔

''سونکی۔تمھارا بھائی گنگا سنگھ کہتا ہے کہ تم بھی یہاں نہر بنانے آنا چاہتی ہو(اور سونکی نے سوچا ہاں جی چاہتی تو تھی ___ مگر سب چیزیں جو ہم چاہتے ہیں وہ تھوڑا ہو جاتی ہیں) میں تمھیں

بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں تین ہزار عورتیں اور لڑکیاں اس نہر کو بنانے میں کام کر رہی ہیں اور ان سب کو بھارتیہ گاؤں کے سونکی کے آنے کا انتظار ہے۔'' اور پھر اس نے سب سے نیچے نام لکھا ہوا پڑھا۔ ''لمبو انجینئر۔''

اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر پھیل گئی۔

اس عرصے میں ہری سنگھ آدھی بے ہوشی میں پھر بڑبڑانے لگا۔ ''کون تھا؟ کون آیا تھا؟''

گوری نے اسے بتایا: 'ڈاکیہ ایک چٹھی دے گیا ہے، تمھارے بیٹے کی۔'

بیٹے کا نام سن کر ہری سنگھ کا احساس جاگ اٹھا۔ ''کیا کہوے ہے میرا بیٹا؟''

کہوے ہے کہ تمھارے آشیرواد سے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اسے آشا ہے کہ گاؤں والے اسے بھول نہیں گئے ہوں گے۔'

ہری سنگھ نے دماغ پر زور ڈال کر پوچھا: ''اس کو نہیں معلوم کہ اس کا گاؤں تو اب بھوتوں کی نگری ہے۔؟''

''بابا'' گوری نے کہا۔ ''یہ چٹھی تو ایک مہینے پہلے کی ہے۔''

اب ہری سنگھ کے دماغ میں کچھ اور ہی سوال گونج رہا تھا۔ 'پانی کے بارے میں کیا کہے ہے؟ ہمارے گاؤں میں نہر کب آوے گی؟''

''تمھارا بیٹا کہوے ہے کہ وہاں سب بڑی محنت سے دن رات کام کر رہے ہیں۔ بہت جلد نہر یہاں تک پہنچ جاوے گی۔''

کمزوری کے باوجود ہری سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کی اور گوری اور سونکی دونوں کو مل کر اسے لٹانا پڑا۔ اب ہری سنگھ کے احساس میں آشا جاگ پڑی تھی۔ ''نہر آ رہی ہے تو پھر جلدی کرو۔ ہل بیل تیار کرو۔ مجھے اٹھا کر میرے کھیت میں پہنچا دو۔ میری کھیتی کو پانی چاہیے۔'' اور پھر گوری کی طرف دیکھ کر۔ ''بہو کھیت میں دینے کے لیے پانی کا گھڑا لائی ہے نا؟''

گوری نے شرمندگی سے اقرار کیا۔ ''بابا۔ پانی کی تو چار بوندیں بس پینے کو ہیں۔ دو دن سے کوئی پانی لینے گیا ہی نہیں۔''

''پانی نہیں؟'' اب ہری سنگھ کا دماغ بہک رہا تھا۔ ''پانی نہیں ہے پھر میری کھیتی کا کیا ہوگا۔

پانی کے بغیر تو فصل جی نہیں سکے۔ سانس نہیں لے سکے۔ تم دو چھوکریاں ایک گھڑا پانی کا نہیں لا سکو ہو۔ نکمیاں! کنواں اتنی دور تو نہیں۔ گاؤں کے باہر ہی تو ہے.....'' پھر بے ہوشی کی ایک لہر آئی۔

گوری نے سونکی کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ''تو بابا کے پاس بیٹھ میں پانی لینے جاتی ہوں۔''

''نہیں بھابی۔'' سونکی نے اصرار کیا اور گوری کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے۔ ''اس حالت میں تم نہیں جا سکتیں۔ میں پانی لینے جاتی ہوں۔''

اور سونکی نے اٹھ کر اینڈوی اٹھائی، کونے میں رکھی ہوئی گاگر لی اور دروازے کے باہر نکل گئی۔

تیز تیز چلتی ہوئی چند قدم ہی گئی تھی کہ نہ جانے کیوں اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ اب اس کو کتنے برس بعد اپنا گھر، اپنا گاؤں دیکھنا نصیب ہوگا۔ اور اس عرصے میں اس کی دنیا ہی بدل جائے گی۔

○

پانی اور خون

پریمی اور اس کی پریمکا کی مورتیاں پتھر کے کھمبوں پر اپنی پتھریلی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں ''تو پی!'' ''تو پی!'' کہ ان کی پتھریلی آنکھوں نے دیکھا کہ سونکی خالی گھڑا سر پر دھرے بھارتیہ گاؤں کی طرف سے آ رہی ہے۔

جس کنویں میں پانی ملنے کی آشا تھی وہ بھارتیہ گاؤں سے کوسوں دور تھا، راستے میں ریگستان تھا۔ ریت کے ٹیلے تھے، ریت کی پہاڑیاں تھیں۔ سونکی اسی ریگستان میں پیدا ہوئی تھی۔ یہاں پلی بڑھی تھی، لیکن آج نہ جانے کیوں پانی لینے جاتے ہوئے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آج ریت میں اس کے پیر دھنس دھنس جاتے تھے۔ جیسے ریگستان اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ ایک جگہ تو وہ ریت کی پہاڑی کی ڈھلان پر اتر رہی تھی کہ ریت نے اس کی جوتیاں ہی پکڑ لیں، لیکن سونکی کو اپنے بیمار باپ کے لیے پانی لانا تھا۔ اس نے پرواہ نہ کی اور دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر ننگے پیر دھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اجڑے ہوئے گاؤں کے کھنڈروں پر بھی اب ریگستان کی عملداری تھی۔ ریت کے سمندر میں ہر چیز ڈوبی ہوئی تھی۔ گھر، دیواریں، دروازے۔ ہر جگہ کمر کمر تک ریت چڑھا ہوا تھا۔ اور تیز ہوا کے جھکو لاکھوں کروڑوں ذرّوں کو اڑا کر لاتے تھے اور ریت کی تہہ کے اوپر تہہ چڑھا جاتے تھے۔ ایک دن یہ گاؤں بھی اس بڑھتے ہوئے ریگستانی سیلاب میں ڈوب جائے گا۔ جیسے اور سیکڑوں

گاؤں ڈوب گئے ہیں اور پھر اس کا نام نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ سوکھی ان بھوت محل جیسے اجاڑ کھنڈروں سے ہوتی ہوئی جارہی تھی۔ اور وہاں اس کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک سوکھے ہوئے پیڑ کے ٹھلٹھ کے جو ریت میں سے سر نکال کر اپنی اندھی آنکھوں سے اسے تاک رہا تھا۔

جھونپڑے میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ہری سنگھ کی آنکھوں میں ابھی جان باقی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ گوری نے کان لگا کر سنا تو وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''پانی۔ پانی۔''

گوری ایک کٹوری میں ذرا سا پانی ڈال کر اس کے ہونٹوں کے قریب لائی۔ اور کہا۔ ''بابا۔ یہ لو پانی۔'' مگر ہری سنگھ بھوک اور پیاس کی ضرورت سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ کسی اور ہی پانی کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ اور دھیمی، مری ہوئی سی آواز میں بڑبڑائے جارہا تھا۔

''وہ آیا—وہ آیا—پانی!—صاف ستھرا پانی—موتیوں جیسا سفید پانی—میرا بیٹا ریگستان میں گنگا جمنا لے آیا۔'' گوری نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''ہاں بابا۔ وہ ضرور لاوے گا۔ وہ ضرور لاوے گا بابا۔''

مگر ہری سنگھ اب کچھ سننے کے قابل نہیں تھا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں وہ اپنی آشاؤں کا آخری سپنا دیکھ رہا تھا۔ ''اب چاروں طرف ہریالی دکھے گی، گیہوں باجرے کی فصل ناچے گی— وہ آئی—وہ آئی—نہر آئی—نہر آئی—پانی آیا—پانی—پانی—پا—اور پھر اس کی آواز سناٹے میں اس طرح کھوگئی جیسے ریت میں دو بوند پانی جذب ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔

مگر اس کی مردہ آنکھوں میں اب بھی آشا کی چمک تھی۔

اور باہر سنسان گاؤں میں آندھی کے جھونکے چل رہے تھے اور ایک بگولہ گھومتا گھومتا آیا اور جیسے ہری سنگھ کی آشا کو سمیٹ کر اوپر کی طرف لے گیا پھر سناٹا ہی سناٹا تھا اور گوری کی چیخ—

''بابا! بابا!''

ریگستان میں سورج ڈوبنے والا ہی تھا۔

ہر طرف آسمان اندھیرا ہو چکا تھا، لیکن مغرب کا آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں سے اب تک جگمگا رہا تھا اگرچہ یہ جگمگاہٹ دو چار پل کی ہی مہمان تھی۔

ریگستان کے پھیلے ہوئے سمندر میں کنویں کی پتھریلی گول دیوار ایک ٹاپو کی طرح تھی، اس کی منڈیر پر ایک سوکھے پیڑ کی بھاری ڈال کاٹ کر لگا دی گئی تھی اور اس کے دو بازوؤں کے بیچ میں ایک چرخی لگی ہوئی تھی۔ ڈول اور رسی منڈیر پر رکھی تھی۔ اور ایک لڑکی گھڑا منڈیر پر رکھ کر اور پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر کنویں میں جھانک رہی تھی۔ غروب آفتاب کے روشن پس منظر میں کنواں، منڈیر، چرخی، ڈول اور لڑکی سب کچھ کالی پرچھائیوں کا کھیل معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ لڑکی سونکی تھی اور وہ اب ایک پتھر کنویں میں پھینک رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کیونکہ کنواں گہرا تھا، پتھر کے پانی میں گرنے کی آواز آئی اور اب سونکی نے ڈول اٹھا کر کنویں میں ڈال دیا اور اس کے بوجھ سے چرخی پر سے رسّی پھسلتی ہوئی نیچے کی طرف جانے لگی۔

دور نیچے سے ڈول کے پانی میں ڈوبنے کی دھیمی سی آواز آئی اور سونکی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ اپنے بابا کے لیے ایک گھڑا پانی کا لے جاسکے گی۔ اس نے جلدی جلدی چرخی پر سے رسّی کو کھینچنا شروع کر دیا۔

عین اس وقت بے خبر سونکی کے پیچھے سے ایک پرچھائیں آہستہ آہستہ مغرب کی جانب سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ ایک اونٹ سوار تھا جس کی صورت تو نظر نہیں آتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں ایک بندوق اور منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو کن انکھیوں سے سونکی نے اس پرچھائیں کو دیکھا۔ اونٹ سوار کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر وہ سہم سی گئی ''کوئی ڈاکو معلوم ہوتا ہے'' اس نے سوچا ڈول اب اوپر آچکا تھا۔ اسے سنبھالتے ہوئے سونکی نے پوچھا۔ ''پانی پیو گے؟''

جواب میں اونٹ سوار نے ڈھاٹا کھول دیا اور کہا: ''میں تو کب سے تمہارا پیاسا ہوں۔'' یہ منگل سنگھ تھا۔

سونکی کے ہاتھ سے پانی سے بھرا ڈول گر گیا اور یہ بوجھ سے رسّی کو بھی چرخی پر گھماتا گھماتا نیچے کنویں کی تہہ میں لے گیا۔ پانی میں ڈول کے گرنے کا دھماکہ ہوا، منگل سنگھ بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے اونٹ سے نیچے کودا اور سونکی گھبرا کر کنویں کی اونچی منڈیر سے نیچے ریت پر۔

سونکی کا ریت پر گرنا تھا کہ منگل سنگھ بندوق کنویں کی منڈیر پر رکھ کر اس پر جھپٹا۔ وہ سنبھل

کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ منگل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ سونکی نے اس کے ہاتھ میں کاٹ کھایا۔ بلبلا کر منگل سنگھ نے سونکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''منگل سنگھ'' سونکی پیچھے ہٹتی ہوئی چلائی۔ ''کیا پاگل ہو گیا ہے؟ اپنے گاؤں کی عزت کا تو خیال کر۔''

''گاؤں اجڑ گیا۔ برباد ہو گیا'' منگل نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ''اب کہاں رہی گاؤں کی عزت!''

اور یہ کہتے ہی وہ ایک بار پھر سونکی پر جھپٹا۔ وہ نیچے گری تو ساتھ میں یہ بھی گرا۔ ریت پر دونوں نے پٹخنیاں کھائیں۔ مگر اب سونکی کو بھاگنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ اس کے پیچھے کنویں کی پتھریلی دیوار تھی۔ منگل سنگھ اپنا منحوس منہ سونکی کے منہ کے قریب لایا تو سونکی نے اس کو روکنے کے لیے اپنے ناخن اس کے گالوں میں گاڑ دیے مگر منگل سنگھ پر تو جنون سوار تھا۔ اس کے گالوں پر جہاں سونکی کے ناخن گڑے تھے وہاں سے خون نکل آیا مگر اس نے اپنی گرفت نہ چھوڑی اور سونکی نے اس کے خوفناک منہ سے نکلتی ہوئی گرم گرم ہولناک سانسوں کو اپنے چہرے کے قریب — اور قریب — آتے ہوئے محسوس کیا۔ یہاں تک کہ اسے ایسا لگا کہ وہ ان شعلوں میں جھلس جائے گی اور پھر اس نے اپنے سانس کو گھٹتے ہوئے محسوس کیا — یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی اس کے احساس پر اندھیرا چھا گیا۔

اور اس تمام عرصے منگل سنگھ کا اونٹ ریت پر بیٹھا اطمینان سے جگالی کرتا رہا۔

اس کھیت میں جہاں اس نے اپنی باجرے کی فصل کی چند کونپلیں اگائی تھیں ہری سنگھ کی چتا جل رہی تھی اور لال پیلے شعلے آسمان پر انگلیاں اٹھا اٹھا کر اس انسان کی طرف سے فریاد کر رہے تھے جو دو بوند پانی کو ترستا ہوا مر گیا تھا۔

اور چتا کے سرہانے کی طرف گوری ایک بانس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی جس سے وہ جب چتا جل جائے گی تو جلی ہوئی لاش کی کھوپڑی توڑ کر اس کی آتما کو آزاد کرے گی۔ یہ کام آج تک کسی عورت نے نہیں کیا تھا۔ لیکن آج سے گوری اس دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی — جب تک اس کا پتی نہر لے کر گاؤں نہ لوٹ آئے گا یا جب تک سونکی پانی لے کر واپس نہ آئے گی، لیکن گوری سوچ

رہی تھی بابا تو چلے گئے۔اب پانی کا گھڑا آیا بھی تو اس کا کیا کریں گے؟۔۔اور کون جانتا ہے سونکی اب کبھی آئے گی بھی یا نہیں۔گوری کا پریشان من کہتا تھا کہ اب وہ نہ آئے گی۔

اور کوسوں دور سونکی زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔اس کی چولی پھٹ چکی تھی۔اس کے لہنگے میں سے ننگی ٹانگ باہر نکلی ہوئی تھی۔اس کے بازوؤں پر منگل سنگھ کے ظالم ناخونوں نے کھرونچ ڈال دیے تھے۔اس کی مانگ میں سہاگ کے سیندور کے بجائے ریگستان کی ریت پڑی ہوئی تھی۔

منگل سنگھ اپنی برسوں کی حیوانی پیاس بجھا کر اپنے اونٹ کو تھپ تھپا رہا تھا۔اس کی بندوق کنویں کی منڈیر پر رکھی ہوئی تھی۔مگر اب نہیں رکھی ہوئی تھی۔ایک ہاتھ نے اسے اٹھالیا تھا۔

آہٹ ہوئی تو منگل سنگھ نے چونک کر پیچھے مڑکر دیکھا۔

سونکی بندوق لیے ہوئے کھڑی ہوئی تھی۔

سونکی بندوق لیے ہوئے......

سونکی اور بندوق۔۔

سونکی کی آنکھوں میں آنسو کا پانی بھی تھا اور ایک خوفناک غصے کا لہو بھی۔اور منگل سنگھ کو معلوم تھا کہ دونالی بندوق کی ایک آنکھ میں ایک گولی باقی ہے۔

منگل سنگھ نے درگا کی مورتی مندر میں دیکھی تھی کچھ ایسا ہی غضبناک جذبہ تھا سونکی کی آنکھوں میں۔بندوق کی آنکھ میں سے منگل سنگھ کو موت جھانکتی ہوئی دکھائی دی۔

کچھ ڈرکر، کچھ کھسیا کر منگل بولا: ''سونکی جو ہونا تھا ہوگیا۔چلو میرے ساتھ ہم لوگ بیاہ کر لیں گے تو عیش کرے گی میرے ساتھ۔'' سونکی نے دانت کچکچا کر کہا۔'چلو'

اور بندوق کی آنکھ سے ایک غضبناک شعلہ نکلا ایک تڑاخہ ہوا اور منگل سنگھ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ ریت پر گر گیا۔

مگر سونکی بندوق ہاتھ میں لیے اسی طرح کھڑی دیکھتی رہی۔یہاں تک کہ منگل سنگھ کو جہاں گولی لگی تھی اس زخم سے خون رس رس کر ریگستان کی ریت میں جذب ہوتا رہا۔

○

ہنومان جی کا ہاتھ

ریگستان کی سوکھی جھاڑیوں کے پیچھے سے ایک اور سورج اُبھرا۔ صبح کی ٹھنڈی تیز ہوا ریت کو اڑا کر اِدھر اُدھر کر رہی تھی جہاں ریت کے ٹیلے تھے وہاں گھاٹیاں بن گئی تھیں جہاں گھاٹیاں تھیں وہاں اب ریت کی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ وقت، زمانے، زندگی کے جلد جلد بدلتے ہوئے نشیب و فراز کی سب سے روشن مثال ریگستان ہی میں دکھائی دیتی ہے۔

ریت کے میدان میں ایک سڑک بنتی آ رہی تھی اور اس وقت اس سڑک پر ایک جیپ لال لال بیر بہوٹی کی طرح رینگتی دکھائی دیتی تھی لیکن جیپ رینگ نہیں رہی تھی دوڑ رہی تھی۔ انجینئر موہن کاؤل اپنی جیپ کو ہمیشہ تیز رفتار سے ہی چلاتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں وقت کم ہے اور جن کو کچھ کام کرنا ہے ان کو بہت کام کرنا ہے۔

پکی سڑک آگے جا کے ختم ہو گئی تھی۔ یہاں سڑک کچی تھی اور یہ کچی سڑک بھی ابھی بنائی جا رہی تھی۔ سوکھے کے مارے ہزاروں مرد عورت ان سڑکوں پر کام کر رہے تھے لیکن یہ راجستھان کے زندہ دل مَرد تھے اور یہ راجستھان کی رنگین لباس پہنے ہوئی عورتیں تھیں جو دور سے اَکال کی ماری شرنارتھی نہیں لال گھاگرے پہنے، لال چنری اوڑھے دلہن لگتی تھی۔ اس جگہ آ کر کاؤل کی جیپ رک گئی اور سڑک کے کنارے مٹی ڈالنے والی عورتوں میں ایک لڑکی اس کو

دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی، یہ لڑکی سونکی تھی اور وہ دیکھ رہی تھی کہ جیپ میں سے وہی نوجوان اتر رہا ہے جو سنیما کے پردے پر ان کے گاؤں میں دکھائی دیا تھا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ’لمبو انجینئر۔‘ اور اس نے گھونگھٹ نکال لیا۔

جب وہ واپس دوسری کام کرنے والی عورتوں میں پہنچی تو ایک مزدورنی نے پوچھا: ’’یہ بابو تیرے گاؤں کا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ سونکی نے کہا ’’مگر اس کی پرچھائیں وہاں ضرور آئی تھی۔‘‘

اتنے میں مقدم بھاگتا ہوا لال جیپ کے پاس پہنچا ایک انجینئر کا آنا تو ٹھیکیدار اور اس کے آدمیوں کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

’’حکم سرکار۔‘‘ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

’’ارے بھائی ذرا سا پانی پلا سکتے ہو؟‘‘

مقدم نے مزدور عورتوں کی طرف منہ اٹھا کر آواز دی۔ ’’اری او صاحب کے لیے پانی لا نا۔‘‘ اور پھر اپنی مستعدی دکھانے کیلیے مقدم جدھر مزدور کام کر رہے تھے ادھر چلا گیا اور مزدوروں کو جلدی جلدی کام کرنے کے لیے کہنے لگا۔

ایک بوڑھی عورت نے سونکی کو کہا: ’’تو جا صاحب کو پانی پلا دے۔‘‘

’’نہیں‘‘ سونکی نے سر ہلا کر انکار کیا۔ ’’تو جا نا۔‘‘

’’نہیں ری‘‘ بوڑھی نے اصرار کیا۔ ’’تو نے تو اس بابو کو دیکھا ہوا ہے تو ہی جا۔‘‘

سونکی پانی کی چھوٹی سی گاگر لے کر کاؤل کے پاس پہنچی تو اس نے کہا ’بابو جی ہمارے پاس کوئی پینے کا کٹورہ یا گلاس نہیں ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ کاؤل نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا! میں اوک سے پی لوں گا۔‘‘

سونکی پانی ڈالتی رہی۔

کاؤل پانی پیتا رہا۔

ایک بار کاؤل نے پانی پیتے پیتے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اس لڑکی کو بھی اپنی طرف دیکھتے پایا۔ مگر سونکی نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

''دھنیہ واد۔'' کاؤل نے پانی پی کر کہا ''اب میری سرسوتی کو بھی پلا دو۔''

سونگی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کوئی سرسوتی نہیں دکھائی دی۔

کاؤل نے ہنس کر اپنی جیپ کی طرف اشارہ کیا ''یہ رہی سرسوتی۔ وہ ندی جو ریگستان میں کھو گئی تھی۔ میری لال پری بھی میری طرح پیاسی ہے!

پھر اس نے ریڈیٹر کھولا اور اس میں گاگر کا پانی انڈیل دیا۔

''دھنیہ واد۔''

''نمستے۔''

اور سونگی پلّو سے گھونگھٹ کیے ہوئے وہاں سے چل دی۔

مگر کاؤل نے اس کا خوب صورت چہرہ دیکھ لیا تھا اور اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے پہلے بھی کبھی یہ چہرہ دیکھا تھا— شاید خواب میں۔''

اب کاؤل ٹہلتا ہوا جہاں مزدور کام کر رہے تھے وہاں گیا۔

''سنو بھائی لوگو۔'' اس نے پوچھا ''یہ سڑک کب تک بن کر تیار ہو جائے گی؟''

''ایک دو مہینہ اور لگے گا صاحب۔''

''اور پھر کیا کرو گے؟'' کاؤل نے پوچھا۔

ایک نوجوان نے کہا۔ ''کریں گے کیا؟ گاؤں واپس چلے جائیں گے۔''

''گاؤں میں تو اَکال ہے۔ سوکھا ہے۔'' کاؤل نے کہا۔ ''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

ایک سفید داڑھی والے بوڑھے نے کہا: ''بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ برسات کر دے۔''

''اور سات برس سے برسات نہیں ہوئی ہے'' کاؤل نے مزدوروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آخر کب تک اوپر کی طرف دیکھتے رہو گے؟''

''ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں، بابو جی؟''

''چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو۔'' کاؤل نے زور دے کر کہا۔ ''سب سے پہلے تو نہر بنانے کا کام کر سکتے ہو۔ یہ نہر بن گئی تو پھر کسی کو پانی کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس ریگستان میں گیہوں اُگے گا؟''

سب کی حیرت کا اظہار ایک آدمی کی زبان سے ہوا۔ ''سچ بابو جی۔''

''بالکل سچ ہے۔'' کاؤل نے چلتے چلتے کہا۔ ''سوچ لو اور پھر چھتر گڑھ کام کرنے آجاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جیپ کی طرف چلا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر بولا: ''ہمیں ہزاروں کام کرنے والوں کی ضرورت ہے مردوں کی بھی عورتوں کی بھی۔''

لال جیپ شور مچاتی، دھول اڑاتی چلی گئی۔ مگر سونکی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی اور ان باتوں کے بارے میں سوچتی رہی جو انجینئر نے آج کہی تھیں۔

ایک فولادی راکھشش نے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ اٹھایا ہوا تھا۔ یہ ایک بہت بھاری کرین تھی جس کے سائے میں انجینئر کاؤل اور ٹریکٹر ڈرائیور گنگا سنگھ کھڑے ایسے لگتے تھے جیسے چھوٹی چھوٹی گڑیاں۔

''او صاحب'' گنگا سنگھ جو اوپر اٹھے ہوئے فولادی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا بولا ''اس مشین کو کیا کہوے ہیں؟''

''اس کو ڈریگ لائینز DRAG LINES کہتے ہیں مگر میں نے اس کا نام رکھا ہے۔ ہنومان جی کا ہاتھ!''

''لیکن صاحب'' گنگا نے سوال کیا۔ ''ہنومان جی نے تو پہاڑ اٹھا لیا تھا اپنی ہتھیلی پر کیا یہ مشین پہاڑ اٹھا سکے ہے؟''

''ایسا ہی سمجھو۔'' کاؤل نے ریت کے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''ریت کا وہ پہاڑ اسی مشین نے بنایا ہے۔''

اور پھر وہ گنگا سنگھ کو فولادی مشین کے اندر کیبین میں لے گیا اور اسے بتایا کہ کیسے صرف ایک آدمی مشین کے کل پرزے دبا کر ٹنوں ریت اور مٹی اور پتھر کو اٹھا کر سینکڑوں گز دور لے جا کر گرا سکتی ہے اور گنگا سنگھ کو حیرت ہوئی کہ انسان نے کیسی کیسی مشینیں ایجاد کی ہیں اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ایک دن ہنومان جی کا یہ ہاتھ اس کے قبضے میں ہو اور اس کی مدد سے ریت میں نہر کھودنے کا جتنا کام آدمیوں اور اونٹوں اور گدھوں سے ہفتوں یا مہینوں میں ہوتا ہے۔ اتنا کام وہ ایک دن میں کر سکے۔ اس کو ایسا لگا کہ اگر نہر کو جلدی جلدی بھارتیہ گاؤں کی

طرف بڑھنا ہے تو ایسی مشینوں کی مدد سے ہی یہ کام پورا ہوسکتا ہے۔

اور اب جہاں نہر تقریباً تیار ہو چکی تھی اور صرف اینٹیں لگا کر اسے پکا کیا جا رہا تھا، وہاں عورتوں کی ایک لمبی قطار سیمنٹ کی تغاریاں سر پر اٹھائے چلی جا رہی تھی کہ دوسری طرف سے انجینئر کاؤل کی لال جیپ آتی دکھائی دی۔ جہاں جہاں سے اس کی موٹر گذرتی تھی ٹھیکیدار اور اوورسیئر اور مزدور اور مزدورنیاں اسے سلام کرتے جاتے تھے۔ عورتوں کی قطار میں کاؤل کو ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی وہ سونکی تھی۔ لیکن کاؤل اس کا نام نہ جانتا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر جیپ ٹھہر گئی تو سونکی نے مڑ کر دیکھا۔

'اے لڑکی' کاؤل نے مزدورنی سے کہا۔ ''تم تو وہی ہو نا جس نے ایک دن پیاسے کو سڑک پر پانی پلایا تھا؟''

سونکی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس نے دیکھا کہ ساتھ والیاں سب آگے چلی گئی ہیں کام کرنے والے مزدور اسے دور سے دیکھ رہے تھے اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف سہمی ہوئی نگاہوں سے لمبو انجینئر کو دیکھتی رہی۔

''تم یہاں کام کے لیے کب آئیں؟'' کاؤل نے سوال کیا۔ ''مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔''

اب سونکی کو جواب دینا پڑا۔ ''تم ہی نے تو سب کو بلایا تھا، بابو جی'' کاؤل ہنس کر بولا۔ ''ارے میں نے تو سینکڑوں، ہزاروں کو بلایا تھا۔ مگر آج تک دو ہی آئے ہیں۔ ایک گنگا سنگھ اور ایک تم!۔ تمھارا نام کیا ہے؟ تم کون سے گاؤں سے آئی ہو؟''

ایک پل میں سونکی نے سوچا۔ کیا میں لمبو انجینئر کو بتا دوں کہ میں سونکی ہوں، گنگا سنگھ کی بہن ہوں؟...... بھیا کو پتہ چل جائے گا پھر نہ جانے کیا ہوگا، کیا منہ لے کر اس کے سامنے جاسکوں گی؟ نہیں نہیں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

اور اس نے دھیرے سے صرف اتنا کہا۔ ''بابو جی۔ تم افسر ہو مزدورنیوں کے ساتھ باتیں کرنا تمھارے واسطے اچھا نہیں ہے۔''

کاؤل لاجواب ہو گیا۔ جو کچھ سونکی نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ افسر افسر ہوتا ہے۔ مزدور مزدور۔ اور مزدورنیوں سے صرف وہ افسر بات کرتے ہیں جن کو ان مزدورنیوں میں خاص دلچسپی

ہوتی ہے۔ اس کا لڑکی سے بات چیت کرنا، دوستی کرنا خطرناک ہو سکتا ہے — نہ صرف اس کے لیے بلکہ اس لڑکی کے لیے بھی۔ کتنی سمجھدار ہے یہ انجانی غریب لڑکی! یہ سوچ کر کاؤل نے کچھ کہے بغیر جیپ دوڑا دی اور سونکی دیر تک کھڑی جیپ کو دھول کے بادل میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔

لمبو انجینئر کی زبانی گنگا سنگھ کا نام سن کر سونکی کے من میں بھائی سے ملنے — یا کم سے کم اس کو دور سے دیکھنے — کی خواہش نے پھر زور پکڑا۔ اور شام کو وہ اس کے گھر کا راستہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئی۔ لمبی بارک میں الگ الگ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ گنگا سنگھ نے چاک سے دروازے پر اپنا نام لکھا ہوا تھا۔ گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ ساکن بھارتیہ گاؤں۔ اندر بجلی کی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس میں وہ گنگا سنگھ کو دیکھ سکتی تھی جو کھاٹ پر بیٹھا ہوا اپنی بیوی کو خط لکھ رہا تھا اور نوسیکھوں کی طرح ساتھ ساتھ ہجے کر کے پڑھتا جا رہا تھا۔ جب سونکی نے کھڑکی کو کان لگا کر سنا تو یہ سن کر کہ وہ اسی کے بارے میں لکھ رہا تھا سونکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —

''...... بابا پیاسے ہی پرلوک چلے گئے۔ تم نے لکھا ہے سونکی ان کے لیے پانی بھرنے گئی تھی۔ نہ جانے کہاں کھو گئی۔ میں تو اُڑ کر تمھارے پاس آ جاتا مگر کیا کروں تمھارے ہی دیے ہوئے وچن سے بندھا ہوا ہوں......''

کتنا پیار تھا اس کے بھائی کے دل میں اپنی بیوی کے لیے، سونکی نے سوچا۔ اور پھر وہ یہ سن کر بے اختیار مسکرا دی —

''مگر اب تو تو اکیلی نہ رہے گی۔ تیرے بھیتر ہمارے پیارے کی جیتی جاگتی نشانی کلبل کرتی ہوگی۔ لڑکا ہو تو اس کا نام جمنا سنگھ رکھنا اور اگر لڑکی ہو تو جمنا دیوی۔

تیری یاد میں تیرا گنگا''

اس کا بھائی اس کے کتنے پاس تھا کہ وہ اس کی آواز سن سکتی تھی! چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ لیکن قسمت نے — یا منگل سنگھ ڈاکو نے — اُسے ایسی جگہ پہنچا دیا تھا جہاں سے وہ اپنے بھائی سے ہمیشہ کے لیے دور — بہت دور — ہو گئی تھی اور صرف اس کو چھپ چھپ کر دیکھ سکتی تھی!

سونکی کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ سسکیاں نہ

بھرنے لگے اور آواز سن کر گنگا کو اس کی موجودگی کا علم ہو جائے وہ کھڑکی سے دبے پاؤں کھسک آئی اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی رات کے اندھیرے میں کھوگئی۔

'تو، پی!' 'تو، پی!' کے کھمبوں کے پاس سے گزرتا ہوا، کھچڑی داڑھی والا بڑھا، مسلمان ڈاکیہ اپنی اونٹنی پر سوار جب بھارتیہ گاؤں پہنچا تو عین اسی وقت ایک چور (جو اَکال اور سوکھے کے زمانے کی پیداوار تھا) گاؤں کے خالی جھونپڑوں میں بچا کھچا جو سامان رہ گیا تھا وہ چرا رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ سارا گاؤں ویران ہے۔ اس لیے اونٹ سوار ڈاکیے کو ادھر آتے دیکھ کر اس کو تعجب ہوا اور وہ ایک دیوار کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔

اس بار ڈاکیے کو مکان تلاش کرنا نہیں پڑا اور وہ سیدھا گوری کے جھونپڑی کے سامنے پہنچا اور آواز لگائی۔ ''او گنگا سنگھ کی گھروالی۔ اری او گنگا سنگھ کی گھروالی۔''

دروازہ کھلا اور گوری باہر نکلی۔ اس کا پیٹ گواہی دے رہا تھا کہ کئی مہینے کا بچہ اس کی کوکھ میں پل رہا ہے۔

''نمستے چاچا۔'' اس نے کہا۔

''جیتی رہو بیٹی۔ یہ لو تمھاری چٹھی!''

گوری نے بڑی بے صبری سے چٹھی لے لی اور پھر گھونگھٹ کے پیچھے سے پوچھا۔ ''چاچا۔ کوئی منی آرڈر تو نہیں آیا ان کے پاس سے؟''

''ابھی تو نہیں آیا۔ آ جائے گا'' ڈاکیے نے ایک تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں تمھارا راشن لے آیا ہوں۔''

''بڑی کرپا کی۔ ان کے پاس سے منی آرڈر آنے پر کاٹ لینا۔''

''کاٹ لوں گا۔ بابا کاٹ لوں گا'' ڈاکیے نے اُسے یقین دلایا۔ ''میں تمھیں خیرات تھوڑی ہی دے رہا ہوں۔'' اور پھر جانے کی تیاری کرتے ہوئے۔ ''اور چٹھی کا جواب لکھ کر رکھنا میں لوٹتے وقت لیتا جاؤں گا اور کوئی چیز منگانی ہو تو کہہ دینا میں شہر سے دس دن کے بعد ادھر آؤں گا۔''

اس نے یہ کہا اور اونٹنی کی گھنٹیاں چھنکاتا ہوا اپنے راستے ہولیا۔

اب گوری نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ کھولا اور اپنے شوہر کی پیار بھری چٹھی پڑھنی شروع

کی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

ایک عورت کو اکیلا پا کر چور کو نکلنے کی ہمت ہوئی۔ پاس آتے ہی بولا۔

''کہوا کیلی ہی رہو ہو؟''

اچانک ایک مرد کی آواز سن کر گوری کے ہاتھ سے چٹھی کا کاغذ گر گیا۔اس نے گھونگھٹ کر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

چور اپنی کہتا رہا،''تمھیں یہاں اکیلے ڈر نہیں لگتا؟ کیا ودھوا ہو؟ ودھوا کا لفظ سن کر گوری کو ایسا لگا جیسے اسے کسی نے گالی بھی دی ہو اور کوسا بھی۔ چمک کر بولی:''تجھے میرے سہاگ کا جوڑا نہیں دکھائی دیوے ہے۔میرا گھر والا نہر بنانے گیا ہوا ہے۔''

چور کی اب تو اور بھی ہمت بڑھ گئی۔''اس میں تو برسوں لگیں گے۔اتنے دنوں جی نہیں گھبرائے گا۔کیوں؟—دن بھر کیا کرو ہو؟''

''میں دن بھر کیا کروں ہوں؟'' گوری نے اس کا سوال دہرایا اور پھر کہا:''ابھی بتاتی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ چور کچھ کہہ سکتا یا کچھ سوچ سکتا گوری تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی جھونپڑے کے اندر گئی اور ایک دو پل کے بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تلوار تھی—اگر چہ ابھی تک نیام میں تھی۔

چور کے پاس آ کر اس نے تلوار دکھائی اور کہا:''یہ ہے میرے پتی کی تلوار، میں دن بھر اسے پتھر پر رگڑ کر صاف اور تیز بناؤں ہوں۔''اور پھر اس نے سٹ سے تلوار کو نیام کے باہر کھینچا اور چور کی طرف بڑھی۔

چور کا تھیلا جس میں چوری کا سامان بھرا ہوا تھا ریت پر گر پڑا اور چور اتنے زور سے سرپٹ بھاگا کہ لگتا تھا کتنے ہی بھوت اس کے پیچھے لگے ہوئے ہوں۔

تلوا سے ڈر کر چور بھاگ گیا۔گوری بے باک اور بہادر راجپوتنی تھی پھر بھی ایک عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی— مگر اس کی آنکھوں میں بے بسی، مجبوری اور مایوسی کے آنسو تھے۔

O

ریگستان میں پھول؟

رات کے اندھیرے میں سونکی ایک بار پھر اپنے بھائی کے کوارٹر میں جھانک رہی تھی۔ مگر اس بار گنگا سنگھ اندر نہیں تھا۔ باہر کہیں سے آ رہا تھا کہ اس نے کسی پرچھائیں کو گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا شاید کوئی چور ہو مگر ہاتھ پکڑ کر باہر روشنی میں دیکھا تو خود اس کی بہن نکلی۔

'سونکی'۔ بے اختیار گنگا سنگھ کی زبان سے نکل گیا۔ ''تو کہاں کھو گئی تھی؟'' اور پھر اس کو اندر گھسیٹتے ہوئے۔ ''چل چل — اندر چل۔''

اندر آ کر دروازہ بند کر کے وہ اپنی بہن سے دُکھی صورت بنا کر کہنے لگا۔

''سونکی تجھے معلوم ہے بابا پرلوک چلے گئے۔''

سونکی خاموش رہی۔ گنگا سنگھ سمجھا باپ کے غم نے اسے گونگا کر دیا ہے۔ وہ کہتا گیا، ''سونو۔ گوری نے اپنی چٹھی میں لکھا ہے کہ تو کنویں پہ پانی بھرنے گئی تھی اور پھر واپس نہ آئی۔ اس نے تجھے کتنا ڈھونڈا۔ تو کیا راستہ بھول گئی تھی؟''

''بھیا میں کیا منہ لے کر گھر جاتی؟''

گنگا نے تعجب سے کہا: ''کیوں کیا ہوا؟''

سونکی نے دھیرے سے کہا: ''بھیا مجھے کسی کا خون کرنا پڑا۔''

''خون!'' گنگا نے کہا ''کس کا؟''

''منگل سنگھ کا'' سونکی اب ایک مردہ غیر جذباتی آواز میں بول رہی تھی ''اسی کی بندوق سے۔''

گنگا نے جلدی سے بہن کو اطمینان دلایا۔ ''اچھا کیا۔ اس بے ایمان نے تمھاری عزّت لوٹنے کی کوشش کی ہو گی۔'' وہ خون کا ارادہ معاف کرنے کو تیار تھا۔ اگر وہ منگل سنگھ جیسے بدمعاش کا خون ہو۔

مگر اس کے بعد میں جب سونکی نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میں اس پاپی کا خون کرتی اس نے میری عزّت کا خون کر دیا۔'' تو یہ سن کر وہ پاگل ہو گیا۔ ''نہیں سونو۔ یہ جھوٹ ہے۔ کہہ دے یہ جھوٹ ہے۔ بول یہ جھوٹ ہے!'' وہ کہے جا رہا تھا اور سونکی کے شانے پکڑ کر اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

سونکی نے آنکھیں نیچی کر کے کہا: ''یہ سچ ہے، بھیا!''

اب تو گنگا سنگھ آپے کے باہر ہو گیا۔ ''بے شرم کلٹا تو مر کیوں نہیں گئی۔ اپنا کالا منھ لے کر یہاں کیوں آئی؟''

یہ کہہ کر اس نے اتنے زور کا تھپّڑ اپنی بہن کے منھ پر مارا کہ وہ بیچاری چار پائی پر جا کر گری اور اس کے منھ سے صرف ایک شبد نکلا۔ ''بھیا!'' مگر گنگا سنگھ دروازہ دھڑ سے بند کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔

بوڑھا بھیکو کاکا شراب کے نشے میں دھت گدھوں کے اصطبل کے پاس کھڑا دارو خانے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا— جہاں سے تھوڑی دیر پہلے وہ نکالا جا چکا تھا کیونکہ اس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

اس نے جو گنگا سنگھ کو تیز تیز قدموں سے آتے اور دارو خانے کی طرف جاتے دیکھا تو فوراً بولا: ''ارے گنگا۔ تو یہاں کیا کر رہا ہے ان جھونپڑیوں میں؟ اب تو تو بڑا آدمی ہو گیا ہے نا؟ بڑے بڑے افسروں کے ساتھ پکّے مکانوں میں رہوے ہے!''

''بھیکو کاکا'' گنگا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں بھی ''اس سمے میں بہت دکھی ہوں۔''

بھیکو کو معلوم نہیں تھا کہ گنگا سنگھ کا دکھ کیا ہے۔ مگر اس نے جلدی سے جواب دیا ''دکھی ہے تو چل میرے ساتھ سب دکھوں کی ایک ہی تو دارو ہے۔ آ جا— ارے— ارے آ نا!''

وہ دارو خانے کی طرف گنگا کو بڑے اصرار سے گھسیٹ کر لے جا رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دونوں کے دکھ کی دوا اس دارو خانے ہی میں ہے! دارو خانے میں گہما گہمی تھی، ہنگامہ تھا، شور سا، رونق تھی۔ لوگ پی رہے تھے گا رہے تھے، بہک رہے تھے، ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

بھیکو کا کا نے دارو کا ایک گلاس گنگا سنگھ کی طرف بڑھایا۔ بدبو کے مارے گنگا نے ناک سکوڑی۔

بھیکو نے سمجھاتے ہوئے کہا: ''گنگا مجھے نہیں معلوم تجھے کیا دکھ ستا دے ہے۔ مگر اتنا جانوں ہوں کہ اس کا ایک گھونٹ سارے دکھ بھلا دے ہے۔'' اور پھر گلاس کو گنگا کے منہ سے لگا کر بڑھا کہنے لگا۔

''مہک تو دیکھ۔ کیا خوشبو آ رہی ہے!''

آخر کار گنگا نے گلاس ہاتھ میں لے ہی لیا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ اس کو ایسا لگا جیسے ننگی تلوار گلے میں اتار لی ہو۔ مگر اب یہ تلوار ایک جلتی ہوئی مشعل بن گئی تھی '' کا کا! اس سے تو سارے تن بدن میں جیسے آگ لگی ہو۔''

''ارے تو آگ بجھا لے۔'' بھیکو نے بوتل میں سے دارو گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''کیسے؟'' بھولے گنگا نے پوچھا۔ ''پانی بھی تو نہیں!''

''یہ آگ پانی سے نہیں بجھتی، گنگا'' بھیکو نے سمجھایا۔ ''دارو کی آگ دارو سے بجھتی ہے۔'' اور گلاس اٹھا کر حکم دیا۔ ''لے پی۔ لے پی۔ آگ بجھ جائے گی۔''

گنگا سنگھ نے دوسرا گلاس بھی حلق میں انڈیل لیا اور اسے تعجب ہوا کہ اس بار تلوار کی دھار حلق کے پار نہیں ہوئی اور نیچے جاتی ہوئی آگ کی گرمی اسے اچھی لگی۔ اس کے دھندلے ہوتے ہوئے دماغ نے سوچا۔ کیا اسی طرح لوگ شراب کے عادی ہو جاتے ہیں؟

اب ایک بے سُرا شرابی گا رہا تھا۔ ''پیو جی۔ اوڑھنی رنگوا دو۔ میں تو میلے جاؤں گی!''

دوسرے نے ''ش ش ش'' کر کے کہا: ''بند کر یہ گیت۔''

اس کا ساتھی اس سے الجھنے لگا۔ ''کیوں بھائی اس کا گانا تمہیں کیوں برا لگا ہے؟''

''اس لیے — اس لیے — کہ یہ گیت سن کے مجھے اپنے گاؤں کی یاد آوے ہے — اپنی گھر والی کی۔''

گنگا سنگھ کے دماغ میں ''گھر والی'' کا لفظ سن کر چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ''گھر والی!'' اس نے دہرایا اور سوچا۔ ''نہ جانے اپنی گوری کس حال میں ہوگی؟''

پھر وہ بھیکو کاکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا ''ایک بات بتاؤ۔''

''بولو''

''تمھیں کیا دکھ ہے جو تم پیتے ہو؟''

''ارے گنگا ایک دکھ ہو تو تمھیں بتاؤں۔'' بھیکو کاکا نے شراب کے گھونٹ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''دشمنوں نے بہت دکھ دیئے ہیں۔''

گنگا کو اب نشہ چڑھتا جا رہا تھا۔ ''دشمن؟'' گلاس پٹختے ہوئے بولا۔ ''کون دشمن؟'' جیسے ابھی وہ ان سے بدلہ لے گا۔

بھیکو کاکا نشے میں تھا مگر جو بات وہ کہہ رہا تھا وہ شرابی کی بڑ نہیں تھی۔ ''ایک دشمن یہ سوریہ دیوتا۔ جو سارے سنسار میں آگ لگا دے ہے۔ ایک دشمن بادل جو کبھی نہ آوے ہے — تیسری دشمن یہ بانجھ دھرتی جس کی کوکھ سے کبھی اناج نہ پیدا ہووے ہے۔ ان تینوں دشمنوں نے مل کر میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ میرا گھر میری گھر والی میرے بچے۔ میرا سکھ۔ میرا سنسار۔''

سب غور سے بھیکو کی درد بھری کہانی سن رہے تھے۔

ایک ٹریکٹر ڈرائیور نے بھیکو کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔ ''بھیکو کاکا ہماری نہر کو بن جانے دو، پھر دیکھو گے تمھارے سارے دشمنوں کو مار بھگائیں گے، اسی سوکھی ریتیلی دھرتی میں پھول کھلیں گے۔ اناج اُگے گا''

اب بھیکو کے بولنے کے انداز میں غصہ نہیں تھا، صرف تلخی تھی۔ آواز دھیمی کر کے اس نے جواب دیا، ''پھول کھلیں گے۔ کھلنے دو۔ اناج اُگے گا۔ اُگنے دو۔ مجھے کیا۔ میرا سکھی سنسار تو لوٹ کے نہیں آوے گا؟''

تھوڑی دیر دارو خانے میں خاموشی طاری تھی۔ پھر سب نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لیے۔ گنگا جس پر بھیکو کی باتیں سن کر سب سے زیادہ اثر ہوا تھا۔ اس نے بھی بن کہے ایک گھونٹ اور چڑھا لیا۔

عین اس وقت دارو خانے کے سامنے سے انجینئر کاوَل گزرا اور اس کی چھچھلتی ہوئی نظر وہاں بیٹھے ہوئے گنگا پر پڑی۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ ٹھٹھک کر ٹھہر گیا غور سے دیکھا۔ یہ تو سچ مچ گنگا سنگھ ہی شراب چڑھا رہا تھا۔ اب کاوَل سیدھا دارو خانے کے اندر چلا آیا۔

''گنگا تم نے بھی شراب پینا شروع کر دی۔ شرم نہیں آتی؟''

''شرم کس بات کی صاحب۔'' مگر یہ گنگا سنگھ نہیں بول رہا تھا، شراب بول رہی تھی۔'' آٹھ گھنٹے کام کیا ڈیوٹی خلاص۔ کیوں بھیکو کاکا؟'' اور اس نے بھیکو کی طرف دیکھ کر اپنے بیان کی داد طلب کی۔

''بالکل ٹھیک انجینئر صاحب۔'' بھیکو نے کاوَل کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنا گلاس سامنے کر دیا۔'' تم بھی تھوڑی سی پیونا۔ اچھا مال ہے۔''

''کیا بکواس کرتے ہو؟'' کاوَل نے ڈانٹ کر کہا اور پھر گنگا کی طرف مخاطب ہو کر۔ ''چل گنگا۔ اٹھو۔ چلو میرے ساتھ — اٹھو......'' اور اس نے گنگا کا ہاتھ پکڑ کر اتنے زور کا جھٹکا دیا کہ گنگا کھڑا ہو گیا اور کاوَل کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔'' ہاں۔ ہاں چلو — مجھے پھانسی دے دو۔ میری جان لے لو — چلو — چلو —''

گنگا کو کاوَل گھسیٹ کر لے گیا۔ تب جا کر دارو خانے والوں کا ڈر دور ہوا ورنہ وہ تو سمجھے تھے آج ان سب کی مصیبت آ گئی۔ بھیکو نے جو گنگا کا گلاس انجینئر صاحب کو پیش کیا تھا اس میں جو دارو تھا اسے وہ اپنے گلاس میں ڈال کر غٹ غٹ پی گیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ جیسے اس کی کوئی بہت بڑی فتح ہوئی ہو!

انجینئر کاوَل نے اپنے گھر کا دروازہ کھول کر گنگا کو اندر ایک کرسی پر دھکیلتے ہوئے غصے سے کہا۔'' میں تو تمھیں ایک محنتی اور ایمان دار کامگار سمجھتا تھا۔ مگر آج میں نے تمھارا ایک اور ہی روپ دیکھا ہے — شراب پیے ہوئے نشے میں دُھت ایسے آدمی کو میں لاکھوں روپے کی مشینیں چلانے کو کیسے دے سکتا ہوں؟ آخر میری بھی تو کوئی ذمہ داری ہے۔''

لاکھوں روپے کی مشینوں کے ذکر پر نشے میں دھت گنگا چونکا اور بڑے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا — ''لے لو۔ اپنی لاکھوں روپے کی مشینیں — بنا دو مجھے پھر گدھے چلانے والا۔ جی چاہے تو کام ہی سے ہٹا دو۔ میں کہیں اور کام ڈھونڈ لوں گا۔''

''یہ تمھیں آج کیا ہو گیا ہے گنگا جو تم ایسی باتیں کر رہے ہو؟ کاؤل نے غصے سے زیادہ افسوس سے کہا اور پھر گنگا کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑی نرمی اور پیار سے پوچھا۔ ''گھر کی۔گھر والی کی یاد آ رہی ہے؟ چھٹی چاہیے تو میں دے سکتا ہوں۔''

''نہیں صاحب۔'' اب گنگا کی آواز میں غصے سے زیادہ شرمندگی تھی۔'' اب میں کبھی گاؤں میں منہ نہیں دکھا سکتا۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' کاؤل نے سامنے کے صوفے پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔'' تم نہیں سمجھو گے کاؤل صاحب۔تم تو کشمیر کے رہنے والے ہو نا جہاں پانی بہت ہے۔'' گنگا سنگھ کی بات کاؤل بڑے غور سے سن رہا تھا۔'' مگر اس ریگستان میں۔ ہماری اس سوکھی پیاسی دھرتی میں دو بوند پانی کے کارن ایک آدمی دوسرے کی جان لیوے ہے۔دو بوند پانی کے کارن ایک چھوکری کی عزّت کا خون ہو جاوے ہے۔ جیسے میری سونکی کا ہوا۔—ہاں میری چھوٹی بہن—اور وہ بدمعاش منگل سنگھ جو کبھی اپنے آپ کو میرا دوست کہوے تھا اس ڈاکو نے بندوق دکھا کر میری بہن کی عزّت لوٹ لی—اور سونکی کو اس کا خون کرنا پڑا۔''

کاؤل نے یہ سارا قصہ سن کر کہا۔''وہ بدمعاش اسی قابل تھا۔کوئی عدالت بھی یہی کہے گی کہ ایسی حالت میں ایک شریف لڑکی اپنی عزّت کی حفاظت کرنے کے لیے خون بھی کر سکتی ہے۔''

''مگر میری سونکی کا کیا ہوگا؟ اب وہ گاؤں میں کبھی منہ نہیں دکھا سکتی۔ایسی ابھاگن سے کون شادی کرے گا؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' کاؤل نے فوراً جواب دیا—''وہ نردوش ہے۔اس سے کوئی بھی شادی کرے گا۔''

کاؤل نے عقل کا فیصلہ سنایا تھا۔مگر زندگی میں، سماج میں عقل کا ہی تو راج نہیں ہے۔ سو گنگا سنگھ نے زور دے کر کہا: ''میں پوچھوں ہوں کون کرے گا؟''

اور پھر گنگا سنگھ نے (جس کو شراب کے نشے نے بے باک اور منہ پھٹ بنا دیا تھا) کاؤل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا: ''تم کرو گے کاؤل صاحب؟''

کاؤل نے عقل کا سہارا لیا۔''اگر میری اس سے جان پہچان ہوتی۔اگر میں اس سے پیار

کرتا تو ضرور کر لیتا۔‘‘

’’پیار — پریم — پریت‘‘ ان لفظوں کو گنگا رام نے زبان سے ایسے نکالا جیسے وہ گالیاں ہوں۔’’یہ شبد سنیما ہی میں سنائی دے دیں۔ اصل جیون میں کوئی پیار پریم نہ کرے۔ سب جات جمات پوچھیں ہیں۔ تمھاری جیب میں کتنا مال ہے — یہ پوچھیں ہیں — جات برادری کے باہر کوئی شادی نہ بنائے ہے — بولو میں جھوٹ کہوں ہوں کیا۔‘‘

یہ کہہ کر گنگا نے اپنی نظر کاؤل کے چہرے پر جمادی۔ جیسے اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہو اور اسے معلوم ہو کہ اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں ہے۔

کاؤل بھی اس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔

دو آدمی ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

ایک انجینئر اور ایک مزدور جو چند مہینے پہلے کسان تھا۔

ایک پڑھا لکھا ایک ان پڑھ۔

ایک امیر۔ دوسرا غریب۔

ایک کشمیر کی خوب صورت وادیوں سے آیا ہوا گورا چٹا۔ دوسرا راجستھان کے تپتے ہوئے ریگستان کی پیداوار۔

مگر تاریخ نے، جغرافیہ نے، سیاست نے، معاشرت نے آج ان کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے لا بٹھایا تھا۔ یا تو وہ ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی ہو سکتے تھے یا ایک دوسرے کے دشمن۔

چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ مگر ایسا لگتا تھا برسوں گزر گئے ہیں، صدیاں گزر گئی ہیں۔

پھر کاؤل آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا دو قدم چل کر گنگا کی کرسی کے پیچھے آیا جہاں سے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغیر اس سے بات کر سکتا تھا۔’’ گنگا سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے سماج میں سو برائیوں کی جڑ یہ غریبی ہے اور یہ نہر ہم تم مل کر بنا رہے ہیں ایک دن یہ غریبی کو دور کر کے ایک نئے سماج کی بنیاد رکھے گی۔‘‘

گنگا کے لہجے میں بڑی تلخی بھری ہوئی تھی۔ ''کاؤل صاحب بنا لو اپنی نہر۔ بنالو اپنا نیا سماج، ریگستان میں پھول کھلالو۔ پر کیا تمھاری نہر میری بہن کی عزّت واپس دے سکے ہے؟''

کاؤل نے بڑے یقین اور بڑے زور کے ساتھ کہا— ''میں جس سماج کی بات کر رہا ہوں اس میں کسی ابلا کو دو بوند پانی کے عوض اپنی عزّت کی قربانی نہیں دینی ہوگی۔''

گنگا کے طنز یہ انداز میں اب بلا کی شدّت آ گئی تھی۔ ''بڑی بڑی کوٹھیوں، بنگلوں میں رہنے والے بڑی بڑی بات بول سکتے ہیں۔'' اور پھر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور اپنے افسر سے بڑے بے باکانہ انداز میں بولا ''پر ایک دن اپنے بنگلے کے باہر نکل کر دیکھو دنیا میں کیا ہو وے ہیں۔ دنیا میں کیوں، اس نہر پہ دیکھو کیا ہو رہا ہے— افسر کہاں رہوے ہیں اور جن کے واسطے کہوے ہیں یہ نہر بنائی جاوے ہے وہ مزدور کہاں رہوے ہیں— کیسے رہوے ہیں— لال لال جیپ میں بیٹھ کے مارے مارے پھر دہو!— دیکھو ہو تو ہمیں بھی بتانا کہ کیا دکھائی دیوے ہے؟''

یہ کہتا اور وہ دروازے کو دھڑ سے کھولتا بند کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا اور کاؤل کے لیے کتنے ہی سوال پیچھے چھوڑ گیا جو اس رات اسے سونے نہ دیں گے اور جن کے جوابوں کی تلاش میں اگلے دن اسے جیپ لے کر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔

○

محبت کی تین منزلیں

کاؤل جیپ کو خطرناک تیزی سے چلا رہا تھا۔ جیسے اپنی پریشانی اور الجھن کا اس کے پاس بس یہی ایک علاج ہو۔

لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح صرف سیدھی سڑک ہی کو نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ جیسا گنگا نے اسے للکارا تھا دائیں بائیں دیکھنے پر بھی مجبور تھا۔

اس نے دائیں کو نگاہ کی تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ جھونپڑیاں تنکوں سے بنائی ہوئی چٹائیوں کی بنی ہوئی تھیں ایک ایک جھونپڑی میں پورا پورا خاندان رہتا تھا۔ آندھی میں یہ جھونپڑیاں اڑ جاتی تھیں۔ ہر چیز پر دھول مٹی، ریت کی تہہ چڑھتی رہتی تھی۔ یہیں آدمی رہتے تھے ان کے گدھے اور ان کے اونٹ۔

اور آگے جا کر بائیں طرف کو نگاہ کی تو دیکھا مزدوروں کی جھونپڑیاں تنکوں کی بھی بنی ہوئی نہیں ہیں۔ تنکوں کی بنی ہوئی چٹائیوں پر بھی ٹھیکیداروں کا کچھ روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ سو کتنی ہی جھونپڑیاں کانٹے دار ریگستانی جھاڑیوں کی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں آندھی اور دھول کی روک تھام کے لیے کوئی دیوار نہیں تھی۔ ریت جھاڑیوں کے کانٹوں میں سے ہوتی ہوئی سیدھی اندر پہنچتی تھی اور گیلا آٹا اگر گندھا ہوا رکھا ہو تو اس آٹے میں مل جاتی تھی، اسی لیے سینکڑوں مزدور آٹا گوندھ کر روٹی پکانا بے کار سمجھتے

تھے۔ سوکھے ستو یا مُر مُرے لے کر کھا لیتے تھے اور اوپر سے ایک لوٹا میلے گدلے پانی کا پی لیتے تھے۔

یہ جھونپڑیاں کاؤل نے پہلے بھی دیکھی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مزدور کن حالات میں رہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں سرکاری انجینئر اور ٹھیکیدار پکے اور آرام دہ بنگلوں میں رہتے ہیں، لیکن آج وہ ان سب چیزوں کو گنگا کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کی بے چینی اور دماغی ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی رفتار سے جس رفتار سے کہ وہ جیپ دوڑا رہا تھا۔

اور اب کاؤل اپنے دفتر کے کمرے میں پریشان گھوم رہا تھا۔ جیسے شیر پنجرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتا ہے۔ رات ہو چکی تھی اور بجلی کی روشنی میں اس کا سایہ دیوار پر لگے راجستھان نہر کے نقشہ پر پڑ رہا تھا۔ ایک نشانی؟ ایک اشارہ؟

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کے خیالات کو قرار نہیں تھا۔ کیا وہ گنگا کی بہن سے شادی کر لے؟ مگر اس نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا! نہ جانے کس قسم کی لڑکی ہو! شریر اور نٹ کھٹ تو ضرور ہوگی۔ ''لمبو انجینئر'' نام تو اسی نے دیا تھا مگر اس وقت اس پر وہ ورگھٹنا نہیں پڑی تھی جس کے بارے میں گنگا سنگھ نے بتایا تھا۔ ممکن ہے اب وہ بدل گئی ہو! اور پھر...... کیا ایک پڑھا لکھا انجینئر ایک گنوار لڑکی کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے؟ کیا ایک گورے چٹے کشمیری کی کالی کلوٹی راجستھانی بیوی (شاید گنگا کی بہن کالی کلوٹی ہی ہو!) کو دیکھ کر لوگ ہنسیں گے نہیں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ اس کے افسر کیا کہیں گے؟ اس کے ماتحت کیا کہیں گے؟ دوسروں کی رائے کی میں کیوں پرواہ کروں۔ اگر میں خود یہ رشتہ کرنے کو تیار ہوں، لیکن کیا وہ واقعی تیار تھا؟ یہ سچ ہے کہ کالج کے زمانے کی ہلکی پھلکی فلرٹیشن کو چھوڑ کر آج تک اس نے کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ یا یوں کہنا چاہیے محبت کرنے کا اسے...... وقت اور موقع ہی نہیں ملا تھا...... ایک دم اس کے ذہن میں ایک لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹا سا قد۔ بڑی بڑی آنکھیں جو دیکھتی تھیں تو دیکھتی ہی رہتی تھیں۔ اس کو کاؤل نے صرف دو بار دیکھا تھا۔ ایک بار اس نے پانی پلایا تھا اور دوسری بار وہ نہر پر سیمنٹ کی تغاری سر پر لیے جا رہی تھی۔ کیا کہا تھا اس نے؟ ''بابو جی۔ مزدور نیوں سے باتیں کرنا تمھارے واسطے اچھا نہیں۔'' ٹھیک ہی تو کہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اسے اس مزدورنی سے بات کرنا اچھا لگتا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جوان تھی؟ خاص خوش شکل تھی؟ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت

تھیں؟ یا اس لیے کہ ان آنکھوں میں ایک اداسی کے ساتھ ایک عجیب تیکھا پن تھا؟ ...... زندگی اتنی عجیب کیوں ہے؟ جس سے محبت کرنا چاہتے ہیں اس سے محبت کیوں نہیں کر سکتے۔ جس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اسے جانتے بھی نہیں...... اس اُدھیڑ بُن میں وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر ٹہلنے لگا۔

اب اس کا عکس دیوار پر لگی ایک اور تصویر کے شیشے پر پڑا۔ یہ پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر تھی۔ کسی آرٹسٹ کے تخیل نے ان کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ نے ان کی تمام شخصیت، ان کی ساری زندگی اور ان کے تمام خیالات و جذبات و محسوسات کو سمیٹ کر رکھ دیا تھا لگتا تھا وہ اداس مسکراہٹ اس وقت اس کی پریشانی پر اداس بھی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے جیسے کہہ رہی ہو، ''بس اتنی سی بات سے گھبرا گئے؟ مجھے تو تم سے بڑی امیدیں تھیں۔ میں نے کہا نہ تھا کہ ہمارے نوجوان انجینئر یہ نہریں، یہ بندھ یہ کارخانے، یہ بجلی گھر ہی نہیں بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے ملک کا مستقبل بنا رہے ہیں۔ کیسا ہوگا یہ مستقبل۔ اگر اس میں گورے اور کالے، کشمیری اور راجستھانی، امیر اور غریب کے درمیان یہ دیواریں ہمیشہ کھڑی رہیں گی؟'' اور اس لمحے کاؤل نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے کیا کرنا ہوگا۔

کاؤل سیدھا گنگا سنگھ کے کوارٹر پر پہنچا۔ وہاں دیکھا کوٹھری میں تالا پڑا ہے اور دروازے کے اوپر جہاں چاک سے ''گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ ساکن بھارتیہ گاؤں'' لکھا ہوا تھا۔ وہاں اس نام کو کاٹ کر لکھ دیا گیا تھا: ''گنگا سنگھ چلا گیا۔'' چلا گیا؟ کہاں چلا گیا؟ کاؤل نے سوچا اور تب اسے مزدوروں کی وہ جھونپڑیاں یاد آئیں۔

اپنی پرانی جھونپڑی میں دروازے کے سامنے گنگا کھاٹ پر ہاتھوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ دوسرے کونے میں چٹائی پر سونکی بیٹھی تھی۔

عورت لاکھ پریشان ہو، شرم سار ہو، اپنی زندگی سے بیزار ہو، لیکن پھر بھی وہ عورت ہوتی ہے۔ جو مرد کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کبھی ماں کے روپ میں، کبھی بیوی کے روپ میں۔ کبھی بہن اور بیٹی کے روپ میں اور پھر سونکی تو (جیسا کہ گنگا نے گوری کو بتایا تھا) اس کی چھوٹی بہن ہونے پر بھی اس کے ساتھ ماں جیسا سلوک کرتی تھی۔

اسی ممتا کے جذبے سے بیتاب ہو کر (کیونکہ گنگا نے صبح سے ایک دانہ تک نہیں کھایا تھا)

سونکی نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ "بھیا کھانا لاؤں؟" گنگا نے اسے ڈانٹ کر جواب دیا، "نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔"

ابھی سونکی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ آندھی طوفان کی طرح سے "لمبوانجینئر" یعنی موہن کاؤل جھونپڑی میں داخل ہوا اور چونکہ وہ چھ فٹ سے بھی زیادہ اونچا تھا، داخل ہوتے ہی اس کا سر جھونپڑی کی نیچی چھت میں لگا۔ وہاں بانس بندھے ہوئے تھے۔ کھٹ سے چوٹ لگنے کی آواز آئی مگر اس وقت اس کا سر بھی پھٹ جاتا، تو بھی وہ پرواہ کرنے والا نہیں تھا۔

"کیوں گنگا؟" اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "تم اپنا کوارٹر چھوڑ کر یہاں کیوں آئے؟"

اور گنگا نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا، "شما کرنا صاحب ہم غریبوں کی جھونپڑی تمھارے جیسے لمبے آدمی کے واسطے بہت نیچی ہے۔"

کاؤل نے اس کونے کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا جہاں دوسری طرف منہ کیے ایک عورت یا لڑکی بیٹھی تھی جو گنگا کی بہن ہی ہوسکتی تھی۔ "لمبے آدمی نہیں لمبوانجینئر، کہو جیسا تمھاری بہن لکھا کرتی تھی۔"

"اُس ابھاگن کا نام کیوں لیتے ہو، صاحب۔" گنگا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ہم پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ ہمیں ہماری حالت پر چھوڑ دیجیے۔"

سونکی دوسری طرف منہ کیے ہوئے بیٹھی تھی، مگر اس کے چہرے سے اور اس کی خوب صورت آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ گنگا اور "لمبوانجینئر" کی بات چیت کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں زہر بھرے کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔

جب گنگا نے کہا کہ "صاحب آپ ہمیں ہماری حالت پر چھوڑ دیجیے تو کاؤل نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، "نہیں گنگا ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اور تم اپنے کام کو، اپنے فرض کو، اس نہر کو جو تمھارا اور سب کا بھوشیہ ہے، نہیں چھوڑ سکتے۔" اور جب کاؤل نے کہا "گنگا، قسمت نے ہمیں ایک ہی ڈور میں باندھا ہے۔" تو سونکی کو ایسے لگا جیسے یہ الفاظ نہیں ہیں شربت کا میٹھا گھونٹ ہے جو کسی نے اسے پلا دیا ہے۔

مگر گنگا— بھولا بھالا سیدھا سادھا گنگا— کہہ رہا تھا— "صاحب۔ یہ اتنے بڑے بڑے

شبد میری سمجھ میں نہ آوے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟''

کاؤل نے بڑے یقین کے ساتھ کہا: ''میں تمھاری بہن کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمھیں اور اسے منظور ہو!''

اور سونکی کے دل کی حرکت خطرناک حد تک تیز ہوگئی۔

مگر گنگا کو اب تک یقین نہ آیا تھا۔ ''نہیں صاحب۔ بھگوان کے لیے مذاق مت کرو کاؤل صاحب۔''

''مر گیا کاؤل صاحب۔'' کاؤل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا'' مٹ گیا۔ ختم ہو گیا۔ اب تمھارے سامنے کاؤل بھیا کھڑا ہے۔'' اور پھر دھیرے سے مسکرا کر'' کہو میرا سالا بننا منظور ہے؟''

اب گنگا کو کاؤل کی بات میں سچائی سنائی دی۔ خواہ وہ سچائی کتنی ہی حیرت ناک کیوں نہ ہو۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔'' کاؤل صاحب!'' اور جب کاؤل نے سر ہلا کر انکار کیا تو اس نے کہا۔'' کاؤل بھیا۔'' اور پھر۔

موہن کاؤل اور گنگا سنگھ —

انجینئر اور مزدور —

گورا چٹا لمبا کشمیری اور سانولا ناٹا راجستھانی۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں آ گئے۔

اور سونکی کو ایسے محسوس ہوا کہ خوشی سے اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا ہے کہ کسی وقت بھی دل کی حرکت بند ہو سکتی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں کہ ان میں کوئی اس کے دل کی کیفیت کو نہ دیکھ لے اور آنسوؤں کی دو بوندیں اس کی خوب صورت آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر ڈھلک گئیں۔

راجستھان نہر کے چیف انجینئر جن کو سب مزدور اور اوورسیئر ''بڑے صاحب'' کہتے تھے۔ سفید بالوں مگر جوان ہمت والے آدمی تھے۔ آج وہ اپنے دفتر کی کھڑکی کے قریب کھڑے ہوئے پیلی ریت کے ٹیلوں پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ جو چھتر گڈھ کی بستی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان مشکلات کا ایک نمونہ تھے جن سے گزر کر راجستھان نہر ریگستان کا سینہ چیرتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی، مگر وہ پریشان معلوم ہوتے تھے اور ان کے سگار کا کالا دھواں

ان کی دماغی پریشانی کی گواہی دے رہا تھا۔

پیچھے سے کاوَل کی آواز آئی۔ ''آپ نے مجھے یاد کیا سر؟''

چیف انجینئر نے گھوم کر اپنے ماتحت انجینئر کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں محبت بھی تھی اور شکایت بھی۔ اس لیے کہ بڑے صاحب اپنے سب انجینئروں میں کاوَل کو ہی سب سے زیادہ پسند کرتے تھے، مگر وہ آج اس سے کچھ ناراض معلوم ہوتے تھے، کیونکہ بڑے صاحب جس کسی سے ناراض ہوتے تھے تو اس سے بڑے تکلیف اور پیار سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے وہ بولے، ''ہاں بھئی کاوَل۔ آؤ بیٹھو.....'' اور جب کاوَل بیٹھ گیا تو وہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور میز سے ایک سگار کا ڈبہ اٹھا کر کھول کر کاوَل کو پیش کیا۔ کاوَل سمجھ گیا کہ آج کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بڑے صاحب اپنے ماتحتوں کو کبھی سگار نہیں پیش کرتے۔

''نو سر۔ تھینک یو۔ سر'' کاوَل نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ ''ہاں خوب یاد آیا تم تو پائپ پیتے ہونا۔'' بڑے صاحب نے کاوَل کی پٹی کی طرف دیکھ کر کہا جہاں حسب معمول ایک پائپ اڑسا ہوا تھا۔

'جی ہاں'' کاوَل نے کہا۔ ''مگر اپنے بڑوں کے سامنے نہیں پیتا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔'' بڑے صاحب کو ایسے نوجوان پسند تھے جو کم سے کم عمر کی بڑائی، چھوٹائی کا خیال رکھیں۔ پھر کرسی پر پیچھے جھولتے ہوئے کہا: ''یہ تمھارے بارے میں اسکینڈل کیا سن رہا ہوں میں؟''

''اسکینڈل، سر؟'' کاوَل نے حیرت سے کہا۔

''دیکھو بھئی'' بڑے صاحب نے بڑے آرام سے کہنا شروع کیا۔ ''میں کسی کی ذاتی زندگی میں تو دخل دینا نہیں چاہتا، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ تم نے کسی مزدور کی بہن کے ساتھ کچھ ایسا ویسا رشتہ.....''

''ایسا ویسا رشتہ'' سننا تھا کہ کاوَل کا منہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ ''نو، سر۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ گنگا سنگھ کی بہن کے ساتھ میرا کوئی ایسا ویسا رشتہ نہیں ہے۔''

''گنگا سنگھ؟ کون گنگا سنگھ؟'' بڑے صاحب نے گویا یہ نام کبھی سنا ہی نہیں تھا۔ پھر کچھ یاد کر کے

بولے، ''اوہ۔ وہ گدھے چلانے والا جسے تمھاری سفارش سے ٹریکٹر ڈرائیور بنا دیا گیا تھا؟''

کاؤل کو وہ دن یاد تھا جب وہ گنگا سنگھ کو پہلی بار اوورآل پہنے بڑے صاحب کے پاس لایا تھا۔ اور انھیں بتایا تھا کہ اس کو مشینوں سے عجیب وغریب لگاؤ ہے اور بہت جلد ٹریکٹر چلانا اس نے سیکھ لیا ہے۔ اگر ان کی اجازت ہو تو وہ اس کو ٹریکٹر ڈرائیور بنا دے۔

اب اس نے کہا، ''وہی سر۔ مگر وہ میری سفارش سے نہیں اپنی قابلیت سے ٹریکٹر ڈرائیور بنا ہے۔''

بڑے صاحب نے اب ایک دوسرے رخ سے حملہ کیا۔ کیا تمھیں اس کی بہن سے عشق ہو گیا ہے؟'' ''A CASE OF LOVE AT FIRST SIGHT?

''نو سر'' کاؤل نے جواب دیا۔'' میں نے تو آج تک اس لڑکی کی صورت بھی نہیں دیکھی۔'' اس کو نہیں معلوم تھا کہ صورت تو دیکھی ہے مگر اس وقت وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پانی پلانے والی لڑکی ہی گنگا سنگھ کی ''لمبوانجینئر'' کہنے والی نٹ کھٹ بہن ہے۔

اب بڑے صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔'' تو پھر کسی نے ایسے ہی خبر اڑا دی ہوگی!''

اب کاؤل کو بڑے صاحب کو اصلی بات بتانی پڑی۔'' مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے کیا خبر اڑائی ہے، مگر میں گنگا سنگھ کی بہن کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔''

''شادی؟'' بڑے صاحب بھی یہ لفظ سن کر کھڑے ہو گئے۔ جانتے ہو اس شادی کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

'' کاؤل نے مسکرا کر جواب دیا،'' شادی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے سر؟'' پھر اسے فیملی پلاننگ کا نعرہ یاد آیا اور وہی اس نے دہرا دیا۔'' دو یا تین بچے۔ اس کے بعد بس۔''

اب بڑے صاحب اپنی لمبی چوڑی میز کے گرد گھوم کر یہ کہتے ہوئے کاؤل کے قریب پہنچے، ''مگر تم ایک بات بھول رہے ہو۔ اس شادی کا نتیجہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ نہر پر کام کرنے والا ہر مزدور تمھیں اپنا بہنوئی سمجھے گا۔ ڈسپلن ختم ہو جائے گا۔ جو کام تین برس میں ختم ہو سکتا ہے اسے دس برس لگ جائیں گے۔......''

یہ سن کر کاؤل کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی آئی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ نہر کا کام آہستہ کیوں ہو رہا ہے۔ لاکھوں کروڑوں مشینیں جو فنافٹ کام کر سکتی ہیں کیوں پڑی زنگ کھا رہی ہیں اور اس

عرصے میں ٹھیکیدار جوانیٹیں بھی سپلائی کرتے ہیں اور مزدور بھی، وہ کتنا منافع کمار ہے ہیں، مگر اب بڑے صاحب بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھا رہے تھے۔"میں تو سمجھتا تھا تمھیں صرف اپنے کام سے کام ہے۔ راجستھان کی ایک لڑکی سے نہیں۔ راجستھان نہر سے لگاؤ ہے!"

اب کاؤل کو کہنا پڑا، "میں جو کر رہا ہوں وہ اسی راجستھان نہر کے لیے ہے۔ مگر یہ نہر نہ بن سکتی ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہوسکتا ہے، اگر راجستھان کے بیٹوں کے من سے وشواس اٹھ گیا اور راجستھان کی بیٹیوں کے من میں آشا نہ جاگی۔" پھر اس نے بڑے بھروسے سے بڑے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "سر میں آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔ آپ آئیں گے نا ہماری شادی میں؟"

"کیسے نہیں آوں گا۔" چیف انجینئر کے چہرے کی سختی ایک نرم مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ "میں نہیں آوں گا تو کنیا دان کون کرے گا؟" پھر اس نے گرم جوشی سے کاؤل سے ہاتھ ملایا اور فضا میں شہنائیاں بج اٹھیں۔

کاؤل کا چھوٹا سا بنگلہ آج شادی کی خوشی میں سجا ہوا تھا۔ ریگستان میں پھول تو ہوتے نہیں۔ پشپ مالا کی بجائے ریشم کے ہاروں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔

پردہ اٹھا اور کاؤل اپنی نئی نویلی دلہن کو اندر لایا۔ لال راجستھانی ساڑی میں سونکی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔ مگر ایسی گڑیا جس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر آتے ہی وہ اپنے پتی کے چرنوں میں جھک گئی۔

"ارے ارے" کاؤل چلایا۔ "یہ نہیں چلے گا۔ اٹھو اٹھو—ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب ذرا اپنا گھونگھٹ تو اٹھاؤ" اور جب سونکی چپ چاپ کھڑی رہی تو دولہا نے خود ہی دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔ سونکی کا چہرہ دیکھ کر کاؤل خوشی اور حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا— 'ارے اس دن تم ہی نے مجھے پانی پلایا تھا!' ارے واہ یہ بھی خوب اتفاق ہوا، میں نے سوچا کہ سڑک پر پانی پلانے والی مزدورنی اور گنگا سنگھ کی بہن ایک ہی لڑکی نکلیں۔"

"سونکی" کاؤل نے سونکی کی طرف دیکھ کر کہا: "تم اس بیاہ سے خوش ہو نا؟" مگر سونکی کی

نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ چپ چاپ ہی کھڑی رہی۔''اب اگر تم نہ بولیں تو میں سمجھوں گا تم اس بیاہ سے خوش نہیں ہو۔''

''کہو ہاں یا نا۔''

سونکی نے ڈر کے مارے جلدی سے منڈی ہلا دی۔

''تمھیں بولنا آتا ہے نا؟'' کاوَل نے پوچھا۔''گنگا تو کہتا تھا کہ تم بڑی نٹ کھٹ ہو—''

''بھیّا تو ایسے ہی.....''

''ارے واہ۔گونگی گڑیا بول پڑی۔اور بولو۔چلو چلو—بولو شاباش۔''

''کیا کہوں'' شرم سے نظریں جھکائے سونکی نے کہنا شروع کیا۔''میں ابھاگن ہوں۔ تمھارے جیسے اچھے آدمی کے برابر کی نہیں ہوں......میں تمھاری داسی بن کر رہوں گی۔''

کاوَل نے جلدی سے غصے کا منہ بنا کر کہا:''مجھے کوئی داسی واسی نہیں چاہیے۔''

''پھر؟'' سونکی نے ڈر کر پوچھا۔

کاوَل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے پلنگ پر بٹھا دیا اور پاس بیٹھ کر بولا:''پھر یہ کہ تم میری نوکر نہیں۔میری مہمان ہو۔آہستہ آہستہ اس گھر کی مالکن بن جاؤ گی۔میری ماں تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔جانتی ہو، وہ سرینگر میں بیٹھی بیٹھی اپنے لمبے بیٹے کے لیے چھوٹی سی بہو کے سپنے دیکھا کرتی تھی۔'' پھر اس نے سنجیدہ منہ بنا کر کہا:''مگر اس کے لیے تمھیں تین منزلیں طے کرنی ہوں گی۔''

سونکی نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔''وہ کیا ہوں گی؟''

''پہلے جان پہچان— پھر دوستی— اور پھر—''

''پھر؟''

''پھر پیار''

اور سونکی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے مگر اس نے اپنے خدشوں کا اظہار کیا،''میری قسمت میں پیار نہیں ہے۔''

○

دلہن کی مانگ کا سیندور

حد نظر تک ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان سب کے پیچھے کہیں سورج غروب ہو رہا تھا۔

ایک ریت کے ٹیلے پر موہن کاؤل اور اس کی بیوی سونکی بیٹھے ہوئے تھے۔ سونکی ریت کو اپنی انگلی سے کرید رہی تھی اور کاؤل سونکی کو دیکھ رہا تھا۔

''سونکی۔''

''جی!''

''کیا کر رہی ہو؟''

''لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ نہیں تو جو کچھ بھابی نے سکھایا ہے بھول جاؤں گی...... میری بھابی بڑی گنی ہے۔''

''ضرور ہوگی۔'' کاؤل نے کہا۔ اور اب اس نے دیکھا کہ سونکی ریت کو انگلی سے کرید نہیں رہی بلکہ کچھ لکھ رہی ہے۔ ''مگر تم نے لکھا کیا ہے؟''

سونکی نے بغیر کاؤل کی طرف دیکھے جواب دیا، ''بس یوں ہی بالو پر انگلی پھیر رہی ہوں۔''

کاؤل نے اصرار کیا، ''پھر بھی کچھ تو لکھا ہوگا۔''

''شاید جو میرے من میں ہو وہی لکھا گیا ہو۔'' سونکی نے جواب دیا۔

''کیا ہے تمھارے من میں۔ ہم بھی تو دیکھیں۔'' کاؤل نے یہ کہا اور سونکی کے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھا اور ریت پر کی ہوئی لکھائی پڑھنے لگا۔ ''میں پاپن ہوں۔ میں نے پاپ کیا ہے۔''

اب کاؤل نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: ''تمھاری لکھائی تو اچھی ہے مگر'' سر کی طرف اشارہ کر کے ''یہاں کچھ نہیں ہے۔''

''کچھ نہیں ہے؟'' سونکی نے بڑے بھولے پن سے بڑی بڑی آنکھیں کر کے سوال کیا۔

''بالکل بھیجا خالی ہے۔'' کاؤل نے کہا اور پھر ریت کی طرف اشارہ کر کے، ''اچھا اب دیکھو۔''

سونکی نے دیکھا کہ ریت ہوا سے اڑ رہی ہے اور اس نے جو لکھا تھا وہ دھیرے دھیرے غائب ہوتا جا رہا تھا۔

''اب کہاں گئی تمھاری لکھائی؟ کہاں رہا تمہارا پاپ؟'' کاؤل نے سوال کیا اور پھر بڑی نرمی سے بڑے پیار سے سمجھایا۔ ''یہ پاپ تم نے نہیں کیا تھا، سونکی۔ یہ پاپ تمھارے شریر کے ساتھ کیا گیا تھا۔ تمھاری آتما اب بھی پوتر ہے۔

یہ پاپ کی پرچھائیں اس بالو میں لکھائی کی طرح ہے۔ ایک ہوا کا جھونکا آیا اور جو لکھا گیا تھا مٹ گیا۔ کیا میرا پیار ایک ہوا کے جھونکے سے بھی کم ہے؟''

اور اب سونکی نے ایک نئی نظر سے اپنے پتی کی طرف دیکھا۔ کتنی بدھی، کتنی سمجھ بوجھ تھی اس کے دماغ میں اور کتنا پیار تھا اس کے من میں! خوشی اور شکرانے کے احساس سے سونکی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

کاؤل نے دیکھا کہ سونکی کی خوب صورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے ہیں۔ ایک پل میں وہ اس کے گالوں پر ٹپک جائیں گے۔ اس نے سونکی کو اپنی بانہوں میں لٹا لیا اور سونکی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ایک آنکھ سے ایک ایک آنسو نکل آیا۔ کاؤل نے سوچا۔ میری آتما بھی پیاسی ہے۔ اس نے سونکی کی دونوں آنکھوں کو چوم کر وہ دو بوند پانی پی لیا اور سونکی کے سارے تن بدن میں ایک طوفان برپا کر دیا۔

طوفان زوروں پر تھا۔

ریگستان میں ایک ہی طرح کا طوفان آتا ہے۔ ریت کی آندھی، ریت کے جھکّڑ جو سارے ریگستان کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ پورے پورے ٹیلوں کو اڑا کر لے جاتے ہیں۔ گاؤں میں جن جھونپڑوں کی چھتیں مضبوطی سے بندھی ہوئی نہیں ہوتیں اور ان پر پتھروں کا وزن نہیں رکھا ہوتا ان کو اڑا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔

بھارتیہ گاؤں میں سے طوفان بلا کسی روک ٹوک کے گزر رہا تھا۔ وہاں تھا ہی کون، جو ان طوفانی جھکّڑوں کی پرواہ کرے گا۔ تقریباً چھ مہینے سے گاؤں خالی پڑا تھا۔ اس عرصے میں کتنے ہی چھپر اڑ گئے، کتنے ہی جھونپڑیوں کی گھاس پھونس کی چھتیں اڑ گئیں۔ اڑتی ہوئی ریت کی آندھی جب جھونپڑوں کی دیواروں سے ٹکراتی ہے تو دیواروں کے کنارے کنارے ریت کی ڈھیریاں چھوڑتی جاتی ہے۔

ایک طوفان جھونپڑے کے باہر آ رہا تھا، جھونپڑے کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک دوسرا طوفان جھونپڑے کے اندر، بلکہ چارپائی پر لیٹی ہوئی گوری کے اندر اٹھ رہا تھا۔ یہ دکھ اور درد اور تکلیف کا طوفان تھا مگر اس درد اور تکلیف میں بھی ایک لذّت تھی۔ یہ طوفان ایک تخلیقی طوفان تھا۔ ماں کی اسی اذیت کی لہروں پر ڈولتا ہوا بچہ زندگی کے ساحل پر پہلا قدم رکھتا ہے۔

ناقابل برداشت تکلیف کی ایک لہر آئی اور گوری کا سارا بدن درد سے لرز اٹھا۔ اس کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ آندھی کے ایک طوفانی جھونکے سے جھونپڑے کے بند دروازے کے پٹ کھل گئے اس وقت زندگی کا دروازہ بھی کھل گیا اور طوفان کی آواز سے بھی بلند ایک بچے کی رونے کی آواز آئی۔

گوری کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اب کرب کی بجائے ایک کمزور سی مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ یہ تخلیق کا احساس تھا جو ہر ماں کو بچہ جننے کے بعد ہوتا ہے۔ گوری کی تکلیف کا طوفان گزر چکا تھا اور جھونپڑے کے باہر بھی آندھی کا طوفان اب کم ہو چلا تھا۔

گوری نے اپنے پاس لیٹے ہوئے بچے کی طرف ایک فاتحانہ نظر سے دیکھا اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے صرف ایک نام سنائی دیا: ’’جمنا کے باپو!‘‘

جمنا سنگھ کا باپو اپنے بل ڈوزر کے آگے لگے ہوئے فولادی بلیڈ سے ریت کاٹ رہا تھا اور ساتھ میں خوشی سے گاتا جا رہا تھا۔"میں باپ بن گیو رے میں باپ بن گیو رے"

ایک اونٹ والے نے جو پاس سے گزر رہا تھا پوچھا"کیوں گنگا سنگھ آج بہت خوش نظر آوے ہے؟"

"ارے میں خوش کیوں نہ ہوں۔ میں باپ بن گیا ہوں میری گھر والی ماں بن گئی ہے۔ اور میری سونکی بوا۔"

سونکی جواب جمنا سنگھ کے بیٹے کی بوا یعنی پھوپی بن گئی تھی اپنے پتی کے گھر میں شاور باتھ کے فوارے کے نیچے کھڑے نہا رہی تھی۔ ریگستان میں رہنے والی لڑکی کو اب تک جسم پر ٹھنڈا پانی پڑنے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ سردی اور خوشی سے کانپ رہی تھی۔"کتا ٹھنڈا پانی۔۔اوئی ماں۔۔کتا ٹھنڈا پانی!"

نہا دھو کر اس نے ساڑی پہنی۔ مانگ میں سہاگ کی نشانی راجستھانی 'بور' لگایا اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک کشمیری شال اپنے کندھوں پر ڈال لی جو سری نگر سے موہن کاؤل کی ماں نے اپنی بہو کو بھیجی تھی۔ سنگھار کر کے تیار ہو کر وہ اپنے بنگلے سے نکلی۔ اب شام ہو چکی تھی اور ریگستانی ہوا ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ ریت کے میدان میں جو اینٹوں کی سڑک ان کے بنگلے سے سیدھی کاؤل کے دفتر کو جاتی تھی۔ اس پر چلتے چلتے وہ اپنے پتی کے کمرے تک پہنچ گئی۔ آج وہ اس کو وہاں اچانک آ جانے سے چونکانے والی تھی۔

موہن کاؤل کی میز پر ٹیبل لیمپ کی روشنی کا ایک گول گھیرا پڑ رہا تھا۔

باقی سب کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اتنے میں بجلی کا سوئچ دبانے کی آواز آئی اور سارے کمرے میں روشنی ہو گئی کاؤل نے حیران ہو کر پلٹ کر دیکھا تو سونکی سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پھر سوئچ دبا کر اس نے اندھیرا کر دیا۔ پھر روشنی کر دی۔ پھر اندھیرا پھر روشنی۔

"یہ کیا بچپنا ہے؟" کاؤل نے بیوی کو ڈانٹا۔۔ مگر پیار بھری آواز میں"تم یہاں آئیں کیسے؟"

"ایسے!" سونکی نے اس کی میز کی طرف چل کر بتایا۔"پاؤں پاؤں چل کے تم اتنی دیر تک نہیں آئے میں گھبرا گئی۔"

اب سونکی اس کی میز کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ کاؤل اس کے گیلے بالوں کی مہک سونگھ سکتا تھا۔

''اچھا بیٹھو، بیٹھو'' اس نے کہا اور جب سونکی وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھنے لگی تو کاؤل نے گھبرا کے اور کمرے کے دروازے کے پاس کی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہاں نہیں وہاں۔'' حیران اور کسی قدر دکھی ہو کر سونکی الٹے پیروں واپس جانے لگی تو اس کے شوہر نے اس حکم کی اصلی وجہ بھی بتا دی۔ ''تم مجھ سے دور بیٹھو۔ ورنہ مجھ سے کام نہیں ہوگا۔''

اب سونکی کو اطمینان ہو گیا بلکہ خوشی ہوئی کہ صرف اس کی موجودگی سے اس کے شوہر کا دھیان بٹتا ہے اور وہ کام نہیں کر سکتا۔

دور کرسی پر سونکی کو بیٹھتے دیکھ کر کاؤل نے کہا: ''دیکھو سونکی، مجھے آج کل بہت کام ہے۔ دیر ہو جایا کرے تو گھبرانا نہیں۔ کسی کام کاج میں دل بہلایا کرو۔''

کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے سونکی نے کہا: ''کیا کام کروں؟ کچھ کام تو ہے نہیں۔''

''گاؤں میں بھلا کیا کام کرتی تھیں؟''

''گاؤں میں سب لڑکیاں پانی بھر کے لاوے تھیں۔ ہمارے بھی سارا دن اس میں گزر جاوے تھا۔''

کاؤل نے سوال کیا: ''اور یہاں؟''

سونکی نے بھولے پن سے جواب دیا، ''یہاں تو جادو کی پھر کی گھماؤ تو پانی سر سے نکل آوے ہے اور تو کوئی کام کاج نہیں، نہ چولھا نہ چکی، اور اب اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا، ''محنت مزدوری تو تم کرنے نہیں دیتے۔''

''اچھا اچھا کوئی کام تمھارے لیے بھی نکالیں گے۔'' کاؤل نے گفتگو کا سلسلہ بند کرتے ہوئے کہا ''اب تمھیں یہاں بیٹھنا ہے تو چپ بیٹھو۔ ش ش ش۔''

سونکی نے شرارت بھرے انداز میں اس کی نقل اتاری، ''ش ش ش۔'' اور اب کاؤل اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ انجینئرنگ کی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ان میں راجستھان نہر بنانے کے سلسلے

میں جو کئی مسئلے پیش آتے تھے ان کا حل ڈھونڈ تا تھا۔ خاص خاص نکتے وہ ایک پیڈ پر لکھتا جا رہا تھا۔ کتنے ہی فائل سامنے میز پر کھلے پڑے تھے۔ اس کام کو جلد ختم کرنے کے لیے کتنے ٹریکٹر چاہییں، کتنے بل ڈوزر، کتنی کرینیں، کتنی اونٹ گاڑیاں، کتنے گدھے، کتنے مزدور، کتنا سیمنٹ، کتنی اینٹیں، اور سب سے مہنگی چیز— کتنا پانی چاہیے ہزاروں مزدوروں کے پینے کے لیے، نہانے دھونے کے لیے، اونٹوں اور گدھوں کو پلانے کے لیے، اینٹیں بنانے کے لیے، سیمنٹ سے اینٹوں کو نہر کے دونوں کناروں پر لگانے کے لیے......

ہزاروں سوال تھے کاؤل کے سامنے لیکن آج اس کی طبیعت کیوں بار بار اچاٹ ہو جاتی ہے؟ ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کی نظر کیوں دروازے کی جانب اٹھ جاتی ہے؟......اس لیے کہ وہاں اس کی بیوی سونکی بیٹھی ہے۔ اور اس کی خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں میں، اس کے جوانی سے گدرائے ہوئے شریر میں، ایسا جادو ہے جس کے سامنے اینٹ پتھر، ٹریکٹر، بل ڈوزر کے حساب کتاب کی اہمیت اس وقت تو بالکل ہیچ ہے۔

آخر کار اس نے کتابوں، فائلوں کو اٹھا کر رکھ دیا۔ دھڑ سے اپنی میز کی دراز کو بند کیا۔

سونکی نے شرارت سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "ش ش ش" کیا اور کہا، "ہمارے انجینئر صاحب کام کر رہے ہیں۔"

"اب تمھارے انجینئر صاحب سے کام نہیں ہوگا۔" کاؤل نے ٹیبل لیمپ کی روشنی بجھاتے ہوئے کہا: "چلو تمھیں میر کرالاؤں۔"

ریگستان میں شام کا دھندلکا چھا چکا تھا۔

ریت کے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں الاؤ جل رہے تھے۔ جہاں نہر پر کام کرنے والے مزدور بیٹھے ڈھولک کی لے پر اپنے گاؤں کا کوئی گیت گا کر اپنا جی بہلا رہے تھے......

ریت کے ٹیلوں کے درمیان ہی انجینئر کاؤل کی لال جیپ خالی کھڑی تھی اور اس سے تھوڑے فاصلے پر کاؤل اور سونکی ٹھنڈی ریت پر پاس پاس لیٹے ہوئے لوک گیت سن رہے تھے۔

کچھ یاد آیا تو سونکی ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''میں تو تمھیں بتانا ہی بھول گئی کہ آج گنگا بھیا آئے تھے......''

کاؤل نے اس کا جملہ پورا کر دیا'' ...... یہ بتانے کہ ان کے بیٹا ہوا ہے۔ میں بھی کام میں تم سے کہنا بھول گیا۔ دیکھا تم نے گنگا کتنا خوش ہے؟''

''بات ہی خوشی کی ہے'' سونکی نے کہا۔

اور پھر کاؤل نے ایک خاص انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''سونکی کیا تمھیں بھی بیٹا چاہیے؟''

''اوں ہوں!''

''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ مجھے بیٹی چاہیے۔''

''بیٹی کیوں؟ بیٹا کیوں نہیں؟''

سونکی نے اپنے شوہر کی طرف بڑے پیار سے دیکھا اور جواب دیا: ''اس لیے کہ جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں تو وہ تمھاری دیکھ بھال کرے۔ تمھارے واسطے کھانا پکائے۔ تمھاری قمیض کے بٹن ٹانکے۔'' اور اب اس نے اپنے شوہر کے سینے کے بالکل قریب جھک کر کہا: ''یہ دیکھو۔ ایک اور بٹن ٹوٹ گیا۔'' اور قمیض میں جھولتے ہوئے بٹن کو توڑتے ہوئے شرارت سے کہا: ''کا تم بٹنوں کو چباؤ ہو؟''

وہ اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس کا نرم اور گرم سانس کاؤل اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ اب اس سے نہ رہا گیا اور اس نے سونکی کو اپنی بانہوں میں لینے کی کوشش کی۔

''اوں ہوں!'' سونکی نے اپنا سر ہلایا۔

''کیوں؟'' کاؤل نے شکایت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا۔ پہلے جان پہچان......''

''پھر دوستی۔'' کاؤل نے پرانا سبق دہرایا۔ ''پھر پیار۔''

''تو پھر جان پہچان کراؤ۔ اپنے ملک کے بارے میں بتاؤ''

''میرا ملک؟'' کاوَل نے تعجب سے کہا۔ ''میرا ملک تو یہی ہندوستان ہے جو تمھارا ملک ہے!''

''وہ تو ہے۔ مگر کشمیر کے بارے میں بتاؤ جہاں تمھارا جنم ہوا۔''

اپنے وطن کی خوب صورت یادوں نے کاوَل کے چہرے پر مسکراہٹ ابھار دی۔ ''کسی کوی نے کہا ہے کہ کشمیر سورگ ہے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی، ہریالی اس لیے کشمیر میں بارش بہت ہوتی ہے۔''

''بارش؟'' یہ لفظ سونکی کے لیے نیا تھا۔ پھر بھی وہ مطلب سمجھ گئی۔ پوچھا۔ ''برکھا؟'' اور جب کاوَل نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تو سونکی نے بڑی ٹھنڈی سانس لے کر کہا: ''میں نے برکھا کبھی نہیں دیکھی۔''

کاوَل نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔ ''تم نے ابھی تک برکھا نہیں دیکھی؟''

بھولی سونکی نے سر ہلا کر نہیں کہا پھر بولی: ''کبھی کبھی چٹے چٹے بادل آویں تھے اور ہمارے گاؤں کے اوپر سے گزر جاویں تھے۔ برکھا نہ ہوئے تھی۔ تم کشمیر کے بارے میں بتاؤ۔''

''لوگ تو وہاں بھی غریب ہیں'' کاوَل نے کہا۔ ''مگر دھرتی میں خوب صورتی کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ جھیلیں، ندیاں، جھرنے، پہاڑوں کی چوٹیاں، سفید سفید برف سے ڈھکی ہوئی۔''

''برف؟'' اب ایک اور انجانا شبد سونکی کے کان میں پڑا۔ ''وہ کیا ہووے ہے؟''

''برف برف'' کاوَل بوکھلا گیا کہ اب ایک ریگستان کی رہنے والی کو آسمان سے گرنے والی برف کے بارے میں کیا بتائے۔ پھر اس نے بے خیالی میں ایک مٹھی ریت اٹھا لیا اور اچانک اسے ایک خیال آیا، مٹھی میں سے ریت کی دھار نیچے چھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ''برف ایسی ہوتی ہے جیسے یہ ریت......''

اور سونکی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ریت کی طرح آسمان سے برف کے سفید سفید گالے گر رہے ہیں اور اپنے تخیل کی آنکھ سے اس نے کشمیر کے قدرتی حسن کی کتنی ہی جھلکیاں دیکھ لیں۔

برف گر رہی ہے۔

برف زمین پر جمی ہوئی ہے۔

بہار کے موسم میں برف پگھل رہی ہے۔

گلابی گلابی شگوفے کھل رہے ہیں۔

لال لال پھول۔

جھرنے پہاڑ سے نیچے گر رہے ہیں۔

جھرنے دریا میں ملتے جارہے ہیں۔

اور دریا جھیل میں ملتے جاتے ہیں۔

جھیل میں گر کر شانت ہو جاتے ہیں۔

اور جھیل میں شکارے ڈول رہے ہیں اور شکاروں میں پریمی جوڑے۔اور جیسے دور سے سونکی کو کاؤل کی آواز آئی۔''جی چاہتا ہے کہ اس وقت ہم بھی ایک شکارے میں ہوتے اور تم میری بانہوں میں ڈولتی ہوتیں!''

اور سونکی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سپنے میں وہ ایک سرنگ سے نکل رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں اب تک کشمیر کی وہ سندر جھلکیاں جھلک رہی تھیں۔

اب اس نے پھر اپنے پتی کی طرف دیکھا اور کہا:''تمھارے شبدوں میں جیسے جادو بھرا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک بہت سندر سپنا دیکھ رہی ہوں۔ بھابی کہتی ہیں،کویتا سندر سپنے جگا دے ہے۔کیا اس کو کویتا کہوے ہیں؟''

''نہیں سونو'' کاؤل نے بڑے پیار سے، بڑی نرمی سے کہا۔''اسے کویتا نہیں،اسے ہماری بھاشا میں پیار کہتے ہیں۔''

اور نہ جانے کب اور کیسے سونکی اپنے پتی کی آغوش میں آ گئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ ان مضبوط بانہوں میں پگھلتی جارہی ہے جیسے کہ بہار کے موسم میں برف پگھلنے لگتی ہے۔

مگر اسی وقت اس نے دیکھا کہ سامنے والے ٹیلے پر جہاں ہلکی ہلکی چاندنی ایک جادو بھری کیفیت پیدا کر رہی تھی، پلک جھپکتے منگل سنگھ آ کھڑا ہوا۔سر پر ناٹکا صافہ۔ہاتھ میں بندوق۔سونکی سہم گئی۔

کاؤل نے محسوس کیا کہ سونکی کسی چیز سے ڈر گئی ہے۔اس نے بھی ادھر دیکھا جدھر وہ دیکھ رہی تھی۔وہاں ٹیلے پر اسے چاندنی کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔

''ارے کیا ہوا۔تم تو ایسے لگتی ہو جیسے کوئی بھوت دیکھا ہو۔''

''شاید بھوت ہی دیکھا ہو'' سونکی نے ٹیلے کی طرف دیکھ کر کہا جہاں اب کسی کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔'' مجھے بہت ڈر لگے ہے۔'' اور وہ اپنے شوہر کی چوڑی چکلی چھاتی سے بچوں کی طرح لپٹ گئی۔'' مجھے بہت ہی ڈر لگے ہے۔''

''ڈر لگے ہے؟'' کاؤل نے تعجب سے پوچھا۔'' کس سے ڈر لگے ہے؟''

اور سونکی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا:'' مجھے ڈر لگے ہے کہ کہیں یہ سندر سپنا ٹوٹ نہ جائے۔''

وقت گزرتا رہا— گوری کی چکی چلتی رہی— آٹا پستی رہی— وقت کے ساتھ ساتھ گنگا اور گوری کا بچہ— جس کا نام اس کی ماں نے جمنا سنگھ رکھا تھا— بڑھتا رہا۔

مگر گاؤں میں اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں تھا۔سوائے اس کی ماں کے۔وہی اس کو لوری کی بجائے راجپوتوں کی ویرتا کے گیت سناتی رہتی۔

گاگر سر پر لے کر پانی بھرنے جاتی تو اس کو اپنی کمر پر باندھ لیتی۔

ننھا جمنا بڑھتا رہا—اپنی ماں کے چولھے چکی کے پاس کاٹھ کے کھلونوں سے کھیلتا رہا۔

اس کا باپ گنگا سنگھ ٹریکٹر اور بل ڈوزر اور بڑی بڑی فولادی کرینوں سے کھیلتا رہا۔

اور ان دونوں کے سہارے— گنگا سنگھ کی یاد کے سہارے اور جمنا سنگھ کی سنگت کے سہارے— گوری نے ایک سال اور اکیلے گاؤں میں کاٹ دیا۔

ایک دن کاؤل کام پر گیا ہوا تھا۔نوکر رسوئی میں کھانا پکا رہا تھا۔سونکی نہا کر کپڑے پہن چکی تھی اور اب بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ وہ کھڑکی کی جالی میں سے کچھ دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔

باہر منگل سنگھ کھڑا تھا۔

چند لمحوں تک تو سونکی کے دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی رہی۔ منگل سنگھ زندہ ہے! منگل سنگھ زندہ ہے!

منگل سنگھ جس نے اس کی عزت کا خون کیا تھا!

منگل سنگھ جس کو اس نے گولی ماری دی تھی! جس کو وہ آج تک مرا ہوا سمجھتی تھی وہی منگل

سنگھ آج ایک ریت کے ڈھیر پر کھڑا اس کی طرف اپنی زہریلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔

آخر کار سونکی اتنا کہہ پائی "تم۔۔ تم زندہ ہو؟"

"ہاں سونکی، میں زندہ ہوں" منگل سنگھ نے جواب دیا۔ "میں تو پہلے ہی آتا مگر دو سال سے جیل میں پڑا تھا۔ تمھاری گولی ٹانگ میں لگی تھی نا۔ تو پولیس والوں نے لنگڑے کو پکڑ لیا۔ اب جیل سے چھوٹ پایا ہوں۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" سونکی نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

"ڈاکو کیوں آتا ہے" منگل سنگھ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ڈاکہ ڈالنے۔ اور اب کی بار جو میں نے ڈاکہ مارا تو ڈائنامائیٹ ہاتھ آئی......"

"ڈائنامائیٹ؟" سونکی کی زبان سے نکلا۔ اس کو کاؤل کے ساتھ رہتے ہوئے معلوم ہو گیا تھا کہ ڈائنامائیٹ کتنی خطرناک چیز ہوتی ہے، اس سے تو چٹانوں کو اڑایا جاتا ہے۔

"اور اب ڈائنامائیٹ سے اس ساری بنی ہوئی نہر کو اور اس کے ساتھ تمھارے پتی کو بھی اڑا دوں گا اگر......"

سونکی کے دل میں اور دماغ پر جیسے بجلی گری ہو۔ اس کے منھ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

"اگر؟"

"اگر تم آج رات کو نہر کے کنارے والے ٹیلے پر مجھے ملنے نہیں آئیں!"

"نہیں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا" سونکی نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے ایک پل کے لیے نظر ہٹائی۔ پھر ادھر دیکھا تو دور تک پھیلے ہوئے ریگستان میں کہیں منگل سنگھ کا نام نشان نہیں تھا۔

تو کیا اس نے دن کے وقت ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا تھا؟

کیا اس کے من میں بیٹھے ہوئے ڈر نے منگل سنگھ کی صورت اختیار کر لی تھی؟

مگر یہ سب سچ ہوا تو؟

گنگا سنگھ بل ڈوزر سے ریت کو کاٹ رہا تھا کہ اس نے دور سے اپنی بہن سونکی کو آتے دیکھا۔ وہ بھاگتی آ رہی تھی اور بہت پریشان نظر آتی تھی۔ دور سے ہی چلا رہی تھی۔ "بھیا! بھیا!"

گنگا سنگھ اپنے بل ڈوزر کو روک کر اتر آیا۔ ''ارے سونی تو یہاں؟''

''تجھے پتہ ہے اب یہ نہر جلدی جلدی اپنے گاؤں پہنچنے والی ہے!''

گنگا کو ایسا لگا جیسے اس کی بہن بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، ''یہ نہر گاؤں کبھی نہیں پہنچے گی۔ وہ کبھی پہنچنے نہیں دے گا۔''

''کون؟ کس کی بات کر رہی ہے تو؟'' گنگا سنگھ نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''وہ زندہ ہے۔'' سونی نے کہا اور پھر ہچکچاتے ہوئے۔۔۔''وہ ڈاکو منگل سنگھ!''

گنگا سنگھ نے دانت بھینچ کر کہا: ''تو وہ شیطان مرا نہیں تھا؟''

''میں تو یہی سمجھی تھی کہ وہ مر گیا ہے۔'' سونی نے جواب دیا۔ مگر وہ آج آیا تھا۔ رات کو اس نے نہر کے کنارے والے بٹے پر مجھے بلایا ہے۔ میں نہ گئی تو کہتا ہے کہ اس نہر کو ڈائنا مائیٹ سے اڑا دے گا۔ اور ساتھ میں ان کو۔''

گنگا سنگھ کے من میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا جس کی پرچھائیں اس کے چہرے پر بھی ابھرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے گنگا نے دانت بھینچ کر بڑی گھمبیر آواز میں کہا: ''گھبرا مت سونو۔ تیرا بھائی ابھی زندہ ہے۔''

ریت کے ٹیلوں میں پکی لال اینٹوں سے بنی ہوئی نہر (جو تیار ہو گئی تھی مگر جو خالی تھی جس میں پانی ابھی تک نہیں آیا تھا) چاند کی مدھم روشنی میں ایسی چمک رہی تھی جیسے کسی دلہن کی مانگ میں سیندور بھرا ہو۔ اسی نہر کے ایک کنارے پر منگل سنگھ اپنی بندوق لیے ہوئے بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

دور سے نزدیک آتی ہوئی پائل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ تو سونی پر اس کی دھمکی کارگر ہو ہی گئی! پائل کی آواز قریب آئی تو وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سونی کا سواگت کرنے کھڑا ہو گیا۔ مگر بندوق اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

نہر کے کنارے بنے ہوئے بندھ کے پیچھے سے پائل کی آواز قریب آ رہی تھی ۔۔۔ اور قریب ۔۔۔ اور قریب ۔۔۔ اسی رفتار سے منگل سنگھ کی بے قراری بھی بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے ایک سر کو ریت کے ٹیلے کے پیچھے سے ابھرتا ہوا دیکھا اور پھر اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے سے دفعتاً غائب ہو گئی۔

یہ سونکی نہیں تھی۔

اس کا بھائی گنگا سنگھ تھا۔

گنگا سنگھ جسے کبھی وہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔

گنگا سنگھ اور منگل سنگھ ــــ دونو جوان جو ایک ساتھ گاؤں سے روانہ ہوئے تھے مگر جنھوں نے دو الگ الگ راستے اختیار کیے تھے۔ آج ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ پائل گنگا کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ اب بھی اسے چھنکار ہا تھا، منگل کو ایسا لگا جیسے گنگا اس کا منہ چڑا رہا ہو۔

''ارے گنگا!'' منگل آخر کار بولا مگر زہر بھری آواز میں، ''تو نے کیوں تکلیف کی؟ اپنی بہن کو بھیج دیتا......''

جواب میں گنگا سنگھ نے ہاتھ میں لی ہوئی پائل کو اتنے زور سے کھینچ کر منگل سنگھ کے منہ پر دے مارا کہ بے اختیار اس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر ریت پر گر پڑی۔ اگلے پل میں بندوق گنگا سنگھ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے منگل سنگھ کے سینے کی طرف تانے کھڑا تھا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔'' منگل سنگھ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا: ''تو نے دھوکے سے میری بندوق اٹھالی۔''

''اس لیے کہ تو صرف بندوق کی بھاشا سمجھے ہے!''

کچھ دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ گنگا کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

''میری طرف ایسے مت دیکھ گنگا'' منگل ان نگاہوں کی آنچ کی تاب نہ لا کر بولا۔ ''جیسے دنیا میں ایک میں نے ہی پاپ کیا ہے۔ گھمنڈ بھی بڑا پاپ ہووے ہے۔ میں نے تجھ سے کہا، تیرے باپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سونکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو، لیکن اس نے مجھے سونکی نہیں دی ــــ گالیاں دیں مجھے ــــ آوارہ، بدماش کہا ــــ تو میں نے بھی بدماش بن کر دکھا دیا۔''

''تو سن بدمعاش، ایک ایک لفظ گنگا کے منھ سے گولی بن کر نکلا۔ اب اس بندوق کے منھ سے آگ نکلے گی اور تیرے منھ سے خون، شاید اس دھرتی کو اس نہر کے پانی کے ساتھ دو بوند خون بھی چاہیے۔''

''نہر!'' منگل سنگھ نے یہ لفظ ایسے ادا کیا جیسے کوئی کسی کڑوی چیز کو تھوکتا ہے۔ ''کون سی نہر؟ ارے مورکھ یہاں نہر کبھی نہیں آئے گی۔ نہر ایک پاگل کا خواب ہے، جس کے انتظار میں میرا باپ مر گیا، تیرا باپ پاگل ہو گیا میں ایک شریف جوان سے ڈاکو بن گیا۔ جانے اور کتنے بڈھے پاگل بنیں گے، کتنے اور منگل سنگھ ڈاکو بنیں گے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا؟'' ایک تیسری آواز چاندنی رات میں گونجی۔ یہ انجینئر کاؤل کی آواز تھی جو اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے چلتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ ''ریت کے اس تپتے ہوئے میدان میں نہر آئے گی اور ضرور آئے گی۔''

''انجینئر صاحب!'' منگل نے بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرا باپ بھی یہی کہا کرتا تھا۔ وہ ساری زندگی اسی نہر کی آشا میں اپنی زمین سے لپٹا رہا لیکن نہر نہ آئی۔ زمین ایک دن ساہوکار لے گیا اور زندگی یم راج۔ پیچھے چھوڑ گیا ایک بیٹا اور ایک بندوق۔''

گنگا نے جو کاؤل کے اچانک آ جانے پر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اب مڑ کر اور بندوق کا نشانہ تان کر منگل سنگھ سے کہا۔

''بیٹے اور بندوق نے مل کر میری بہن کی عزّت لے لی۔ اب حساب چکانے کے لیے تیار ہو جا، منگل سنگھ۔''

وہ بندوق کی لبلبی دبانے والا ہی تھا کہ کاؤل نے 'گنگا!' کہہ کر اس کے ہاتھ سے بندوق چھیننے کی کوشش کی۔ چھینا جھپٹی میں گنگا چلاّیا، ''کاؤل صاحب ہٹ جاؤ میرے سر پر خون سوار ہے۔''

''خون تو میرے سر پر بھی سوار ہے'' کاؤل نے بھی چلاّ کر کہا اور بندوق گنگا سنگھ کے ہاتھ سے چھین لی۔ اب وہ بندوق کا نشانہ منگل سنگھ کی طرف کیے ہوئے کہہ رہا تھا، ''تم نے اپنی بہن کی عزّت میرے حوالے کی ہے تو منگل سنگھ سے بدلا لینے کا حق بھی میرا ہے۔''

''بندوق چلایئے کاؤل صاحب۔'' گنگا چلاّیا۔

''چلاؤ گولی اگر ہمت ہے تو۔'' منگل سنگھ نے کاؤل کو للکارا۔ لیکن یاد رکھنا کہ ادھر بندوق کی آواز ہوگی ادھر ڈائنامائیٹ کا دھماکہ۔ ڈائنامائیٹ جو میرے ساتھیوں نے نہر کے دونوں طرف بچھا رکھا ہے — منگل سنگھ اکیلا نہیں جائے گا اس دنیا سے اس کے ساتھ تم بھی جاؤ گے۔'' منگل سنگھ

نے پہلے کاوَل کی طرف اشارہ کیا پھر گنگا کی طرف۔ ''تم بھی جاؤ گے۔۔اور ساتھ میں تمھاری نہر بھی جائے گی۔اب سوچ لو اور چلاؤ گولی۔''

''تم سچ مچ شیطان ہو!'' کاوَل نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''تمھیں کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔''

منگل سنگھ جواب میں ہنس دیا۔ ''موت سے بڑھ کر بھی کوئی سزا ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتی ہے'' کاوَل نے زور دے کر کہا۔ ''جب ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ پیار اور ہمدردی کا رشتہ توڑ لیتا ہے تو وہ نفرت کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔تمھاری زندگی ہی تمھاری سزا ہے منگل سنگھ۔''

منگل کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔اس نے پوچھا۔ ''تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟''

کاوَل نے جواب دیا۔ ''میں تم سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔''

گنگا کی زبان سے اس کی حیرت کا اظہار ہوا، ''سمجھوتہ؟''

منگل نے بھی شبہ سے کاوَل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''کیسا سمجھوتہ؟''

اب کاوَل نے اپنی شرط پیش کی۔ ''تم نہر سے ڈائنامائیٹ ہٹا کر میرے حوالے کر دو اور میں تمھاری جان اور تمھاری بندوق واپس کیے دیتا ہوں۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد منگل نے کہا، ''مجھے منظور ہے۔''

کاوَل نے بندوق منگل سنگھ کی طرف پھینک دی۔ اس سے پہلے کہ گنگا اسے روک سکتا، بندوق منگل کے ہاتھ میں تھی اور وہ کہہ رہا تھا، ''مگر کہے دیتا ہوں کہ تمھاری نہر کبھی پوری نہیں ہو گی۔اس میں پانی کبھی نہیں آئے گا کیونکہ اس پر میرے باپ کے خون کا شراپ ہے!''

گنگا حیرت اور غصّے سے کاوَل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کیا کیا آپ نے کاوَل صاحب۔ایک ڈاکو کو اس کی بندوق لوٹا دی۔''

''نہیں۔'' کاوَل نے جواب دیا۔ایک ایک لفظ پر زور دے کر۔۔ ''میں نے ایک ڈاکو کو اس کی بندوق نہیں ایک کسان کو اس کا ہل لوٹایا ہے، اس کی زمین لوٹائی ہے۔اس کی نہر لوٹائی ہے۔''

''میری نہر؟'' منگل نے بڑی حقارت اور تعجب سے کہا۔

''ہاں منگل سنگھ۔تمھاری نہر'' کاوَل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''نہر اڑانے سے پہلے یہ

سوچ لینا کہ یہ نہر جتنی میری ہے، گنگا کی ہے، اتنی ہی تمھاری ہے۔''

منگل سنگھ ان باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ ''اونھ''! کہہ کر مڑنے والا ہی تھا کہ کاؤل کی آواز پھر گونجی۔

''ایک بات اور یاد رکھنا منگل سنگھ جس دن یہ نہر پوری ہو جائے گی مجھے وشواس ہے کہ تم اس دن اپنی بندوق اس نہر کے پانی میں ڈبو دو گے۔''

اور اس لمحے گنگا سنگھ نے نہر کی طرف نگاہ کی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ چاندنی رات میں خالی نہر ایک دلہن کی سیندور بھری مانگ کی طرح اپنی سہاگ رات کا انتظار کر رہی ہے۔

○

جمنا سنگھ ولد گنگا سنگھ

ایک بار پھر بل ڈوزر کے فولادی ہاتھی پر سوار ہو کر گنگا سنگھ ریت کاٹنے کا کام ایسے جوش کے ساتھ کر رہا تھا جیسے پرانے زمانے میں کوئی راجپوت رن ویر گھمسان کی لڑائی میں دشمنوں کا صفایا کر رہا ہو۔ جتنا کام کدال اور کسّی لے کر ہاتھ سے کھودنے والوں سے ہفتوں میں ہوتا تھا اُتنا کام ایک اکیلا گنگا سنگھ اور اس کا بل ڈوزر ایک دن میں کر ڈالتے تھے اور چونکہ یہ کام صرف گنگا ہی نہیں اور کتنے ہی ٹریکٹر اور بل ڈوزر چلانے والے کر رہے تھے، اس لیے کھدائی کا کام زوروں پر تھا۔ نہر ریگستان کا سینہ چیرتی ہوئی بھارتیہ گاؤں کی طرف چلی جا رہی تھی۔

دن ہفتے، مہینے گزرتے گئے۔ کام زور شور سے ہوتا رہا۔ نہر آگے بڑھتی رہی۔ گنگا سنگھ کی امنگیں اور آرزوئیں اس کی گوری اور اس کے بچے جمنا سنگھ کی صورتوں میں ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ اب ان کی جدائی کے کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔

اور پھر ایک دن گنگا سنگھ کا بل ڈوزر رک گیا۔ وہ ریت کے ٹیلوں کو نہ کاٹ سکا۔ دوسرے بل ڈوزر بھی اسی طرح رک گئے۔ گنگا سنگھ نے اپنے بل ڈوزر کی پوری طاقت لگائی مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اس کے فولادی پہیے اور پٹے بالو میں گھومتے رہے مگر سامنے والی جمی ہوئی ریت کے تودوں کو بل ڈوزر کے آگے لگی ہوئی تلوار نہ کاٹ سکی۔ رن ویر پریشان ہو کر اپنے فولادی ہاتھی سے اتر آیا۔ گنگا نے ریت کے تودے پر گھونسے مار مار کر دیکھا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

گنگا سنگھ نے بل ڈوزر وہیں چھوڑ دیا۔ دوسرے ڈرائیوروں نے بھی اپنے بل ڈوزر اور ٹریکٹر وہیں چھوڑ دیے۔ ریت کے پھیلے ہوئے ٹیلوں کے درمیان وہ ہاری ہوئی فوج کے مردہ گھوڑوں، ہاتھیوں کی طرح لگتے تھے۔ نہ صرف ان کا کام بند ہو گیا بلکہ اونٹ گاڑیوں کا کام بھی بند ہو گیا۔ ساری نہر پر سناٹا چھا گیا۔

کام رکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے گنگا سنگھ ایک دن کاؤل کے بنگلے پر گیا۔ وہاں سونی نے خوش ہو کر اس کا سواگت کیا۔

''ارے بھیّا! نمستے، بیٹھو۔''

گنگا نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا، ''کاؤل بھیّا نہیں آئے؟''

''ابھی باہر گئے ہیں۔ جلد آ جائیں گے۔ تم بیٹھو نا، بھیّا۔''

گنگا سنگھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سونی سے پوچھا، ''ارے تو نے اپنی بھابی کو چٹھی لکھی ہے کہ نہیں؟''

''میں نے تو چٹھی لکھی ہے، بھیّا۔'' سونی نے اسے بتایا۔ ''مگر بھابی نے شکایت کی ہے کہ کئی اٹھواڑوں سے تم نے کوئی چٹھی نہیں بھیجی۔

گنگا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، ''سونو۔ اب چٹھیوں سے تسلی نہیں ہوتی۔ اور پھر اپنے جمنا کو تو چٹھی نہیں بھیج سکوں ہوں۔''

''مگر اب تو جلد نہر ہمارے گاؤں پہنچ جائے گی اور پھر ہم بھی چلیں گے تمھارے ساتھ......''

سونی ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کاؤل وہاں آ گیا۔ افسر کو دیکھ کر گنگا فوراً کھڑا ہو گیا۔

''گنگا بھیّا'' کاؤل چلایا۔ ''مگر تم کھڑے کیوں ہو؟''

گنگا نے اسے اصلی بات بتائی۔ ''آپ میرے افسر جو ہیں، کاؤل صاحب۔''

کاؤل نے گنگا کو زبردستی گدے دار کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا، ''گھر میں میں تمھارا چھوٹا بہنوئی ہوں۔''

''لیکن میں اس وقت بہنوئی سے نہیں انجینئر صاحب سے ملنے آیا ہوں۔'' گنگا سنگھ نے جواب دیا۔

سونی جوان کی اس بحث پر کھڑی مسکرا رہی تھی اب اندر جانے لگی۔ ''اچھا تم دونوں باتیں کرو.....'' اور جاتے جاتے گنگا سے کہہ گئی۔ ''اور بھیتا یہاں کھانا کھا کر جانا۔ میں تمھارے لیے کھانے کی کڑھی پکا رہی ہوں۔''

سونی اندر گئی تو گنگا نے پوچھا، ''اچھا یہ بتاؤ یہ پریتی بھوجن کس خوشی میں ہے؟''

کاؤل نے مسکرا کر وجہ بتائی۔ ''یاد نہیں، آج سے دو سال پہلے تم نے مجھے اپنی بہن سونپی تھی۔ آج ہماری شادی کی دوسری سالگرہ ہے۔''

''بدھائی ہو۔ بدھائی ہو۔'' گنگا نے بڑے جوش سے کہا اور پھر اداسی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ ''پھر تو اپنا جمنا بھی دو برس کا ہو گیا ہوگا!''

پھر اپنے جذبات کو قابو کرتے ہوئے وہ بولا، ''کاؤل صاحب اچھا یہ بتاؤ۔ اپنا کام کیوں بند ہو گیا۔ کوئی وجہ نہیں بتایا۔''

''بات یہ ہے گنگا کہ کسی کو اصلی وجہ معلوم ہی نہیں ہے۔'' کاؤل نے اسے بتایا۔ ''سب لوگ شکایت کر رہے ہیں کہ ریت بہت سخت ہو گیا ہے۔ بل ڈوزر سے کٹتا نہیں۔ دراصل وہ ریت نہیں ہے۔ ریت میں دبی ہوئی چٹانیں ہیں۔''

چٹانوں کے ذکر پر گنگا سوچ میں پڑ گیا پھر بولا، ''اب کیا ہوگا؟'' کاؤل نے لمبا سانس لے کر کہنا شروع کیا، ''تمھارے جیسے ٹریکٹر ڈرائیور اپنے اپنے اوورسیئر کو رپوٹ کریں گے۔ دو چار دن میں جب اوورسیئر کو فرصت ملے گی، وہ اسسٹنٹ انجینئر کو اطلاع کرے گا— اسٹنٹ انجینئر یہ معاملہ ایگزیکٹیو انجینئر کے حوالے کرے گا— ایگزیکٹیو انجینئر سپر نٹنڈنگ انجینئر کو فائل بھیجے گا— سپر نٹنڈنگ انجینئر چیف انجینئر کو اور وہ آگے منسٹر صاحب کو۔''[1]

''ٹھہرو۔ ٹھہرو۔'' گنگا نے گھبرا کر کہا۔ ''اس سب میں کتنا ٹائم لگے گا اور کتنے دن ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے، گوری کو— اور جمنا کو؟''

''اور پھر فیصلہ کیا ہوگا؟''

''ممکن ہے فیصلہ یہ ہو کہ نہر کا رخ موڑ دیا جائے۔''

1۔ یہ جملہ بھی سنسر نے کاٹ دیا

''مطلب یہ نہر بھارتیہ گاؤں نہیں پہنچے گی۔ کسی اور طرف چلی جائے گی؟''

''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''دوسرا کیا ہوسکے ہے کہ نہر ہمارے گاؤں جلد ہی پہنچ جائے ہمیں اور انتظار نہ کرنا پڑے؟''

جواب دینے سے پہلے کاؤل نے کچھ دیر سوچا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''دوسری صورت یہ ہے کہ ایک بڑا دھماکہ ہو جو نہ صرف ریت میں دبی ہوئی چٹانوں کو توڑ دے بلکہ ان سب سرکاری دماغوں میں ہلچل مچادے۔''

گنگا سنگھ نے بڑے یقین کے ساتھ کہا، ''تو یہ کام میں کروں گا، صاحب۔'' اور جب کاؤل نے کہا، ''گنگا تم اکیلے کیا کر سکتے ہو؟'' تو گنگا کی آنکھوں میں ایک خطرناک ارادے کی چمک ابھر آئی اور اس نے ایک ایک لفظ کو تولتے ہوئے کہا، ''میں وہی کروں گا جو فرہاد نے کیا تھا۔''

فرہاد نے کیا کیا تھا؟

اس نے اپنے فولادی تیشے سے پہاڑوں کے پتھر کاٹ کاٹ کر اپنی محبوبہ شیریں کے لیے نہر کھود دی تھی۔ اگرچہ اس کام کی تکمیل میں خود اس کی اپنی جان بھی چلی گئی تھی۔

گنگا تو بیسویں صدی کا فرہاد تھا۔ اس نے کیا کیا؟

اس نے ریت کی دبی ہوئی چٹانوں کو ڈائنامائیٹ لگا کر اڑا دیا۔ جو کام برسوں میں ہوتا اس کو چند دھماکوں میں پورا کر دیا۔ بھارتیہ گاؤں کی طرف نہر جانے کا راستہ صاف کر دیا۔ اپنی گوری اور اپنے جمنا۔۔۔ اور اپنے گاؤں والوں کے لیے۔۔۔ پانی کا مستقل انتظام کر دیا لیکن خطرناک دھماکوں کے درمیان اسے اپنی دنیا، اپنی زندگی اوپر نیچے ہوتی، پھر گھومتی دکھائی دی۔ وہ ریت پر ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور ڈائنامائیٹ کے دھماکوں سے اڑتا ہوا ایک بڑا پتھر خطرناک تیزی سے اسے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔

موت کو قریب آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اور اب گنگا کی آنکھوں کے سامنے اس کی زندگی کے ماضی اور مستقبل کی جھلکیاں ایک کے بعد ایک آنے لگیں۔

اس کا باپ ہری سنگھ ۔۔۔ بہتا ہوا پانی۔۔۔ گیہوں کی فصل ہوا میں لہراتی ہوئی۔۔۔ اس کی بیوی

گوری — لال لال پھول کھلے ہوئے — اس کی بہن سونکی — بہتا ہوا پانی — ریت میں چلتا ہوا ٹریکٹر — لال جیپ میں بیٹھا ہوا انجینئر کاؤل۔

پھر بہتا ہوا پانی...... پانی جس میں ان کی زندگی تھی۔ زندگی کی ساری امیدیں اور آشائیں تھیں اور زندگی کا سارا حسن سمٹا ہوا تھا!

اور آخر میں ایک اور دھما کہ ہوا۔ لال لال شعلوں اور دھوئیں کا ایک بادل اس کے شعور پر ہمیشہ کے لیے چھا گیا!

اور اب وہی پرانی لال جیپ ریگستان میں سے دوڑتی ہوئی بھارتیہ گاؤں کی طرف دوڑ رہی تھی — جھونپڑے کے سامنے کے چبوترے پر گوری اپنے بچے کو لیے بولنا سکھا رہی تھی۔

''جمنا — بولو — بابا۔ بابا۔''

اسی دم گوری نے دیکھا کہ گاؤں میں ایک لال لال موٹر آ کر رکی ہے اور اس میں سے ایک آدمی اور ایک عورت اترے۔ دور سے شکل تو نہیں پہچان سکتی تھی لیکن اتنا دیکھ سکتی تھی کہ آدمی کافی لمبا ہے اور عورت چھوٹے سے قد کی ہے۔

موٹر سے اتر کر وہ دونوں گوری کے جھونپڑے کی طرف بڑھے اور گوری نے اپنے آپ سے سوال کیا، ''یہ کون آوے ہے رے؟''

ننھا جمنا — جس نے آج تک اپنی ماں کے سوا کسی انسان کو دیکھا ہی نہیں تھا — ان دونوں کو حیرت سے کھلی آنکھوں سے تکتا رہا۔ مگر جب وہ قریب آئے تو گوری نے سونکی کو پہچانا۔ اب سونکی اور اس کا لمبا ساتھی دونوں گوری کے چرن چھو رہے تھے۔

''بدھائی ہو سونکی۔'' گوری نے آشیرواد دیتے ہوئے کہا اور پھر کاؤل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہی ہے نا وہ......''

''لمبو انجینئر۔'' کاؤل نے جملہ پورا کر دیا۔

سونکی اب بچے کے پاس بیٹھ کر اسے پچکار رہی تھی۔ ''اور بھابی یہ اپنا جمنا ہے نا؟ اس کی شکل بالکل بھیا جیسی ہے!''

اب گوری کو پوچھنے کا موقع ملا۔ ''سونکی تمھارے بھیا کیسے ہیں؟''

سونکی نے پہلے اپنے پتی کی طرف دیکھا پھر کہا "بھیا بہت اچھے ہیں ان کا بڑا نام ہے۔"

اور کاؤل نے کہا، "انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔"

سونکی نے پھر کہا۔ "تمھاری نہر تیار ہوگئی ہے بھابی۔"

اب گوری نے رنکھی اور پریشان ہو کر پوچھا، "نہر تیار ہو گئی ہے۔ پھر وہ کیوں نہیں آئے؟ کتنے مہینے سے چٹھی بھی نہیں لکھی انھوں نے میرے دل میں تو برے برے وہم اُٹھ رہے تھے۔ کہاں ہیں وہ؟"

"بھابی۔ گنگا بھیا بڑا کام کر رہے تھے۔" کاؤل نے کہا۔ "ان کا کام پورا ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو تمھیں وہاں بلایا ہے۔"

"مجھے بلایا ہے؟" گوری کی آواز میں بڑا جوش تھا، بڑی امیدیں تھیں۔

"ہاں بھابی" سونکی نے اسے یقین دلایا۔ "تمھیں لے جانے کے لیے ہی تو ہمیں یہاں بھیجا ہے۔"

"اور اپنے جمنا کو بھی؟" گوری نے سوال کیا۔

کاؤل نے جواب دیا، "اور جمنا سنگھ ولد گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ کو بھی بلایا ہے۔" اور گوری کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ خوشی کے مارے پھٹ پڑے گی۔ اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر بھینچتے ہوئے وہ بولی، "سنا جمنا۔ تیرے بابا نے ہمیں بلایا ہے! ہاں تیرے بابا نے ہمیں بلایا ہے!"

لاؤڈ اسپیکر سے آواز آرہی تھی۔ "آج راجستھان نہر کے انتم بھاگ کا اُدگھاٹن جمنا سنگھ ولد گنگا سنگھ ولد ہری سنگھ کے ہاتھوں میں ہوگا۔"

نہر کے کنارے رنگ برنگے جھنڈے لگے ہوئے اسی خوشی کے موقع پر اعلان کر رہے تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی نہر کے دونوں طرف لوگ اپنے راجستھانی لباس میں کھڑے تھے۔ مرد، عورتیں، بچے، اونٹ سوار، کسان، مزدور اور شامیانے میں منسٹر بھی تھے افسر بھی اور سب انجینئر بھی موجود تھے اور ان کے بیچ میں چیف انجینئر جس کو سب مزدور بڑے صاحب کہتے تھے۔ لیکن آج مہمان خصوصی کی جگہ گوری کھڑی ہوئی تھی جس کے ایک طرف سونکی تھی اور دوسری طرف کاؤل اور اس کی گود میں ننھا جمنا سنگھ۔

جیسے ہی اعلان ہوا گوری نے حیران اور پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کہیں اپنا پتی نہیں دکھائی دیا تو اس نے سونکی سے پوچھا، ''جمنا کے بابا کہاں ہیں؟''

سونکی جواب نہ دے سکی اس نے اپنے پتی کی طرف دیکھا۔ گوری بھی گھبرا کر کاؤل کی طرف مڑی۔ کاؤل نے نہر کی طرف اشارہ کیا۔ گوری نے ادھر دیکھا، مگر اس کو خالی نہر کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس کا گنگا سنگھ کہاں ہے؟ اس کی خاموش نگاہوں نے کاؤل سے مطالبہ کیا۔ اب کاؤل نے ننھے جمنا کی انگلی پکڑ کر بجلی کے بٹن پر رکھ دی اور اسے دبا دیا۔

اور اسی دم بندھ کے دروازے اوپر اٹھ گئے اور خالی نہر میں پانی کا ریلا آ گیا لیکن گوری نے جب ادھر دیکھا تو اسے پانی لال نظر آیا۔

ہزاروں لوگ تالیاں بجا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے، پانی کے آجانے پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے، رنگین جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے، رنگین غبارے نہر کے پانی پر تیر رہے تھے۔ سفید کبوتر آزاد کیے جا رہے تھے۔ اور وہ ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ راجستھان، ریگستان میں نہر آ گئی تھی، لوگ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ نہر کے ٹھنڈے پانی میں کود رہے تھے اور خوشی سے نہر کا پانی گنگنا رہا تھا، گا رہا تھا، ناچ رہا تھا، ابل رہا تھا، مچل رہا تھا، لیکن گوری کے لیے پانی کا رنگ لال تھا۔ لہو کی طرح لال۔ اس کے گنگا کے لہو کی طرح لال۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ گنگا نے فرہاد کی طرح اپنی جان دے کر گاؤں کے لیے خوشی اور خوشحالی کے دروازے کھول دیے تھے۔

جیسے ہی اس کو یہ احساس ہوا اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ نہر کے بہتے ہوئے پانی میں سے اس کا گنگا ابھر آیا۔ وہی کپڑے پہنے ہوئے تھا جو اس نے گاؤں سے رخصت ہوتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت اس کا سارا بدن اور اس کا چہرہ لال سرخ — جیسے وہ خون میں نہایا ہوا ہو۔ اور اس کے بازو کھلے ہوئے تھے جیسے کسی کو آغوش میں لینے کا انتظار کر رہے ہوں۔

اس 'گنگا سنگھ' کو گوری نے دیکھا، سونکی نے دیکھا اور انجینئر کاؤل نے دیکھا۔ کسی کو وہ دکھائی نہ دیا۔ نہر کھلنے کی خوشی میں تالیاں بجتی رہیں، لیکن تالیاں بجانے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ کسی گھرانے کے غم اور دکھ نے ان سب کے لیے خوشیاں خریدی ہیں۔

اسی وقت نہر کے اس پار ایک ریت کے ٹیلے پر منگل سنگھ اونٹ پر سوار رائفل لیے کھڑا تھا

اور نشانہ کاؤل کے سینے پر لگایا ہوا تھا۔ وہی اس کا دشمن تھا۔ اس نے ہی سونکی کو اس سے چھینا ہوا تھا۔ وہی یہ نہر لایا تھا۔ ابھی منگل سنگھ لبلبی دبانے والا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں سونکی کی آواز آئی، ''تو پھر یاد رکھ منگل سنگھ، ایک دن میرا بھائی اس گاؤں میں نہر لے کر ضرور آئے گا۔''

منگل سنگھ نے پلٹ کر پانی کی طرف نگاہ کی۔ اس کی نگاہ میں غصہ ہی غصہ تھا۔

مگر پانی اچھل رہا تھا۔

پانی ابل رہا تھا۔

پانی گنگنا رہا تھا، پانی گا رہا تھا، پانی ناچ رہا تھا۔

اور پانی منگل سنگھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

کچھ زندگی کی حقیقتیں سمجھا رہا تھا۔

اور اب منگل سنگھ کو چاروں طرف سے ایک اور آواز گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔۔۔ انجینئر کاؤل کی آواز۔ ''ایک بات اور یاد رکھ، منگل سنگھ، ایک دن تو اس بندوق کو نہر کے پانی میں ضرور ڈبو دے گا۔''

اور چند پل کے بعد ایسا ہی ہوا۔

منگل سنگھ نے بندوق کو اپنے سر کے اوپر اٹھایا اور اس کو نہر کے پانی میں پھینک دیا۔ پانی میں بندوق گرنے کی آواز چھپاک سے آئی۔ اس وقت گوری اور کاؤل اور سونکی۔۔۔ اور ننھا جمنا سنگھ جو کاؤل کے کندھے پر چڑھا ہوا تھا۔۔۔ ''تو پی۔ تو پی'' کی سمادھی کی طرف جا رہے تھے۔ آخر کار نہر۔۔۔ یہ نہر جو راجستھان کے لیے بلکہ سارے ہندوستان کے لیے، ایک نئی زندگی کا اعلان تھی۔۔۔ وہ نہر اب بھارتیہ گاؤں کی سرحد پر آن پہنچی تھی۔

○

خواجہ احمد عباس (جون 1914 - یکم جون 1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے ومضامین بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے وسوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف وتالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادبِ اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تاکہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب ونایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے جملہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے اور وہ داد وتحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-87510-28-9
ISBN 938751028-X
NCPUL
New Delhi

قیمت ₹ 265/-
قیمت سیٹ ₹1935/-